188424

Osmania University Library

Call No. 910 M / ط - ع　　　Accession No. 48523

Author حبیب اللہ

Title ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی اساس

This book should be returned on or before the date last marked below.

ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس

دہلی کی ترک سلطنت (1206ء - 1290ء) کے قیام اور فروغ کی ایک تاریخ

اے۔ بی۔ ایم۔ حبیب اللہ

مترجم

مسعود الحق

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

سنہ اشاعت جنوری تا مارچ 1984 ـــــــ شک 1905
پہلا ایڈیشن : 1000

قیمت : -/25
سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو، 333
کتابت : واجد علی خاں
مصوّر : کماری ستیہ پربھا

اشتراک : انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دلّی

PG 8523
9 ...

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ڈائرکٹر بیورو فار پروموشن اردو (ویسٹ بلاک 8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی (110066) نے ترقی اردو بیورو، وزارت تعلیم و ثقافت، حکومتِ ہند نئی دہلی کے لیے سپر پریس دہلی ۵۱ سے چھپوا کر شائع کیا۔

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت مؤثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا ہے جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کرچکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائریکٹر ترقی اُردو بیورو

انتساب

اپنی ماں، کنیز فاطمہ صغرا لطیف کے نام
جو اب صرف ایک یاد ہیں۔

فہرست

1۔ تعارف	15
2۔ پس منظر۔ وسط ایشیا	30
3۔ ابتدائی فتح	73
4۔ سلطنت دہلی (1206ء تا 1235ء)	114
5۔ جھوروتی جھگڑے اور بغاوتیں (1265ء تا 1235ء)	146
6۔ ہندو جارحیت (1265ء تا 1235ء)	178
7۔ سلامتی اور استحکام (1265ء تا 1287ء)	199
8۔ مملوک سلسلہ سلاطین کا خاتمہ (1277ء تا 1290ء)	228
9۔ مغربی سرحد اور بیرونی حملے	244
10۔ مرکزی حکومت	273
11۔ صوبائی بندوبست	291
12۔ افواج	304
13۔ قانون اور عدلیہ	313
14۔ مالیات اور رائج الوقت سکے	322
15۔ معاشرہ اور تہذیب	338
16۔ سایۂ عاطفت میں رہنے والے غیر مسلم (ذمی)	362
17۔ ماضی کے واقعات پر ایک نظر	378

۱۵۔ فن تعمیر کی یادگاریں 398

ضمیمہ

الف:۔ معیز الدین محمد بن سام کا برن "فرمان" 410
ب:۔ پرتھوی راج اور معیز الدین کی جنگ کا مقام 412
ج:۔ کھوکھروں کی تبدیلی مذہب 414
د:۔ حوالے جات کی فہرست 416

دوسرے انگریزی ایڈیشن کا دیباچہ

اس کتاب کی پہلی اشاعت جن حالات میں ہوئی تھی انھوں نے اس کی طباعت کو متاثر کیا تھا۔ تاہم دو سال کے اندر ہی کتاب کی دوسری اشاعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ برطانوی حکومت کے ہندوستان اور پاکستان کو اقتدار سونپنے سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس کی بنا پر یہ کام فوراً ہاتھ میں نہیں لیا جا سکا۔ اس تاخیر سے بہر حال یہ فائدہ ہوا کہ مجھے متن پورے طور پر نظر ثانی کرنے اور ان برسوں میں جو نیا مواد سامنے آیا اسے اس میں شامل کرنے کا موقعہ ملا۔ نتیجہ کے طور پر کچھ ابواب کو دوبارہ لکھا گیا، ان میں کچھ اضافہ کیا گیا۔ بعض مسائل کی از سر نو تحقیق کی گئی تشریحات اور ضمیموں کو اور مزید مفصل اور تازہ تر کر دیا گیا۔ عمارتی آثاروں کے ضمیمے کو ایک باب کی شکل دی گئی۔ اور فرانسیسی آرکیالوجیکل مشن کی افغانستان میں حالیہ دریافت جام مینار کو مملوک طرز تعمیر سے مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تبصرہ نگاروں کے کچھ نکات کو شکریہ کے ساتھ اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔ نقشوں کو پیمانے کے مطابق دوبارہ تیار کرایا گیا ہے اور ایک نئے نقشے کا اضافہ بھی کیا ہے۔ آثار اور مینا طوروں کی پہلی پلیٹوں کی جگہ نئی تصویریں دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک تصویر تو پہلی بار اس کتاب میں چھپ رہی ہے۔ یہ دعویٰ تو بے جا ہوگا کہ کتاب طباعت کی غلطیوں سے یکسر پاک ہے مگر یہ توقع ضرور ہے کہ اس ایڈیشن کی ظاہری شکل و صورت پہلے سے زیادہ دیدہ زیب ہوگی۔

اعراب کے استعمال پر کچھ تبصرہ نگاروں کے اصرار کے باوجود میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ اُن کی عدم موجودگی کی وجہ سے پڑھا لکھا اور سنجیدہ قاری دشواری محسوس کرے گا۔ نقل لفظی کا کوئی ایسا قاعدہ ابھی تک نہیں بنا ہے جو

ہر ایک کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اعداد کو علامات سے ظاہر کرنے (NOTATION) کے مختلف قاعدوں میں سے کسی ایک کے محدود یا مکمل شکل میں استعمال کرنے میں اس سے زیادہ منطق نہیں رہ گئی ہے کہ حروف کو اضافی علامتوں سے بوجھل اور گنجلک کیے بغیر صوتی مشابہت کے سادہ طریقے کو استعمال کیا جائے۔

اعراب کے برتنے پر ضرورت سے زیادہ اصرار اُسے بے جان اور بے معنی بنا سکتا ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ایک رسم کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے جس نے متبحر علمی کو محض غیر اہم خارجی اجزاء کا ایک مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

مقامات کے ناموں کے لیے میں نے ان ہی ہجّوں کو اپنایا ہے جو آج کل ہندوستان اور پاکستان میں سرکاری طور پر رائج ہیں۔ بعض خاص اصطلاحات جیسے مملوک اور عباسی وغیرہ کے لیے نسبتاً سادہ شکل اختیار کی گئی ہے۔

پہلے ایڈیشن میں میں نے خاص طور سے کچھ لوگوں کا ذکر کیا تھا ان میں سے پروفیسر ایچ۔ سی۔ رائے چودھری ابو طاہر صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے اس بنا پر ان کے احسان کا بوجھ میرے اوپر اور بڑھ گیا ہے۔ ناموں کی اس فہرست میں مجھے کلکتہ اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ایس۔ این۔ سین کا نام شامل کرنا چاہیئے۔ وہ خدا کے فضل سے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور جن کی اپنے پرانے طالب علموں کے کاموں میں ہمدردانہ دلچسپی میرے لیے ہمیشہ تقویت کا باعث رہی ہیں۔ میرے ساتھی ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ امام الدین اور ڈاکٹر ایم۔ آر۔ طرفدار نے پروف پڑھنے میں میری امداد کی لیکن کتاب میں پھر بھی جو کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں تو اس کی ذمّہ داری یقیناً مجھ پر ہے۔ میری چھوٹی بیٹی شیرین، مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے اشاریہ تیار کرنے کا مشکل کام صبر و استقلال اور احتیاط سے کر دیا۔

ڈھاکہ یونی ورسٹی
جون ۱۹۶۱ء

اے۔ بی۔ ایم۔ حبیب اللہ

پہلے انگریزی ایڈیشن کا دیباچہ

1192ء میں چوہان راجپوتوں کی تباہی کے بعد کی صدی ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ غزنوی اور عربوں کی اوّلین کوششوں کے بعد غوریوں کی فتوحات نے ترکی مسلمانوں کو حکومت کرنے اور اس ملک میں بس جانے کے مصمم ارادے سے شمالی ہندوستان میں جما دیا۔ یہ لوگ اسلام کے ان ثقافتی عناصر کے ارتباط و ادغام کا ذریعہ بنے جو بعد کی کئی صدیوں تک ہندوستانی زندگی پر غالب رہنے والے تھے۔ مگر پھر بھی ان نئے اقدار کی تہہ میں ہندوستانی اداروں اور ہندوستانی طرزِ زندگی کی وہ مسلسل رو تھی جسے یکسر بدل دینے کی ان نئے حکمرانوں میں نہ تو سکت تھی اور نہ ہی خواہش۔ مغلوب ہندو فوجوں نے انھیں کبھی معاف نہیں کیا اور اپنے تمام وسائل کو بڑی شدت کے ساتھ اُس وقت آزمایا جب منگول وحشی اپنی تمام تر قوت اور اپنا سارا ساز و سامان ختم کر چکے تھے۔ ان کی یہ تجربیت ایک بڑا مفید سرمایہ ثابت ہوئی اور مصالحت اور برجستگی کے ذریعہ وہ اس اساسی عمل کو روکنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن اس عمل میں انھوں نے اپنے ہندوستان سے باہر کے رابطوں اور الحاق کو کھو دیا اور وہ ماحول وجود میں آیا جس نے تہذیب اور تمدن کے اس نمونے کو تیار کیا جو آج اور گذرے ہوئے کل کا ہندوستان ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا آغاز کرنے کے تیرھویں صدی عیسوی اس تاریخ کی اہم کڑی ہے۔

ان صفحات میں اسی عبوری دور کے مطالعے کو پیش کیا گیا ہے۔ میرا بنیادی ماخذ کا ذریعہ لازمی طور پر فاتحین ہی کا ہے۔ مگر پھر بھی میں یہ دعویٰ تو کر ہی سکتا ہوں کہ میں نے کسی ہندوستانی ماخذ کو وہ چاہے کتنے ہوں یا سکوں

کے ذریعہ اور چاہے ادبی ہوں، نہ تو نظر انداز کیا ہے اور نہ ہی اسے مرہونِ منت کر کے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہا ہوں۔

میں نے سلاطین دہلی کے لیے لفظ 'مملوک' استعمال کر کے ایک عام اصطلاح وضع کرنے کی کوشش کی ہے کیوں کہ یہ لفظ اگر ایک طرف ان کی اصل حیثیت کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف یہ لفظ غلام کی غیر قطعیت سے بھی پاک ہے۔

میں اپنے ناقدین کے سامنے کچھ وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں یہ ہے غیر انگریزی ناموں اور لفظوں کو لکھنے کے طریقے کے بارے میں جسے غیر سائنسی طریقہ کہا جاسکتا ہے۔ جواز میں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ محض سہولت کی بنا پر ہے اس طریقے کے استعمال کا میرا جواز صرف آسانی ہے۔ آسانی پڑھنے والے کے لیے بھی اور چھاپنے والے کے لیے بھی مزید یہ کہ اعراب یا صوتی و امتیازی علامتوں میں مجھے ہمیشہ بلاوجہ اپنی علمیت جتانے کی بو آتی ہے۔ کیوں کہ جو لوگ زبان سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ضروری ہے اور اس آدمی کے لیے بھی جو اس زبان کے اعراب سے مانوس نہیں ہے، یہ علامتیں بے کار محض ہیں سوائے اس کے کہ اس سے مصنف کی علمیت اور قابلیت کا اظہار ہو۔ میرے خیال میں دوسری زبان کے لفظوں کو ادا کرنے کے لیے ماہر لسانیات اور باریک بین ضابطہ پرست کے علاوہ سب کے لیے، مشابہت کا طریقہ انتہائی فطری ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ آسان ہے۔ میں نے مقامات کے ناموں کی ان ہجوں کو برقرار رکھا ہے۔ جن کا صوتی سقم انگریزی زبان کا تقریباً حصہ بن چکا ہے۔ جس میں وہ گزٹوں میں استعمال ہوتے ہیں صرف دو مقامات متھرا اور اودھ کے ہجے میں نے ضرور تبدیل کیے ہیں۔ ان کا استعمال انگزیت زدہ تلفظ کی وجہ سے بڑا بھیانک ہو جاتا ہے۔ طباعت کی غلطیوں کی تعداد تکلیف دہ حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ اس کے لیے میرا پروف کو خراب پڑھنا اتنا ہی ذمہ دار ہے جتنا کہ جنگ کی وجہ سے پریسوں میں کام کی زیادتی جہاں ٹائپ کو بہت جلدی جلدی طباعت کے دوسرے کاموں کے لیے اور بعض اوقات، متن کی صحت کو قربان کر کے خالی کرنا پڑتا تھا۔

جن لوگوں کی قابل قدر امداد کا مجھے اعتراف کرنا ہے ان میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سی۔ سی۔ ڈیویز ہیں۔ آپ پہلے لندن یونیورسٹی میں بھی کام کر چکے ہیں۔ آپ کا بے انتہا اخلاق اور استادانہ مشورے نے میرے اس کام کو آسان بنادیا جسے میں شروع میں ناممکن حد تک مشکل سمجھتا تھا۔ میں آنجہانی سر ای۔ ڈینیس راس اور جناب ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے متعدد سہولتیں فراہم کیں اور مسائل کو حل کرنے میں امداد کی۔ جناب نیلسن رائٹ نے ازراہ کرم سکہ سازی سے متعلق باب کو پڑھا اور اس میں اہم غلطیوں کی اصلاح کی۔ مجھے بلند شہر کے جناب حسن برنی صاحب ایڈوکیٹ کا بھی شکر گزاری کے ساتھ ذکر کرنا چاہئے جنھوں نے معزالدین کے فرمان کو دیکھنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت دی۔ میں اپنے اساتذہ ڈاکٹر این۔ کے۔ دت اور پروفیسر ایچ سی۔ رائے چودھری کے مشوروں اور ہدایتوں کے لیے انتاہی احسان مند ہوں۔ اس کام کی مختلف منزلوں پر میرے دوست ڈاکٹر مہدی حسن اور جناب محب الحسن خاں نے جو اعانت کی اس کے لیے میں اُن کا بھی شکر گزار ہوں۔ اپنے شاگرد اور دوست عبدالمجید ایم۔ اے کا بھی احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے اپنا کافی وقت اور آرام تج کر بڑی خوشی کے ساتھ اشاریہ مرتب کرنے کے مشکل کام کو انجام دیا۔

آخر میں سب سے زیادہ شکر گزار اور احسان مند "م" کا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ ابوطاہر کا اور ابوالحسن مرحوم کا جو میرے لیے بہت کچھ رہے ہیں۔ ان کے احسانات الفاظ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

کلکتہ یونیورسٹی
15، ستمبر 1945ء

اے۔ بی۔ ایم۔ حبیب اللہ

اختصاریات

ADD......: ایڈیشنل مینو سکرپٹ اِن برٹش میوزیم۔ لندن۔

ASR......: رپورٹس آف آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔

BSOAS...: بلیٹن آف دی اسکول آف اورنٹیل اینڈ ایفرکن اسٹڈیز۔

BMC......: برٹش میوزیم کیٹلاگ آف کوائنس۔

CHI......: کیمرج ہسٹری آف انڈیا۔

DHB......: ڈھاکا یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال۔

EI.........: ایپی گرافیا انڈیکا۔

(ALIGARH) ELLIOT ایلیٹ اور ڈاؤسن کی ہسٹری آف انڈیا، ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹورینس۔ جلد دوم (الف) پروفیسر محمد حبیب کے تعارف (ب) پروفیسر ہدی والا کی کمنٹری اور (ج) خلیق احمد نظامی کے ضمیمے کے ساتھ دواں اشاعت علی گڑھ 1952ء

HCIP......: ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل۔

IA.........: انڈین اینی کوئٹی۔

IC.........: اسلامک کلچر۔

IGI........: امپریل گزیٹیر آف انڈیا۔

IHQ.......: انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی۔

IO.........: انڈیا آفس لندن۔

JAOS......: جرنل آف دی امریکن اورنٹیل سوسائٹی۔

JASB......: جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

JBORS ..... جنرل آف دی بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی۔
JDL ...... جنرل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرس۔ کلکتہ یونی ورسٹی۔
JGIS ...... جنرل آف دی گریٹر انڈیا سوسائٹی۔
JRAS ...... جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن۔
JRASBL ... جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ لیٹرس۔
MASB ..... میموآئرس آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔
MASI ..... میموآئرس آف دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔
NC .... نیومسمیٹک کرانیکل۔
OR .... اورنٹیل مینوسکرپٹس اِن دی برٹش میوزیم
PIHC ...... پروسیڈنگس آف دی انڈین ہسٹری کانگریس۔
PIHRC .... پروسیڈنگس آف دی انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن۔
TA .... طبقات ناصری۔
T.M .... تاریخ مبارک شاہی۔

پہلا باب

تعارف

ترک فاتحین کے ساتھ جو مذہب ہندوستان آیا وہ کوئی غیر مانوس مذہب نہ تھا۔ تقریباً اسی وقت سیاسی مہمات کے ساتھ ساتھ ساتویں صدی میں اسلام نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر قدم جمانے کی جگہیں حاصل کرنا شروع کر دی تھیں۔ ان مقامات پر عرب تاجر صدیوں سے جانے پہچانے تھے اور مسلمانوں کی حیثیت سے بھی ان کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم ہوا تھا۔ راجا رجواڑوں نے بھی جو اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے بے چین تھے، اُن لوگوں کے ساتھ بڑا فراخ دلانہ سلوک کیا کیوں کہ مہذب دنیا کے اہم تجارتی راستے اُن کے زیر اثر تھے۔ یہ لوگ داڑھیاں رکھتے تھے اور لمبے لمبے کرتے پہنتے تھے۔ ذات پات کے قاعدوں کو نہیں مانتے تھے اور ایک مقررہ اوقات میں ایک مستطیل عمارت میں عبادت کے لیے جمع ہوتے، جس میں کوئی بت نہیں تھا۔ یہاں کے لوگوں کے لیے یہ ایک ایسا منظر تھا جس کا نیا پن وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتا گیا۔ جیسے جیسے اُنھوں نے نوآبادیات قائم کیں اور پھیلتے چلے گئے، وہ آبادی کا ناقابل تقسیم حصہ بن گئے۔ اپنے سازوسامان کے ساتھ ملک میں گھومتے ہوئے اس "تاجک" نے تمدن کی ایک نئی شکل کا اضافہ کیا اور دانشوارانہ ترسیل کی نئی راہ کھول دی۔ اسے اپنے مذہب کی تبلیغ کی پوری آزادی تھی۔ گوکہ براہِ راست تبدیلِ مذہب کے واقعات شروع میں بہت کم ہی رہے ہوں گے۔ ایک ابتدائی

رپورٹ میں، جس کا حوالہ ایک عرب جغرافیہ داں نے بڑے شکایتی انداز سے دیا ہے کہا گیا ہے کہ اسلام نے ہندوستان میں کسی ایک کو بھی مسلمان نہیں بنایا تھا۔ مگر ثقافتی نظریات کا اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔ مقامی باشندوں، خصوصاً نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے تو مسلمان خوشحالی اور نجات کا مظہر تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قدیم ترین جماعت کی تسکین کو انھیں مبلغ تاجروں کی کوششوں کا ثمرہ کہنا چاہیے۔

سندھ پر حملہ بھی کوئی بے جوڑ یا اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ ان عرب تاجروں کے ساتھ گشتی کشتیاں اور سروے پارٹیاں آئیں۔ خلیفۂ روم کے عہد میں کونکن پر سمندر کی طرف سے حملہ ہوا۔ تجارتی سامان کی کشتیوں کی حفاظت کرنے والے مسلح جہاز ساحلی مدافعتی انتظامات کی چھان بین کرتے رہے۔ مگر اُن کی سرحد سے ہونے والے ان جائزوں نے آخر کار "کابل اور زابل" کی سرحدی سلطنتوں میں پیش قدمی کی صورت اختیار کی جس کا انجام محمدؐ بن قاسم کی فتوحات پر ہوا۔

مگر ہندوستان میں اسلام کو ایک سیاسی فتوحات کی حیثیت دینا عربوں کا مقصد نہیں تھا۔ سندھ کے واقعے کے ثقافتی اثرات چاہے جو بھی ہوئے ہوں سیاسی اثرات کے لحاظ سے یہ غیر موثر رہا۔ اس نے ہندوستانی برصغیر کے ایک بہت محدود حصّے کو متاثر کیا اور یہاں بھی جو تھوڑی بہت حرکت پیدا ہوئی جلد ہی فراموش کر دی گئی۔ عربوں نے اسلامی دولت مشترکہ میں جلد ہی اپنا مقام کھونا شروع کر دیا۔ ہندوستان میں ان کی توسیع کی راہ میں جغرافیائی حالات آڑے آئے۔ دسویں صدی تک ان کا فاتحانہ کردار ختم ہو چکا تھا۔ اور ہندوستانی راجاؤں نے انھیں صرف قدیم منچلے اور حالات سے مطابقت کرنے والے تاجر کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا۔

مذہب کی ترویج کے لیے ہندوستان میں ایک خود مختار اور مقتدر ریاست قائم کرنے کے لیے تاریخ نے ترکوں کا انتخاب کیا۔ جن کی تبدیلی مذہب خود ابھی نا مکمل تھی۔ اور جن کی فضیلت اُن کی تلوار تھی۔ یہ اپنے ساتھ بے پناہ قوت، ہمہ

جہت نسل پرستی اور ایک نئے نئے مسلمان کی پرجوش راسخ الاعتقادی سے کر آئے۔ یہ ایران کی تہذیب اور وہاں کے تمدّن سے سرشار تو ہوئے مگر اُن میں نہ تو ایرانیوں کی سی آن اور تخیل تھی اور نہ ہی عربوں کے ذہن کی دروں بینی اور دقیقہ شناسی۔ وہ انتہائی مادّہ پرست تھے اور شدید طور پر عمل اور کر گزرنے والے لوگ تھے۔ عربوں کی آتشیں جوش اور ولولوں نے اُن کے دلوں میں بڑی ہلکی حرارت پیدا کی۔ خوش مزاج اور خوش خلق ہونے کے باوجود یہ لوگ بسا اوقات اپنے دور کے قرابت دار منگولوں کی طرح انسانی جذبات سے یکسر عاری تھے۔ ان کے نزدیک اسلام محض ایک ہتھیار تھا۔ زیبائش اور جارحیت کا ہتھیار۔ اسلام نے دنیا کی انتہائی ترقی پسند کمیونٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے ان کے مقام کو بلند کر دیا اور اُن پر طاقت و دولت کی راہیں کھول دیں۔ یہ لوگ بہر حال وحشی نہیں تھے۔ انھیں تار تار کے اجڈ منگولوں سے نفرت تھی۔ انھیں حسن، انصاف، انسان دوستی اور علم متاثر کرتے تھے۔ ان کے اندر کی یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ یہ لوگ وہ تھے جو ڈھلانوں پر سرپٹ بھاگتے ہوئے ایک غیر متمدّن گھڑ سوار سے، شعر و شاعری کے رسیا اور فردوسی اور خسرو جیسے شاعروں کے سرپرست ہوئے۔ یہ ایک عظیم تبدیلی نظر آتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ ایک صدی سے کم مدّت میں ہو گیا۔ جب منگولوں نے ایک تباہ کن آندھی کی طرح سارے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس وقت ایک خانہ بدوش اور جنگجو قوم کا اسلامی ثقافت کے بہترین اجزاء کا محافظ ہو جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

اس طرح کے لوگ تھے جن پر عربوں کا سایہ پڑا۔ وسط ایشیا میں آٹھویں صدی سے بڑے پیمانے پر انتقال آبادی ہو رہا تھا اور یکے بعد دیگرے سلجوق، خطائی، غز، الِ باری اور ترکی نسل کے قرلوغ قبائل اسلامی سرزمین میں پھیل رہے تھے۔ اُنھوں نے سلطنتیں اور مملکتیں قایم کیں اور جب کبھی عقب سے دباؤ پڑا۔ تو دست بردار بھی ہوئے اور پردیس میں اور زیادہ ہٹ گئے۔ اس طرح یہ ایران عراق، افغانستان اور ہندوستان میں پھیلے۔ مگر صرف

اس لیے کہ نقل وطن کرنے والے منگولوں کی آخری لہر کے لیے ایک بار پھر اپنی جگہ چھوڑی۔

دسویں صدی عیسوی تک قلمرو ہند میں دریائے سندھ کے پار کابل کی ہندو شاہیا سلطنت سے ترکوں کے فوجی روابط قایم ہو چکے تھے۔ غزنوی کی حکومت کا وجود ختم ہوگیا اور ترکوں کا تسلط دریائے راوی تک بڑھ گیا۔

دریائے سندھ کے مشرق تک ایک مسلم حکومت قایم ہوگئی تھی جس نے سندھ کے عرب نو آباد کاروں کے برخلاف، جلدی ہی ہندوستان کے جغرافیہ کو سمجھ لیا اور گنگا کی وادی تک پہنچنے والے راستوں کے لیے خطرہ بن گئی۔ تقریباً دو سال تک غزنویوں نے پنجاب پر حکومت کی اور ہندوستان کے سیاسی نقشے کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے۔ ہندوستان اُن کی اگلی منزل بن گیا۔ ہندوستانی راجاؤں کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ حمیرہ ایک طاقتور جارح حملہ آور کی علامت بن گیا اور ایسا دکھائی دینے لگا گویا محمود کا خانودہ آریہ ورت کے قلب میں اسلام کو تخت نشین کردے گا۔

بہر حال یہ اعزاز ملنا اُن کی قسمت میں نہ تھا۔ محمود کی تیسری پشت میں اس کی وسط ایشیا کی حکومت سلجوقیوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ نئی ترکستانی شورشوں، خاندانی جھگڑوں اور نااہلی کے ساتھ ساتھ غور کے پہاڑی قلعے ان کے سابق شنا بانی باج گزاروں کی سرکشی نے بعد کے غزنویوں کو اپنے ہندوستانی مقبوضات کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ اگر وسائل اجازت بھی دیتے تب بھی مشرق کی طرف توسیع اور اس کے نتیجے میں راجپوتوں سے جنگ کرنا کسی طرح بھی مناسب نہ ہوتا اور خصوصاً اس صورت میں جب کہ غور کا رویہ مسلسل اور مستقل طور پر معاندانہ تھا۔ چنانچہ اس کے بجائے انھوں نے ہندوستانی راجاؤں سے مصالحت کی اور ان سے سمجھوتہ کر لیا۔

اس عمل کی تکمیل کا کام مخلوط الاصل اور غیر معروف شاہی خاندان یعنی شنسابانیوں کے لیے رہ گیا۔ انھوں نے غزنویوں کی جگہ لی اور حالاں کہ وسط ایشیا کی طرف ان کی توجہ پہلی بار ہوئی تھی۔ مگر کمزور اور باہمی جھگڑوں کے

شکارہندوستان کو تاراج کرنے میں انھیں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ شمال سے موج در موج، ترک منچلے اس راستے پر آئے جو ہندوستان کے امیر ترین صوبوں کو جاتا تھا۔ یہاں اُنھیں مناسب روزگار، خوشحالی اور شہرت کے ذرائع نصیب ہوئے۔ پندرہ برس کے مختصر وقفے میں، سیوالک سے بنگال تک کے طاقتور راجہ زیر کر لیے گئے اور وقت کھڑی کی گئی۔ مسجدوں نے اسلام کی حکمرانی کی کی حیثیت کا اعلان کر دیا۔ مگر یہ سراسر غلبہ مستقل فتح میں تبدیل نہ ہو سکا۔ یہ ایک طول طویل مسئلہ تھا اور اس میں پوری ایک صدی لگ گئی۔ راجپوتوں نے پہلی چوٹ برداشت کر لی۔ ترکی خصوصیات نے ترقیاتی عمل کو روک دیا تھا۔ چنگیز خاں نے ایک طوفان کی طرح سارے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ترکوں کو ان کے وطن سے منقطع کر دیا۔ مستقل مزاجانہ تدبّر اور خوش قسمتی کی وجہ سے ترک اپنے پیش رو عربوں کے انجام سے بچے اور مسلم حکومت کی مستحکم بنیاد رکھنے کے لائق ہوئے۔ ابتدائی استحکام کے اس کام میں مملوک سلاطین نے ایک بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اُنھوں نے سلطنت کو تباہی سے بچایا اور اگر خلجیوں نے توسیع دے کر اس سلطنت کو مملکت میں تبدیل کیا تو گویا انھوں نے محض ایک تاریخی فرض انجام دیا۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کے بانیوں کی حیثیت سے مملوک سلاطین زیادہ عزّت اور عمیق مطالعے کے لیے اس سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں جو اب تک انھیں دی گئی ہے۔ اس صدی میں نہ صرف یہ کہ ایک ریاستی نظام کی بتدریج تشکیل ہوئی بلکہ اس صدی نے ان متعدد عوامل کے آغاز کو بھی دیکھا جن پر عہد وسطیٰ کا مشترکہ ہندوستانی سماج اور مشترکہ ہندوستانی تمدّن پروان چڑھا۔ مغلوں کی آب و تاب نے ان کے پیش رووں کے عہد کو دھندلا دیا ہے جو بذات خود بھی معمولی نہ تھا۔ بہر حال ایک متوازن فیصلہ ایک عمیق مطالعے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ آنے والے صفحات اسی طرح کے مطالعے کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔

اس عہد کی طرف سے جو لاپروائی سی نظر آتی ہے اس کا آپ سبب کسی

حد تک ابتدائی مواد کی قلّت کو ٹھیرایا جاسکتا ہے مگر ایک محتاط تلاش و جستجو کے بہرحال ہمّت افزا نتائج نکلیں گے۔

وسط ایشیا کی تاریخ اور غور کے شنسابانی خاندان کے عروج کے لیے شیخ ابوالحسن بن ابوالکرم شنسابانی معروف بہ ابن الاسیر کی "کامل التواریخ" بہت ممتاز ہے۔ یہ مصنّف جو میسوپٹامیا میں رہتا تھا اور اس نے اپنی تصنیف 1230ء/628ھ میں مکمل کی۔ اس کی تصنیف کی آخری دو جلدوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ خود اس کے اپنے زمانے کے ہیں۔ اس نے اپنے ماخذ کو بڑی چھان بین کے بعد استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بیانات شاذ ہی غلط یا غیر مصدّقہ پائے گئے ہوں۔ تاہم یہ بات اس کے ان بیانات اور تبصروں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی جو تاریخوں اور ضروری حقائق کے اعتبار سے قابلِ ذکر حد تک صحیح ہونے کے باوجود سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کے تفصیلات میں رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ وہ بہرحال جہاں دوسرے ماخذوں کی تصدیق کرتا ہے۔ وہاں وہ قابلِ قدر ہے بعض مقامات پر وہ بہت دلچسپ توضیحات پیش کرتا ہے۔ جن کا ذکر اگرچہ دوسرے مستند لوگوں کے یہاں نہیں ملتا تاہم وہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ نجم الدین ابوبکر محمدؐ بن علی الرّاوندی کی تصنیف "راحت الصدّور" عراق کے بعد کے سلجوقیوں کی ایک بڑی مفید تاریخ ہے۔ ان بعد کے سلجوقیوں کا خاتمہ مصنّف نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ حالاں کہ ممتاز تصنیف "تاریخ جہان گوشۂ جوینی" کے مصنّف عطا ملک جوینی نے ان دونوں ماخذوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر اس کی تصنیف جو 1260ء/658ھ میں مکمل ہوئی تھی تیرھویں صدی کے نصف اوّل کے وسط ایشیا کی تاریخ کے لیے انتہائی قابلِ قدر ہے۔ وہ ہلاکو کے تحت بغداد میں ایک اہم انتظامی عہدے پر فائز تھا اور اس حیثیت میں تھا کہ منگولوں کی سرکاری دستاویزات کو استعمال کرسکے۔ اس لحاظ سے اس کی تصنیف مغربی ایشیا میں منگولوں کی فتوحات کے حالات کے لیے اوّلین تفصیلی اور معتبر تصنیف ہے۔ اس کا رویّہ منگول دوست کا ہے۔ کیوں کہ اس نے یہ کتاب منگو خاں کے عہد کی یادگار کے طور پر لکھی ہے۔ مگر اس کے بیانات اغلاط سے یکسر پاک ہیں۔ وسط ایشیا کے دوسرے مورخوں

کی طرح، ہندوستان کے بارے میں اس کی برائیں کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی صرف شنسا بانیوں یا جلاوطن خوارزمی شہزادے جلال الدین سے متعلق ہیں۔ یہ بات دوسری معدودے چند تواریخ کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں جو ہندوستان کے باہر اسی صدی کے دوران لکھی گئی ہیں۔ ان تصانیف میں مفرور شہزادے کے دوست اور ساتھی نورالدین محمدؒ زیداری النساوی کی کتاب "سیرت جلال الدین منگ برنی" ہے جو 1240ء میں مکمل ہوئی یہ ہندوستان میں شہزادے کی سرگرمیوں سے متعلق مفید تفصیلات فراہم کرنے کے لحاظ سے اہم ہے۔ ساری کتاب میں مصنّف نے اپنے ہیرو کی زبردست جانبداری کی ہے وہ حالات کی تصویر اس طرح مسخ کر کے پیش کرتا ہے کہ جس میں جلال الدین اور زیادہ شاندار نظر آتا ہے۔ مفسر قران ابو سعید عبداللہ بن ابوالحسن البیضاوی کی کتاب "نظام التواریخ" جو 1294ء / 674ھ میں مکمل ہوئی تھی، قطعاً قابل ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں غوریوں اور سلاطین دہلی کا نہایت مختصر تذکرہ ہے بلکہ ایک سبب اس کے بیانات کی عدم صحت ہے جو واضح طور پر افواہوں اور افسانوں پر مبنی ہیں۔ چودھویں صدی کے آغاز میں لکھی جانے والی تاریخوں میں عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی کی تصنیف "تاریخ وصاف" کا ذکر 1300ء اور 1328ء کے درمیان لکھی گئی۔ ضرور کیا جانا چاہیے۔ یہ کتاب جوینی کی منگولوں کی تاریخ ہی کا ایک سلسلہ ہے اور منگو خاں کے عہدِ حکومت کے آخری برسوں سے شروع ہوتی ہے۔ منگول مہمات کے ذکر میں ہندوستان کا بڑا سرسری حوالہ ہے مگر پھر بھی یہ کتاب ہندوستانی سرحد پر منگول سرگرمیوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک مقام پر اس کتاب میں محمود کی حکومت کے منگو خاں سے تعلقات سے متعلق بہت مفید معلومات ملتی ہے۔ دہلی کے سرکاری روزناموں میں جن واقعات کا ذکر ہے ان کی تصدیق کرتی ہے۔ سلاطین دہلی کا تذکرہ بہرحال غیر معتبر ہے۔ صرف خلجیوں کے عہد سے واقعات کا تذکرہ کسی حد تک غلطیوں سے پاک ہے۔ ہندوستان سے متعلق بالکل ایسے ہی مواد پر مبنی رشید الدین کی عالمی تاریخ "جامع التواریخ" ہے جو 1310ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اگر ایک طرف

وسط ایشیا کی معاصر تاریخ کے لیے یہ کتاب مفید ہے تو دوسری طرف فرمان روایان دہلی کا تذکرہ واصف سے زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے اور یوں بھی اس نے جگہ جگہ واصف کا بار بار حوالہ دیا ہے۔ اس عہد کی ایک دوسری تصنیف جو اتنی ہی نامکمل ہے ابوالفضل بن محمدؒ البناگیتی کی کتاب "تاریخ بناگیتی" ہے جو 1317ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا انتساب ایران کے اِل خانی حکمراں سلطان ابوسعید کے نام ہے۔ یہ دنیا کی ایک عام تاریخ ہے مگر درحقیقت اس کی حیثیت رشیدالدین کی "جامع التواریخ" کے خلاصے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کتاب نے "جامع التواریخ" کی ساری غلطیوں کو دہرایا ہے اور صحیح معنوں میں اس سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ حمداللہ مصطوفی قزوینی کی تصنیف "تاریخ گزیدہ" جو 1339ء/730ھ میں مکمل ہوئی بہرحال نسبتاً ایک زیادہ کارآمد تاریخ ہے۔ اس کا شمار مشرق کی چند بہترین عام تواریخ میں ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان کی تواریخ سے متعلق اس کی افادیت غزنیوں، شنسابانیوں اور سلاطین دہلی کے مختصر مگر صحیح تذکرے پر مبنی ہے۔ غوریوں کے علاوہ کہ جن کے بارے میں یہ کتاب بڑی دلچسپ تفصیلات فراہم کرتی ہے۔ جہاں تک تاریخوں اور واقعات کا تعلق ہے اس تصنیف کی قدر و قیمت محض تائیدی ہے۔ ہندوستان سے باہر لکھی جانے والی بعد کی تاریخوں میں ان تصانیف کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے جیسے "مجمل فصیحی" جسے فصیح الدین احمد بن محمدؒ فصیحی الخافی نے پندرھویں صدی کے وسط میں مرتب کیا تھا اور جو تاریخوار سلسلۂ واقعات کا ایک خلاصہ ہے۔ دوسری کتاب میرخوند کی 1498ء میں مکمل ہونے والی تصنیف "روضۃ الصفاء" ہے دو اور کتابیں جنھیں میرخوند کے پوتے خوندامیر نے 1528ء میں مرتب کیا تھا۔ "حبیب السیر" اور "خلاصۃ الاخبار" ہیں اس موقع پر "تاریخ الفی" کا تذکرہ بھی ضروری ہے جسے اکبر کی ہدایت پر ایک مجلس ادارت نے مرتب کیا تھا۔ اس میں رسول اللہ کے وصال کے ایک ہزار سال بعد یعنی 632 تک کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔ جو ماخذ مل سکے اُنھیں مرتبین نے استعمال کرنے میں انتخاب اور احتیاط سے کام لینے میں بڑی کاوش کی ہے یہ کتاب درحقیقت وسط ایشیا سے متعلق ہے اور واقعات کو نہایت

سختی کے ساتھ تاریخی ترتیب سے پیش کیا ہے۔ اس میں سلاطین دہلی کا تذکرہ بڑا سرسری ہے۔ سیف بن محمدؐ بن یعقوب الحروی کا ترتیب دیا ہوا شہر ہرات کا تاریخی تذکرہ جو غالبا 1318ء اور 1322ء کے درمیان لکھا گیا ہے۔ تیرھویں صدی میں ہندوستانی سرحد پر منگولوں کی سرگرمیوں سے متعلق مفید معلومات فراہم کرتا ہے [2] اس وقت ہرات کرٹ حکمراں غیاث الدین کے تحت تھا۔۔۔۔۔
معین الدین الزامچی الاصغیزاری کی مشہور و معروف تصنیف روضۃ الجنات" کے ماخذوں میں ایک ماخذ شہر ہرات کا مذکورہ تاریخی تذکرہ ہے معین الدین نے آخر پندرھویں صدی میں ہرات کا تفصیلی تذکرہ خود اپنے زمانے تک لکھا تھا۔

ان تصانیف کے علاوہ جو اپنی قدر و افادیت کے لحاظ سے محض ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہمارے اصل اور بنیادی ادبی ماخذ تعداد کے اعتبار سے معدودے چند ہیں۔ ان میں اوّلین تصنیف حسن نظامی کی "تاج المعاصر" ہے جو التمش کے عہد آخر میں مکمل ہوئی۔ یہ کتاب 588-626ھ/ 1192-1228ء کے خاص خاص فوجی واقعات پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اسلوب کے لحاظ سے انتہائی مسجّٰی اور مقفّٰی ہے مگر پھر بھی تھوڑے بہت جو واقعات اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ عام طور پر صحیح ہیں۔ فتح دہلی کے فوراً بعد ہی مصنف ہندوستان آیا تھا اور اس نے ایبک کے عہد میں اپنی تصنیف کا کام شروع کیا اور اس کا پہلا حصہ ایبک ہی کے نام معنون ہے۔ انڈیا آفس کے ایک مسودے کے علاوہ تمام دستیاب مسودوں میں کہیں نہ کہیں غلطیاں ہیں اور کسی ایک میں بھی 614ھ / 1217ء سے 1228ء/ 626ھ تک کے واقعات پر مشتمل وہ حصہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ ایلیٹ نے لوہارو کے نواب ضیاء الدین کے ایک ذاتی نسخے سے مدد لے کر اقتباسات پیش کیے ہیں۔ فتح کی ابتدائی تاریخ جاننے کے لیے انتہائی مفید اور "تاج المعاصر" سے جداوہ تاریخی حصہ ہے جو فخر الدین مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبّر کی نسبیات کی کتاب جس کی دریافت کا سہرا ڈینیسن راس کے سر ہے کے دیباچہ میں شامل ہے۔ مصنف پہلے غزنی اور دہلی کے دربار میں ایک مشہور اور صاحب حیثیت آدمی تھا۔ اس نے غوریوں کی ایک اور منظوم تاریخ لکھی۔ حالاں کہ اس کا تذکرہ

منہاج سراج نے کیا ہے مگر بدقسمتی سے اب ناپید معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ایک دوسری تصنیف "آداب الحرب والشجاعت" کے مسودے جس کو اس نے التمش کے نام معنون کیا ہے۔ متعدد ذخیروں میں محفوظ ہیں۔ دہلی کی اس نئی سلطنت کی فوجی تنظیم اور حکومت کے بارے میں یہ کتاب بڑی مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ نورالدین محمدؐ عوفی کی کہانیوں کا مشہور مجموعہ "جوامع الحکایات" جو التمش کے وزیر نظام الملک جنیدی کے نام معنون ہے، کے دیباچہ میں التمش کی اُن فوجی کارروائیوں کی تفصیلات کا ذکر ہے جو اس نے 1227ء/625ھ میں قباچہ کے خلاف کی تھیں اور جسے مصنّف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس عہد کے مسلسل عصری حالات کے لیے ہمیں منہاج الدین ابوعمر بن سراج الدین الجوزجانی کی تصنیف "طبقات ناصری" پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو 1260ء/658ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ یوں تو یہ دنیا کی ایک عام تاریخ ہے مگر اس کی اصل قدر و قیمت ہندوستان میں شنسابانی فتوحات اور اس کے نتیجے کے طور پر قایم ہونے والی حکومت کے حالات کے عینی تذکرے ہیں۔ جہاں خود مصنّف اعلیٰ مذہبی اور عدالتی عہدوں پر فائز تھا جن حالات کا اس نے ذکر کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اس کے عہد کے ہیں بلکہ اُن میں سے کچھ میں تو وہ حقیقی طور پر خود بھی شامل تھا اور یہی وجہ ہے کہ تصنیف میں ذاتی تعصب اور جانب داری کی جھلک نظر آتی ہے وہ غوریوں اور التمش کے خاندان کا طرفدار تھا۔ وہ بہت سے مقامات پر اُن حقائق کو چھپا جاتا ہے جو اس کے مربیّ اُلغ خاں اور سلطان ناصرالدین محمود (جس کے نام کتاب معنون ہے) کے حق میں نہیں ہوتے ہیں، جہاں تک حقائق کا تعلق ہے وہ عام طور پر صحیح ہیں مگر تفصیلات کے فراہم کرنے میں اس نے انتہائی خست سے کام لیا ہے اور بعض مقامات پر تو اس نے متضاد بیانات بھی دیے ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود ہمارے اصل ماٰخذ کی حیثیت سے اس کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ بلبن کی تخت نشینی کے وقت تک مصنّف زندہ رہا مگر یہ بدقسمتی ہے کہ اس نے اپنی تاریخ کو محمود کی وفات تک نہیں پہنچایا[46] اس وجہ سے 1260ء/658ھ سے 1265ء/664ھ کے درمیانی عہد کی تاریخ میں ایک ایسا خلا

رہ گیا جسے بعد کے بھی کسی مصنّف نے پُر نہیں کیا ہے۔ فرشتہ عین الدین بیجاپوری کی ایک تصنیف کا حوالہ دیتا ہے جس کا نام "ملحقات طبقات ناصری" ہے اور جس سے وہ کچھ ایسی معلومات اخذ کرتا ہے جو کسی دوسری جانی پہچانی تواریخ میں نہیں ملتیں۔ مگر آج نہ تو کوئی "ملحقات" سے واقف ہے اور نہ ہی اس کے مصنف سے۔ فرشتہ ایک دوسرے مصنّف صدر جہاں گجراتی کے حوالے بھی دیتا ہے۔ مگر یہ مصنّف بہر حال آخر پندرھویں صدی کا ہے اسی وجہ سے یقینیہ عہد کے لیے ہمارا سارا دارو مدار صرف "تاریخ فیروز شاہی" کے مصنّف ضیاء الدین برنی پر ہے۔ تاریخ فیروز شاہی 1359ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اس کا انتساب فیروز تغلق کے نام سے کیا گیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے دہلی کی تاریخ اس نقطے سے آغاز کی جس نقطے سے منہاج سراج نے اسے چھوڑا تھا۔ اس کا تذکرہ بہر حال بلبن کے عہد کے پہلے سال سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تصنیف اپنے طرز کے لحاظ سے حکایتی ہے اور منہاج کی تصنیف کے برخلاف اس کا مقصد بلاشبہ ناصحانہ اور پند آمیز ہے اور مطمع نظر "مثالوں کے ذریعہ سکھانا" ہے۔ برنی جو کچھ سکھانا چاہتا ہے وہ بسا اوقات بیان کو ایک بامقصد اور شعوری موڑ دے کر اور کبھی کبھی حکمرانوں کے برتاؤ اور چال چلن کی چیدہ چیدہ مثالوں کو پیش کر کے سکھاتا ہے مگر بیشتر وہ یہ کام تاریخی شخصیات کی زبان سے آئیں جہاں باتی پر طول طویل تقریروں اور مکالموں کے ذریعے کرتا ہے۔ تاریخ کو ڈرامہ بنانے کی یہ صلاحیت جو تھیوسی ڈائڈیز کے بعد سے معدوم ہے اور اس کے ساتھ اس کی زبردست قوت بیان دراصل اسی شہرت کا سبب ہے جو برنی کی "تاریخ" کو نصیب ہوئی۔ مگر اس تصنیف کو بہر حال روزنامچے کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل یہ ان حکمرانوں کے کردار کے مطالعے کا ایک سلسلہ ہے جن کے اقوال اور افعال کی اس وسعت و گہرائی کو پیش کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے جو خود مصنّف کی نظر میں ایک مثالی حکمراں کے قول وفعل میں ہونا ضروری ہے۔ یہ بات اس لیے نہیں کہی جا رہی ہے کہ بیان کیے ہوئے حقائق پر شبہے کا پر تو ڈالا جائے۔ اس کتاب کو ایک ماخذ کے طور پر استعمال کرتے وقت بھی مصنّف کی ذاتی ترجیحات کی طرف سے بہر حال چوکنا

رہنا پڑتا ہے۔ یہ ترجیحات، واقعات کے انتخاب اور ان کے پیش کرنے کے ڈھنگ اور سب سے زیادہ ان تقریروں اور مکالموں میں ظاہر ہوتی ہیں جن کے انداز بیان سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان میں استعمال کیے ہوئے الفاظ حقیقتاً بولے گئے ہیں بلکہ انھیں حقیقی طور طریقوں اور فیصلوں کی جانبدارانہ تاویلیں سمجھنا چاہیں جو بالکل مختلف اسباب و مقاصد کے پیشِ نظر کی گئیں ہیں۔ یہ بات ان میں سے ہر عمل کو، خود برنی کے بیان یا دوسرے ماخذوں سے ملنے والے حقائق کی روشنی میں پرکھ کر سمجھی جا سکتی ہے۔ بلبن کا تذکرہ اس صورت حال کی ایک اچھی مثال ہے۔ اگر ایک طرف اس کے بیس سالہ عہد کی چھوٹی سی چھوٹی تفصیلات کو پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف ہمیں سلطان کی طول طویل تقریریں بھی پڑھنا پڑتی ہیں جن کا انداز بڑی حد تک ''قابوس نامہ'' جیسی فارسی کتابوں میں ملتا ہے جن میں اپنے عمل سے ظاہر ہونے والی ایک بے درد عملی سیاست دان کی بجائے وہ ایک مثالی نظر آتا ہے۔ حکومت اور سرکاری پالیسیوں کے جس نمونے کو برنی نے مثال بنانے کی کوشش کی ہے۔ اسے وہ اپنی ایک دوسری تصنیف ''فتاوائے جہانداری'' میں حکمرانوں کے لیے خود اپنی ہدایتوں اور نصیحتوں کی شکل میں انتہائی بے تکلفی سے پیش کر چکا ہے۔ ''فتاوائے جہانداری'' چودھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ اس میں جو نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ درحقیقت التمش اور بلبن کے اُن نظریات سے ہم آہنگ ہیں جو درحقیقت وہ رکھتے ہوں گے[6] منہاج کے مقابلے میں برنی بہرحال انتظامی تفصیلات کو ضبط تحریر میں لانے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ حکومت میں اور غالباً شعبۂ مالیات میں کسی عہدے پر فائز رہنے کی وجہ سے وہ زرعی معاملات میں نسبتاً زیادہ واقفیت کا اظہار کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی رائیں اور اس کے خیالات اکثر اوقات بڑے غیر واضح اور کسی حد تک بڑے بے ربط ہیں۔

برنی کے ساتھ ہی ہمارے اصل ماخذوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ سیاسی اور سماجی زندگی کے اتفاقی مگر بسا اوقات انتہائی واضح اور بصیرت افروز حوالے ان عصری تحریروں میں ملتے ہیں جو باضابطہ طور پر غیر تاریخی ہیں۔ ان میں برنی کے

ایک ہمعصر امیر خسرو کی منظوم تصنیفات ہیں جن سے اس وقت کے واقعات اور اسی زمانے کے افراد پر بڑی دل چسپ روشنی پڑتی ہے۔ دربار کی اہم شخصیات سے متعلق اُن کے قصائد عام طور پر بہت مفید ہیں۔ امیر خسرو، بلبن کے بڑے لڑکے محمود کے مقرب خاص ہیں۔ اس کے انتقال کے بعد انھوں نے کیقباد کے دربار میں ملازمت شروع کی تھی۔ موخرالذکر کی درخواست پر انھوں نے "قران السعدین" نامی نظم لکھی تھی۔ جس میں کیقباد کی اپنے باپ سے ملاقات کا تذکرہ ہے۔ نظم کے دیباچہ میں جس کا عنوان "عاشقہ" تھا امیر خسرو نے اس میں علاء الدین خلجی تک کے سلاطین دہلی کی تاریخ کا ایک مختصر خلاصہ دیا ہے۔ ہمیں اُن کی تصنیف "اعجاز خسروی" میں نظام حکومت اور بعض مہموں سے متعلق بڑی مفید معلومات ملتی ہیں۔ یہ کتاب دراصل اپنی ادبی فنکاری اور تخلیقی صلاحیت کے اظہار کے طور پر لکھی گئی تھی مگر اس کے باوجود اس میں بعض اصل خطوط اور فرمانوں کا مواد موجود ہے۔ ان کی اتنی ہی دلچسپ ایک اور کتاب "مطلع الانوار" ہے جو اس وقت کے آداب و رسوم اور سماج پر روشنی ڈالتی ہے۔

ہندوستانی اسلام میں تصوّف کا فروغ ایک اہم واقعہ ہے۔ صوفیاء کرام کے اثر نے مذہب کی کٹّر ضابطہ پرستی کو نرم کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کو مقامی مذہبی احساسات سے ربط و تعلق پیدا کرنے کے قابل بنایا۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس عمل کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ اس سے تعلق نزاع شروع ہوئے۔ کٹّر مولویوں کے اعتقادی اسلام اور صوفیاء کے ادراکی مذہب کی باہمی کشمکش کبھی پورے طور پر کبھی ختم نہ ہوئی۔ مگر پھر بھی مسلمان ذہن صوفیاء کی روشن خیالی سے متاثر ہوتے رہے۔ اُن کے عمل اور رجحانات نے موجودہ نظام اور مروجہ اخلاق کی تنقید کی اور اسی لیے وہ اُبھرتے ہوئے مسلم سماج کے مزاج اور اُس کے رُخ کو سمجھنے کے لیے ہمارے لیے مفید ہیں۔ یہ باتیں ہمیں اُس اولیائی ادب میں بہت ملیں گی۔ جو عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں صوفیاء کے سوانح ان کے ملفوظات نظری اور اعتقادی تفسیروں اور صوفیوں کے متصوفیانہ طور طریقوں کے بارے میں تخلیق ہوا اور جن کی طرف مورخین نے ابھی حال میں ہی توجہ دینا شروع کی ہے۔

شاعر امیر حسن سنجری کا مجموعہ "فواد الفوائد" جیسی چیزوں سے بھی اس وقت کے سماج پر بڑی بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے اور امیر حسن سنجری نے بدایوں کے نظام الدین کی روزانہ گفتگو کو قلم بند کر دیا تھا۔ اس میں دلی کے گرد و پیش کے واقعات اور افراد کے بارے میں بڑے دلچسپ تذکرے اور تبصرے موجود ہیں۔ اس تصنیف کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ دوسرے اولیا کے ملفوظات کے ایک سلسلے کے لیے نمونہ قرار پایا[5] ان میں سے اکثر کو اب بہر حال جعلی تصور کیا جانے لگا ہے۔ جن چند تصنیفات کو صحیح اور اصل مانا جا سکتا ہے اور جن میں تیرھویں صدی کے ہندوستانی سماج کا پرتو نظر آتا ہے۔ ان میں حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ نصیر الدین چراغ دہلی کے شاگرد حامد قلندر کی کتاب "خیر المجالس" کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور ہمعصر صوفی تھے فرید الدین محمود یہ اجمیر کے معین الدین چشتی کے ایک ہم عصر اور شاگرد حمید الدین ناگوری کے بیٹے تھے۔ ان کے (فرید الدین محمود) کے ملفوظات ان کے بیٹے نے "سرور الصدور" کے نام سے مرتب کیے تھے۔ اس میں اس ولی کے اچھے خاصے خیالات مل جاتے ہیں۔ صوفیوں کے سوانح یا ان کے تذکروں میں ایک پرانا تذکرہ نظام الدین کے نوجوان شاگرد میر خورد کا ہے۔ میر خورد نے سلسلہ چشتیہ کے ہندوستانی صوفیاء کے حالات کو "سیر الاولیاء" کے عنوان کے تحت قلم بند کیا۔ شیخ جمالی کی "سیر العارفین" میں بھی جس کی تالیف 1535ء میں ہوئی یہی تذکرے ہیں مگر کچھ مزید تفصیلات ایسی ہیں جو کہ دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ ہمیں جو مواد ملتا ہے اس کے ایک محتاط مطالعہ پر مبنی ہندوستانی صوفیاء کی ایک عام تاریخ عبد الحق دہلوی کی مشہور تالیف "اخبار الاخیار" ہے جس کی تکمیل جہانگیر کے عہد میں ہوئی۔ اسی عہد کا دوسرا بہت مفید تذکرہ محمد غوثی کی "گلزار ابرار" ہے۔ محمد غوثی مشہور شطاری ولی محمد غوث کے شاگرد تھے۔ ان کا مزار گوالیار میں ہے۔ اس تصنیف میں بہت سے ولیوں کا تذکرہ ہے جو نامعلوم تھے اور جن کی حیات اور عمل سے سلطنت عہد کے سیاسی اور سماجی رجحانات کی بڑی دلچسپ تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں ایک منظوم تاریخ لکھی گئی "فتوح السلاطین"

اس کے مصنّف کا قلمی نام اِسامی تھا۔ یہ 1348ء میں مکمل ہوئی اس میں بہت سی دل چسپ مگر غیر مصدقہ تفصیلات ملتی ہیں ؎ حالاں کہ تصنیف کے سلسلے میں مصنّف کے جوش و خروش کا ساتھ دینا مشکل ہوگا مگر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تصنیف برنی کے عہد کی تصنیف ہے اور اپنی شاعرانہ خوش لفاظی اور آرائش کے باوجود یہ کتاب قابلِ توجہ ہے۔ اس کتاب کا اور خصوصاً اس کے تیرھویں صدی سے متعلق حصّوں کا ایک مناسب تجزیہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ عربی النسل افریقی مسلمان ابن بطوطہ کی مشہور تصنیف "کتاب الراحلہ" جو چودھویں صدی کے وسط کے قریب مکمّل ہوئی تھی ہمارے پیشِ نظر عہد کے لیے اتنی مفید نہیں ہے جتنی کہ یہ عہد تغلق کے لیے ہے۔ کیوں کہ سلطنت کی شروع کی تاریخ کے جو حوالے ہیں وہ نمایاں طور پر بازاروں کی کہانیاں ہیں اور نہ صرف یہ کہ غیر مصدقہ ہیں بلکہ بعض بعض مقامات پر بالکل غلط ہیں۔ یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی کی کتاب "تاریخ مبارک شاہی" جو 1434ء میں مکمّل ہوئی تھی۔ حالانکہ زیادہ تر مذکورہ بالا تصانیف پر مبنی ہے۔ تاہم یہ کچھ مزید نئی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ مگر اس کے لیے کوئی سند نہیں پیش کرتی۔ عہد مغلیہ میں جن تاریخوں کی تالیف ہوئی ان میں نظام الدین بخشی کی "طبقات اکبری" عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور محمد بن قاسم بن ہندو خاں کی کتاب "گلشن ابراہیمی" جو عام طور پر "تاریخ فرشتہ" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا انتساب بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کے نام کیا گیا، قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلی دو کتابیں مذکورہ ابتدائی ماخذوں کے چربے ہیں۔ فرشتہ نے کچھ دوسرے ماخذ استعمال کیے ہیں۔ مگر اُن میں سے کچھ جن کے نام اس نے بتائے ہیں۔ اب نایاب معلوم ہوتے ہیں ؎ محض چند مقامات پر اس کے بیانات غلط پائے گئے ہیں۔ حقائق کے بیان میں وہ اپنے سلسلے کے دوسرے مصنّفین کے مقابلے میں بہت زیادہ صحیح ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی اس کا تخیّل پرواز کرنے لگتا ہے۔ بہرحال وہ ریورٹی کے سخت گیرانہ کلمات کا کسی طرح بھی مستحق نہیں ہے ؎ حاجی دبیر نے مغلیہ عہد کی نسبتاً زیادہ مفید ایک اور تاریخ عربی زبان میں لکھی ہے جس کا نام ہے "ظفرالوالہی"

یہ عہد جہانگیر کے آخری زمانے میں لکھی گئی ہے۔ یہ تصنیف بظاہر تو گجرات کی تاریخ ہے مگر یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ پر بالکل شروع سے روشنی ڈالتی ہے۔ بہر حال جہاں تک تیرھویں صدی کا تعلق ہے یہ کتاب اس سے پہلے کی تصانیف کا نہایت احتیاط سے کیا ہوا تلخیصی ترجمہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ دوسرے ایسے مصنّفین سے استفادہ کیا گیا ہے جن کے نام ظاہر نہیں کیے گئے ہیں۔

صوبائی تواریخ میں اکبر کے عہد میں لکھی جانے والی محمد[۲] معصوم کی تصنیف "تاریخ معصومی" قابلِ توجہ ہے جو سندھ کی شروع کی تاریخ اور خصوصاً زیریں سندھ کے مقامی سمرا اور سما قبائل کے بارے میں بعض اضافی معلومات فراہم کرتی ہے۔ بہر حال جہاں تک تفصیلات اور جزئیات کا تعلق ہے اس کے بیانات دوسری تصنیفات جیسے ٹھٹا کے سید حسن کے بیٹے طاہر محمد[۲] نسیانی کی تصنیف "تاریخ طاہری" سے مختلف ہیں۔ یہ تاریخ طاہری 1620ء میں مکمل ہوئی تھی اور اس کا انتساب جہانگیر کے نام ہے۔ یہ کتاب اپنے اُن بیانات کے لحاظ سے مفید ہیں۔ جو سمرا قبائل کے بارے میں ہیں۔ اگرچہ یہ بیانات بھی بے ربط ہیں اور اُن کے لیے کتاب میں کوئی سند نہیں پیش کی گئی ہے۔ قدیم زمانے سے اٹھارویں صدی تک کی مشرق کی ایک عام تاریخ ٹھٹا کے میر علی شیر قانی کی تصنیف "تحفۃ الکرام" ہے جو جزوی طور پر میر معصوم اور طاہر نسیانی کے بیانات کی تصدیق کرتی ہے۔ مگر اس نے بھی اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قلعہ گوالیار کی تاسیس اور اس سے متعلق بعد کے واقعات کے روایتی بیانات ہیرامن منشی کی تصنیف "گوالیار نامہ" میں ہیں "گوالیار نامہ" اورنگ زیب کی حکومت کے بارھویں سال میں مکمل ہوا تھا۔ اس کے بیشتر واقعات قصص و روایات پر مبنی ہیں۔ اس کتاب کی اگر کوئی افادیت ہے تو وہ صرف اس کی تائید اور توثیقی خصوصیت ہے۔ یہی بات گنیش داس مدرا کی جموں کی ایک مقامی تاریخ "راج درشنی" کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو 1847ء میں لکھی گئی ہے۔ یہ بہر حال اس اعتماد کی کسی طرح مستحق نہیں جس کا اظہار ریورٹی نے کیا ہے کیوں کہ اس کا سارا انحصار "پرتھوی راج راسو" جیسے غیر معتبر اور افسانوی مواد پر ہے۔ جموں کی قدیم سلطنتوں سے متعلق اس کے کسی بھی بیان

کی تصدیق کشمیر کی دستاویزوں سے نہیں ہوتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے پہلے کی کسی تصنیف سے بھی کسی بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ صوبائی تاریخوں کے ضمن میں غلام حسین سلیم کی کتاب "ریاض السلاطین" کا نام لینا ضروری ہے جو 1768ء میں مکمل ہوئی اور جو بظاہر مسلمانوں کی فتوحات کے بعد سے بنگال کی تاریخ کو پیش کرتی ہے۔ حالاں کہ مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے پچھلی تواریخوں کو استعمال کیا ہے۔ اس نے اختیار تمیزی سے بہت کم کام لیا ہے اور اپنے تذکروں میں تیرھویں صدی کے ایسے بیانات شامل کر لیے ہیں جن کی تصدیق ان کتبوں اور سکوں سے نہیں ہوتی جو مختلف مقامات پر پائے گئے ہیں۔

اس عہد کے ایسے بہت کم رسالے ہیں جو انتظامی طور و طریق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے سرکاری ادارے حکومت کے طریقے اور نظریات میں ایک تسلسل ہے جس کا پورا ادراک صرف موزدی کی تصنیف "احکام السلطانیہ" جیسی تصانیف کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یہ رسالہ دسویں صدی میں لکھا گیا ہے۔ جو عباسی فن آئین جہاں بانی سے متعلق ہے۔ یا پھر سلجوقی بادشاہ ملک شاہ کے وزیر طوس نظام الملک طوسی کا مرتب کیا ہوا 'سیاست نامہ' ہے (جس میں حکومت اور سیاست کے فن پر مباحثے ہیں۔) مسلمانوں کی فلسفہ و قانون کی "وقائع" جیسی کتابوں نے اس موضوع پر اثر ڈالا ہے۔ کیوں کہ مسلم قانونی اداروں اور طریقوں میں ایک بنیادی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں خاص طور پر ہمارے زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں میں "آداب الحرب" اور "فتاویٰ جہاں داری" کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ بنیادی طور پر ایک شخص یعقوب کی تالیف کی ہوئی کتاب "فقہ فیروز شاہی" جس پر بعد میں ایک نامعلوم شخص نے نظر ثانی کی اور ساتھ ہی ساتھ اس میں اضافے بھی کیے۔ اور فیروز شاہ تغلق کے نام اسے معنون کیا۔ یہ کتاب اس لحاظ سے کافی مفید ہے کہ "فتاویٰ عالمگیری" کی طرح اس میں بھی مروجہ قانونی طور طریقوں کا ذکر ہے جو فلسفہ و قانون کی معیاری کتابوں میں بیان کیے گئے طور طریقوں سے اکثر مطابقت نہیں رکھتے۔ اس طرح اس کتاب کی مدد سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی حد تک ریاستی طور طریقے سیکولر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کتاب کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جسے شرف محمد نے "فوائد فیروز شاہی" کے نام سے لکھا اور اسے

فیروز تغلق کے نام معنون کیا۔ یہ تصنیف چودھویں صدی کے ہندوستان کے مسلم معاشرے کے رائج عقائد، رسومات اور طور طریقوں کا ایک قاموسی انداز کا تذکرہ ہے مسلم دنیا کا ایک قاموسی تذکرہ القلق آشندی کی ”صبح الاعشا“ اور شہاب الدین عبّاس کی ”مسالک الابصار“ سے بھی اچھی خاصی مدد ملتی ہے۔ حالاں کہ اس میں اس زمانے کے حالات خصوصیت سے نہیں ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی تالیف چودھویں صدی کے آغاز میں ہوئی۔ اس میں دہلی کے انتظامی حکومت کا بڑا مفید تذکرہ ملتا ہے۔

محض مسلم ماخذوں پر انحصار ایک غیر متوازن نقطہ نظر پیدا کر دیتا ہے۔ مفتوح لوگوں کے اصل خیالات کا پتہ صرف اُنھیں تحریروں سے چل سکتا ہے۔ بدقسمتی سے تاریخی نوعیت کی غیر مسلم تحریریں بہت کم باقی رہ پائی ہیں۔ ان میں سے معدودے چند جو ہمارے پاس موجود ہیں وہ ایرانی دربار کے روزنامچوں کی محض نقلیں ہیں اور اُن میں اپنے ہیرو کی اکتا دینے والی بے جا خوشامد ہے۔ کرنل ٹوڈ کی وجہ سے کئی برسوں تک چندر بردائی کی ”پرتھوی راج راسو“ کی حیثیت ایک سنجیدہ تاریخی تصنیف کی رہی۔ جدید تحقیقات بہر حال اسے پرانی ہندی شاعری کا ایک اچھا نمونہ لیکن تاریخی تذکروں کے اعتبار سے ایک بیکار چیز قرار دے رہی ہیں۔ کسی نامعلوم مصنّف کی نامکمل تصنیف ”پرتھوی راج وجے کاویہ“ جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی چوہان راجکمار کی زندگی میں لکھی گئی اور جس کا ایک مختصر سا حصّہ ہی ابھی تک دریافت ہو سکا ہے، اس کے مقابلے میں زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔[۳۱] ایک زیادہ مفید تذکرہ ”ہمیرہ کاویہ“ ہے جس میں پرتھوی راج کی اولاد میں نتھمبھور کے چوہان راجا کے بیٹے ہمیرہ کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ان کا اندازہ راج پوت روایت کے مطابق قصیدوں کا سا ہے تاہم یہ مسلمانوں کے روزنامچوں (کرانیکل) میں مذکور واقعات میں متعدد جگہوں پر اضافہ کرتی ہے۔ نیز راج پوتانہ پر مسلمانوں کی گرفت اور پھر اس کے نشیب و فراز کی ایک نسبتاً بہتر تصویر پیش کرتی ہے۔ سولہویں صدی کے ایک بنگالی شاعر چندر شیکھر کے ”سورجنا چرت کاویہ“، چوہان خان دان کی تاریخ کا سلسلہ وار

بیان ہے۔ حالانکہ شروع کے حصے میں راج پوتانہ سے ترکوں کے روابط کے بارے میں چند، چندر شیکھر کے خیالات کو پیش کرنا ہے تاہم یہ بالکل بے کار نہیں ہیں۔ گجرات کی "رس مالا"، جیسی عوامی کہانیوں کے مجموعوں میں بسا اوقات بہت مفید تائیدی شواہد مل جاتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ "راج مالا" ہے جو تپرہ کے حکمراں خاندان کے ایک مسلسل سرکاری روزنامچے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ابتدائی تاریخ بنگال میں تیرھویں صدی کی مسلمان حکومت سے منسلک ہے۔ یہ تصنیف بنگالی نظم میں ہے اور اس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مولفین کی یکے بعد دیگرے کئی نسلوں نے اس کی تالیف کے کام کو جاری رکھا ہے۔ پراتنا پروندھا سمگراہا (PURATANA PRAVANDHA SAMGRAHA) اور ایتہاسک جین کاویہ سمگراہ (AITIHASIK JAINA KAVYA SAMGRAHA) میں جمع کی ہوئی تیرھویں اور چودھویں صدی کی جینی تحریریں بھی کم قابلِ قدر ہیں کیوں کہ اُن میں سیاسی معاملات سے متعلق ایسے ضمنی واقعات کا ذکر ہے جو مسلمان فاتحین کی مذہبی رواداری اور اُن کی تہذیب پر بڑی خوش آئند روشنی ڈالتے ہیں۔ ناقص سنسکرت میں ایک دلچسپ کتاب "شیکا سبھودیا" (SHEKASUBHODAYA) کے نام سے بنگال میں سامنے آئی ہے۔ اس تصنیف کے سولہویں صدی کی ایک جعلی تحریر کہلائے جانے کے باوجود عالموں کا اسی بات پر اتفاق ہے کہ اس میں لکشمن سیتا کے زمانے میں اس صوبے سے مسلمانوں کے ربط و تعلق سے متعلق حقیقی تاریخ کا مواد ملتا ہے۔ صوفی جلال الدین تبریزی، کی کراماتی سرگرمیوں کے واقعات کو اس نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس میں بیان کی ہوئی بہت سی کہانیوں کی قرائینی شہادتیں ملتی ہیں۔ اس وقت کے طور طریقوں کی وضاحت کرنے والے جن افراد و واقعات کا اُن میں تذکرہ ہے اُن میں سے بیشتر کی تصدیق دوسری شہادتوں سے بھی ہوتی ہے۔ اس لیے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اس تصنیف میں اچھی خاصی تعداد میں حقائق موجود ہیں جو آگے چل کر عوامی روایت بن گئے ہیں۔

حوالاجات

1۔ بحوالہ تینار "عرب بیوگرافرس نالج آف ساؤتھ انڈیا" ص 108 ایلیٹ مین حبیب کو بھی ملاحظہ کیجیے۔ (علی گڑھ) ii، تعارف، ص 46-48۔

2۔ سیف ابن محمدؒ۔ ابن یعقوب الہراوی کی "تاریخ نامۂ ہرات" مرتبہ ایم۔ زبیڈ صدیقی کلکتہ 1944، تعارف، ص۔ xiii - xiv۔

3۔ اس کے کام کی اچانک اختتام اور خود اس کا گمنام ہونا ممکن ہے کہ بلبن سے تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے ہو "سرور الصدور" میں نقل کی گئی شیخ معین الدین چشتی کے صاحب زادے شیخ فرید الدین محمود سے گفتگو میں بلبن کے ایک جملے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے جس کا ذکر تیرھویں صدی کی ایک گمنام تالیف میں ملتا ہے روایت ہے کہ بلبن نے کہا کہ "ان کے قاضیوں میں منہاج سراج ان میں سے تھا جو نہ "مجھ سے ڈرتے تھے اور نہ خدا سے" خلیق احمد نظامی۔ ضمیمہ (ایلیٹ) (علی گڑھ) ii، ص۔ 844۔

4۔ اس ضمن میں ملاحظہ ہو۔ آئی سی۔ 1941، ص۔ 207-216 آگے ملاحظہ ہو آٹھواں باب۔ تاریخ اور فتویٰ کے تفصیلی تقابل کے لیے ملاحظہ ہو ہارڈی: برنی کی فیروز شاہی کے مکالمے۔ بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز 1957ء - xx ص - 315-331۔

5۔ ایم حبیب۔ میڈیول انڈیا کوارٹرلی میں چشتی شک رکارڈس آف سلطنت پیریڈ۔ جلد۔ 1 شمارہ 2-1950ء خلیق احمد نظامی ج۔ س۔ ص۔ 833-834۔

6۔ خلیق احمد نظامی۔ ذ سرور الصدور پروسیڈنگ آف انڈین ہسٹری کانگرس۔ ناگپور۔ 1950ء ص 167-169۔

7- (مدیر) اے-ایم-جین، آگرہ، 1938ء - نوٹس کے ساتھ بہتر تنقیدی اڈیشن ایم - اوشا مدراس -

8- نایاب ماخذوں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو حبیب اللہ- پروسیڈنگس آف انڈین ہسٹری کانگرس میں "اَن ڈسکورڈ لٹریری سورسز فار پری مغل انڈیا" 1939 ص 858-872-

9- تاریخ مبارک شاہی- ترجمہ i ص 302 -

10- موجودہ رائیں یہ ہیں کہ اس کو کاشمیری جے ناکا کی تصنیف مانا جائے- ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیوپل - v ص 384 نوٹ 20-

دوسرا باب

پس منظر — وسط ایشیا

محمود کی تخت نشینی کے بعد غزنی کی ریاست میں ڈیڑھ سو برس کے وقفہ میں دو عظیم سلطنتوں کا عروج و زوال ہوا۔ سلجوقی، جنھوں نے وسط ایشیا[1] میں غزنیوں کے قدم جمائے تھے، وہ زیر نظر عہد میں خود تیزی سے زوال کا شکار ہوئے اور اس زوال نے متعدد خاندانوں کو عروج کے مواقع فراہم کیے سلجوقیوں کے شاہی خاندانوں کا آخری بادشاہ سنجر تھا مگر اس کا طویل عہد حکومت سلجوقیوں کے انجام کی نشانیوں کو چھپانے سے قاصر رہا۔ غزنی[2] سمرقند[3] اور غور[4] پر اس کی ابتدائی فتوحات کے بعد اسے ایسی شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا جس نے اس کی سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ سب سے زبردست شکست جنوب کے ترکوں نے دی۔ ان ترکوں کو مسلمان مورخین "قرا خطائی" کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے جیحون کے مشرقی کنارے پر ایک مضبوط سلطنت قائم کر رکھی تھی اور "ماوراالنہر" پر زور دار یورشیں کر رہے تھے۔ انھوں نے 1137ء/537ھ میں سمرقند پر حملہ کیا اور سنجر کے باجگزار پر ایک فیصلہ کن فتح حاصل کر لی۔[5] پانچ سال بعد اپنے حلیف قرلغ کی مدد کے بہانے جو سمرقند کے خان کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر دریائے جیحون کو پار کر لیا۔ سمرقند کے خان نے امداد کے لیے اپنے سرداروں کو بلایا۔ اس جنگ میں سنجر کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی شکست ہوئی اور وہ محض اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بچ کر نکل سکا۔[6]

اس شکست کی وجہ سے اسے پورے ماوراالنہر[9] سے دستکش ہونا پڑا۔ اس شکست کے اثرات اس کی سلطنت کے دوسرے حصّوں پر بھی پڑے۔ "تاریخ گزیدہ" کے مطابق خوارزم (خیوا) کے باج گزار حکمراں، اتسیز نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور شاہی القاب و اعزاز اپنائے۔ اس نے سنجر کے دارالسلطنت مرو پر بھی قبضہ کر لیا۔ جو بہر حال بعد کو نہایت آسانی کے ساتھ واپس لے لیا گیا۔ 1153ء / 548ھ میں اس کی سلطنت کی آخری تباہی کی وجہ، بلخ[10] سے غزوں کے اچانک حملے اور اُن کے ہاتھوں اس کی شکست اور گرفتاری ہوئی۔ چار سال بعد وہ جان بچا کر نکل بھاگنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر اس کے کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔[11]

چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود مختاری کی طرف قدم اُٹھا رہی تھیں۔ خاندان سلاجقہ کے مغربی صوبے عراق، آذربائجان، ہمدان جو سلجوقی اتابکوں کے تابع تھے، وسط ایشیا کی سیاست سے عملی طور پر دور ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی اتابکوں اور عبّاسی خلفا میں شدید اختلافات تھے جو عداوت کی حد تک پہنچ گئے تھے۔[11] اس اختلاف اور عداوت کی وجہ یہ تھی کہ عبّاسی خلفاء اتابکوں کے تابع صوبوں میں پھر سے اپنے اقتدار کو مستحکم کر لینا چاہتے تھے۔ سنجر کا جانشین غزوں اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہوا اور عملی طور پر ان کا قیدی رہا۔ اسے غزوں کے ہاتھوں 1162ء / 557ھ میں صرف اس لیے آزادی ملی کہ اس کا انتقال سنجر کے ایک سابق غلام موید کی قید و بند میں ہوا جو اس وقت خراسان کے ایک بڑے حصّے کا خود ساختہ حکمراں بن گیا تھا۔[12]

وسط ایشیا کے اس عہد کی تاریخ میں خوارزم اور غور کا عروج اور خراسان پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اُن کی جدوجہد بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ خوارزم کی عظمت کا بانی اتسیز بنیادی طور پر سنجر کا ایک وفادار باجگزار تھا مگر سنجر کے درباریوں نے حسد اور رقابت کے جذبے کی بنا پر اتسیز کو 1138ء / 533ھ میں سنجر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر مجبور کر دیا۔[13] سنجر نے اسے شکست دی اور اپنے بھانجے سلیمان کو اس کی جگہ پر مقرر کر دیا۔ یہ سب کرنے کے بعد سنجر نے وہاں سے پیٹھ موڑی تھی کہ اتسیز نے پھر بڑھ کر سلیمان کو خوارزم سے نکال باہر کیا۔[14] ۱۱۴۱ء میں اتسیز نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا جس کی

کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس وقت قراخطائیوں نے سنجر کو شکست دے کر سلجوقی حکومت کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں۔ غزوں کے اس غلبے نے بہر حال اتسیز پر بھی اثر ڈالا۔ اس موقعہ پر خود اس کے علاقے بھی حملے کی زد میں آئے اور وہ تیس ہزار دینار (طلائی) سالانہ خراج کے طور پر دینے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ ایک ایسا وعدہ تھا جسے کہا جاتا ہے کہ اسے تاحیات پورا کرنا پڑا۔[17] مرو کے قبضے کے بعد 1143ء/538ھ میں سنجر کے ہاتھوں اس کی دوسری شکست نے بھی اس کی جاہ طلبی کو ختم نہیں کیا۔ معافی اور بحالی کے باوجود اس نے فوراً ہی بغاوت کی اور سنجر کے ایجنٹ کو قتل کر دیا۔ اس نے خود اپنے آقا سنجر کے قتل کا بھی منصوبہ بنایا۔ 1147ء/542ھ میں سنجر نے خوارزم پر تیسری بار چڑھائی کی مگر ایک بار پھر اس نے اپنے شکست خوردہ باغی کو معاف کر دیا۔ جس زمانے میں سنجر غزوں کی حراست میں تھا اتسیز نے اپنے آقا کو آزاد کرانے کے بہانے خراسان پر چڑھائی کی مگر اسے ناکام واپس ہونا پڑا۔ اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں وہ اعلانیہ سرکشی سے تو احتراز کرتا رہا مگر اس نے اپنے مقبوضات میں توسیع کی درپردہ کوششیں جاری رکھیں۔

1156ء/551ھ میں اپنے انتقال سے پہلے اس نے اسی طرح جند اور منکسلاغ پر قبضہ کر لیا تھا اور سمرقند کے خان کو اپنی فرمانروائی میں لے لیا۔[18] بہر حال خراسان میں غز قوت نے اس کی اس توسیعی مہم کو روکا اور موئد کے عروج کی راہ ہموار کی جو سلجوقیوں کے مفاد کو آگے بڑھانے کا دم بھرتا تھا، غزوں کی اس ہمت افزائی کی وجہ سے موئد نیشاپور، طوس اور قرب و جوار کے دوسرے اضلاع پر اپنے اثر کو قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ مرو، سرخس اور بلخ، غزوں کے قبضے میں تھے۔ جب کہ ہرات سلجوقیوں کے ایک سابق باج گزار اور غزوں کے موجودہ زیر دست آئیتگین کے تحت آ گیا۔[19]

اتسیز کے جانشین ایل ارسلان نے اپنے باپ کی شہنشاہیت پسند پالیسیوں کی بڑی شدومد کے ساتھ پیروی کی۔ اس نے تخت نشینی کے سلسلے میں سنجر کی منظوری بھی حاصل کی اور عراق کے سلجوقی دور آقا اتابک غیاث الدین سے بھی اسے تسلیم کروا لیا۔ اس نے گرگان اور دہستان کے غز سردار سے اپنی فرمانروائی کو منوالیا

اور جب 1162ء / 558ھ میں اس نے محسوس کیا کہ یہ سردار مویّد سے، جس سے کہ وہ ایک غیر فیصلہ کن جنگ پہلے لڑ چکا تھا، کچھ ساز باز کر رہا ہے تو اِل اِرسلان نے اسی کو بہانہ بنا کر دہستان کے ضلع کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ ماوراالنہر اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے 1159ء/553ھ میں اس نے قرلغ اور خان سمرقند کے درمیان از سر نو شروع ہونے والی لڑائی میں مداخلت کرتے پر فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ نتیجہ بہر حال اس کے حق میں خوشگوار نہیں نکلا حالاں کہ یہ کشمکش پُرامن طور پر ختم ہو گئی مگر تنازعہ میں سمرقند کے خان کا ساتھ دینے کی وجہ سے اس کے باپ کے قراخطائی سردار سے ایک مستقل اختلاف پیدا ہو گیا۔ سالانہ خراج کی ادائیگی کو جاری رکھنے سے انکار کر کے اس نے 1172ء/567ھ میں انھیں اپنے علاقوں میں مداخلت کرنے پر اکسایا۔ اس کے بعد جو جھگڑا ہوا اس میں خوارزم فوجوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور اس طرح طاقت کے ذریعے اس بات کی یاد دہانی ہو گئی کہ وسط ایشیا میں سلطنت کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کفار کی یہ طاقت قطعی طور پر تہس نہس نہیں کی جاتی ہے۔ اس کے بعد سے خوارزم نے یہی مقصد سامنے رکھ کر اپنی پالیسی وضع کی۔ اِل ارسلان اگلے سال اس دنیا سے چل بسا۔

غز اور بعد میں قراخطائیوں نے خوارزم شاہ کی کوششوں میں رخنہ ڈالا اور وہ خراسان میں کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس کی ان مفروضیات نے غور کی معمولی سی ریاست کے آن حکمرانوں کو جنھیں منہاج سراج شنسب کی اولاد ہونے کی وجہ سے شنسبانی کہتا ہے اس بات کا موقعہ فراہم کر دیا کہ وہ صوبے پر قابض فوجی افسروں کو زیر کر کے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی طاقت کو بڑھالیں وہ غور کے پہاڑی قلعے کے سرداروں کی ناقابلِ لحاظ حیثیت سے نکل کر بہرام غزنوی کے عہد میں نمایاں حیثیت کے مالک ہوئے۔ یہ بہرام وہی ہے جس نے ایک غوری شہزادے ملک قطب الدین حسن کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ قطب الدین نے اس کے یہاں پناہ لی تھی اور بہرام کی ایک لڑکی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس واقعہ نے مقتول شہزادے کے بھائی سیف الدین سوری کو ایسا برافروختہ

کیا کہ اس نے غزنی پر حملہ کیا اور بہرام کو شہر سے نکال باہر کیا۔ مگر بہرام جلدی ہی یعنی 1148ء/543ھ میں واپس آیا اور غور کے فوجی دستوں کی عدم موجودگی کا فائدہ اُٹھایا، جو ان دنوں اپنے اپنے گھروں پر موسم سرما گزار رہے تھے، اُنھوں نے سیف الدین کو پکڑ لیا اور اس کا سر سنجر کو بھجوا دیا۔[22] سیف الدین کے چھوٹے بھائی علاالدین نے غزنی پر چڑھائی کی اور خوفناک انتقام لیا۔ شہر کو لوٹنے اور ساری آبادی کو تہہ تیغ کرنے[23] کے بعد اس نے عمارتوں کو آگ لگائی جو سات دن تک جلتی رہی۔ "جہاں سوز" کا ناقابلِ رشک نام دلانے والی اُس کی ان حرکتوں کے ساتھ ساتھ بہرام پر واجب طے شدہ خراج کی ادائیگی سے انکار نے سنجر سے جھگڑا کرایا۔
اتسیز کی سرکشی کی مصروفیات کے زمانے میں بلغ اور ہرات پر ناجائز قبضہ کر کے وہ سنجر کو پہلے ہی برافروختہ کر چکا تھا۔[24] اس کی بعد کی شکست اور قید کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔[25] اس کی دانش مندی اور ذہانت نے بہرحال اس کے گرفتار کرنے والے کو متاثر کیا۔ جس نے اس کی ریاست اسے پھر سونپ دی۔ سنجر کی گرفتاری اور قید سے فائدہ اُٹھا کر علاءالدین نے بامیان، تخارستان، جاروم کے اضلاع اور بست کو فتح کیا۔ غرجستان کو دریائے مرغاب کی وادی تک محدود کر دیا اور ہرات کے قریب تلک پر قبضہ کر کے خراسان میں بھی رسائی پیدا کر لی۔[26]
بلخ اور تخارستان میں اس کی فتوحات بہرحال بہت دنوں تک باقی نہیں رہیں۔ اور جلد ہی ان پر غزّ نے قبضہ کر لیا۔ ان کے ایک ساتھی آئتیگین نے ہرات کو خود اپنے قبضہ میں رکھا۔ جہاں سوز کا انتقال 1161ء[27] میں ہوا۔ اس کی جگہ اس کے ایک دوسرے بھائی نے لی جس کا نا سیف الدین تھا۔ اس نے ہرات کے ایک حصے کی مویئد کے حملے سے بڑی کامیابی سے مدافعت کی۔[28] بلخ سے غزّ کو ہٹانے کی ایک ناکام کوشش میں اس کے مارے جانے کے بعد غزنی بھی اُن کے ہاتھوں سے نکل گیا اور بارہ سال تک شہر پر غزّوں کا قبضہ[29] رہا۔ غیاث الدین نے جو غور میں اپنے چچا زاد بھائی کا جانشین ہوا تھا بہرحال پھر جدوجہد شروع کی اور کہا جاتا ہے کہ اس نے گرم سیر اور زمین داؤ کو آزاد کرا لیا۔[30] غزّ کی رُو بہ زوال قوت نے اُسے فارس، کلیون، گرجستان، باغ شور اور طلقان پر قبضہ کرنے اور

1173ء / 568ھ میں غزنی[31] کو بھی واپس لے لینے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس کے اقتدار کو سیجستان نے بھی تسلیم کیا اور چار سال بعد ہرات کو بھی وہاں کے شہریوں نے جو اپنے حکمراں کی غز دوست پالیسی کے مخالف تھے اس کے حوالے کر دیا۔[32] کرمان کے غز سردار نے آخر کار اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ہرات سے قریب بلخ اور خراسان کے حصے بھی آہستہ آہستہ اس کی بڑھتی ہوئی سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔

خراسان میں غوریوں کی اس پیش قدمی نے خوارزم شاہ سے اُن کی کھلم کھلا رقابت پیدا کر دی۔ اِل ارسلان کی موت کے بعد اس کے دو بیٹوں تکاش اور سلطان شاہ کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں اول الذکر نے اپنے بھائی کو نکالنے کے لیے سالانہ خراج دینا قبول کر کے قراخطائیوں سے کمک حاصل کی سلطان شاہ نے موئد کے پاس پناہ لی کچھ ہی دنوں بعد تکاش سے اس کے لیے جنگ کرتے ہوئے موئد مارا گیا۔ سلطان بھاگ کر پہلے دہستان پہنچا اور پھر غور[33] اس کی حرص وہوس نے خراسان کے پیچیدہ حالات میں ایک نئی صورت پیدا کر دی۔ جلدی ہی تکاش کی اپنے ان قراخطائی حاکموں سے لڑائی ہو گئی جن سے اتحاد کرنے میں سلطان کو اب مصلحت نظر آ رہی تھی[34] ان کی اعانت سے وہ مرو، سرخس اور طوس کو غز سردار ملک دینار سے چھیننے میں کامیاب ہوا اور اس کے ساتھ ہی موئد کے جانشین توغان شاہ کو بھی نیشاپور سے اکھاڑنے میں کامیابی حاصل کی۔ موخر الذکر نے تکاش کی اطاعت کو قبول کیا جس نے اسے نیشاپور پر تاحیات قابض رہنے کی اجازت دے دی[35] 1187ء/583ھ میں نیشاپور پر تکاش کے قبضے کے بعد دونوں بھائیوں نے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے سلطان کو مرو، سرخس اور کچھ دوسرے قصبوں پر اختیار کلی رکھنے کی اجازت مل گئی[36] اس کی ہوسِ جاہ نے بہر حال اسے کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اس کے سابق غوری دوستوں سے بھی اس کے اعلانیہ کشمکش ہو گئی۔ ایک منچلے طغرل کے ساتھ مل کر جس نے ایک مختصر مدت کے لیے ہرات پر حکمرانی کی تھی سلطان نے معفیوشانج کا محاصرہ کیا اور غور علاقوں پر حملے کر کے وہاں بے چینی اور افراتفری پیدا کی[37]

غوریوں نے اپنے حوصلوں اور ارادوں کی راہ میں مزاحمت محسوس کی کیونکہ خراسان میں خوارزم نے دوبارہ اپنا تسلط جمالیا تھا۔ سلطان نے صورت حال کو کچھ ایسا خراب کر لیا کہ ہتھیار اٹھانا ناگزیر ہو گیا۔ غوریوں کے ساتھ اس وقت مسلسل چپقلش اور غیاث الدین کے بھائی معزالدین کی مجوزہ ہندوستانی مہم کی وجہ سے غوری بہرحال علی الاعلان جنگ نہیں شروع کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے خراسان کے معاملات کے بارے میں تکاش سے گفت و شنید شروع کی۔ غیاث الدین جو سلطان شاہ کے خلاف موخرالذکر کی اعانت بھی حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ 1183ء کے ایک خط میں اُس نے بدلے میں خود مسلح اعانت کی پیش کش کی۔[38] منہاج تو دو خود مختاروں کے درمیان اتحاد کے ایک معاہدے کا بھی ذکر کرتا ہے۔[39] اور قراخطائیوں سے غوریوں کی کشمکش کا جو شاید ماحصل تھی کچھ حوالہ دیتا ہے قراخطائیوں کی ناپسندیدہ حکمرانی کا خاتمہ ایسی چیز تھی جسے خوارزم شاہ ہر حال میں چاہتا تھا۔ تکاش کے اپنے بھائی سے مذکورہ بالا معاہدے کے بعد، یہ اتحاد جو سلطان کے خلاف تھا، قدرتی طور پر بے عمل ہو گیا۔ اس طرح سلطان سے نپٹنے کے لیے غوری تن تنہا رہ گئے۔ 91-1190ء/586ھ[40] میں جب وہ اس پر حملہ کرنے کے لائق ہوئے تو وہ نسبتاً زیادہ آزاد تھے کیوں کہ اس وقت غزنوی دشمن پورے طور پر ختم کیے جا چکے تھے۔ سلطان اور اس کے حامی ہرات کے طغرال دونوں بڑی آسانی سے ہار گئے اور گمان غالب ہے کہ ہرات غور سے ملحق ہو گیا۔[41] اگلے سال سلطان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس کے مقبوضات پر تکاش نے قبضہ کر لیا۔[42]

سلطان پر فتح حاصل کرنے کے باوجود، غیاث الدین اپنی قلمرو کو وسعت دینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کیوں کہ سارے خراسان پر تکاش کا عمل دخل تھا۔ ماوراالنہر میں اپنے مقبوضات کو مستحکم بنانے کے لیے اس نے 1182ء/578ھ میں ایک مہم بخارا بھیجی۔ اس کے علاوہ اپنی سلطنت کی شمالی سرحد پر قپچاق قبائل کی سرکشی کو ختم کیا۔ مغرب میں اُس نے آخری سلجوقی سلطان طغرل اور اس کے سرکش باجگزار اتابک اتانج کی لڑائی میں بڑی کامیابی کے ساتھ مداخلت کی۔

اس کے نتیجہ میں ہونے والی جنگ کے بعد اتابک کا سر خلیفہ بغداد کو تحفے کے طور پر بھیجا گیا[43] اور اس طرح تکاش سلجوقی سلاطین کا حقیقی وارث ہو گیا۔ مگر ان کی سلطنت کے ساتھ ہی اسے خلیفہ کی روایتی دشمنی بھی ورثے میں ملی تھی۔ اس کا انتہائی خراب اثر نہ صرف اس کی سلطنت پر ہوا بلکہ سارے مسلم ایشیا کے لیے تباہ کن رہا۔ اس کی وجہ سے سیاسی صورت حال ایک سہ طرفی کشمکش میں تبدیل ہو گئی جس نے چند برسوں بعد منگولوں کی پیش قدمی کو آسان بنا دیا۔ عراق میں تکاش کی پیش قدمی آسان ہو گئی۔ عراق میں تکاش کی پیش قدمی نے کچھ عرصے کے لیے اپنے سیاسی اقتدار کو قایم کرنے کی خواہش کو پورا کرنے کے امکانات روشن کر دیئے۔ خلیفہ کی اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں ابھی تک سلجوقی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ مگر اس کی امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب تکاش نے اس کے وزیر کی بہت معمولی عزت افزائی کی اور عراق کے اقتدار میں اس کے ساتھ حصہ بٹانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔[44] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ اس کا زبردست دشمن بن گیا۔ اور اس کے بعد سے اس نے اپنے آپ کو پورے طور پر خوارزم شاہ کے خلاف عداوت کی آگ بھڑکانے کے لیے وقف کر دیا۔ منہاج بیان کرتا ہے کہ بغداد سے غور میں کچھ سفیر آئے جنھوں نے غیاث الدین کو تکاش سے فوری جنگ کی ترغیب دی۔[45]

اپنے جوش اور ولولے کے باوجود غوری اتنے مضبوط نہیں تھے کہ ان کی درخواست کی فوراً تعمیل کر سکتے مگر 1200ء/596ھ میں تکاش کی موت پر اس کے بیٹے علاءالدین اور پوتے ہندو خاں کے درمیان خانہ جنگی سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور اگلے سال کے آغاز ہی میں غوری دستے خراسان میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے نیشاپور، مرو، سرخس اور طوس پر قبضہ کر لیا۔[46] جرجان اور بطام جیسے دور دراز علاقے بھی اس کے زیر اثر لائے گئے۔ ملاحدہ، مرتدوں کے گڑھ کوہستان کو تاراج کیا گیا اور اس طرح سارے کے سارے خراسان پر پہلی بار غوریوں کا قبضہ ہو گیا۔

ان کی یہ فتح بہرحال عارضی رہی کیوں کہ علاالدین نے، جو آخرکار تکاش کی

جگہ تخت نشین ہوا، یہ ثابت کر دیا کہ اس کا خمیر بھی وہی ہے جو اس کے باپ کا تھا۔ اس نے جلد ہی نیشاپور اور دوسرے غوری مقبوضات کو واپس لے لیا۔ یہاں تک کہ ہرات نے بھی 1201ء/ 598ھ میں اس کی اطاعت قبول کر لی[49]۔ اپنی اتنی آسان فتوحات کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ اپنے مردود قراخطائی باجگزار کو کلی طور پر قابو میں لانے کی خاطر علاء الدین غوریوں کے ساتھ مصالحت اور امن کے لیے کوشاں رہا۔ مگر اُن لوگوں نے اسے چین سے کبھی بیٹھنے نہ دیا۔ غوری جو خراسان پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے بے چین تھے، انھوں نے حملہ کیا اور مرو الرود کے قریب ایک فتح حاصل کرنے کے بعد طوس اور سرخس کو محاصرے میں لے لیا۔ ہرات بڑی آسانی سے ان کے قبضے میں آ گیا۔ بہر حال 1202ء/ 599ھ میں اپنے بھائی غیاث الدین کے انتقال کے موقع پر ہرات سے معز الدین کی مختصر سی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علاء الدین نے خرناک کی زیر قیادت غوری دستوں کو شکست دی۔ مرو کا محاصرہ کیا اور شہر کو اُن کے قبضے سے آزاد کرا لیا[49]۔ حکومت کے دو سلسلوں کی پرانی رقابت اپنے عروج پر پہنچ گئی اور ایک فیصلہ کن جنگ اور زیادہ ملتوی نہ کی جا سکی۔

ایک فیصلہ کن وار کرنے کے خیال سے معز الدین علاء الدین کے دارالسلطنت گرگنج کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ موخر الذکر جلدی سے واپس ہوا اور اپنے قراخطائی امیر سے امداد کی درخواست کرنے پر مجبور ہو گیا[50]۔ اس نے حالات کا رخ بالکل بدل دیا۔ معز الدین کو جب اس درخواست کی اطلاع ملی تو اسے فوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ قراخطائیوں نے اس کا تعاقب کیا اور دریائے آکسس کے کناروں پر اس کی فوج کو عبرت انگیز شکست دی۔ وہ اپنی ہزیمت خوردہ بچی کھچی فوج کے ساتھ بھاگا مگر 1204ء/ 601ھ میں اندخود کے مقام پر پھر گھیر لیا گیا[51]۔ تاکاش کے باج گزار سمرقند کے خان، عثمان کی یہ مہربانی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے دارالسلطنت تک بحفاظت واپس جا سکا۔ ایسی فیصلہ کن اور قطعی شکست کے بعد معز الدین اپنے سابق دشمن علاء الدین سے اتحاد کے ایک دفاعی معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار نہ کر سکا[52]۔ غوریوں کی بعد کی فتوحات میں سے

علاءالدین نے انھیں صرف ہرات اور بلخ اپنے قبضے میں رکھنے کی اجازت دی۔
اس طرح خوارزم شاہ نے اپنے حریف کو صرف جنگ ہی میں نہیں بلکہ حکمت عملی میں بھی واضح طور پر شکست دی۔ اس نے غوریوں سے قراخطائیوں کے خلاف مدد کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔ اسے جو کچھ ملا تھا وہ یہ کہ اس نے موقع پرست معزالدین کے اندر جاہ وحشم کی ہوس کو اور بڑھایا۔ موخرالذکر کو صلح وصفائی بلکہ اپنے ساتھ ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے اس نے اسی دشمن کو استعمال کیا، جس کو برباد کرنا اس کا اصل اور آخری مقصد تھا۔ مگر علاءالدین کی پالیسی کی اہمیت کو نہ تو غوریوں نے سمجھا اور نہ ہی قراخطائیوں نے۔ معزالدین اپنی شرمناک شکست کو بھلا نہ سکا اور بے دین حکومت کو نیست و نابود کرنا اس کا فوری مقصد بن گیا۔[53] خلیفۂ بغداد نے اس سے پہلے خوارزم شاہ کو ختم کرنے اور اس کام کی تکمیل کے لیے قراخطائیوں سے ایک معاہدہ کرنے کی لاحاصل التجا کی[54]۔ موخرالذکر کے ساتھ جھڑپوں کا آغاز ترمذ پر قبضہ کرنے والے معزالدین کے بلخی گورنر سے ہوا۔[55] قبل اس کے کہ وہ ماوراءالنہر میں ان کے علاقوں پر بڑے پیمانے پر حملہ کرتا۔ پنجاب کی بغاوت نے معزالدین کو "خزانے اور اسلحہ خانے کے معاملات کو ٹھیک کرنے کے لیے[56]" فوراً اس طرف رجوع ہونے پر مجبور کر دیا۔ جب وہ واپس ہو رہا تھا تو اس نے بامیان کے حکمران کو آنے والی مہم کے لیے تیار کرنے اور دریائے آکسس پر ایک پل بنانے کے لیے احکامات بھیجے۔ لاہور سے اس نے اپنے فوجی دستوں کو اپنے اپنے گھروں کو جانے کی اجازت دی جس کے بعد انھیں اس مہم کے لیے جمع ہونا تھا جسے وہ تین سال تک چلانا چاہتا تھا۔
اس مہم کا آغاز کبھی نہ ہو سکا کیوں کہ اپنے دارالسلطنت تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوکش کے پار اس کی سلطنت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے چند ہی سال بعد اس کا بھانجہ اور غور میں اس کا جانشین محمود، خوارزم کے حاکمانہ اقتدار کو قبول کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کی موت کے بعد شنسبانی حکومت عملی طور پر خوارزمی سلطنت میں ضم ہو گئی۔ غور کی تحلیل اس وقت مکمل ہو گئی۔ جب 1215ء/ 612ھ معزالدین والسراے یلدز کو نکال باہر کیا گیا اور غزنی

کو علاء الدین کے ولی عہد جلال الدین کے باج گزار علاقے سے منسلک کردیا گیا۔ معزالدین کے تعمیر مملکت کے منصوبے میں ہندوستانی مہموں کی حیثیت ثانوی حیثیت کے طور پر نظر آتی ہے۔ مگر پھر بھی خود اس کی قلمرو کی تباہی کے باوجود ہندوستانی مقبوضات برقرار رہے۔ اگر منگولوں سے قبل خوارزمی شہنشاہیت کا زوال نہ ہوا ہوتا تو شاید نوزائدہ دہلی کا انجام بھی وہی ہوا ہوتا جو غزنی کا ہوا۔

شمالی ہندوستان

عالم اسلام پر ترکوں کی فوقیت کی ابتدا تقریباً اسی وقت ہوئی جب کہ ہندوستانی سماج میں ایک نیا عسکری نظام ابھر رہا تھا۔ عربوں کو سندھ میں ایک برہمن موروثی سلطنت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور ترکوں کا سامنا راج پوتوں سے ہوا۔ ہندوستان میں بدیسی حملوں اور آبادکاری کی وجہ سے سنہ عیسوی کی ابتداء سے ہی ایک تغیر ہوچکا تھا۔ ساتویں صدی کے آخر میں ہرش کی سلطنت ختم ہونے کے ساتھ ساتھ پرانی روایتیں اور سماجی بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اور خواص کا ایک نیا اعلیٰ طبقہ آہستہ آہستہ وجود میں آنے لگا تھا اور یہ راج پوت تھا جو آنے والی کچھ صدیوں تک برہمنیت کو دوبارہ زندہ کرنے اور شمالی ہند کی تقدیر کو اپنے قابو میں رکھنے والا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ خالص ہندوستانی ہے۔ دوسرا جنم یعنی دو بجائے چکا ہے اور سورج کی فرمارروائی کی نمائندگی کرتے کے لیے ماؤنٹ آبو پر قربانی کی مقدس آگ سے ابھرا ہے۔ مورّخین اس بات سے متفق ہیں کہ اس کے خون میں آمیزش تھی اور اس میں غیر ملکی خون زیادہ تھا لیکن اسے ہندو سماج میں جگہ مل گئی تھی مگر مخصوص نام کے ساتھ۔ اس نے عملی طور پر لڑنے والوں کے پرانے طبقے یعنی چھتریوں کی جگہ لے لی تھی۔ اور ایسا کرنے میں اس نے ایک ایسے تخیل پرست فوجی دور کا آغاز کیا تھا جو جواں مردی رزمیہ گیتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں کچھ باتیں ترکوں سے ملتی جلتی تھیں دونوں کے لیے ناموری حاصل کرنے کا ذریعہ تلوار تھی۔ فلسفیانہ تفکّر میں دونوں کے لیے کوئی کشش نہیں تھی اور دونوں کی خصلت میں گروہ بندی اور اندھی وفاداری کے عنصر پائے

جاتے تھے۔ دونوں کے سیاسی نظام میں ایک قسم کی جاگیرداریت تھی لیکن راجپوتوں میں ترکوں سے کہیں زیادہ بے دھڑک جرأت اور جاں نثاری کی حد تک پہنچا ہوا عزت کا احساس تھا جو اُسے شکست کھانے یا اُسے خود اپنی نظر سے گر جانے کے مقابلے میں خود کو تباہ کر لینے پر آمادہ کرتا تھا۔

سندھ میں عربوں کے مقابلے میں ناکارہ لوگ آئے تھے ترکوں کے مقابلے کے لیے مردانہ سپاہیوں کی نسل سامنے آئی جو شوالک کے سلسلہائے کوہ سے وندھیا تک راج کرتی تھی۔ لیکن راجپوتوں کی فوجی شان و شوکت حاصل کرنے کی غیر معمولی ہوس نے اس کے پاداشِ عمل کا ثبوت دیا کیوں کہ اس کا نتیجہ مسلسل جنگوں اور سیاسی انتشار کی شکل میں ہوا۔ گرجر۔ پرتی ہار سلطنت[58] کی جگہ متعدد ریاستی طریقے نے لے لی۔ جس میں آئے دن اقتدارِ اعلیٰ حاصل کرنے کے لیے متواتر کشمکش شروع ہو گئی۔ جو جنگجو مسلمان سندھ اور پنجاب پر قابض تھے انھوں نے پھوٹ ڈالنے والی طاقتوں کو شہ دی۔ بارھویں صدی کا ہندوستان بلا شبہ ہندوستان کے بھوکے ترکوں کے لیے ترغیب دینے والے انعام کی مانند تھا۔

یہ مناسب ہو گا اگر شمالی ہند کا، جو مختلف موروثی سلاطین کے تحت تھا ایک سیاسی جائزہ لے لیں۔

پنجاب اور سندھ کی مسلم ریاستیں

محمود کے وقت سے پنجاب غزنی سلطنت کا ایک اٹوٹ حصہ رہا تھا۔ مسعود کو وہاں سلجوقیوں سے پناہ کے لیے ایک محفوظ جگہ ہاتھ آئی۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بہرام اور آخر میں اُس کا لڑکا خسرو اپنے ہندوستانی صوبے پر حکومت کرنے کے لیے غزنی سے نکالے گئے۔ مؤخر الذکر کی جگہ لاہور میں خسرو ملک نے لی۔ خسرو ملک نے روزنامچے کے الفاظ میں ''اپنے آپ کو پورے طور سے عیش و عشرت کے حوالے کر دیا اور ریاست کے ملازم اور ملک کے گورنر اپنے اختیارات کا آزادانہ استعمال کرتے رہے۔''[59]

اس کی سلطنت کی حدود کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں

غالباً پشاور شامل تھا۔ جہاں سے معزالدین نے ہندوستان میں غزنوی مقبوضات پر اپنا پہلا حملہ شروع کیا تھا۔ محمود نے شیعہ مسلمانوں کے قرامیط فرقے سے ملتان چھینا تھا۔ اس کی موت کے کچھ برسوں بعد موخرالذکر کے دوبارہ طاقتور ہو جانے کی وجہ سے یہ صوبہ پنجاب سے الگ ہو گیا۔[60] ریاست جموں کی طرف سے یالکوٹ سرحد معلوم ہوتا ہے جو بعد کے ایک روزنامچے کی رو سے خسرو ملک کا دشمن تھا۔[61] غزنیوں کی سرحد بہر حال مستحکم نہیں تھی کیوں کہ راجپوتوں نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا دیا۔ چوہان بادشاہ وشال دیو وگراہ راجہ چہارم کا دعویٰ ہے کہ اس نے پنجاب میں آسی (جسے اب ہانسی کہتے ہیں) مسلمانوں سے لے لیا تھا جن کو اس نے متعدد جنگوں میں شکست دی تھی اس کے بھانجے اور جانشین پرتھوی راج اوّل کے خلاف وکرمادیت سمیت 1224 / 1167ء میں ہانسی کے ایک مضبوط چوکی میں تبدیل ہونے کا ذکر ملتا ہے۔[62] یہ دباؤ مسلسل جاری رہا ہوگا۔ اس بات کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ بھٹنڈا (جو بتر ہندہ لکھا جاتا ہے) جو مزید شمال میں واقع تھا، کچھ برسوں بعد پرتھوی راج دوم کے قبضے میں نظر آتا ہے جسے بعد کو 1191ء میں معزالدین کو فتح کرنا تھا۔

خوارزم شاہ سے ایک طویل جنگ کے امکانات کے پیشِ نظر شنسبانیوں کو یہ بات ضروری معلوم ہوئی کہ پشت پر سے دشمنوں کا بالکل صفایا کیا جائے۔ سندھ کی طرف سے حملے کی ناکامی کی وجہ سے معزالدین نے اپنی توجہ شمالی راستے کی طرف مبذول کی اور 1179ء/575ھ میں پشاور پر قبضہ کر لیا۔[63] دو سال بعد اُس نے لاہور کی طرف پیش قدمی کی۔ خسرو قیمتی تحائف اور اپنے بیٹے کو یرغمال کے طور پر دے کر ہی اپنی جان بچا سکا۔ 1185ء/581ھ میں معزالدین نے پھر پنجاب پر حملہ کیا مگر دیہاتوں کو لوٹنے اور سیالکوٹ کے قلعے پر جس کی مرمت ہوئی تھی اور جس پر محافظ فوج تعینات تھی، قبضہ کرنے پر ہی قناعت کی۔ دشمن کے اصل مقصد کا اندازہ لگانے کے لیے آخر کار خسرو نے پھر کوشش کی اور کھوکر[64] قبائل کی مدد سے قلعے کا محاصرہ کیا مگر اُسے ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ اگلے سال معزالدین پھر حملہ آور ہوا اور لاہور کا محاصرہ کیا۔ مگر طاقت کے ذریعہ اُسے حاصل نہ کر سکنے پر

اُس نے حکمت عملی اختیار کی۔ اس نے جان کے تحفظ کا یقین دلا کر خسرو کو اپنے کیمپ میں آنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں اسے دغا بازی سے پکڑ لیا گیا اور مستقل قید میں رکھنے کے لیے غرجستان میں بلروان کے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ 1193ء / 588ھ میں اسے قتل کر دیا گیا۔[65]

بالائی سندھ کا زیادہ حصہ ملتان کے قرامیط قبائل کے حصے میں تھا۔ اُچھ کی تاریخ بہرحال واضح نہیں ہے یحییٰ سرہندی، فرشتہ اور دوسرے مصنّفین نے غالباً ابن الاثیر کی سند پر بیان کیا ہے کہ اس پر بھٹی راجپوتوں کا قبضہ تھا۔[66] بہرحال بھٹیوں کی تاریخوں میں اُچھ پر ان کے قبضے کا کوئی معمولی سا ذکر بھی نہیں ملتا۔ یہ بات کچھ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ قرامیط قبائل کے قبضے میں تھا۔ بہرصورت معزالدین نے 1175ء / 571ھ میں اپنے ایک ہی حملے میں اُچھ اور ملتان دونوں پر قبضہ کیا تھا۔[67]

سندھ کے نچلے حصے میں جس کی راجدھانی دیبل میں تھی جو ایک مقامی خاندان کے ماتحت تھا۔ ان علاقوں میں محمود کی فتوحات کسی بھی طرح مکمّل نہیں تھیں۔ اس کے انتقال کو ابھی بہت دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک مقامی قبیلے سمرا نے شہر پر دوبارہ قابو حاصل کیا۔ اور خود مختار بن گیا۔ اس قبیلے کے اصل مبداء کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ابن بطوطہ نے سنا تھا کہ یہ عربوں کا کوئی سلسلہ تھا۔[69] اس خیال کی حمایت "تحفۃ الکرام" میں ہے۔[70] مگر فرشتہ میں اس کی تردید ہے۔ طاہر نسیانی اور ابوالفضل اصرار کرتے ہیں کہ یہ لوگ ایک مقامی ہندوستانی قبیلے کے تھے جنھوں نے کافی شروع ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔[71] ایلیٹ اور لوڈ ا انھیں راجپوت نسل پارمار کی شاخ سمجھتے ہیں۔[72] میر معصوم[73] کے مطابق یہ لوگ عبدالرشید غزنوی کے عہد کے آخر میں حکمراں بنے جس کی کمزوری نے اُنھیں تھاری کے قصبے کے قریب اپنے اقتدار و اختیار کو قائم کرنے کی ترغیب دی "تاریخ طاہری" اُن کی خود مختاری کے آغاز کو 1302ء / 700ھ[74] کا واقعہ بتاتی ہے۔ یہ بات "تحفۃ الکرام" کے اس بیان کے کافی قریب ہے کہ یہ لوگ غیاث الدین تغلق کے عہد میں سر پر حکومت پر آئے۔[75] یہ بات

حقیقتاً "سما" سے متعلق ہونا چاہیے کیوں کہ یہ طے ہے کہ انھوں نے ہی پہلے شاہی خاندان کا بیج بویا تھا اور سندھ کے نچلے حصے پر اس وقت قابض تھے جب 1362ء / 762ھ میں فیروز تغلق نے ٹھٹھہ کے جام کے خلاف حملہ شروع کیا تھا۔ ایلیٹ کو 1032ء کی ایک شہادت سندھ کے ایک سمرا شہزادے کی ملی ہے جس کی رو سے دروزیس کے قرامیط قاصد قائد کی طرف سے اُسے مذہبی اہمیت کے خطوط ملتے تھے۔ دروزیس فاطمی خلفاء کے کٹر حمایتی تھے۔[76] ان کا شیعہ عقائد کو قبول کرلینا اور اس کے نتیجے کے طور پر ملتان کے قرامیتوں سے ان کا قرب بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ "تحفتہ الکرام" میں ملنے والی سمرا حکمرانوں کی فہرست میں گیارہواں نام چنیسر یا چنیسار کا ہے جسے واضح طور پر سنان الدین چنیسر کہا جاسکتا ہے۔ جو دیبل کا حکمران تھا اور جس نے 1228ء میں التمش کی طاقت قبول کی تھی۔[77] جوینی کے مطابق وہ اس وقت اپنی راجدھانی چھوڑ کر بھاگا جب خوارزمی شہزادہ جلال الدین منگ برنی عراق جاتے ہوئے سندھ کے نچلے حصے سے گذرا تھا۔[78] جب 1182ء / 578ھ[79] میں معزالدین نے دیبل کو "سمندر روں تک" اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ اس وقت اس نے سمرا حکمراں کو اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔[80]

مغربی راجپوت

تین طاقتور شاہی خاندانوں نے دہلی سے گجرات بشمول راجپوتانہ تک کی سرزمین پر حکومت کی۔ ان میں سے انہل واڑہ (ANHILWARA) اناہلا پٹن (ANAHILLA PATTAN) کا چالوکیہ خاندان، جیا سنہا سدھ راجا (JAYASINHA) (SIDDHARAJA) (1094ء - 1143ء) کے عہد میں اپنی طاقت کے عروج میں پہنچا۔ جیا سنہا نے طویل جنگ کے بعد مالوہ کی پرمار سلطنت کا زیادہ بڑا حصہ ہڑپ کرلیا تھا۔[81] اس نے چتوڑ کی قلمرو کو بھی فتح کیا۔ جے سوورما (JASO VARMA) کی شکست (1133ء - 1143ء) کے بعد پرمار عملی طور پر چالوکیہ کی جاگیردار بن گئے۔ چالوکیہ مولا راجا دوم (MULA RAJA) (1176ء-1178ء)

کی کمزور حکومت کے بعد ہی پرمار وندھیا ورمن (VINDHYA VARMANA) کی قیادت میں اپنی خود مختاری کو پھر سے منوا سکے۔[82] ماؤنٹ آبو کے گرد و پیش ملک میں پرمار خاندان کی مختلف شاخوں کی حکمرانیاں تھیں وہ بھی محکوم ہو کر رہ گئیں۔ مگر بہر حال ان کی یہ باج گذاری 1179ء تک چلتی رہی۔ یہاں تک کہ باگڑ میں حکومت کرنے والی شاخ کو میواڑ کے گوہلاٹ (GUHELATS) نے پھر سے جما دیا۔[83] نادول کی چوہان راج شاہی نے بھی چالوکیا کی اطاعت قبول کر لی۔[84] جیا سنہا نے جزیرہ نما کاٹھیاوار میں گرنار کی یادو (JADAVA) راج شاہی کو بھی تسخیر کر لیا۔[85]

ان کی قومیت و حکمرانی نے جلدی ہی دوسرے جاہ پسند شاہی خاندانوں سے اُن کی دشمنی کرا دی۔ جیا سنہا نے بندیل کھنڈ کے چندیلوں سے ایک غیر فیصلہ کن جنگ لڑی۔[86] اس کا سب سے طاقتور حریف اجمیر کا چوہان بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے جس کی بنیاد سامنت نے رکھی تھی۔ گیارھویں صدی میں اجمیر کی بنیاد رکھنے والے دیو کی ماتحتی میں اپنے علاقے کی سرحدوں کو کافی بڑھایا۔ اس کے جانشین ارنوراجا (ARNORAJA 1153ء - 1164ء) کو ایک مختصر مدت کے لیے چالوکیہ کی باج گزاری کو تسلیم کرنا پڑا۔ مگر اس نے جلد ہی اپنی خود مختاری کو حاصل کر لیا۔ چوہان خاندان کی ایک شاخ نے نادول پر قبضہ کیا اور 1143ء / 1200 وکرمی سمبت کے قریب مندور (MANDOR) کے پری ہاروں کے قدم پھر سے جما دیئے۔[87] اسی خاندان کی شاخ نے کوٹہ جالور (JALOR) سروہی اور بندی کے حکمراں سلسلوں کی بنیاد رکھی۔[88]

راجپوتانہ کے دو اعلیٰ سلسلہ سلاطین اپنی غیر تسکین پذیر حب اقتدار و قوت کی وجہ سے امن و سکون سے نہ رہ سکے۔ 1140ء - 1150ء کے مدھ راجا کے جانشین کمارپال (1143ء - 1173ء) نے اجمیر کے ارنوراجا کو دو دفعہ شکست دی۔[89] چوہان دوسری دفعہ گجرات کے باج گزار ہوئے۔ ارنوراجا کا بیٹا اور اس کا جانشین سمیشور (SOMESWARA) کوکن کے سلاہاروں سے کمارپال کی جنگ میں موخر الذکر کی طرف سے لڑا۔[90] اس کے انتقال سے بہر حال چالوکیہ

کی قوت رو بہ زوال ہوئی۔ دوسرے حکمراں اجے پال نے چتوڑ کے معمولی سے گوہلاٹ سردار سمانتا سنہا کے ہاتھوں شکست کھائی۔ بعد کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ سمانتا سنہا نے چالوکیوں کو خود کمار پال کی زندگی ہی میں میواڑ سے نکال باہر کیا تھا۔[91] مالوہ کے پرماروں نے بھی اپنی خود مختاری کا دعویٰ کیا اور اُنھوں نے تو گجرات پر حملہ بھی کیا۔[92] صرف چندراوتی کے پرمار پورے طور پر چالوکیاؤں کے وفادار رہے۔ بلکہ ان کی وفاداری تو 1230ء تک قایم رہی۔[93] باقی ماندہ مغربی اور جنوبی راجپوتانہ آزاد ہوگیا۔ گجرات کے اگلے دو حکمراں مُل راجہ دوم اور بھیم کا انحصار تقریباً پورے طور سے اپنے پورے پرمار باج گذاروں اور بگھیلا سردار لَوَن پرساد کی اعانت پر تھا۔ لَوَن پرساد کے لڑکے ورادھ والا (VIRADHA VALA) نے بالآخر خاندانی حکومت کی بنیاد رکھی۔

چالوکیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ مالوہ کے پرماروں اور اجمیر کے چوہانوں نے شہرتِ حاصل کی۔ لیکن اول الذکر کی تقدیر میں نہیں تھا کہ وہ کافی عرصے تک طاقت اور اقتدار پر قابو رکھ سکیں۔ کیوں کہ چالوکیوں اور گوہلاٹ پر فتح حاصل کرنے کے بعد ان کو ایسی مسلسل شکستیں ہوئیں جو اُن کے مکمل زوال کا سبب بنیں۔ دوسری طرف چوہانوں نے نہایت تیزی کے ساتھ شمالی مشرقی راجپوتانہ کو ہڑپ کر لیا۔ اجمیر کا وشال راجا ایک زبردست فاتح تھا۔ اس نے 1150ء تک دہلی کو توماروں (TOMAR) سے چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔[94] اپنی ایک تحریر میں وہ ہمالیہ اور وندھیا کے پہاڑوں کے درمیانی علاقے بشمول "بیکنٹھ اور جبلی پور" تک کو جیتنے اور اس کو اپنے ماتحت کرنے پر انتہائی فخر کا اظہار کرتا ہے۔[95] غزنویوں کو ہٹا کر ہانسی پر اس کے قبضہ کرنے کا تذکرہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اس کے لڑکے اپار گنگیا (APARGANGEYA) اور اس کے بھتیجے پرتھوی راج اوّل کے مختصر اور غیر اہم عہد حکومت کے بعد تخت اس کے چھوٹے بھائی شمیشور کو ملا۔ اس نے 1170ء سے 1179ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد ہی اس کا مشہور و معروف بیٹا پرتھوی راج دوم اس کا جانشین ہوا۔ پرتھوی راج جس کو مسلمان مورّخ رائے پتھورا کہتے ہیں۔ اس کی مبینہ صلاحیتوں اور اس کی فتوحات کا ذکر چند بردائی کی پرتھوی راج راسو

میں ملتا ہے جدید تحقیق نے اُن میں سے اکثر کی تردید کی ہے۔[96] اس کے عسکری کارناموں کی صرف ایک غیر مشکوک شہادت 1183ء کی، بندیل کھنڈ کے ضلع للت پور میں پائی جانے والی ایک تحریر ہے جس میں کالنجر کے چندیل راجا پرمار دیدیوار ـــــــ (PARAMR DIDEVAR) سے چھین کر مہوبے پر اس کے قبضے کا ذکر ہے۔[97] جو بہر حال ایک ہی سال کے اندر دوبارہ حاصل کر لیا گیا۔ یہاں اس کی نامور فتوحات کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اس نے گہادوالا (GAHADAVALA) آبو کے پرماروں، گجرات کے چالوکیوں یا قنوج کے گہادوالا پر حاصل کی تھیں۔ موخرالذکر نے گہادوالا کے بادشاہ جے چند کی بیٹی کا اغوا بھی کیا تھا۔ ان سب کی اساس داستانوں جیسی غیر مستند اور راسو جیسی نامعتبر اسناد پر ہے۔[98] اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک زبردست بادشاہ تھا۔ لیکن شمالی ہندوستان پر اس کے اقتدار مطلق کی صداقت کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ پڑوسی بادشاہوں سے اس کے تعلّقات بہت دوستانہ نہیں ہو سکے تھے۔ اسی سے شاید اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اسے ترک حملہ آوروں کا یکّا وتنہا مقابلہ کرنا پڑا ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم ان جاگیر شہزادوں (FEUDATORY PRINCES) کے ناموں کی تصدیق کریں۔ اس کی طرف سے معزالدین کے خلاف لڑے تھے۔[99] اس بات کا امکان ہے کہ گوبند رائے (جسے مسلم تحریروں میں کھنڈی رائے (KHANDIRAI) لکھا گیا ہے) جسے دہلی کا رائے کہا گیا ہے وہ اس کا باج گذار ہو اور تومار کے شاہی خاندان سے متعلق ہو۔

مشرقی راجپوت

مشرقی راجپوت قنوج کے گہادوالا (GAHADAVALA) کالنجر کے چندیلوں اور چیدی (CHEDI) کے کالاچوری (KALACHURIS) پر مشتمل ہیں۔ گہادوالا کی امارت کی بنیاد گیارہویں صدی کے آخر میں چندر دیو نے رکھی تھی۔[100] چندیلوں نے اپنی حکومت اسی صدی کے شروع میں گرجار، پرتی ہار (GURJAR PRAIHARA) خاندان کے زوال سے فائدہ اٹھا کر قائم کی۔[101] اُن لوگوں نے دوآبہ گنگ و

جن پر اپنی سرداری قائم کر رکھی تھی مگر کالاچوری خاندان کے، جس کی بنیاد اس سے بھی قبل تری پوری میں پڑی تھی، ملک بھی کرن نے مدھیہ بھارت صوبے کے جبل پور ضلع میں ان کے قدم جمائے[102]۔ موخرالذکر نے بہرحال ابھرتے ہوئے گہادوالا کے سامنے دم توڑ دیئے۔ گہادوالا جنہوں نے گوبند چندر (115-114) کی قیادت میں ایک طرف بنگال کے پال (PALA) اور سینا (SENA) حکمرانوں اور دوسری طرف غالباً دہلی کے تومر (TOMAR) کی قیمت پر اپنے علاقے میں توسیع کر لی تھی۔ چندیل وفاق مغربی بندیل کھنڈ پر غالباً جس کی شمالی بنیاد جمنا تھی، مشتمل تھا۔ وفاق کی جنوب مشرقی سرحد کالاچوری کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہوگی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گوالیار کے کچھواہا حکمرانوں پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا[103]۔ شروع شروع میں گہادوالا کی سلطنت، کاشی (KASI) (بنارس)، کوسالار (KOSALAR) (اودھ) کوشیکا (KAUSIKA) (الہ آباد) اور اندرپرستھ (دہلی)[104] پر مشتمل تھی۔ اس خاندان کے بادشاہوں کی توسیع پسندانہ پالیسی نے جلد ہی ہمسایہ ریاستوں پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ چندر دیو کے جلوس (تخت نشینی) کے انعامات کو جس میں وہ انعامات بھی شامل ہیں جو اس سے پہلے تری پورہ کے جشا کرن (JASHH KARNA) کے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کالاچوری اس توسیع پسندانہ پالیسی کے سب سے پہلے شکار ہوتے تھے[105]۔

چندر دیو کا پوتا گوبند چندرا اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ کالنجر میں اس کا ہمعصر مدن ورما بھی اسی جیسا حوصلہ مند شہزادہ تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے مالوہ کے پرماروں کو شکست دی۔ اور گجرات کے جے سنہا سدھ راجا کے ساتھ انتہائی کامیابی کے ساتھ جنگ کی۔ چندیلوں اور گہادوالا کے ولولوں کی تسکین کو صرف کمزور کالاچوریوں کی قیمت پر مل سکی۔ ساگر، دموہ اور جبل پور کے اضلاع پر مشتمل موخرالذکر سلطنت کا ایک حصہ جو ساگر، دموہ اور جبل پور پر مشتمل ہے۔ چندیل عملداری میں آ گیا[107]۔ شمال مغرب میں گوبند چندرا نے اچھے خاصے حصے کو ہتھیا لیا[108]۔ جنوب کی طرف بھی کالاچوریوں نے اڑیسہ کے گنگا بادشاہوں کے حملے کو جھیلا۔ گنگا بادشاہوں کی طاقت چھوڑا گنگا (1147-1026ء)

کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچی۔ موخرالذکر کے ساتھ جھگڑوں کا حوالہ تماننا (TAMMANA)
کے کالاچوری راجاؤں کے ایک جدی سلسلے کے جنھوں نے بڑی طویل جنگ لڑی تھی، دو
کتبوں میں ملتا ہے۔[109] گنگا بادشاہ آخر کار کالاچوری بادشاہ پارمروی (PARAMARDI)
کو اپنا باج گذار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ موخرالذکر کا تذکرہ نرسمہا (NARASINHA)
دوم (1278ء-1202ء) کے جھنڈے تلے لڑنے والوں میں ملتا ہے۔[110] بارہویں صدی
کے اختتام سے پہلے ان کی سلطنت کے ختم ہوتے کا پتہ 1214ء کی ایک گرانٹ سے ملتا
جس میں چندیلوں کے غلبے کا کالاچریوں کے ایک سابق باج گذار (موجودہ ریوہ) کے
مہارنکا (MAHARANKA) کا اعتراف ملتا ہے۔[111] اب تک کے دریافت کیے ہوئے
کالاچوری ریکارڈ میں آخری 1195ء کا ہے۔[112] Ph 8523

کالاچریوں پر اپنی ابتدائی کامیابیوں کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ شمالی ہندوستان
میں قوت اقتدار کی دوڑ میں چندیل گہاڑوالا سے مات کھا گئے۔ مدن ورما کے طویل
عہد حکومت (1165ء-1125ء) کے بعد اس کے پوتے پرمار دیدیو (PARAMADIDEVA)
کا عہد شروع ہوا۔ اس کے اقتدار کی بنیادیں پرتھوی راج دوم کی دی ہوئی شکست
سے ہل گئیں۔ اس شکست کے نتیجے کے طور پر اس کے مغربی فتوحات چوہانوں کے ہاتھوں
میں چلے گئے۔ اس کا قبضہ مہوبے، کھجراہو، کالنجر اور اجے گڑھ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔
1176ء کے ایک کتبے سے چند گاؤں کے تحفے کا ذکر ملتا ہے۔ اس کا اثر و رسوخ بہر
حال جھانسی تک معلوم ہوتا ہے۔[113]

میدان میں اکیلے باقی رہ جانے کی وجہ سے گہاڑوالا نے اپنے اثر و رسوخ کو بتدریج
بڑھا لیا۔ گورکھپور، الہ آباد اور پٹنہ میں ملنے والے کچھ فرمانوں سے گوبند چندر کی سلطنت
کی توسیع ظاہر ہوتی ہے۔[114] یہ فتوحات زیادہ تر پال کی قیمت پر حاصل ہوئی تھیں۔
جو اب عملی طور پر جنوبی بہار تک محدود تھے گوبند چندرا کی توسیع پسندانہ پالیسی کو
اس کے جانشین وجے چندر (1170-1155ء) نے جاری رکھا اسی کے عہد میں شاہ آباد
کا ضلع بھی گہاڑوالا کے تحت نظر آتا ہے۔[115] اس کا بیٹا جے چندر (جسے مسلمان مورخ
جے چند لکھتے ہیں) گہاڑوالا میں آخری راجا تھا۔ اس کے فرمانوں کا سلسلہ 1170ء-1189ء
تک ملتا ہے۔ بنارس اور گیا سے جاری ہوتے والے فرمان بہار پر اس کے بدستور قبضے

کی شہادت دیتے ہیں۔[116] اس توسیع پسندی کی وجہ سے جو کشمکش بنگال کے پال اور سینا حکمرانوں سے ہوئی ہوگی۔ اس کے تذکرے کا موقعہ بعد میں آئے گا۔ گہا دوالا سلطنت کے شمال مشرقی کونے کی طرف شہزادوں کا ایک سلسلہ تھا جو اپنے آپ کو راشٹرکوتاز (RASHTRAKUTAS) کہتا تھا وہ چندر دیو کے زمانے سے بدایوں پر اپنا اثرورسوخ رکھتا تھا۔ یہ اثرورسوخ غالباً ان کی جاگیردارانہ (FEUDATORY) حیثیت سے تھا۔[117]

مشرقی ہندوستان کی ریاستیں

زیر تبصرہ عہد میں، شمال مشرقی ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا خاص پہلو پالا (PALA) سلطنت کا تیزی سے خاتمہ تھا۔ رام پالا (1126ء)[118] جسے کیورترا کے غاصب دیا سے اپنا آبائی تخت واپس لینے میں کامیابی ملی تھی۔ اب انگل، کالنگا اور کامروپ میں فتوحات حاصل کر کے شاہانہ جاہ وحشم کو واپس لانے کے قابل ہوا۔ مگر یہ سب کچھ اس کی موت کے فوراً بعد ہی یکسر ختم ہوگیا۔ اس کے وائسرائے ویدیادیو (VAIDYADEVA) نے کامروپ اور وادی برہمپتر میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ورمان خاندان کے جاگیردار راجاؤں (FEUDATORY KINGS) نے جو مشرقی حصوں اور جنوبی بنگال کے کچھ حصوں پر حکومت کر رہے تھے اپنے آپ کو خود مختار مطلق العنان کی حیثیت سے جمالیا۔[119] ہگلی کے ضلع میں اپارامندرا (APARA MANDARA) کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں تک نے اپنی باج گذاری سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ سیناؤں سے اتحاد کر لیا۔ جنھوں نے وجے سین (VIJAY SENA) (1097ء - 1159ء) کی ماتحتی میں بہت پہلے ہی رادھا (مغربی بنگال)[120] کے ایک حصّے کے اوپر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ کمل پال 1126ء - 1130ء اور مدن پال (1130ء - 1150ء) کے زمانے میں پال سلطنت اپنے پھیلاؤ کے لحاظ سے بڑی تیزی سے سکڑ گئی اور بہت جلد شمالی بنگال کے وارندی ڈویژن کے ایک حصّے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بہار میں ان کی سلطنت گیا میں رام پال کے ایک سابق باجگذار یکش پال (YAKASH PALA) کی خود مختار امارت سے گھری ہوئی تھی۔[121] یہ ناداین

جو ابھی حال ہی میں خود مختار ہوا تھا اپنے آپ کو پتھی پاتی (PATHI PATI) کہتا تھا۔ اس نے گیا اور ہزاری باغ کے کچھ حصّوں پر حکومت کی۔[122]

پال شہنشاہیت کے زوال کے بعد علاقوں کے لیے جو چھینا جھپٹی ہوئی اس میں سینا دوسروں کے مقابلے میں تیز رہے۔ اپنے فرمانوں میں یہ لوگ اپنے آپ کو برہما چھتری (BRAHMAKSHARYE)[123] کہتے ہیں۔ یہ نام ایک مخلوط نسل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ جنوبی ہند سے منچلے سپاہیوں کی طرح آئے اور پالا راجاؤں کے یہاں ملازمتیں کیں یا پھر چالوکیہ بادشاہ وکرما دتیہ کے ساتھ اس وقت آئے جب اس نے (1044 - 1068 C)[124] کے درمیان شمال مشرقی ہندوستان پر چڑھائی کی۔ وجے سین نے (1097-1159)[125] جلد ہی حملہ کیا۔ اور مشرقی بنگال کے ورمن (VARMANS) کو اُن کی گدی سے اتار دیا اور وہاں 1159ء میں ایک فرمان جاری کیا۔[126]

شواہد سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وارندری کے ایک حصّے کا وہ مختار بن بیٹھا تھا۔ مدن پال نے آخری فرمان اپنی تخت نشینی کی آٹھویں سالگرہ پر بنگال سے جاری کیا۔[127] وجے سین نے اپنے فرمان میں نہ صرف گوڑا کے بادشاہ کو شکست دینے کا بلکہ کامروپ، کالنگا اور شمالی جنوبی بنگال کے چھوٹے شہزادوں کو ہرانے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ کامروپ کے بادشاہ پر فتح حاصل کرنے کا حوالہ غالباً ریاری دیوا (RYARI DEVA) یا اس کے جانشین اودے کرن سے لڑائیوں کی طرف ہے، جو کامروپ کی چندرا سلطنت کے ولبھ دیوا (VALLABHDEVA) سے قبل آئے تھے۔[128] کہتے ہیں کہ چوڑ اگنگا، اڑیسہ کے جانشین راگھو (RAGHAVA) نے گنگا کی سرحد پر واقع زمینوں پر خراج عائد کر دیا تھا اور اس طرح اس نے سین لوگوں سے دشمنی مول لے لی تھی کیوں کہ یہ سین متاثرہ علاقے کے سور (SURA) راجکماروں کے رشتے دار تھے۔ وجے سین بھی متھلا (شمالی بہار) کے نانیادیو (NANYA DEUA) سے بڑی کامیابی سے لڑا تھا۔ اس کے جانشین ولال سین کے ایک فرمان میں کہا گیا ہے کہ وجے سین نے گنگا پر ایک بحری مہم بھی بھیجی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ حوالہ گہادوالا کے خلاف کی جانے والی ابتدائی جھڑپوں کا ہے جو اس وقت بڑی تیزی سے مگدھ

کی طرف بڑھ رہے تھے۔

پال فرمانروائی کے مدن پال کو غالباً آٹھویں سنہ جلوس کے بعد بنگال سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ پٹنہ اور منگھیر کے اضلاع کے کچھ حصّوں پر 1150ء تک عارضی طور پر قبضہ رکھنے میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا تھا۔[130] ولال سین (1170ء - 1159ء) اور اس کا بیٹا لکشمن سین جسے ایرانی روزنامچوں میں رائے لکشمینا (RAI LAKHMANIA) کہا گیا ہے (1206ء - 1170ء) نہ صرف متھلا پر اقتدار جمائے رہا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اس نے مغرب کی سمت پیش قدمی کی۔[131] پال گیا کے قریب کسی نہ کسی طرح زندگی گذارتے رہے کیوں کہ راجکمار گووند پال کا ایک کتبہ وہاں ملا ہے۔ یہ پال شاہی خاندان کا فرد تھا۔ یہ کتبہ اس کے چودھویں سنہ جلوس کا ہے جسے بعض مورخین نے 1175ء/V.S.1238 قرار دیا ہے۔[132] ایک اور راجکمار پالا پال (PALA PALA) کا نام بھی ایک مورتی پر کندہ کتبے پر ملا ہے جو اس کے پینتیسویں سنہ جلوس پر نذر کی گئی تھی۔[133] تاہم عملی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بہار سے پالوں کا وجود ختم ہو چکا تھا کیوں کہ اس کا بیشتر حصّہ گہادوالا کے قبضے میں جا چکا تھا۔ بہرکیف صدی کے اختتام پر اگر واقعی پال فرمان روائی کا وجود تھا تو پھر وہ آج کے بہار ضلع تک محدود تھی جس کے حدود کے اندر بدھ خانقاہ (وہارا) کا شہر اُدنداپور (UDDANDAPUR) اور دانتی پوری بھی واقع تھا۔

حوالاجات

1۔ سلجوق سلطنت کی ابتدا 1040ء سے مانی جاسکتی ہے۔ اسی سال انھوں نے مسعود اوّل کو آکسس کے جنوب میں زبردست شکست دی۔ گزیدہ، I، ص۔ 435۔

2۔ ابن الاثیر، x، ص 213 کے مطابق 510ھ/1116ء میں سنجر نے بہرام اور اس کے سوتیلے بھائی ارسلان کے جھگڑے میں بہرام کی طرف سے کامیاب مداخلت کی جب اوّل الذکر نے سلجوقوں کی فرماں روائی یا اقتدار کو تسلیم کر لیا تو اوّل الذکر کو غزنی کے تخت پر بیٹھایا گیا۔ جلد ہی بہرام نے اس تابع داری سے منحرف ہو کر خراج دینا بند کر دیا، لیکن 530ھ/1135ء میں اسے آسانی سے زیر کر لیا گیا۔ گزیدہ، i، ص۔ 458۔ جوینی نے 529ھ/1134ء کی تاریخ دی ہے، i، ص۔ 4۔

3۔ ابن الاسیر، xi، ص۔ 281۔ 282 "گزیدہ" کا بیان قدرے مختلف ہے۔

4۔ فصیحی کے مطابق بحوالہ ریورٹی ترجمہ طبقات ناصری، ص۔ 358۔

نوٹ:۔ 'i' علاء الدین حسین غوری جہاں سوز کا باپ بھی سنجر کا تابعدار تھا۔ خود علاء الدین کو بھی 547ھ/1152ء میں زیر کیا گیا۔ اس عمل کی طرف منہاج نے علاء الدین اور سنجر کی کشمکش کے ضمن میں اشارہ کیا ہے ایضاً ص۔ 149، 357، 358۔

5۔ بارٹولڈ، "ترکستان" ص۔ 323۔

6۔ ابن الاثیر، xi، ص 37۔ 38 "گزیدہ"، i، ص 487 اور راوندی، ص۔ 172۔ اس کی تاریخ 534ھ/1140ء بتاتے ہیں۔ لیکن جوینی، ii، ص۔ 5 اور ابن الاثیر xi، ص۔ 37 کے علاوہ بارٹولڈ بھی "ترکستان" ص 326۔ اس کی تاریخ 534ھ/1141ء مانتے ہیں۔

7- جوینی، ص- 88 -

8- i، ص 487 - خاندان خوارزم کی ابتدا جاننے کے لیے جس کی بنیاد ملک شاہ کے غلام نشتغین نے رکھی تھی- ملاحظہ ہو جوینی ص - 2 ذ گزیدہ، i ، ص 486 اور منہاج ص- 242-245 نے یکسر مختلف بیان دیا ہے- خوارزم اور اس کے دارالسلطنت گرگنج (موجودہ کونیا ارگندج) کے نام کے لیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں خوارزم پر مقالہ ملاحظہ ہو-

9- غز ترکی نسل کے تھے اور انھوں نے ابھی ابھی اسلام قبول کرنا شروع کیا تھا -

10- انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں غز پر مقالہ ملاحظہ ہو-

10- تفصیلات کے لیے دیکھیے بارٹولڈ: "ترکستان" ص- 329 ص- 6

11- اس جھگڑے کی ابتدا کا پتہ سنجر کی حکمرانی کے ابتدائی سالوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے- جب عراق کے سلجوق حکمران مسعود اول 1134ء- 1152ء نے حکمراں خلیفہ کو معزول کرکے اپنے نمائندوں کا تقرر کیا- (تفصیلات کے لیے دیکھیے ابن الاثیر X، ص- 270- 272-

12- جوینی ii، ص 6، ذ گزیدہ i، ص- 463- ابن الاثیر ص- 101 کے مطابق وہ سنجر کا غلام تھا- لیکن بارٹولڈ- ح- س، ص- 335 کا اصرار ہے کہ وہ غز کا سردار تھا-

13- ابن الاثیر XI، ص - 168 جوینی IDEM - نے اس واقعہ کی تاریخ 1169ء/565ھ بتائی ہے-

14- ابن الاثیر XI، ص -37 کا بیان ہے کہ اتسیز نے اپنے فرماں روا کے خلاف قراخطائیوں سے دوستانہ سمجھوتہ تک کر لیا تھا- (لیکن بارٹولڈ "ترکستان" ص- 327 اس کو شبہ سمجھنے پر مائل ہے-

15- جوینی ii، ص- 88 ذ گزیدہ، i، ص- 489 -

16- جوینی ح-س، ص- 7-

17- ایضاً ص- 7-

18- جوینی ii، ص- 10 -ان وقتاً فوقتاً ہونے والے جھگڑوں کی تفصیلات کے لیے

دیکھئے بارٹولڈح۔س،ص۔333 ص۔ذ۔ان جھگڑوں میں دونوں حریف قراختائیوں سلجوقیوں اور خوارزم شاہ سے مسلسل مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

19- ابن الاثیر: x1، ص۔131-

20- جوینی: ii، ص۔16-

21- ابن الاثیر x1، ص۔168 ذ جوینی نے IDEM اس واقعہ کی تاریخ 565ھ/1169ء بتائی ہے۔بارٹولڈ مندرجہ بالا تاریخ سے متفق ہے۔

22- گزیدہ i، ص۔460، راوندی: ص۔175-

23- منہاج i، ص۔55 ص۔ذ۔یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ غزنی میں علاءالدین کا حریف کون تھا۔کیوں کہ بہرام کی موت اور اس کے بیٹے خسرو کی تخت نشینی کی تاریخوں کے بارے میں بیانات مختلف ہیں۔منہاج ص، 24-25 کا بیان ہے کہ علاءالدین نے بہرام کو غزنی سے بھگادیا تھا۔وہ 552ھ/1156ء کو بہرام کی تاریخ وفات قرار دیتا ہے۔تاہم صفحہ 115 پر بیان کی گئی ایک روایت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاءالدین کی مخالفت کرنے والا خسرو تھا۔گزیدہ i، ص۔406 اور ابن الاثیر x1، ص۔85 نے 544ھ/1149ء اور 548ھ/1153ء کو بالترتیب بہرام کی تاریخ وفات قرار دیا ہے۔بیضاوی صفحہ ذیل 5، 1 کے مطابق علاءالدین کے غزنی پر حملہ سے پہلے بہرام نے وفات پائی۔جو یقیناً 544ھ کے فوراً بعد ہوگا جب سیف الدین کو کا سر سنجر کو بھیجا گیا تھا۔ابن الاثیر x1، ص 74۔کے مطابق علاءالدین کے ہاتھوں غزنی کی بربادی 547ھ میں سنجر سے شکست کھانے کے بعد عمل میں آئی۔جو قرین قیاس نہیں ہے۔وہ آگے لکھتا ہے کہ علاءالدین نے اپنے بھائی سیف الدین کو غزنی کے تخت پر بٹھایا جسے بعد کو بہرام نے قتل کردیا اور اس نے ایک بار پھر شہر کو برباد کرنے کی غرض سے فوج کشی کی۔لیکن اس دوران بہرام وفات پاچکا تھا اور اس کا وارث خسرو پنجاب فرار ہوچکا تھا۔گزیدہ اس کی تائید کرتا ہے۔لیکن وہ خسرو اور اس کے بیٹے خسرو ملک جو آخری غزنوی حکمراں تھا فرق نہیں کرپاتا تھا۔منہاج کے بیان کے مطابق خسرو غز کی آمد آمد سے گھبرا کر غزنی سے فرار ہوا۔جو دس سال تک اس پر قابض رہا۔

ریورٹی نے 552ھ/1157ء اور 555ھ/1160ء بالترتیب خسرو اور اس کے بیٹے خسرو ملک کی تاریخ ہائے جلوس قرار دی ہیں: ح، س 114۔

نوٹ:۔ یہ تاریخیں تفصیل سکہ' نامی مخطوطے میں ان حکمرانوں کے ممکنہ سکوں کے بیان سے لی گئی ہیں۔ بہرکیف ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں یہ بیانات مشتبہ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہو چکا ہے کہ یہ مخطوطہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں مرتب کیا گیا تھا۔

24- ابن الاثیر ' xi '، ص ص 66 اور 74۔ راوندی ص۔ 176 ذ اور گزیدہ ' i '، ص۔ 460 یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ علاءالدین نے ہرات کے گورنر علی چھتری سے معاہدہ کیا تھا جو سنجر کا باغی تھا اور جسے علاءالدین کی شکست کے وقت سزائے موت دی جا چکی تھی۔ اس واقعہ کی طرف ایک گنجلک اشارے کے لیے ملاحظہ ہو منہاج ، ص۔ 237۔

25- صفحات بالا میں ص۔ 22 ۔اس واقعہ کے چشم دید بیان کے لیے نظامی عروضی کو بھی دیکھیے: چہار مقالہ ص۔ 29۔

26- منہاج ص۔ 62، ص۔ ذ۔

27- تاہم ابن الاثیر ' xi '، ص 121 گزیدہ ' i '، ص۔ 408 اور بیضاوی، 86 بی ، اس واقعہ کی تاریخ بالترتیب 551ھ/1156ء اور 558ھ/1163ء بیان کی ہے۔ ریورٹی دیکھو حوالہ ص۔363 نوٹ بھی گزیدہ کی تائید کرتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ نظامی عروضی نے 'چہار مقالہ' کو جس کی تکمیل براؤن کے مطابق 1156ء-1157ء میں ہوئی علاءالدین کے نام معنون کیا تھا۔ جن کو یا حیات بتایا گیا ہے۔ ابن الاثیر کی تاریخ کو صحیح سمجھنا چاہیئے براؤن: ترجمہ چہار مقالہ' ص۔ 71۔

28- ابن الاثیر: ' xi '، ص۔ 126۔

29- ایضاً ص۔ 131۔

30- فصیحی بحوالہ ریورٹی ح۔ س، ص۔ 374، نوٹ 3 ذ منہاج ، ص۔ 71

31- ایضاً ص۔ 131 ص۔ ذ

ریورٹی، دیکھو حوالہ ح۔ س، ص۔ 192۔ منہاج ، ص۔ 73 ذ ابن الاثیر: ' xi '

ص۔ 77۔

33۔ جوینی، ii، ص ص 7 تا 19 ؛ ریورٹی، دیکھو حوالہ ح۔س۔ ص ص 345 اور 378۔

34۔ ابن الاثیر : ix، ص۔ 169 ؛ جوینی، ii، ص۔ 19 صفحہ ذیل۔

35۔ بارٹولڈ، ترکستان ص۔ 340 جوینی، ii، ص 22 نے مزید بیان کیا ہے کہ اس نے سلطان کے خلاف غوریوں سے مدد کی درخواست کی تھی جو بیکار گئی۔

36۔ جوینی، ii، ص 24۔ 25۔

37۔ منہاج، ص۔ 73۔ 74۔

38۔ بارٹولڈ، ترکستان، ص۔ 340۔ 352۔

39۔ منہاج ؛ ص 329۔ ریورٹی دیکھو حوالہ ح ، س، ص ص 243۔245 اور 382۔

40۔ ابن الاثیر : xii، ص۔ 28 جوینی، ii، ص 28 اس کے بعد ہونے والے کچھ واقعات کی تاریخ 586ھ/1190ء بیان منہاج، ص۔ 74 ان کی تاریخ 588ھ/1192ء بناتا ہے۔ لیکن اس سال معیزالدین کی اس جنگ میں شرکت بعید از قیاس ہے کیوں کہ وہ اِن دنوں پرتھوی راج کے خلاف دوسری مہم کی تیاریوں میں مشغول تھا۔

41۔ ابن الاثیر، xii، ص۔ 64 بھی ذکر کرتا ہے کہ 594 میں تاکش (TAKASH) نے ہرات کا محاصرہ کیا جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ شہر اس کی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔ منہاج، ص 329 بھی دیکھیے۔

42۔ جوینی : ii، ص۔ 30۔

43۔ بارٹولڈ، ترکستان، ص۔ 341 طغرل کی اتابکوں سے کشمکش کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، راوندی، ص ص 347۔435 ؛ ابن الاثیر ؛ ii ؛ ص ص 50۔44 ؛ i، ص ص 475۔ 476۔

44۔ طغرل کے خلاف اتابک کی امداد کے لیے خلیفہ ناصرالدین اللہ نے اناج کے خط کے ہمراہ ایک ایسے ہی دعوت نامہ میں تاکش کو اس جھگڑے میں مداخلت کرنے کی دعوت دی۔ ابن الاثیر، xii، ص 45 ؛ بارٹولڈ، ترکستان و 346 ؛ جوینی، ii، ص۔ 33۔

45 ریورٹی (RAVERTY) دیکھو حوالہ ص 243 - ایسا ہی ایک خط غزنی میں دریافت ہوا 1215ء میں جس میں خلیفہ نے اُسے کافر قراخطائیوں سے تاکش کے خلاف معاہدہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ جوینی، ii، ص 120؛ ابن الاثیر، xii، ص ص 9-518 بھی دیکھیے۔

46- جوینی، ii، ص۔ 49-48۔

47- ابن الاثیر، xii، ص 82-81۔

48- منہاج، ص۔ 75 نے ذکر کیا ہے کہ علاء الدین نے اور تابع داری قبول کرنے کی پیش کش کرتے ہوئے غور سے سمجھوتہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ ابن الاثیر اسی مصنّف کے یہاں سے بھی 598ھ/1201ء میں خوارزم شاہ کی ایسی ہی ایک درخواست کا ذکر کیا ہے۔

49- منہاج ص۔ 77۔

50- جوینی، ii، ص 55۔ گزیدہ، i، ص 411 مزید لکھتا ہے کہ اس نے اپنے تابع دار خان سمرقند کو اس موقع پر اپنی مدد کے لیے طلب کیا۔

51- منہاج، ص۔ 123؛ ابن الاثیر، xii، ص۔ 86۔

52- جوینی، ii، ص۔ 58۔ گزیدہ، i، ص 412۔

53- منہاج، ص۔ 121؛ جوینی، ص۔ 58۔

54- بارتولڈ: ترکستان۔ ص۔ 352۔

55- ابن الاثیر، xii، ص 96۔

56- جوینی، ii، ص 58۔

57- منہاج، ص۔ 123۔

58- اس شاہی خاندان کے کارہائے نمایاں کے لیے مجمدار، ڈی گرجا ایرتی ہارالمپائر۔

59- منہاج، ص۔ 26۔

60- آداب الحرب؛ صفحہ ذیل 76 اے۔

61- راج درشنی انڈیا آفس۔ لندن 507؛ صفحہ ذیل 45 - روایت ہے کہ جموّں کے راجا چکر دیو نے خسرو کے خلاف معزالدین کو مدعو کیا اور اس کی مدد کی۔ حالانکہ

اس بیان کے مصدقہ ہونے میں شبہ ہے۔ پھر بھی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں اسے غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دیکھیے iii ص۔ 39 ریورٹی نے بھی اکثر اس کے حوالے دیئے ہیں۔ گو کہ اس بات کا امکان ہے کہ جمّوں کے حکمراں کی خسرو سے مبینہ دشمنی کا تعلق کسی حد تک 1144ء میں " بالائی وادیٔ سندھ کے ملیچھوں " کے حملے اور جو ناترکشوں کے 1150ء۔ 1155ء کے درمیان ہونے والے حملوں سے بھی رہا ہو جیسا کہ کشمیر کے روزنامچوں کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ دراج ترنگنی' ii ،ص 217۔ پیش لفظ بھی دیکھیے۔ 128' ایچ۔ سی۔ رائے کی ڈینسٹک ہسٹری آف ناردن انڈیا (DYNASTIC HISTORY OF NARTHERN INDIA) 'i' ص ص۔ 172-173! میں نقل کی ہوئی دوتیّہ راج ترنگنی۔

62- انڈین اینٹی کیوری (INDIAN ANTIQUERY) XLi ص 17- 18! لوڈ بھی دیکھیے ٹرانزیکشنز آف رائل۔ ایشیاٹک سوسائٹی (TRANSACTIORIS OF ROYAL ASIATIC SOCIETY) ص 135۔ تھومس : کرونکلز (CHRONICLES ص 82 ، V ، ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل - 60 - ص۔

63- ریورٹی دیکھو حوالہ ص۔ 252 : نوٹ - 8 میں شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آیا لفظ فرشور جیسا کہ منہاج نے ص 116 پر لکھا ہے واقعی پشاور کے لیے استعمال ہوا ہے جو اس کے مطابق زمانے میں باگرام (BAGRAM) کہلاتا تھا۔ ابن الاثیر ' ix ' ص ص۔ 75-76 اس کے لیے فرشاور نام استعمال کرکے اس شبہے کو دور کر دیا ہے جو ریورٹی کے بقول پشاور رہی تھا۔ دوسرے موقع پر منہاج بھی اسی اصطلاح کا استعمال کرتا ہے : ص - 9-

64- منہاج ص۔ 117 ؛ دی راج درشنی (THE RAJ DARSHANI) صفحہ ذیل 45 بی بیان کرتا ہے اصل میں کھوکھر ریاست جمّوں کی رعیت تھے لیکن انھوں نے محصول ادا کرنا بند کرکے خسرو کے حلیف ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے راجا نے معیز الدین کو بلایا اور اسی کی رائے کے مطابق سیالکوٹ میں محافظ فوج تعینات کی گئی۔

65- منہاج نے اس واقعہ کی تین تاریخیں دی ہیں، ص 27 پر 598 ؛ ص 118 پر

587 ؛ اور ص 74 پر 588۔

66۔ تاریخ مبارک شاہی ص۔ 6 ؛ فرشتہ ص 56 ؛ طبقات اکبری، i ، ص 37۔ معیز الدین اور اُچھ کے راجا بھٹی کی ملکہ کی سفارش کا واقعہ سب سے پہلے ابن الاثیر نے بیان کیا ہے ملکہ نے اپنی بیٹی کی شادی غوری سردار سے کرنے کے لیے اپنے شوہر کو زہر دے کر قلعہ پر قبضہ ہو جانے دیا، xi ، ص۔ 77۔ لیکن مصنف نے خود۔ ص۔ 79 پر تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان کے متعلق اس کے بیانات غیر مصدقہ افواہوں پر مبنی ہیں۔ پھر بھی ان خام بیانات کو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا' iii ' ص۔ 38 پر غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اُچھ پر مسلمانوں کے اوّلین قبضہ کے یکسر روایتی بیان کے لیے دیکھیے امپیریل گزیٹر آف انڈیا' xxiv ' ص۔ 82۔

67۔ دیکھیے ٹوڈ: "انیلز (ANNABS) " ii ' ص۔ 1190۔ 1205 جہاں بارہویں صدی کے آخر میں بھٹیوں کی پنجاب سے جیسلمیر تک بڑھنے کا بیان ہے۔ جیسلمیر کے بانی جیال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لودوروا (LODORRVA) پر قبضہ کرنے کے لیے اس نے غور کے بادشاہ سے مدد حاصل کی تھی۔ قدیم دار السلطنت لودوروا جیسلمیر سے دس میل دور شمال مغرب میں واقع ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے شاہ غور کا اقتدار قبول کر لیا تھا۔ جس کی فوجیں سندھ کے نشیبی علاقے میں واقع بھکر (BHAKAR) کے لیے روانہ ہوئیں۔ ہوسکتا ہے اس کہانی میں اصل واقعات کی طرف مبہم اشارے ہوں لیکن اس سے ابن الاثیر کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ارسکن (ERSKINE) بھی دیکھیے۔ راجپوتانہ گزیٹر ص۔ 11۔

68۔ منہاج۔ ص۔ 127 نے ملتان اور اُچھ کے قرامتہ کے خلاف جہاد کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی۔ ص۔ 6 ، 5 بھی دیکھیے فرشتہ i ، ص۔ 56۔ نے اس واقعہ کی تاریخ 572ھ/1176ء لکھی ہے۔

69۔ کتاب الراہلہ (KITAB-UR-REHLA) ' ii '۔ ص۔ 5۔

70۔ ایڈیشنل مینوسکرپٹ ان دی برٹش میوزیم۔ لندن 21589 صفحہ ذیل 663 بی۔

71۔ فرشتہ ii ، ص 314 ، تاریخ طاہری، صفحہ ذیل 14 بی ؛ آئین اکبری جیرٹ اور بلاک مین (JERRET AND BLOCKMAN) ' ii ' ص 341 ' 345۔

72- ایلیٹ، i، ص 448-449 ؛ ڈانلر، iii، ص ص 1281-1283 اور 1299-

73- تاریخ معصومی، صفحہ ذیل 51-اے۔

74- دیکھو حوالہ صفحہ ذیل 12 اے۔

75- دیکھو حوالہ صفحہ ذیل 263 بی۔

76- ایلیٹ، i، ص 191 -

77- بحوالہ ریورٹی دیکھو حوالہ، ص۔ 614 ؛ نوٹ: منہاج، ص۔ 173 -

78- 'ii'، ص - 147 -

79- منہاج۔ ص۔ 117 -

80- سمرس (SUMARS) کے تنقیدی بیان کے لیے ملاحظہ ہو ریاض الاسلام دی سُمرس آف سندھ (THE SUMRAS OF SINDH) اسلامک کلچر 1948-1949-

81- اوجھا: راجپوتانہ۔ ص۔ 196 اور 217 -

82- ایضاً۔ ص۔ 199۔ جورنل آف دی امریکن اورینٹل سوسائٹی 32۔ 33 -

83- اوجھا دیکھو حوالہ۔ ص۔ 208۔ رے (RY) دیکھو حوالہ، ii، ص۔ 1182۔ کے مطابق باگر کو موجودہ دنگا پور کی ریاست سے شناخت کرنا چاہیے۔

84- اوجھا: دیکھو حوالہ۔ ص۔ 216 -

85- ایضاً۔ ص۔ 217 -

86- رے (RAY): دیکھو حوالہ۔ ص۔، ii، 971 -

87- شاہا جاپالا کا وکرمی سمبت 1202ء مطابق 1145ء کا کتبہ ؛ رپورٹس آف آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا۔ ص۔ 102۔ 103-

88- ارسکن: راجپوتانہ گزیٹر۔ ص 236 - 237 ؛ اپگرافیا انڈیکا، x، ص۔ 82-

89- اوجھا: دیکھو حوالہ۔ ص۔ 218 -

90- ناگری پرچارنی پتریکا، i، ص 399 ؛ اودے پور میں پائے گئے کتبوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمار پال نے میواڑ بھی فتح کیا تھا۔ اپگرافیا انڈیکا، ii، ص 421-

91- اپگرافیا انڈیکا، VIII، ص 216 ؛ انڈین اینٹی کیوری، iii، ص۔ 100 - 102-

92- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1836، ص۔ 378- 379 ؛ اوجھا:

دیکھو حوالہ ص۔ 200۔

93۔ ویانا اورنٹیل جرنل (VIENNA ORIENTAL JOURNAL) xxi ؛ چیروا کا کتبہ؛
انڈین اینٹی کیوری ، 1928 ۔ ص۔ 32۔

94۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، 1886 ص ، 41 - 43 ؛ اوجھا
دیکھو حوالہ ، ص۔ 234 ۔

95۔ انڈین اینٹی کیوری ، 1890 ص ۔215- 217۔

96۔ پروسیڈنگ آف میڈیول انڈیا (COINS OF MEDIEVAL INDIA) ص 83 ؛
جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، 1886ء ، ص۔ 5 ؛ انڈین اینٹی
کیوری ،1930 ۔ ص ص 6 - 9 ۔ اسمتھ : ارلی ہسٹری آف انڈیا ص۔ 402 ،
نوٹ ، 2 ۔ جس نے بیلڈ میں شامل صریحی ناممکنات کی تشریح کرنے کی کوشش کی
اے ڈفنس آف راسو (A DIFENCE OF THE RASO) ، انڈین ہسٹریکل کوارٹرلی
1940ء میں موجود ہے ، ص ص 738- 749۔

97۔ کننگھم : رپورٹس ، xxi ص۔ 173- 174 ، شال پور ، ریاست جے پور کے دوسرے
کتبے میں اس کے نام کا ذکر ہے ۔ جس کی تاریخ 1244 وکرمی سمبت مطابق
1187ء ہے ۔ ایضاً ، vi ۔ص ۔ 156 ۔ اودے پور میں ایک دوسرا کتبہ پایا گیا ہے
جس کا ذکر ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل ، v ۔ص ۔ 108 بھی دیکھئے ۔ رپورٹس
آف دی آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا ۔ ویسٹرن سرکل ، 1906ء ص۔ 62 ان
واقعات کا ذکر پرتھوی راج وجے کاویہ میں نہیں ہے ۔ دیکھئے جرنل آف رائل
ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن ، 1913 ص ۔26 ، انڈین اینٹی کیوری 1879ء ،
ص ۔25 ؛ اوجھا ۔ دیکھو حوالہ ، ص ۔ 277- 278 ۔

99۔ منہاج : ص ۔ 118۔

100۔ اس کے قدیم ترین دستیاب کتبہ کی تاریخ 1148 وکرمی سمبت مطابق 1090ء
ہے ۔ ایگرافیا انڈیکا ، xi ص 304۔ اس کے تخت حاصل کرنے اور فتوحات کا بیان
گوند چند کے کتبے میں ہے ؛ انڈین اینٹی کیوری ، 1858 ص 102- 103۔

101۔ اسمتھ ؛ دیکھو حوالہ ص ۔ 405۔

102- رے (RAY)؛ ڈائنسٹک ہسٹری (DYNASTIC HISTORY)، i، ص 504 -
ii، ص - 779 -

103- گوالیار کے قلعے کے روایتی بیان کے لیے ہیرامن منشی کا گوالیار نامہ دیکھیے کننگھم رپورٹس، ii، ص - 312 - 316 بھی دیکھیے۔ اوجھا کے بیان کے مطابق: ٹوڈس انلز (ہندی ترجمہ) ص 373۔ وہاں کچھواہوں نے 1155ء تک حکومت کی۔ رے (RAY) : ڈائنسٹک ہسٹری (DYNASTIC HISTORY)، ii، ص - 825-826 بھی دیکھیے۔

104- ایپگرافیا انڈیکا، x، ص - 304؛ انڈین اینٹی کیوری، xvii، ص - 102-103-

105- ایپگرافیا انڈیکا، xviii، ص - 193 -

106- ایپگرافیا انڈیکا، i، ص ص 195 - 207؛ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، xvii؛ ص ص 317 - 320 -

107- انڈین اینٹی کیوری، 1908، ص - 143 - 144 -

108- ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس کرن کی دی ہوئی جاگیر کو برقرار رکھا، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال xxxi ص - 123-124-

109- ایپگرافیا انڈیکا، x، ص ص 52 - 54 -

110- ایضاً، iii، ص 151 - 152 -

111- کننگھم: رپورٹس، xxi، ص 104، 146 - 148؛ م - بہ - انڈین اینٹی کیوری میں اسمتھ، 1908ء، ص - 124، نوٹ 35 کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ کتبہ میں مذکور ترلوکیہ ورما چندیلہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

112- انڈین اینٹی کیوری، xvii، ص - 228 ایک کلاچری شہزادے کے کچھ سکوں کے لیے دیکھیے، انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی، 1927، ص - 175 کہا جاتا ہے کہ یہ شہزادہ مدھیہ پردیش میں رتن پور پر 1250ء سے 1193ء تک حکمراں رہا۔

113- انڈین اینٹی کیوری 1909 - 1910 ص 44 -

114- انڈین اینٹی کیوری، v، ص 113 - 155؛ vii ص 98 -

115- جرنل آف دی امریکن اورینٹل سوسائٹی، vi، ص 547، 1169ء میں دی گئی ایک ہبہ نامے میں ایک جاگیری حکمراں جاپلا کے مہاراننگا پرتاپ دھولا کا ذکر

ہے۔ ایگرافیا انڈیکا، v، کیل ہارن (KIELHORN) کی فہرست میں نمبر 153 دیکھیے۔

116- انڈین اینٹی کیوری، vii، ص۔ 61 کیل ہارن (KIELHORN) نے مدن پال کے کتبہ کی تاریخ 1276 وکرمی سمبت مطابق 1219ء پڑھی لیکن بعد کو اس غلطی کو درست کیا گیا اور صحیح تاریخ کا پتہ چلا جو 1176 وک سمبت مطابق 1119ء نکلی۔ انڈین اینٹی کیوری، xxiv، ص۔ 176، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1892 کا زائد شمارہ، ص۔ 58 بھی دیکھیے۔ بدایوں کے کتبہ میں مذکور لکھمن پال اسی خاندانی سلسلے سے تعلق رکھتا ہے جس سے کہ مدن پال۔ ای۔ آئی، i، ص۔ 62۔

61- فن کتب خوانی کی بنیاد پر دوسرا کتبہ بارھویں صدی عیسوی کے اواخر کا بتایا جاتا ہے۔ قنوج کے گڑھوالوں سے ہے۔ راشٹر کوٹ خاندان کے تعلقات کے لیے ریو (REU) کی ہسٹری آف دی راٹھورس (HISTORY OF THE ROTHORS) ص۔ 16 بھی دیکھیے۔

118- ایگرافیا انڈیکا، ii، ص۔ 355-356۔

119- اس خاندان کے ابھی تک دو تاریخی دستاویز پائے گئے ہیں۔ حالانکہ ان پر تاریخ نہیں ہے پھر بھی یہ بارھویں صدی کے بتائے جاتے ہیں۔ ایگرافیا انڈیکا، xii، ص۔ 37-43۔ منجدار: انسکرپشن آف بنگال (INSCRIPTION OF BENGAL)، iii، ص۔ 25-41۔

120- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1914، ص۔ 97؛ رے (RAY): ڈائنسٹک ہسٹری (DYNASTIC HISTORY)، i، ص۔ 320-21، 342-3 اور 359؛ جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹل لیٹرز، xxii، ص 14 پر سرکار (SARKAR): ارلی ہسٹری آف بنگال بھی دیکھیے۔

123- اس اصلاح سے مراد یا تو وہ برہمن ہے جو چھتریہ کا پیشہ اپنا لیتے ہیں۔ یا پھر وہ چھتری ہیں جو برہمنوں میں شادی کرتے تھے۔ اس پر سیر حاصل بحث کے لیے دیکھیے ڈھاکا یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال، i، ص۔ 205-209۔

124- رے (RAY): ڈائنسٹک ہسٹری (DYNASTIC HISTORY)، i، ص۔ 354-57۔

125- سینوں (SENAS) کے تاریخ وار سلسلہ واقعات کے بارے میں بڑا اختلاف

رائے ہے مکمل بحث کے لیے دیکھیے ڈھاکا یونیورسٹی آف بنگال، i، ص-230-

230-اس مسئلہ پر مکمل فہرست کتب دیکھیئے رے (RAY)؛ ڈائنسٹک ہسٹری 'i' ص 353-354-

126-اپگرافیا انڈیکا، xv، ص ص-278-286-

127-جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1900، ص ص-66-73-

128-ولبھاچاریہ کے کتبہ پر 1107 ساکہ مطابق 1184-1185ء کی تاریخ ہے۔ اپگرافیا انڈیکا، v، ص ص (88-181) ویدیہ دیوا (VAIDYA DEVA) اور ولبھاچاریہ کے مابین تعلقات کی نوعیت واضح نہیں ہے۔

129-جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1915، ص-408-409 نانیہ دیو اور اس کے گرھ والوں اور سین خاندان سے تعلقات کے لیے دیکھیے رادھاکرشن چودھری؛ دی کارناٹس آف متھلا ان انلز آف بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (THE KARNATAS OF MITHILA IN THE ANNALS OF BHANDARKAR ORIENTAL RESEARCH INSTITUTE) xxxv - 92-98-

130-ایک کتبہ جس پر اس کے انیسویں سال کی تاریخ ہے لکھی سرائے ضلع منگیر کے قریب پایا گیا؛ کنگھم؛ رپورٹس، iii، ص-125-

131-کہا جاتا ہے کہ لکھمن سین نے پوری بنارس اور الہ آباد میں فتح کے مینار تعمیر کیے۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1914، ص ص 97-104؛ رے (RAY)؛ ڈائنسٹک ہسٹری، i، ص-368-

132-کنگھم؛ رپورٹس، iii، 125-اس کا دوسرا کتبہ مورخہ 1178ء قریب ہی پایا گیا۔ ایضاً، xv، ص، 155۔ ان تاریخوں کی مختلف تشریحات کے لیے دیکھیے میموائرس آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال شمارہ 5، ص ص 108-112 میں بنرجی: اے ہسٹری آف دی پالا دائنسٹی۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (نیا سلسلہ) ix، ص 278 اور بنرجی؛ بنگلا اتہاس (BANGLA ITIHASA) 'i' ص ص-348-351-

133-کنگھم؛ رپورٹس، iii، ایلیٹ، xiv، شمارہ 33۔ جرنل آف دی بہار اینڈ اڑیسہ

ریسرچ سوسائٹی۔ 1918 ص۔ 496۔ آخری پالہ بادشاہ کے حالات کے لیے
دیکھیے کننگھم (CUNNINGHAM) : رپورٹس (REPORTS) iii، ص 159 ؛
مارٹن بھی ملاحظہ ہو۔ ایسٹرن انڈیا (EASTERN INDIA) ii، ص۔ 23۔
اس بادشاہ کے متعلق روایات ہے کہ وہ اُن مسلمان فوجوں کے ڈر سے جن کی
قیادت مخدوم نام کے ایک بزرگ کر رہے تھے۔ بھاگ کر جے نگر کے قلعہ میں قلعہ
بند ہو گیا۔ یہ بزرگ لکھی سرائے کے نزدیک کاجول (KAJOL) میں دفن ہیں۔

تیسرا باب

ابتدائی فتح

گذشتہ باب میں اُس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے جس میں پنجاب اور سندھ کا الحاق بڑھتی ہوئی سلطنت غوریہ سے ہو جاتا ہے۔ ان ممالک کے لیے مسلم حکومت نئی نہ تھی۔ اس کی حیثیت سلسلہ سلاطین کی تبدیلی سے بس کچھ ہی زیادہ تھی اور حملہ آوروں کا مقابلہ سماجی مذہبی جنگ کا رنگ کبھی اختیار نہ کر سکا۔ اس قسم کا تصادم اُن علاقوں میں ہونا ضروری تھا۔ جہاں ہندو سلطنت کی اٹوٹ روایت تھی۔ اور یہیں مسلم ترکوں کو مخالفین سے حقیقی اور پیہم مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ نہ صرف ایک غیر ملکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ ایک ایسے مذہب کے پیرو کار تھے جس کا ہندوستان کے رائج مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندو مذہب میں جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ یہ ماضی میں بیشمار قوموں کو اپنے اندر سمو چکا ہے۔ جن کی انفرادیت ہندوستانی سماج اور تہذیب کے گل بوٹوں میں کھو چکی ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ ایسا نہیں ہے انھوں نے بڑے عزم اور استقلال سے اپنی انفرادیت قائم رکھی اور مذہب کے معاملے میں سمجھوتے سے انکار کیا۔ اور اپنی تاریخ میں پہلی بار ہندوستان کو ایک مختلف کلچر رکھنے والی قوم کو تسلیم کرنا پڑا۔

اس سے پہلے کہ ہم شمالی ہندوستان کی سلطنتوں کی ابتدائی فتح بیان کریں یہ مناسب ہوگا کہ ہم حملہ کے جغرافیہ پر بحث کر لیں۔ ہندوستان نمایاں موسمی تبدیلیوں اور جغرافیائی تضاد کی سرزمین ہے۔ سرحد پر قدرتی حد بندیوں کے نہ ہونے کے

باوجود ایک حملہ آور کو بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے بڑھنا ہوتا ہے۔ وادیٔ سندھ کا علاقہ تو اپنے آپ میں ایک دنیا ہے۔ مشرق اور جنوب کے مقابلے میں اس کو مغرب اور شمال سے زیادہ مماثلت ہے مشرق کا بھیانک ریگستان ایک ایسے غیر مہمان نواز علاقہ تک پہنچا دیتا ہے۔ جہاں پہاڑ، جھلسی ہوئی زمین اور بے رحم سورج کی وجہ سے مسلسل جدوجہد کا صلہ محض زندہ رہنے کی شکل میں ملتا ہے۔ راجپوتانہ کی سنگ لاخ زمین نے اپنے باشندوں کو بے چین سپاہی بنا دیا ہے پھر بھی سلسلۂ اراولی کے پار، وسطی راجپوتانہ سے محض دو سو میل دور کی زمین کاشتکاروں کے لیے جنت ہے۔ وادی گنگا زمین کی ایک پٹی ہے جو چوڑائی میں تین سو میل سے زیادہ نہ ہوگی اس کے ایک طرف مہیب ہمالیہ کی حاشیہ بندی اور دونوں طرف وسطی ہندوستان کی بیابانی۔ سارے شمالی ہندوستان میں سب زیادہ گنجان آبادی کے علاقے کو سہارا دینے کے وسائل اس علاقے میں موجود ہیں۔ وادیٔ نیل کی طرح یہ علاقہ بھی بہت ابتدائی زمانے سے مہذب زندگی کا گہوارہ رہا ہے۔ فطرت کی کرم فرمائی نے انسان کو مادی ضروریات کے لیے جدوجہد کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کی علاحدگی کو مکمّل کرنے کی خاطر وادی میں داخل ہونے کے لیے قدرت نے ایک تنگ راستہ فراہم کیا ہے جس کی حفاظت کوئی مشکل کام نہیں۔ پنجاب کو وادی گنگا سے جدا کرنے والے میدانی خطے کے اس پار کوہ "اراولی" جنوب مغرب سے اور سوالک شمال مشرق سے ایک دوسرے کے نزدیک آتے ہوئے ایک مختصر لیکن مناسب راستہ چھوڑتے ہیں جو چوڑائی میں ایک سو میل سے زیادہ نہیں۔

مغرب کی طرف سے وادی گنگا یا مسلمانوں کے دیئے ہوئے نام کے مطابق — "ہندوستان" فوجیں پہنچانے کا واحد تنگ راستہ ہو سکتا تھا۔ گویا قدرت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ وادی کے اندر لڑی جانے والی جنگوں میں نہیں ہوگا بلکہ ان میدانوں میں ہوگا جو "ستلج" سے "جمنا" تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ ایک دفعہ حملہ آور کے پیر گنگا کے میدانی علاقے میں جم جائیں تو پھر مدافعت لازمی طور پر دشوار ہو جاتی ہے حملہ آور کا اس وقت تک آگے بڑھنا آسان ہوگا جب تک وہ دریا کے مشرقی موڑ تک نہیں پہنچ جاتا۔ جہاں اس قسم کا

ایک اور راستہ ملتا ہے جسے "وندھیا" اور 'ترائی' کے شمالی پہاڑی سلسلوں نے تنگ بنادیا ہے۔ دریا کے شمال میں یہ وہ مقام ہے جہاں مختلف پہاڑی جھرنے اور تیز بہنے والے وسیع دریا میدانوں کو منقطع کرتے ہیں۔ جنوب میں دریا پر جھکے ہوئے پہاڑوں کے تنگ لگر متقابلتاً ایک آسان راستہ فراہم کرتے ہیں جو دریاؤں کے ایک اور زرخیز حصّے میں لے جاتا ہے۔ بنگال کو دفاع کے قدرتی وسائل حیرت انگیز حد تک ملے ہیں اس کی آب وہوا، دلدلی زمین اور موسمی سیلاب لانے والے بے شمار دریا شمال سے آنے والوں کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ مغرب کی طرف پہاڑوں کی ایک تقریباً اٹوٹ زنجیر ہے۔ ناقابل گزر جنگلات کافی دور سمندر تک چلے گئے ہیں۔ مشرق کی طرف اس قسم کی ایک اور رکاوٹ ہے جہاں صرف برہمپترا کی گذر ہے جو ایک اور تنگ وادی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ بھی اتنی ہی زرخیز ہے لیکن اس کی ناہموار زمین، سیلابی دھارے اور نم ہوا مغرب سے آنے والے حملہ آور کے لیے موت کا ایک جال ہے۔

شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کو مجبوراً ان ہی دریائی راستوں کے ساتھ ساتھ جانا پڑا کیوں کہ اپنی روندی ہوئی زمین پر بود وباش اشد ضروری تھی۔ جغرافیائی علامتوں کو نہ سمجھنا تباہی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس سلسلے میں معزالدین کی ہندوستان پر حملہ کرنے کی ابتدائی کوششیں اچھی مثال پیش کرتی ہیں۔ لیکن یہاں پر افغانستان سے آنے والے راستے پر ایک نظر ڈالنا برمحل ہوگا۔ اس زمانے میں کوہ سلیمان کے اس پار سے نکلنے والا عام راستہ نہ مشہور "درۂ خیبر" تھا اور نہ جنوب کا درّہ "بولان"۔ بلکہ یہ راستہ دراصل 'گومل' کی طرف ڈیرا اسمٰعیل خاں سے ہوتا ہوا اگر دو آب کے بالائی حصّے تک پہنچتا تھا۔ 'درۂ خیبر'۔ بولان اور بدقت رسائی والے خرّم اور توچی کی گھاٹیوں کو تجارتی قافلے درہ گومال کے مقابلے میں بہت کم استعمال کرتے تھے۔ 'گومال' فوجی نقل وحرکت کے لیے عام راستہ تھا۔[1]

اس حقیقت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تیرھویں صدی کے دوران کوہ 'سلیمان' کے پار سے آنے والے تمام حملہ آوروں کا فوجی نشانہ 'ملتان' یا اچھ ہوا کرتا تھا نہ کہ لاہور، پیشاور یا غزنی سے پنجاب تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ درۂ 'خرم'، توچی

اور "گومال" سے تھا۔ "درہ خیبر" کا راستہ شمال کی طرف سے ملبا اور پر پیچ ہونے کے علاوہ سیاسی طور پر غیر محفوظ بھی تھا۔ شمال سندھ کے ساگر دوآب میں رہنے والے قبیلے عادتاً معاند تھے۔

اسی لیے معزالدین ہندوستان کی پہلی مہم میں بالائی سندھ تک پہنچ سکا۔ ملتان اور اس کی سلطنتوں کو آسانی سے مغلوب کرنے کا ذکر پچھلے باب میں کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری مہم دیرانا لیکن غلط مشورے پر مبنی تھی۔ پھر بھی یہ مہم مغربی راجپوتوں کی طرف سے اندر گھسنے کی ابتدائی کوششوں کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس علاقے میں گذشتہ پچاس سال سے ترکوں کا دباؤ راجپوتوں کو مصروف رکھے ہوئے تھا۔ نادول کے چوہان حکمراں، چاچی گدا یوا (CHACHI GADEVA) کے 1262ء کے ایک کتبہ میں ترشکا (TURUSHKA) فوج کی شکست اور تباہی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شکست اس کے ایک بزرگ "اناہیل دیوا" (ANAHILLADEVA) نے دی تھی۔ جو گجرات کے بھیم اوّل کا ہمعصر تھا۔[2] اس کے بیٹے "کلہانا" (KALHANA) جس کے کتبوں کی تاریخ 1161ء سے 1169ء تک ہے۔ اس نے بھی ترشکا فوج کو تباہ کیا۔[3] "طبقات ناصری" کے مطابق غالباً انھیں میں سے کسی ایک مہم کا نتیجہ ناگور (ریاست مارواڑ) پر قبضے کی صورت میں نکلا تھا۔ یہ قبضہ پنجاب میں بہرام کے گورنر بہلیم (BAHLIM) نے کیا تھا۔ ان کی سب کی تقدیر میں ناکامی لکھی تھی لیکن ایسا کرنے میں یہ لوگ فوجی اندازوں میں جغرافیائی اہمیت کو سرفہرست لے آئے۔

ان مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے معزالدین اپنی فوجوں کو گجرات کی "چالوکیہ" ریاست کے مقابل لے آیا۔ گجرات ایک ایسا صوبہ ہے جو وسائل کے اعتبار سے مالا مال ہے اور جس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا کہ وہ سمندر ساحل سے ہندوستان میں داخل ہونے والے دروازے کی کنجی ہے اس علاقے کو بہرصورت مغربی راجپوت ریاستوں پر ایک مؤثر برتری حاصل تھی اور اسی لیے غزنویوں کو مغلوب کرنے اور ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے راستہ کھولنے کے منصوبے میں یہ ایک رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ 1178ء میں "ملتان" اور اچھ سے گذرتے ہوئے وہ راجپوتانہ کے صحرا میں پھنس گیا۔ جب اس کی تھکی ہاری فوج کوہ ابو کے دامن پر پہنچی تو اس نے

مولاراجہ (MULARAJA) دوم کی تازہ دم فوج کو اپنا راستہ روکنے کے لیے منتظر پایا۔ معزالدین کی مرضی کے خلاف یہ لڑائی کیا درہ (KAYADRA) [5] گاؤں کے پاس لڑی گئی۔ اسی لیے اسے عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی وہ خوش قسمت تھا جو اپنی شکست خوردہ فوج کو لے کر بچ نکلا۔

یہ شکست نہ صرف اس کی فوج کی تھی بلکہ اس کے منصوبوں کی ناکامی بھی تھی۔ اب اس کے لیے ہندوستان پہنچنے کا صرف ایک ہی عملی راستہ تھا یعنی غزنوی پنجاب کا الحاق اب سیاسی سے زیادہ فوجی ضرورت بن گیا تھا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اگلے دو سال تک وہ خسرو ملک کی سلطنت سے ثابت قدمی کے ساتھ بتدریج پیش قدمی کرتا رہا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ پشاور پر 1179ء میں قبضہ کر لیا گیا تھا۔ سیالکوٹ 1185ء میں اور تین حملوں کے بعد بالآخر 1186ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا گیا۔ تین سال گزرنے کے بعد اس نے اصل ہندوستان کی طرف فوجی نقل و حرکت شروع کی۔

اس جگہ مناسب ہوگا کہ ہم اس سمت میں کی جانے والی پہلی کوششوں پر ایک نظر ڈال لیں کیوں کہ ترائن کے میدانی علاقوں پر معزالدین کی فتح، جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے نہ تو اس کی علیحدہ سی ایک انفرادی فتح تھی اور نہ ہی یہ کوئی اتفاقی حادثہ تھا اس فتح کا سبب دراصل ایک طرف تو اولوالعزم فاتح کے سوچے سمجھے منصوبوں پر عمل درآمد تھا اور دوسری طرف یہ پوری بارھویں صدی کے طرزِ عمل کی تکمیل۔ ہندوستان میں پیر جمانے کے لیے شمال مغرب سے ترکوں کے تمام حملے دراصل ترائن کی تمہید تھے۔ ان کوششوں میں سب سے کامیاب کوشش معزالدین کی تھی۔ اس طرح شناسا بانی فاتح نے نادانستہ طور پر ایک ایسی صدی کے تمہیدی اور فوجی منصوبوں کا جس کا وہ خود بانی نہیں تھا۔ کامیابی سے خاتمہ کر دیا۔ محمود کی نمایاں مہموں نے ایک راستہ دکھایا تھا۔ اور پنجاب کے غزنوی گورنر حالانکہ ایک تیزی سے روبہ زوال سلطنت کے خدمت گزار تھے۔ پھر بھی وادیٔ گنگا کی ہندو ریاستوں پر ایک دباؤ قائم کیے ہوئے تھے۔ بائے حقی (BAIHAQI) [6] کے مطابق احمد نیالتیگین (AHMAD NIYALTIGIN) ہندوستان میں ایک مہم

کی قیادت کرتے ہوئے بنارس تک گھس آیا تھا حقی نے ہانسی پر قبضے کو مسعود سے منسوب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم نے غیر مسلموں کے[9] خلاف کیے جانے والے معرکوں کی قیادت کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 1086ء اور 1090ء کے درمیان اس کے لڑکے محمود نے جو پنجاب کا گورنر بھی تھا قنوج اور کالنجر میں لوٹ مار کی اور اجین[10] پر حملہ کیا۔ گیارھویں صدی میں ان حملوں کا مجموعی تاثر بہت زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ترکی خطرے کی اہمیت کو راجپوت راجاؤں نے محسوس کر لیا تھا۔ گہاداوالا (GAHADAVALA) کے بادشاہ گوبند چندر کے فرمان میں بھی ترشکا ڈنڈ (TURUSHKA DANDA) کے نام کے لگان کے ذکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے[11] (یہ لگان غالباً ترکوں سے چھٹکارا پانے یا ان سے لڑنے کے اخراجات وصول کرنے کے سلسلے میں جمع کیا جاتا تھا۔)

فرمان کی زبان سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ لگان ان دنوں عام تھا۔ آنے والی صدی میں ان حملوں کی کمیت اور کیفیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ گوبند چندر را کے 1109ء کے فرمان میں اس نے اپنے باپ مدن پال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انھوں نے اپنی بے مثال لڑائی سے ہمیرا (HAMMIRA) کو اپنی عداوت ترک کرنے پر مجبور کر دیا تھا[11]" بدایوں کے جاگیردار راجکمار لکھن پال کے ایک کتبے میں اس کے دادا مدن پال کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔ "ان کی غیر معمولی جوانمردی کی وجہ سے دیوتاؤں کے دریا کے کنارے تک ہمیرا کے آنے کا ذکر بھی نہیں ہوتا تھا[12]" گوبند چندر را کی رانی اپنے شوہر کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے کہتی ہے۔ "وارانسی کو بدمعاش ترشکا سپاہی سے بچانے کے لیے ہر (بھگوان) نے میرے پتی کو بھیجا ہے کیوں کہ وہی ایسا شخص ہے جو اس دھرتی کی حفاظت کر سکتا ہے[13]" اس جگہ بنارس کا ذکر حاجب تغاتگین (HAJIB TUGHTIGIN) کی مہم سے تعلق ظاہر کرتا ہے۔ حاجب تغاتگین مسعود سوم کے ماتحت پنجاب کا گورنر تھا اور کہتے ہیں کہ وہ گنگا کے پار ایسے علاقے میں آگیا تھا جہاں اس سے پہلے سوائے محمود اول کے دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکا تھا[14] وجے چندر رانے (1150ء - 1170ء) بھی دعویٰ کیا ہے۔ کہ "ہمیرا کی بیویوں کی آنکھوں سے پھوٹنے والے پانی کے چشمے جو دنیا پر بے پناہ تباہی

کا مسکن تھے، اس نے ختم کر کے دنیا کو قہر سے پاک کر دیا ہے،، بعد میں لکھی جانے والی سنسکرت کتابوں میں غور بادشاہ کو مغلوب کرنے کا سہرا گہاداوالا کے آخری بادشاہ وجے چندرا کے سر ہی باندھا گیا ہے[16]

اس سے پہلے کہ ہم آخری مقابلے کا ذکر کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی یورش کا کچھ ذکر کر دیا جائے۔ چوہانوں پر اس کا سب سے زیادہ دباؤ پڑنا ضروری تھا جن کی سلطنت اجمیر سے دہلی تک پھیلی ہوئی تھی اور جو ایک لحاظ سے ہندوستان میں داخل ہونے والے راستے کے نگہبان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سانبھر کے دُرلاوا دوم (DURLAVA II) کی موت بھی ترکوں سے لڑی جانے والی ایک جنگ میں ہوئی تھی۔ مسلمان حملہ آوروں کو متعدد بار شکست دینے کا سہرا اجے دیو کے سر جاتا ہے[17] ارنوراجا کے زمانہ کو حکومت میں ترک لشکر کو تباہ کر کے اناساگر تک پہنچ گئے۔ بعد ازاں وگ راہا راجا چہارم (VIGRAHA RAJA IV) کے زمانۂ حکومت میں یہ لوگ بلبیرا (BALBERA) (جو اب کشن گڑھ کے روپ نگر کے نام سے جانا جاتا ہے) تک پہنچ گئے تھے[18]۔ اسی بادشاہ کا ایک کتبہ دہلی کے ایک مینار پر موجود ہے جس کی تاریخ 1162ء/1220ء وکرمی سمبت ہے کتبے میں اس بادشاہ کی وندھیا اور ہمالیہ کے درمیان کی فتوحات کے علاوہ ملیچھوں کے خاتمہ اور ملک کو پھر ایک دفعہ آریاؤں کے سپرد کرنے کا ذکر ملتا ہے[19] اس نے اپنی آنے والی نسلوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ ان گندے حملہ آوروں کے خلاف جنگ جاری رکھیں ترکوں کی خطرناک پیش قدمی کا ایک قطعی ثبوت پرتھوی راج اول کے ایک کتبے میں ملتا ہے جس میں دنیا کے لیے ایک خطرہ بن جانے والے ہمیرا کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے سرحد پر واقع ،، ہانسی،، شہر کو دفاعی طور پر مضبوط بنانے کا ذکر ہے[20] اسی کتبے میں تیج پور کی تباہی کا بھی ذکر ملتا ہے جو غالباً دریائے ستلج کے پرانے ساحل پر واقع پنج پٹن (پاک پٹن) کے مماثل ہے[21]۔ ہانسی کے ساتھ پاک پٹن کے تذکرے سے وہ علاقے مراد ہوتا ہے جہاں سے ترکی حملے ہوا کرتے تھے۔ ہانسی کے استحکام سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے کے اہم شہروں پر قبضہ کر کے ان کو دفاعی طور پر بہتر بنانے کی پالیسی پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔ ایسا کوئی کتبہ موجود

نہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ بعد میں چوہانوں نے اس پالیسی کو کیسے جاری رکھا۔ لیکن چند برسوں کے بعد جیسا کہ مسلم حوالوں سے پتہ چلتا ہے ہانسی سے تقریباً سو میل دور "بھٹنڈا"، چوہان کا مضبوط مورچہ بن چکا تھا۔ شاید اسی لیے معزالدین نے ہندوستان[22] پر جب حملے شروع کیے تو ۱۱۹۱ء / 587ھ اس کو بری طرح گھیر لیا تھا۔

یہ غالباً اچانک حملہ تھا شائد اسی لیے بہت جلد محافظ فوج مقابلہ نہ کر سکی اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تاہم معزالدین اس آسان فتح کے بعد اس بات کے لیے تیار نہیں تھا کہ فوری طور پر چوہان کے علاقے میں پیش قدمی کرے۔ آگے بڑھنے کے بجائے اس نے تلک (TULAK) کے ضیا الدین کو بارہ ہزار فوج دے کر اس علاقے کو اگلے سال اپنی واپسی تک قبضے میں رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنی واپسی کا سفر شروع کرے پرتھوی راج بنفس نفیس اس فوجی قلعے کو واپس لینے کے لیے پہنچ گیا۔[23] فرشتہ کے مطابق اس کی فوج دو لاکھ گھڑ سواروں اور تیس ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔"[24]

معزالدین مقابلے کے لیے پلٹ پڑا لیکن قلعے سے تھوڑی دور "ترائن" کے گاؤں میں مقابلہ کرتے ہوئے شدید طور پر زخمی ہونے کے بعد اسے ایک فیصلہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا۔[25] ایک خلجی گھڑ سوار نے اس کی جان بچانے میں مدد کی اور وہ اپنی باقی ماندہ فوج لے کر کسی نہ کسی طرح غزنی پہنچ گیا تھا۔ پرتھوی راج نے فوراً قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ضیاءالدین کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے میں تیرہ[13] مہینے لگ گئے۔ "فرشتہ" کی تحریر کے مطابق لڑائی میں شکست کی اصل وجہ افغان، خلجی اور خراسان افسروں کی غفلت اور بے توجہی تھی جن کو معزالدین نے غزنی میں کافی ذلیل کیا تھا۔ اگلے سال حملہ کرنے کے لیے وہ پھر واپس لوٹا۔ اس بار اس کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی تھے جن کا ترائن کے میدان میں ایک دفعہ پھر چوہان کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔

ظاہر ہے کہ وہ اس بار بہت محتاط تھا۔ اپنی تیاریوں کے سلسلے میں غالباً کچھ مہلت حاصل کرنے کے خیال سے اس نے "قوام الملک رکن الدین حمزہ" کو لاہور سے پرتھوی راج کے پاس بھیجا تاکہ اطاعت کا مطالبہ کرے۔[26] غالباً اس بات کی پہلے سے امید تھی کہ جواب سرکشی اور تحقیر کی صورت میں ملے گا۔ ایک بہت مستند حوالے کے مطابق[27] "پرتھوی راج کی فوج جب میدان میں اتری تو اس کے پاس تین لاکھ

آدمی تھے۔ معزالدین نے اپنی فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جن میں سے چار حصوں نے دشمن کی فوج کو ہر طرف سے لڑائی میں الجھا دیا اور دن ڈوبتے اس کی فوج کے پانچویں ڈویژن نے تھکے ہوئے دشمن پر حملہ کر کے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔[28] کھنڈی رائے (گوبند رائے) جس نے پہلی جنگ میں معزالدین کو زخمی کیا تھا مارا گیا۔ پرتھوی راج بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے 'سرسوتی' کے مقام پر گرفتار ہوا۔[29] حسن نظامی کے بیان کے مطابق اس کو اجمیر لے جایا گیا جہاں کچھ عرصے بعد غداری کے جرم میں سزائے موت دے دی گئی۔[30] پرتھوی راج کے کچھ سکوں کے شبیہ والے حصے پر سنسکرت میں ہمیر الکھا ہوا دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ابتدائی طور پر معزالدین کی فرماں روائی کو تسلیم کر لیا تھا۔[31]

اس فتح کی خاص بات یہ تھی کہ اس نے ساری چوہان سلطنت کو معزالدین کے قدموں پر ڈال دیا۔ ہانسی، کہرام اور سرسوتی جیسی فوجی اہمیت رکھنے والی عام جگہوں پر فوری طور پر قبضہ کر کے فوج کو حفاظت کے لیے متعین کر دیا گیا۔[32] لیکن انتظامیہ کو چونکہ اتنی جلدی ہاتھ میں لینا مناسب نہیں تھا اس لیے پرتھوی راج کے بیٹے کو تابعدار بنا کر اجمیر سپرد کر دیا گیا۔[33] یہی پالیسی دہلی کے لیے بھی اختیار کی گئی۔ جہاں کھنڈی رائے کے جانشین نے معزالدین کی سپہ سالاری کو تسلیم کر لیا۔ دہلی کے قریب اندرپت، پر قطب الدین ایبک کی سپہ سالاری میں ایک فوج تعینات کر دی گئی۔ یہ وہی قطب الدین ایبک ہے جسے بعد میں ہندوستان کے نمائندے کا رول ادا کرنا پڑا تھا۔[34]

فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے بعد مفتوحہ علاقے کو مستحکم کرنے کے لیے ایبک کو وسیع اختیارات دے کر فاتح معزالدین اپنے وسط ایشیائی منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے واپس لوٹا لیکن فوراً ہی پرتھوی راج کے حمائیتیوں نے سر اٹھایا جس کے مقابلے کے لیے ایبک کو فوری طور پر اپنی توجہ مرکوز کرنا پڑی۔ رمضان 588ھ/ 1192ء ایک ہندو سردار نے جسے نظامی نے جٹوان (JATWAN) کہا ہے 'ہانسی' میں مسلمانوں کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ (جٹوان غالباً کسی جاٹ قبیلے کا سردار تھا جو روایتی طور پر اس علاقے کے مالک سمجھے جاتے تھے۔) ایبک فوراً

امداد کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے محاصرہ توڑ کر 'باگڑ' تک جیٹواں کا پیچھا کیا۔ اس مقام پر پہنچ کر جیٹواں پلٹ پڑا اور ایک دفعہ پھر رن میں کود پڑا۔ لڑائی میں اس کو شکست ہوئی اور مارا گیا۔[35] اسی سال کے آخر میں ہانسی کو مستحکم بنا کر ایبک نے جمنا پار بالائی دوآب میں ایک فوجی اڈہ قائم کرنے کی کوشش کی۔[36] اس علاقے کا بیشتر حصہ گہادوالاس کے تحت ڈور راجپوتوں کے پاس تھا جن کا مضبوط حصہ 'بارن' میں تھا اور جو دریا کے دوسری طرف قائم ہونے والی مسلمان حکومت کی طرف کچھ زیادہ امن پسندانہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔[37] ان کی روایتی تاریخ میں اس گھمسان لڑائی پر کافی زور دیا گیا ہے جو چندرسینا کی قیادت میں ترکوں کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اس بات کی جزوی تصدیق ایک دستاویز میں ملتی ہے، جو معزالدین محمدؒ بن نام کا فرمان معلوم ہوتی ہے اور اس میں چندرسینا کے ایک رشتے دار اجے پال کو بارن پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں امداد دینے پر انعام دیئے جانے کا ذکر ہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ غدّاری نے اس واقعہ کو سرعت بخشی تھی۔[38] اس موقع پر میرٹھ پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ پھر ان دونوں جگہوں کو اور مضبوط و مستحکم کر کے "گہادوالا" ریاستوں پر شمال کی طرف سے حملہ کرنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔[39]

اس کے بعد ایبک نے ایک مرکزی اور مستقل فوجی مرکز بنانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ اندرپیٹ کا پڑاؤ ایک عارضی مسکن تھا جہاں سے سیاسی مرکز کی بڑھتی ہوئی ضروریات اطمینان بخش طور پر پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔ اجمیر دراصل راجپوتانہ کے اندرونی حصے میں واقع ہونے کی وجہ سے ایک ایسی ترکی فوج کا مرکز بننے کے لیے مناسب نہیں تھا۔ جس کا مقصد ہندوستان کی طرف بڑھنا ہو، اس کے بدلے دہلی زیادہ موزوں تھا۔ اس کا محل وقوع اور تاریخی روایات مرکز کی تمام ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ تمارا کے بادشاہ کے جارحانہ منصوبوں کے بروقت انکشاف نے جواز بھی فراہم کر دیا۔ چنانچہ 589ھ/ 1193ء کی ابتدا میں ایبک نے اپنی فوجوں کا رخ شہر کی طرف موڑ دیا۔ قبضہ کی کارروائی نسبتاً آسانی سے مکمل ہو گئی۔ راجکمار کو اپنے آدمیوں کو لے جانے کی اجازت بھی دے دی گئی اور اس طرح دہلی معزالدین کا دارالخلافہ بن گیا۔[40]

لیکن بہت جلد ایبک کو پھر میدان میں اترنا پڑا۔ سابق بادشاہ چوہان کے بھائی 'ہری' راجا نے راجپوت فوج جمع کر کے 'رنتھمبور' کا محاصرہ کر لیا۔ جہاں اسی سال ایبک نے قوم الملک کی قیادت میں محافظ دستہ بنایا تھا۔ چوہان نے باجگذار راجکمار کو بھی نکال دیا اور اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ ایبک کے پہنچنے پر وہ لوگ دونوں جگہوں سے دستبردار ہو گئے اور شہزادے کو پھر تخت نشینی کا موقعہ دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہری راجہ کا مؤثر طریقے پر پیچھا کیا جاتا مسلم جنرل کو بغاوت کی ایک اور خبر سن کر واپس لوٹنا پڑا۔ یہ بغاوت دہلی کے بے دخل بادشاہ کی قیادت میں ہوئی تھی۔ پھر بھی اس بغاوت کو بڑی آسانی سے کچل دیا گیا[42] حسن نظامی کی روایت کے مطابق ہری راجہ ابھی تک آزاد تھا[43] کہ ایبک کو غزنی میں مقیم اس کے آقا نے طلب کیا۔ ایبک غزنی میں تقریباً چھ ماہ تک مقیم رہا۔ اس کے وہاں کے قیام کے وجود کہیں مکمل طور پر بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ ایبک کی غیر موجودگی میں ترکی محافظ دستے نے ہری راجا اور اس کی طرح دوسرے سرداروں کے حملوں کا کس طرح مقابلہ کیا اس کا ذکر کہیں روزناموں میں نہیں ملتا۔ 'ڈور' راجپوت غالباً ایک ایسا اہم خطرہ بن گئے تھے جس کا مقابلہ کرنا ضروری ہو گیا۔ 590ھ/ 1194ء میں واپسی کے فوراً بعد کہا جاتا ہے کہ ایبک نے دوسری دفعہ جمنا پار کر کے 'کول' علی گڑھ پر قبضہ کر لیا[44]

وہ ابھی دوآب ہی میں تھا کہ معزالدین نے ایک دفعہ پھر اپنی فوجوں کا رخ ہندوستان کی طرف موڑ دیا۔ بالائی دوآب میں 'ڈوروں' کے خلاف کاروائی کرنے کا واضح مقصد بالآخر گہادوالاسلطنت پر فتح حاصل کرنے کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا۔ کیوں کہ مطلوبہ ہندوستان اس علاقے میں واقع تھا۔ ایبک غالباً جنگ کے منصوبوں کی ترتیب میں مدد دینے کے لیے غزنی گیا تھا جن کی تکمیل کے لیے اس کا آقا بنفسِ نفیس آیا تھا۔ دہلی میں مقیم فوجوں کی شمولیت کے بعد معزالدین نے بنارس کی طرف حملہ کرنے والی فوج کی قیادت سنبھالی، جو پچاس ہزار گھڑسوار پر مشتمل تھی[45] جے چندر کی حفاظتی فوج ایبک کے ہراول دستوں سے ابتدائی مقابلے میں ہار گئی[46] بالآخر دونوں فوجوں کا مقابلہ 'قنوج' 'ایٹہ' کے درمیان

چاندور کے ارد گرد ہوا گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ گہادوالا، جن کی قیادت خود جے چندرا کر رہا تھا تقریباً پالا مارے گیا تھا کہ اس کی موت نے فوج میں انتشار پھیلا دیا۔ اس تبدیلی کا بڑی تیزی سے فائدہ اٹھا کر معزالدین نے اس انتشار کو بھگدڑ سے بدل دیا۔
اس فتح نے ایک اور عظیم الشان سلطنت کا اضافہ کیا جو مونگھیر سے کرشنسا بانی مملکت تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو ایک فوجی ڈیویژن بنا کر ملک حسام الدین اتملک کو اس کا پہلا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ بنارس، اسنی اور دوسرے شہروں پر جن کے خزانوں کی خبریں مشہور تھیں حفاظتی دستے تعینات کر دیئے گئے۔ ان جگہوں کو قنوج جیسے مرکزی شہر پر فوقیت دی گئی تھی جس کو 9-1198ء/595ھ تک قبضے میں نہیں لیا گیا تھا۔ تاہم گہادوالا فرمان روائی ملک میں پھر بھی زندہ رہی۔ 1199ء کا ایک حکم نامہ مچھلی شہر میں دستیاب ہوا ہے جسے جے چندر کے بیٹے ہریش چندر[49] نے جاری کیا تھا اور جس سے ہریش چندر کے آزاد فرمار وا ہونے کا پتہ چلتا ہے ضلع مرزا پور سے دستیاب ہونے والے رن کا وجیا کرن؛ کے کتبے میں گہادوالا سلطنت کا اس طرح ذکر ملتا ہے جیسے وہ ہنوز قائم ہو۔ تاہم اس میں فرمار وائے وقت کا نام غائب ہے جو غالباً اس وقت کی سیاسی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے[50] یہاں تک کہ قنوج بھی واپس لے لیا گیا ہوگا تاکہ اس کے بعد التمش اس کو پھر فتح کرے[51]
معزالدین کی واپسی کے بعد ایبک کول کے محافظ کی امداد کے لیے لوٹ پڑا۔ جس پر غالباً ڈورا راجپوتوں کا کافی دباؤ پڑ رہا تھا۔ جب وہ 1195ء/591ھ میں دہلی واپس پہنچا تو اسے اجمیر کے نیئے ہنگامے کی اطلاع ملی۔ ہری راجا نے ایک دفعہ پھر اپنے بھتیجے کو نکال دیا تھا۔ اور یہ اطلاع ملی کہ وہ جھٹ رائے کی قیادت میں ایک فوج دہلی پر حملے کے لیے بھیج رہا ہے اپنی فوج کے ایک حصے کو دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر ایبک جھٹ رائے کے مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ جھٹ رائے کو مجبوراً اجمیر میں پناہ لینا پڑی۔ محاصرہ بہت سخت تھا اور جب اس کے لیے زیادہ دنوں تک قدم جمانا ممکن نہیں رہا تو ہری راجا اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ چتا پر قربان ہو گیا۔ ایبک اجمیر میں داخل ہوا۔ لیکن چوں کہ پرتھوی راج کا لڑکا بحیثیت تابعدار کے ایک ذمہ داری بن چکا تھا، ایبک نے براہ راست الحاق کا فیصلہ کیا

اور پہلی بار ایک مسلمان افسر کو تعینات کر دیا۔ تاہم شہزادے کو ہر جانے کے طور پر رنتھمبور بخش دیا گیا جو بعد میں چوہان فرماں روائی میں دوبارہ جان ڈالنے کا مرکز بن گیا۔[52]

اگلے سال 6-1195ء/592ھ میں پھر معزالدین ہندوستان واپس آیا۔ اور اس نے جاڈون بھٹی راجپوتوں (JADON BHUTTI RAJPUTS) کے دارالسلطنت "دبیانا" کا رُخ کیا۔ راجا کمار پال نے سامنے آکر مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو پڑوسی علاقے تھینگر (تہان گڑھ) میں محصور کر لیا۔[53] تاہم ایک موثر محاصرے نے اسے قلعے کو چھوڑنے اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح تھان گیر (THANGIR) اور مستحکم وجے مندر گڑھ (VIJAY MANDIR GARH) پر قبضہ کیا گیا اور بہاءالدین طغرل کی زیر نگرانی محافظ فوج کے سپرد کر دیا گیا۔ بعد میں بہاءالدین نے ایک فوجی اڈا تیار کیا جس کا نام تھا سلطان کوٹ اور جس کا مقصد میدانی علاقوں میں کی جانے والی کاروائیوں کے لیے بنیاد قائم کرنا تھا۔

معزالدین کی توجہ کا مرکز گوالیار کا وہ قلعہ بن گیا جو حسن نظامی کی روایت کے مطابق پری ہار فرماں روا خاندان کے راجکمار سلکھشن پال کے قبضے میں تھا۔ پہاڑی قلعے نے محاصرہ کا جم کر مقابلہ کیا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ مقابلہ غیر معین مدت تک جاری رکھا جا سکتا ہے۔ سلکھشن پال عملی سوجھ بوجھ رکھنے والا ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ اس نے معزالدین کی فرماں روائی تسلیم کرنے کا جب پیغام بھیجا تو معزالدین نے بڑی خوشی سے محاصرہ اٹھا لیا۔ دشمن کا کسی مضبوط قلعے پر قبضہ رہنے دینا فوجی اعتبار سے مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے مستقبل میں کسی نامناسب موقعہ پر اُسے ختم کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کام کے لیے طغرل کو منتخب کیا گیا۔ روزنامچوں میں لکھے ہوئے واقعات کے مطابق طغرل نے خبر رساں کے وہ تمام ذرائع تباہ کر دیئے جو گوالیار کو میدانی علاقوں سے ملاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیڑھ سال کے اندر راجپوتوں کی حیثیت ناقابلِ مدافعت ہو گئی۔ انھوں نے قلعے کو خالی کر دینے کی پیش کش کی اور اس طرح ایبک نے اپنے آقا کے نام پر اُسے اپنے قبضے میں لے لیا۔[54]

1196ء/592ھ کے اختتام پر ایبک کو ایک بار پھر راجپوتوں کی دھمکی کا سامنا

کرنا پڑا جو اس دفعہ بہت زیادہ خطرناک تھی۔ اجمیر کے گرد و نواح میں بسنے والے مہیر (MHER) قبیلے نے بے دخل کیے ہوئے چوہانوں سے مل کر چالوکیاؤں سے مسلح امداد طلب کی تاکہ راجپوتانہ سے ترکوں کو باہر نکالا جاسکے۔ اجمیر کا حفاظتی دستہ اتنا طاقتور نہیں تھا کہ مشترکہ فوجوں کا مقابلہ کرسکتا چنانچہ فوراً دہلی سے امداد طلب کی گئی۔ کمان سنبھالتے ہی ایبک نے ان مہیر فوجوں پر حملہ بول دیا جو شہر کے سامنے کھڑی ہوئی چالوکیہ فوج کا انتظار کر رہی تھی۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی کہ چالوکیہ فوجیں پہنچ گئیں اور ایبک کو بھاگ کر اجمیر میں پناہ لینی پڑی۔ جب راجپوتوں نے محاصرے کے دائرے کو چھوٹا کرنا شروع کر دیا تو ایبک نے اپنے آپ بڑی نازک صورت حال میں پایا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس وقت غزنی سے ایک اور امدادی دستہ پہنچ گیا جس کے شہر سے رابطہ قائم ہوتے ہی راجپوت پیچھے ہٹ گئے۔[59]

اگلے سال کے شروع میں ایبک مکارانہ حملے کے انتقام کے سلسلے میں اجمیر سے اپنی فوجوں کو لے کر انہلوارا کی طرف روانہ ہوا۔ راجپوتانہ کے جنوب مغرب سے گزر کر جب وہ اس پہاڑ کے دامن پر پہنچا جہاں معزالدین کو پہلی شکست کھانی پڑی، تو اس نے چالوکیا فوج کو آبو کے دھارا ورشا (DHARA VARSHA) اور ناڈول کے کلہانہ (KELHANA) کی قیادت میں اپنے بالمقابل پایا۔[60] ان لوگوں کی طاقت کا اندازہ لگانے کے بعد ایبک نے حملے کے لیے کھلم کھلا اظہار میں تامل کیا۔ اس ہوشیاری کو خوف سمجھ کر چالوکیہ کھلے میدان میں آنکلے جہاں ترک اپنے گھوڑوں سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ نقل و حرکت، وسائل کی برتری اور منتخب رسالوں کے دھاوے نے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔[61] ایبک نے نمایاں فتح حاصل کر کے دارالخلافہ انہلوارا کے لیے اپنا راستہ کھلا پایا۔ جہاں سے وہاں کا حکمراں بھیم دوم بھاگ چکا تھا۔[62] اس مہم کا مقصد گو کہ تعزیری تھا لیکن غالباً آسانی سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد فاتح کو قبضہ قائم رکھنے کی ترغیب ہوئی۔ فرشتہ کے مطابق شہر زبردست لوٹ مار کا نشانہ بنا اور ملک ایک مسلم حکمراں کے سپرد ہو گیا۔[63] دہلی سے وہاں تک کی جوکھم اور خطروں سے پُر مسافت کی وجہ سے اسے بہرحال ایک مصیبت بننا تھا۔ چنانچہ راجپوتانہ پر نامکمل قبضہ ایک سنگین رکاوٹ بن گیا۔ بہرکیف بہت

جلد یہ فتح باطل بن گئی۔ ہم عصر چالوکیہ تصانیف میں ترکوں کے نکالے جانے کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں ملتا ہے۔ ابن الاثیر کو اطلاع دینے والا بتاتا ہے کہ بالآخر ایبک نے خود ہی ملک کو اس کے ہندو فرمارواؤں کے حوالے کر دیا۔[64] کتبوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ چالوکیہ فرمارواں نے 1240ء تک آبو کو بغیر کسی دخل اندازی کے اپنے قبضے میں رکھ کر اپنی خود مختاری و فرمارروائی کو برقرار رکھا۔[65]

آنے والے چھ برسوں میں ایبک کی فوجی کاروائیوں کی تفصیلات صرف فخر مدبر سے معلوم ہوتی ہیں۔ بالائی گنگا کے اس پار کا ملک جو ابھی تک دوآب میں ترکی حملوں سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ جنوب کے بے شمار گہادوالا مہاجروں کی جائے پناہ تھا۔ بدایوں میں غالباً ابھی تک راشٹر کٹا (RASHTRA KUTTA) سلطنت قائم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایبک نے اسی حصّے کی طرف اپنی فوجوں کا رُخ موڑ دیا تھا۔ کیوں کہ 1197ء/594ھ میں بدایوں پر اور اس کے بعد بنارس پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا۔[66] کہا جاتا ہے کہ اگلے سال 595ھ/9-1198ء چین تروال (چندواڑ) (CHANDWAR) اور قنوج پر قبضہ کر لیا گیا۔ بعد ازاں اس کی فوجی کاروائیاں راجپوتانہ میں ہوئیں جہاں سلطنت "سروہ" (سروہی) (SIROHI) کی تسخیر کے بعد فخر مدبر لکھتا ہے کہ 596ھ/12-1199ء میں "مالوا"[65] فتح کیا گیا۔ تاہم آخر الذکر واقعہ تصدیق طلب ہے۔[67] یہ بعید از قیاس نہیں ہوگا کہ راجپوتانہ پر قبضے کو بڑھانے کی کوشش کی گئی اور اس کاروائی کے نتیجے کے طور پر چوہانوں کو ناڈول سے جنوب کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ بندی، کوٹہ، سروحی کے چوہان فرمارواخاندانوں کی بنیاد کو ہر قیمت پر مسلمانوں کی مداخلت کے اسی دور پر محمول کیا جاتا ہے۔[68] راجپوتانہ میں ایبک کے مقبوضات جیسا کہ اگلے باب میں دیکھا جائے گا۔ پائیدار ثابت ہونے والے نہیں تھے۔

تیرھویں صدی کے آغاز میں ہم ترکی فوجوں کو آخری راجپوت راجاؤں بندیل کھنڈ کے چندیلوں سے دست و پا دیکھتے ہیں۔ ان کی شمالی سرحدیں مسلم سلطنت سے ملحق تھیں۔ بنارس اور اسنی پر قبضہ کی وجہ سے ان کی سلامتی کو خطرہ تھا کیونکہ پڑوسی ملکوں پر ظالمانہ حملے کرنا ترکی فوجوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ مخفی عداوت

کا نتیجہ بالآخر 599ھ/1202ء میں کالنجر پر کیے جانے والے کھلے حملے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ کالنجر پرامری دیوار (PARMARDIDEVA) کا فوجی مرکز تھا۔ چندیلیوں نے میدانِ جنگ میں بڑی بہادری سے مدافعت کی لیکن شکست کھانے پر انھیں قلعے میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ محاصرے کی مدت جیسے جیسے بڑھی اور زیادہ موثر ہوئی پارامردیدیوا نے مذاکرات شروع کر دیئے اور باجگذار طابعدار بننے کی پیش کش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ معاہدوں پر عمل درآمد شروع کرتا اس کا انتقال ہوگیا اور مذاکرات نامکمل رہ گئے۔ اس کے وزیر اعلیٰ اجے دیو نے پیش کش واپس لے لی۔ پہاڑی جھرنوں سے پانی کی فراوانی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے دوبارہ مخاصمانہ رویہ اختیار کیا۔ ترکوں نے اس کی سرکشی کی اسباب معلوم کر کے، پانی کا رُخ موڑ کر اس کو مصالحت کے لیے درخواست کرنے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کو خالی کرنے کی اجازت پانے پر چندیل پڑوس میں اجے گڑھ کے قلعے میں چلے گئے۔ اس طرح کالنجر، مہوبہ اور کھجراہو پر قبضہ کر کے انھیں حسن کرنال کی زیر کمان ایک مشترکہ فوجی دستے میں منسلک کر دیا۔[69]

بنارس اور اودھ دستوں کے سپہ سالار ملک حسام الدین اغلبک کے سپرد ایک خلجی سردار اختیار الدین محمد بختیار[70] کو کر دیا تاکہ وہ آس پاس کے علاقوں میں جاسوسی کر سکے چوں کہ وہ بے ہنگم اور بے ڈول تھا۔ اس نے غزنی اور دہلی[71] دونوں جگہ اُسے ملازمت سے محروم رکھا گیا تھا تاہم اس نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ ایک باہمت اور بیدار مغز آدمی ہے۔ بھبوّلی[72] اور بھگوت گاؤں اس کے سپرد کیے گئے تھے۔ جس کی آمدنی سے اس نے بہت جلد جانباز لوگوں کا ایک گروہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ اس گروہ میں زیادہ تر افغانستان کے مشرقی سرحد پر بسنے والے خلجی قبیلے کے لوگ تھے۔ اس گروہ کی مدد سے اس نے دریائے کرمان کے مشرقی علاقے مگدھ پر حملے شروع کیے جہاں جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے گہاڈوالاؤں کے زوال کے بعد چھوٹی چھوٹی منظم مخالفت کا سامنا ہو سکتا تھا۔ ضلع مانیر پر پیہم حملے کر کے بختیار نے نہ صرف شہرت حاصل کر لی تھی بلکہ اپنی فوجی وسائل کو بڑھانے کے لیے دولت بھی جمع کر لی تھی۔ اس نے اپنی فوجی

کارروائیوں کو اوڈنٹا پور وہار تک بڑھادیا جو راہبانہ یونیورسٹی قصبہ تھا اور اس پاس کے مضافات اسی نام سے مشہور تھے۔[73]

ان حملوں کی کامیابی نے اس کی ہمت بڑھادی تھی چنانچہ بختیار نے اس راہبانہ شہر پر ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے ایبک کی اجازت حاصل کرلی۔[74] منہاج نے بہار کے قلعے حسار اور قلعہ (HISAR AND BOLAH) کا ذکر کیا ہے۔ حالاں کہ یہ بڑی ناقابلِ قیاس بات ہے کہ وہاں کوئی مؤثر فوجی طاقت موجود ہو بہر حال اس جگہ جہاں یونیورسٹی واقع تھی ایسا لگتا ہے کہ کچھ ہتھیار بند لوگوں نے مدافعت کی۔ ان لوگوں کی اکثریت سرمنڈے بدھ راہبوں کی تھی، جن کو مسلمانوں نے غلطی سے برہمن سمجھا۔[75] بہر حال ان لوگوں کو بہت جلد تہہ تیغ کر دیا گیا۔ بختیار نے اپنے دو سو ہتھیار بند جنگجو جوانوں کی مدد سے بڑی آسانی سے شہر پر قبضہ کرلیا اس جگہ کی اصل نوعیت کے بارے میں اسے بہت دیر میں پتہ چلا۔ جب اسے خبر دی گئی کہ وہاں بے شمار کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔[76] پندرھویں صدی کا تبتی سرگذشت نویس ترانا تھ (TARANATH) کہتا ہے کہ بختیار نے اس موقع پر وکرم سلا اور نالندہ کے راہبانہ شہروں پر قبضہ کرلیا اور دندا پور کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کردیا۔[77]

اس واقعہ کا زمانہ "طبقات ناصری" میں نہیں ملتا جو کہ فتح بنگال کے سلسلہ واقعات کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اس کا اندازہ صرف سلسلۂ واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔[78] اس علاقے پر قبضہ کرنے سے ترک سینا (SENA) کی سرحد پر آپہنچے۔ اس موقعہ پر بھی ہم عصر ہندو ماہرین جنگ نے اس کوتاہ اندیشی سے کام لیا جو ان کی سرشت میں داخل تھا۔ انھوں نے نہ تو انھیں بہار سے نکالنے کی کوشش کی اور نہ اپنی سرحدی دفاع کو مستحکم کیا۔ چنانچہ عدم مزاحمت کا رویہ جانباز سردار کے لیے دعوت نامہ بن گیا۔ اُدنداپور پر قبضہ کے بعد بختیار ایبک کے پاس گیا۔ جس نے اسے مزید فتوحات کی ہدایت تو دیں لیکن کوئی ضروری کمک نہیں فراہم کی۔ اس کو جب ایک ایسے امیر ملک کے بارے میں اطلاع ملی جہاں کا نظم ابتر ہوچکا تھا اور جس کی فرماں روائی کی باگ ڈور ایک بیکار خانہ نشین ضعیف

کے ہاتھوں میں تھی اور جو علم وفضل کے مشغلے میں لگا رہتا تھا ـــــ تو اس نے اپنی نئی چال کا فیصلہ کر لیا۔ سلطنت 'سین' پر ایک مکمل اور بھرپور حملہ کرنا اس کے وسائل سے باہر کی بات تھی۔ وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ بادشاہ کے شاہی محل پر اچانک حملہ کر کے 'سین' کا نظام درہم برہم کر دے۔ اس سے نہ صرف اس کو شہرت ملے گی بلکہ ایسے وسائل بھی حاصل ہو جائیں گے جو آگے چل کر بڑے حملے میں کار آمد ثابت ہوں اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ملک میں پیر جمانے کے لیے کوئی محفوظ اڈا بھی مل جائے گا۔

بہار کی کامیابی کے ایک سال بعد 5-1204ء میں بختیار وادیٔ گنگا کے زیریں حصے پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے کمربستہ ہوا۔ دستیاب فوج کو ساتھ لے کر وہ جنوبی بہار کے سنسان اور دقت طلب جھار کھنڈ علاقے سے اس قدر تیزی سے آگے بڑھا کہ اٹھارہ گھوڑسوار بمشکل اس کا ساتھ دے سکے[80] راستے میں کسی کو نقصان نہ پہنچانے کی وجہ سے لوگ غلطی سے اسے گھوڑوں کا سوداگر سمجھ بیٹھے۔ وہ کسی مدافعت کا سامنا کیے بغیر بڑی آسانی سے ناڈیا، منہاج کے مطابق نوڈیا تک پہنچ گیا جو لکشمن سین کی رہائش تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھا تھا کہ دروازے پر ہنگامہ ہوا اور اس "گھوڑوں کے سوداگر" نے محافظوں کو مارنا شروع کیا۔ بادشاہ کو فوراً خطرے کا احساس ہوا اور اس نے بھاگنے کی تیاری شروع کر دی۔ حملہ آور جوں ہی محل میں داخل ہوئے وہ فوراً بغلی دروازے سے باہر نکل کر دریا کے ساتھ ساتھ اپنے مشرقی صوبے کی طرف پناہ لینے کے لیے بھاگا۔ بادشاہ کے فرار نے مسئلہ کو حل کر دیا۔ اس سے پہلے کہ بادشاہ کی فوجیں عالم حیرت سے جاگ کر حملے کی تیاری کرتیں بختیار کی باقی فوج نے پہنچ کر مدافعت کو ناکارہ کر دیا۔[81] بادشاہ کا اتنی آسانی سے فرار ہونا اور شہر پر بے روک ٹوک قبضہ ہونے سے خود بختیار کو سخت تعجب ہوا ہوگا۔ "اٹھارہ گھوڑسواروں کے ہاتھوں ایک عظیم فرماں روائی کی شکست" کی کہانی پر متعدد ہندو عالموں نے شبہ کا اظہار کیا۔[82] منہاج کی صداقت پر انگشت نمائی کرتے ہوئے انھوں نے دلائل کے سہارے ان واقعات کو خرافات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم سین فرمانروائی کی مفروضہ بزدلی پر عذر خواہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ بزدل تھا بھی تو اس کو

بنگالیوں کی خصوصیات سمجھنا تاریخی طور پر غلط ہوگا۔ جلد بازی میں بھاگنے کا عمل یا جسے کم ظرف ناقد شرمناک فرار کہیں گے۔ اس سے بھی زیادہ بڑے لوگوں کے بلکہ مستند سورماؤں کے نصیب میں ہو رہا ہے۔ راجپوتوں کی بے پروائی اور ناعاقبت اندیشی میں رومانیت کا عنصر تو ضرور ہے لیکن عملی سوجھ بوجھ نہیں ملتی۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس پوری کہانی کو اس بنیاد پر غلط ثابت کر دیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر بنرجی نے کہا ہے کہ ہندو حوالوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ لوڈیا یا نوادیپ سین کا دارالسلطنت تھا۔ یا "زرائے لکھمانیہ" لکشمن سینا کا مماثل تھا جو مسٹر بنرجی کے خیال میں بہت پہلے مر چکا تھا۔ ایسا نقطۂ خیال دراصل مثبت تاریخ کی بنیاد منفی دلائل پر رکھنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ سلطنت سین کے ایک حصے پر بختیار کا قبضہ اور اس کا ناڈیا پر حملہ کرنا ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ منہاج کے حوالوں کی مکمل صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا لیکن حالیہ چھان بین اور تحقیقات مسٹر بنرجی کے دلائل کو یقیناً سہارا نہیں دیتیں[83]۔ دوسری طرف اس کہانی میں تھوڑی بہت بعید از قیاس باتیں بھی ملتی ہیں کیوں کہ تمام حوالوں کے مطابق بنگال میں پائیداری اور استحکام کی زیادہ علامتیں موجود نہیں ہیں۔ برہمنوں کا غلبہ منتشر سماج اور پھر ایک فرماں روا جس کی عنفوان شباب کی بہادری اور فوجی طاقت پر مذہب اور شعر و شاعری کے نشے نے غلبہ پا لیا ہو جس کا نظم و نسق اوپر سے بھاری اور نیچے سے کھوکھلا ہو اور جہاں کے باج گذاروں میں اعلان آزادی کی طاقت پیدا ہو گئی ہو[84]۔ وہاں دراصل لکشمن سینا کی سلطنت کچھ بھی ہو سکتی ہے لیکن ایک ایسی طاقت نہیں ہو سکتی جو مقابلے کے لیے صف آرا ہو سکے ترشکا ایک ایسا عفریت بن گیا تھا جو ہر طرف ایک مفلوج کر دینے والا خوف و ہراس پھیلا رہا تھا۔ توہم پرستانہ "پیشن گوئی" کہ "لمبے بازوؤں والا ترشکھا بالآخر سلطنت سین کو تباہ کر دے گا۔ درحقیقت مبالغہ آمیزی تھی۔ خوف زدہ درباریوں کے ساتھ خطرناک علاقے سے بھاگ نکلنے سے بادشاہ کا انکار کر دینا[85] اس بات کی علامت ہے کہ عقلی اور استدلالی ہمت نے مکمل طور پر جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنے والی تباہ کاری کا خطرہ محسوس کر لیا گیا تھا کیوں کہ ایک کتبے کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ

نے چھبیسویں سال میں 1203ء دیوتاؤں کے لیے ایک بہت بڑی قربانی کا انتظام کیا تھا تاکہ وہ اس ناگہانی مصیبت سے چھٹکارا دلانے میں اس کی مدد کریں[86] ترکوں کی پیش قدمی نے اس کے خوف میں اضافہ کر کے اس کی خود اعتمادی کو تباہ کر دیا تھا۔ اسی لیے بھری دوپہر میں حملہ کر کے بختیار کا آسانی سے جنگ جیت لینا کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ بہادری سے کیا جانے والا حملہ اس سے بھی زیادہ باہمت اور تیار فوجوں کو مفلوج کر سکتا ہے۔ یہ حقیقت بھی توجہ طلب ہے کہ شہر ناڈیا پر صرف اسی وقت قبضہ کیا گیا جب اس کی اصلی کمک جائے وقوع پر پہنچ گئی۔

گمان کیا جاتا ہے کہ یہ عارضی نوعیت کا قبضہ تھا۔ کیوں کہ زیریں بنگال میں مستقل قیام کا بختیار کے وسائل پر بہت زیادہ دباؤ ہوگا۔ اڑیسہ کی گنگا فرماں روائی کا شمار بڑی طاقتوں میں ہوتا تھا۔ سین کی فوج ابھی تک صحیح و سالم تھی اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ بغیر کسی لڑائی کے وہ پیچھے ہٹ جائے گی۔ بہار میں اس کے مرکز کے پاس کی کسی جگہ پر قبضہ نہ صرف زیادہ تحفظ کا ضامن ہو سکتا تھا بلکہ اس کی وجہ سے آگے بڑھنے میں بھی آسانی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بختیار نے ناڈیا کو برباد کر دیا اور شمال کی طرف ہٹتے ہوئے اس نے لکھنوتی میں (جس کی بنیاد لکشمن سین نے رکھی تھی یا اسے یہ نام دیا تھا)[87] ڈیرہ ڈالا جو ضلع مالدہ میں موجودہ گور کے مقام کے پاس سینوں کا مغربی مرکز تھا۔ اس کے اندازے صحیح ثابت ہوئے کیوں کہ راڑھ (RARH) کا علاقہ (دریائے بھاگیرتھی کے مغربی اضلاع) اور ناڈیا کا ہندو راج آنے والے پچاس برسوں تک قائم رہا۔ 1205ء میں خود لکشمن سین نے ایسی جگہ سے ایک اعلان نامہ جاری کیا تھا جو ناڈیا سے ملتا جلتا ہوا ہے[88] منہاج کہتا ہے کہ لکھمانیہ اپنے خوف زدہ درباریوں، برہمنوں اور ساہوؤں (SHAHAS) کے ساتھ سنکنات (SANKNAT) کے علاقے اور بانگ اور کمرود کے شہروں میں گوشہ نشین ہو گیا جہاں کچھ ہی دنوں بعد اس کی موت بھی واقع ہو گئی۔ سنکنات غالباً سنکت یا سنکا کوٹ کی بگڑی ہوئی شکل ہے یہ بارھویں صدی میں[89] بانکوں (تاجروں) کا مضبوط گڑھ تھا۔ اور وکرم پور سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ وکرم پور، مشرقی بنگال میں بلال سین (BALLAL SENA) کا دار السلطنت تھا۔ آثارِ قدیمہ کی رو سے یہ بات پایہ ثبوت

تک پہنچ چکی ہے کہ اس مقام پر لکشمن سین کی فرماں روائی آنے والی تین نسلوں تک قائم رہی تھی۔

اس طرح بختیار کا قبضہ شمالی بنگال کے ایک چھوٹے سے علاقے پر رہا۔ بعد میں کی جانے والی شجرۂ نسب کی تحقیقات کے مطابق وہاں سے اس نے لکشمن سین کے بیٹے کو بھگا دیا تھا[90] غور سلاطین کے لیے روایتی عداوت اس کو بھی ورثے میں ملی تھی۔ اڑیسہ کی طرف جنوب مغربی سرحد کی نگرانی کے لیے اس نے لکھنور میں ایک فوجی چوکی قائم کی۔ لکھنور (LAKHNOOR) جو بہار اور اڑیسہ کو ملانے والے رستے پر 'ناگر' ضلع بیربھوم سے بھی پہچانا جاتا ہے[91] شمال مشرق میں بھی اس نے ایک ایسا ہی اڈا، دیوی کوٹ، یا دیوکوٹ پر قائم کیا۔ یہ جگہ شہر دیناج کے جنوب مغرب سے چند میل دور تھی اور مقامی طور پر 'بانگڑھ' کے نام سے مشہور تھی۔ چنانچہ اس طرح متذکرہ علاقہ میں گنگا کے اطراف مالدہ، دیناج پور، مرشد آباد اور بیربھوم کے اضلاع شامل تھے۔ منہاج کی نشاندہی کے مطابق راڑھ اور وارندری (رال اور برند) کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جس کی مغربی سرحد تستا کراتویا (TISTA KARATOYA) وادی کے ساتھ جاتی تھی۔ اول الذکر آج کے مقابلے میں اُس وقت نسبتاً زیادہ مغرب میں بہتا تھا[93] اولوالعزمی نے بختیار کو آرام کرنے کی اجازت نہ دی۔ ناڈیا پر حملے کرنے کے دو سال کے اندر اندر اس نے تیسرے معرکے کی تیاری شروع کر دی اس کی یہ مہم شمال مشرق کی طرف "تبت اور چین" کی تسخیر کے لیے تھی[94] بظاہر یہ ایک جنونی منصوبہ تھا لیکن بنگال میں مسلم حکومت کے بانی کے بارے میں یہ بات غالباً ضرور ماننا چاہیے کہ اس میں صحیح تخمینہ لگانے کی صلاحیت ہوگی۔ غالباً منہاج کا اشارہ اس مہم کے اصل مقصد کی طرف ہے جب وہ ان پینتیس[95] تجارتی راستوں جن پر کرم بٹن، (غالباً بھوٹان میں کُری کوٹھ) اور تبت سے کامروپ اور پھر شمالی بنگال کے اضلاع کے درمیان ٹانگن گھوڑوں کی کافی آمد و رفت ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ بنگال جہاں خاص طور سے گھوڑوں کی کمی تھی بختیار نے معقول طور سے یہ خواہش کی ہوگی کہ وہ اپنے مخصوص نسل کے گھوڑوں کی درآمد کی اجارہ داری حاصل کرے۔ تاہم ایسا کرنے میں وہ اپنی حد سے تجاوز کر گیا۔ اس نے اپنے نائب

محمدؒ شیران کو لکھنور پر سرحد کی نگرانی کے لیے متعین کرتے اور ایک نومسلم کوچ (KOCH) رہبر کی خدمات حاصل کرنے کے بعد وہ دس ہزار گھڑ سواروں کو لے کر نکل کھڑا ہوا۔ منہاج کے حوالے کے مطابق وہ لکھنوتی سے بردھان کوٹ آیا جہاں سے وہ گنگا کے مقابلے میں تین گنا چوڑے دریائے بانگ متی کے کنارے کنارے اس نے شمال کی طرف دس دن تک سفر کیا ہوگا۔ دریا پار کر کے وہ برہم پترا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک ایسے پہاڑی مقام پر پہنچا جہاں دریا پر پتھروں کا ایک پل موجود تھا۔ اس مقام پر اس کا رہبر رخصت ہو گیا۔ اسے کامروپ کے فرماں روا کا پیغام ملا۔ جس میں اس نے اس مہم کو اگلے سال تک ملتوی کرنے کی درخواست کی تھی اور فوجی امداد کا وعدہ کیا تھا۔ اس مشورے پر کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے اس نے پل کی حفاظت کے لیے دو افسروں کے تحت تھوڑی سی فوج چھوڑی اور خود دریا پار کر کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ پہاڑوں کے تنگ راستوں کو پار کرتا ہوا جہاں جوکھم میں ڈالنے والا یہ سفر اور پھر کرم بٹن کے قریب ترین قلعے سے پچاس ہزار ہتھیاروں سے لیس ترکی سپاہیوں کی آمد کی منحوس خبر، اور پرسے مقامی محافظ دستے سے شدید لیکن نامکمل جنگ یہ سب کی سب ایسی باتیں تھیں جن سے اس کے سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور اس نے مجبوراً واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ واپسی میں اسے انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ پہاڑی لوگوں نے آدمیوں اور جانوروں کے کھانے کا سارا سامان تباہ کر دیا تھا۔ یہی نہیں جب وہ پل کے نزدیک پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ کامروپ کی فوجیں پل توڑ چکی ہیں اور حملہ کرنے کی منتظر ہیں۔ اس کے دونوں افسر جن میں آپس میں خود بھی تفرقہ پیدا ہو گیا تھا، بھگا دیئے گئے ہیں۔ اسے مجبوراً رکنا پڑا۔ اس نے ایک قریبی مندر میں عارضی طور پر پناہ لی اور اس اثنا میں لٹھوں کی مدد سے بیڑا بنانے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ اس کی دہشت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ کام روپ کی فوجیں قریبی علاقوں میں چھپی ہوئی اسے بانسوں کے حصار میں پھانسنے کا منصوبہ بنا رہی ہیں۔ بانسوں کا یہ حصار بہت جلد مندر کے چاروں طرف بڑھنا اور بلند ہونا شروع ہو گیا۔ بختیار نے فوری کارروائی کی اور آن کی آن میں اسے توڑ کر بھاگ نکلا۔ لیکن اس کی فوج کو دریا کے کنارے تک ڈھکیل دیا گیا۔ فرار کا جب کوئی راستہ نہ ملا تو دریا کو

پایاب سمجھ کر اس کی ساری فوج پانی میں کود پڑی۔ پانی گہرا تھا اور بہاؤ تیز، نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کا بیشتر حصہ بہہ گیا۔ لیکن بختیار خود کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف سو ساتھی تھے۔[97] اس کی ملاقات پھر اپنے رہبر سے ہوئی جو اسے دیوکوٹ واپس لایا۔ بختیار جیسا شخص اس تباہی کے بوجھ سے دب کر پامال ہو چکا تھا۔

بختیار کی اس مہم کا راستہ اور واقعاتی تفصیلات ایک زمانہ سے نزاعی مسئلہ رہے ہیں۔ حالانکہ بردھان کٹی (بردھان کوٹ) کا نام ابھی تک زندہ ہے[98] لیکن دریائے بانگ متی کا پتہ چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ تاہم برہمپتر میں ملنے والی بارندی کے اوپر بنے ہوئے پتھر کے پل کی شناخت سے کسی حد تک مہم کے راستے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں گوہاٹی کے بالمقابل پائے جانے والے ایک سنسکرت کتبے میں ترشکھا فوجوں کی تاریخ مارچ 1206ء لکھی ہوئی ملی ہے۔ یہ انکشاف اس سوال کو فیصلہ کن طور پر طے کر دیتا ہے۔[99]

دیوکوٹ میں بختیار بہت جلد اپنے دکھوں کا شکار ہو گیا۔ ایک جان لیوا بیماری نے اسے صاحب فراش بنا دیا۔ آخر ایک دن اس کے ایک سردار علی مردان نے بڑی خاموشی سے اس کے بیمار جسم میں چاقو اتار دیا۔ بختیار کی زندگی کے اس عبرت ناک انجام اور تباہی سے ملتا جلتا ایک اور المیہ ترک ریاست کے ایک اور حصے میں ہو رہا تھا۔[100]

وسط ایشیا میں معزالدین کی مہموں کے بیان میں آندھ کھڈ کی شکست کی تلافی کے لیے بنائے جانے والے منصوبوں کا ذکر آیا ہے۔ اس شکست کے فوراً بعد اس کی موت کی خبر پھیل گئی جو اس کی ہندوستانی سلطنت کے مغربی صوبوں میں بسنے والے سرکش قبیلوں کے لیے عام بغاوت کا اشارہ ثابت ہوئی۔ خود اس کا ایک سردار جس کا نام ایبک بک تھا، آندھ کھڈ، کے میدانِ جنگ سے نکل کر ملتان چلا گیا۔ اس نے وہاں کے گورنر کو قتل کر کے اپنی خود مختار حیثیت کا اعلان کر دیا۔[101] اس کی بغاوت کی خبر بہت جلد پھیل گئی۔ اور اس واقعہ کو معزالدین کی موت کا ثبوت سمجھا گیا۔ سالٹ رینج کے ایک سردار رائے سال[102] نے جو اپنا رشتہ "کھوکر" اور دوسرے قبائل سے

جو رہتا تھا۔[103] اس نے نہ صرف چناب اور جہلم کے درمیانی اضلاع میں لوٹ مار شروع کر دی بلکہ لاہور پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔[104] بغاوت کی وجہ سے چوں کہ سڑکوں کا راستہ منقطع ہو گیا تھا۔ اس لیے پنجاب سے مالیہ جمع کر کے غزنی بھیجنے کا سلسلہ بھی رک گیا۔ یہ سرکشی چوں کہ معزالدین کے منصوبوں میں رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی۔ اور مقامی افسران اس کو دبا نہیں سکتے تھے اس لیے معزالدین نے خود مداخلت کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایبک کو جہلم پہ ملنے کا حکم دیا اور خود پنجاب کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں دریا پر باغیوں سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ انتہائی جواں مردی سے لڑنے کے بعد وہ مغلوب کر لیے گئے ان میں سے بہت سے مارے گئے یا گرفتار کر لیے گئے جو سپاہی بچ گئے انھوں نے قریب کے پہاڑی قلعے میں پناہ لی۔ اگلے دن جب ان کو جبراً مطیع بنا لیا گیا تو کچھ لوگ قریبی جنگل میں بھاگ نکلے لیکن جب جنگل میں آگ لگائی گئی تو اُنھیں دردناک موت کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنی واپسی سے پہلے معزالدین اپنے ساتھ ایبک کو لے کر لاہور گیا تاکہ وہاں کے معاملات کو سلجھایا جا سکے۔ ایبک کو دہلی جانے کی اجازت دے کر وہ خود بھی غزنی کے لیے نکل پڑا۔ راستے میں وہ سندھ کے ایک مقام دمیاک پر رکا اور اس نے دریا کے کنارے ایک سرسبز مقام پر خیمے گاڑ دیئے۔ اس مقام پر جب وہ اپنی شام کی نماز کے فرائض ادا کر رہا تھا تو ایک قاتل نے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ قتل کی تاریخ تین شعبان 602 ہجری / 15 مارچ 1206ء بتائی جاتی ہے۔[105] کچھ ہمعصر مصنفین نے قتل کی ذمہ داری 'ملاحدہ' پر رکھی ہے۔ ملاحدہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو نہ صرف قرامیتہ اور اسماعیلی شیعوں کے لیے استعمال ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی غیر مسلموں کے لیے بھی اس اصطلاح کا استعمال کیا جاتا ہے۔[106] کچھ اور لوگوں نے اس سلسلے میں کھوکھروں کا بھی ذکر کیا ہے۔[107] بہرکیف معزالدین سے دونوں کی دشمنی کے اسباب موجود ہیں اور غالباً دونوں نے مل کر اس جرم میں حصّہ لیا ہوگا۔[108]

معزالدین کو اوراق تاریخ میں کون سا مقام ملنا چاہیئے اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ محمود غزنوی کے خلاف وہ ایک عملی سیاست داں تھا۔ ہندوستان کے فرسودہ سیاسی نظام سے اس نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا تھا۔ مغل سلطنت کے

بانی کی طرح اس کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے انتہائی پختہ اور مصمم ارادے سے نکلتا تھا اور شکست کو آخری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ معزالدین کا رقیب خوارزم شاہ[109] اس سے کہیں زیادہ باصلاحیت تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی وسط ایشیائی سلطنت چند روزہ ثابت ہوئی۔ لیکن بابر کی طرح اس کی ہندوستانی فتوحات کا وجود قائم رہا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے پیچھے موروثی سلاطین کا سلسلہ چھوڑنے میں ناکام رہا لیکن اس نے ایک ایسے گروہ کو تربیت دی تھی جو نہ صرف اس کے نصب العین سے وفاداری برتتے تھے بلکہ اس کی سلطنت کو برقرار رکھنے کے لیے موزوں بھی تھے۔ آدمیوں کے انتخاب میں اس کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا کیوں کہ اس کی کامیابی کا سہرا بڑی حد تک ایبک، یلدوز اور طغرل جیسے غلاموں کے سر جاتا ہے۔ جیحون (JAXARES) سے جمنا تک اس کی سالانہ مہمیں۔ اس غیر معمولی فوجی صلاحیتوں کی علمبردار تھیں۔ فوجی کارروائیوں میں اس کی بے پناہ مشغولیت کی وجہ سے غالباً اس کے پاس جمالیاتی تفریحوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ تاہم ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے تعلیم اور علم وفضل سے دلچسپی نہ ہو۔ مشہور فلسفی اور عالم فخرالدین رضی اور مشہور شاعر نظامی عروضی، دربار غور کی زینت تھے۔ اور انھوں نے اپنے دوست اور آقا کی ذہنی صلاحیتوں کو خراج تحسین بھی پیش کیا ہے[110]۔

حوالاجات

1۔ پشاور آنے کے لیے ممکن ہے معزالدین نے ایک دو بار خیبر کا راستہ استعمال کیا ہو۔ لیکن جنوبی راستے زیادہ موزوں تھے۔ غزنی کے حکمراں یالذور کو گرفتار کرنے کے لیے 1215ء میں خوارزم شاہ کی فوجوں نے ہندوستان کے سرحدی راستوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جو گاردیز (GARDAIZ) اور کراہا (KARAHA) دونوں یعنی وادیٔ قرم کی طرف جاتے تھے۔ یلدوز کو قدرے زیادہ جنوب مشرقی راستہ اختیار کرنا پڑا۔ جو "سنگ سرخ" پہاڑیوں سے گزرتا ہے۔ ریورٹی دیکھو حوالہ ص۔ 505 کے مطابق یہ تین یا چار درّوں کا مجموعی نام ہے۔ زمنہاج ص۔ 135 ہندوستان آنے کے لیے معزالدین عام طور پر وہ نشیبی راستہ اختیار کرتا تھا جو "کوہ سفید" کے جنوب میں واقع گاردز اور سالٹ (SALT RENGE) کی درمیانی علاقے سے گزرتا تھا۔ جس کا پرانا نامہ صوبۂ کارمان اور سنکورن تھا؛ منہاج۔ ص۔ 132 ؛ ریورٹی دیکھو حوالہ 498-499۔ ریورٹی بھی دیکھئے؛ نوٹس آن افغانستان۔ ص۔ 84-80۔ غالباً اسی علاقے میں سنگ سرخ کے وہ درّے واقع تھے جن کو یلدوز اور ایبک نے غزنی سے واپسی کے لیے اختیار کیا؛ منہاج۔ 35-194؛ ریورٹی کا نوٹس آن افغانستان (NOTES ON AFGHANISTAN) ص۔ 38-36 بھی دیکھئے؛ ترجمہ طب۔ ناص ص۔ 538۔ نوٹ

2۔ اپگرافیا انڈیکا ، xi ، 62-63 ؛ اوجھا: راجپوتانہ ، i ص۔ 269۔

3۔ اپگرافیا انڈیکا ، ix ص۔ 46-51۔

4۔ ص۔ 24۔

5- منہاج رص۔ 116۔ نے بھیم کا تذکرہ اہتیل وار کے راجہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن کتبے اور دوسری ہندو یادداشتیں اس کو مول راجا دوم کی فتح قرار دیتے ہیں۔ انڈین اینٹی کیوری، 1877، ص۔ 186 اور 198 ز فوربس (FORBAS) بھی ملاحظہ کیجیے: رس مالا تدوین رالنسن (RAWLINSON)، i، 199 ز اوجھا: راجپوتانہ، i، ص 220۔ م۔ بہ۔ رے (RAY): ڈاینسٹک ہسٹری (DYNASTIC HISTORY)، i، ص۔ 1004-1005 ماؤنٹ آبو کے نزدیک کرا ذو میں پائے گئے ایک خستہ کتبے میں جس کی تاریخ 1235 وکرمی سمبت مطابق 1178ء ہے ایک مندر کی مرمت کا ذکر ہے جسے تُرکشا فوج نے توڑ دیا تھا۔ ممکن ہے یہ اشارہ معزالدین کے حملے کی طرف ہو: ایگرافیا انڈیکا، ix، ص۔ 72-

6- تاریخ آل سبکتگین۔ ص۔ 497۔

7- ایضاً ص۔ 665 صفحہ 14 پر منہاج نے لکھا ہے کہ اس نے کئی موقوں پر ہندوستان پر فوج کشی کی ریورٹی: ترجمہ (TAB - NAS) طب۔ ناص ز ص۔ 93 بغیر کسی ماخذ کا حوالہ دیئے لکھتا ہے کہ جون پور میں ظفر آباد کے نزدیک فیروز تغلق نے اس مندر کے کھنڈرات دیکھے جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ اسے مسعود نے برباد کیا تھا۔

8- ریورٹی: دیکھو حوالہ ص۔ 105 ولوٹ۔ 4۔

9 اسلامک کلچر، 1942، ص۔ 422۔ اس امر کے لیے کہ اس موقع پر محمود کے حلیف "چاند رائے" کا ذکر مسلم تذکروں میں قنوج کے راجا کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ وہ گڑھوال خاندان کا چندر دیو تھا جس نے شاید پرمار اور کالاچوری بادشاہوں کے خلاف جو ہنوز طاقت ور تھیں غزنویوں سے مدد چاہی تھی۔ دیکھیے ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل، v، ص۔ 51۔

10- انڈین انٹی کیوری، xiv، ص 113۔

11- ایضاً، 1889، ص ص 14-19۔

12- ایگرافیا انڈیکا، i، ص۔ 62-

13 ایگرافیا انڈیکا، ix، ص ص 234-237-

14- منہاج ص- 22 - اس کا کسی قدر مفصل ذکر اسی دور کے ایک شاعر مسعود سعد بن سلیمان کے دیوان میں ہے۔ ایلیٹ، iv، ص ص- 27-526 -

15- انڈین اینٹی کیوری، xv، ص- 9 -

16- ودیاپتی: پُرش پرکھیا (PURUSHAPARIKSHA) ص 7-146، رمبھا منجری (RAMBHA MANJARI) نام کے ایک ڈرامے میں جے چندر کو تمام "جوانوں" کو برباد کرنے والا بتایا گیا ہے۔

17- اوجھا: راجپوتانہ، i، ص- 266 -

18- انڈین اینٹی کیوری، 1890، ص- 202؛ ساردا (SARDA)، اجمیر، ص- 79 -

19- انڈین اینٹی کیوری، 1890، ص ص- 215-217 -

20- انڈین اینٹی کیوری، xli، ص- 17 تھامس (THOMAS): کرانکلز (CHRONICLES)، ص- 59، نے کسی کلہاں (KELHANA) کے ایک سکے کو نوٹ کیا ہے جس کے دوسری طرف عربی کتبہ میں "ثنا" کندہ ہے۔ جو اس کے خیال کے مطابق صرف مسعود سوم کے سکوں کی خصوصیت ہے۔ اس صورت میں کلہاں یقیناً مسعود کا باجگذار رہا ہوگا جس نے بعد کو باغی ہو کر پاک پٹن سے آنے والے راستے کو مستحکم کر لیا۔

21- یہ کتبہ اس کو گوہیلا خاندان کے کلہان کی طرف منسوب کرتا ہے۔ جو پرتھوی راج کا ماموں تھا۔ یہ یقیناً وہی شخص ہے جس کا ذکر تھامس (THOMAS) کے تلاش کردہ سکے میں ہے۔ اس امر کے لیے کہ کلہان کا وہ دشمن جسے اُس نے اس موقع پر گرفتار کیا تھا غزنوی حکمراں خسرو ملک تھا جو ان دنوں لاہور پر حکومت کر رہا تھا دیکھیے ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیوپل، v، ص- 83 -

22- ایشوری پرشاد: میڈیول انڈیا ص 177 پر رقمطراز ہیں کہ پٹیالہ میں واقع سرہند جو کرنال سے 100 میل شمال مغرب میں ہے سب سے پہلے قبضے میں آیا۔ وہ منہاج کی مطبوعہ متن پر بھروسہ کرتے ہیں جس میں سرہندہ لکھا ہوا تھا اور بعد کی تاریخیں اس سلسلے میں اس کی تائید کرتی ہیں۔

ہراۃ جہاں نما: صفحہ ذیل- 8 - 50 رے اور زبدۃ التواریخ: صفحہ ذیل، 7 بی لیکن فرشتہ اور طبقات اکبری میں ٹھنڈا تحریر ہے؛ تاریخ، i، ص- 5 اور 7؛ طبقات

اکبری ، i ، ص ۔ 37 ۔
ریورٹی ، دیکھو حوالہ ص۔ 457 ، نوٹ ، 3 کا کہنا ہے کہ اس نے جتنے مخطوطوں کا تقابل کیا ہے ان میں تبر ہندہ (TABAR HINDA) تحریر ہے جو تاریخ مبارک شاہی میں بھی۔ ص۔ 7 پر بھی لکھا ہوا ہے ، بدایونی ، i ، ص ۔ 49 اور حاجی دبیر ، ii ، ص۔ 677 ۔ اس نام کی کسی جگہ کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ تیزی سے لکھے گئے فارسی رسم الخط سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص بھی اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ لفظوں کی ذرا سی اُلٹ پھیر اور حروف کو ملانے میں تھوڑی سی لاپرواہی کسی طرح بھٹنڈا کو تبر ہندہ ہی نہیں سرہند بھی بنا سکتی ہے۔ سرہند ذرا بھی قرینِ قیاس نہیں ہے کیوں کہ لاہور سے ہندوستان کا مختصر ترین راستہ مغربی پٹیالہ سے گزرتا ہے جہاں بھٹنڈا واقع ہے کسی ایسے مضبوط قلعے کے باقیات سرہند میں نہیں پائے گئے۔ جو پرتھوی راج کے حملوں کو سال بھر سے زیادہ تک جھیل سکتا۔ اس کے برعکس گیرکس (GARRICKS) نے بھٹنڈا میں ایسے ہی ایک زبردست قلعے کو دیکھا اور ایسی مقامی کہانیاں بھی سنیں جو اس مقام پر معزالدین کے حملے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کننگھم : رپورٹس ، xxiii ، ص 3۔ 2 ۔ ریورٹی کے مطابق دیکھو حوالہ ص۔ 458۔ نوٹ ، لب التواریخ ہند (LUBBUL -TAWARIKH-E- HIND) میں لکھا ہے۔ لیکن ایشوری پرشاد کا اصرار ہے کہ سرہند بھٹنڈا کے نام سے موسوم تھا۔

23۔ منہاج ، ص ۔ 119 ۔

24۔ i ، ص۔ 5 اور 7 ، ابن الاثیر ، ix ، ص۔ 255 ۔

25۔ منہاج ، ص۔ 118 ، فرشتہ ، i ، ص ص۔ 7-5 اور ٹی۔ اے ، i ، ص۔ 37 میں تحریر ہے کہ یہ لڑائی سرسوتی ضلع میں ترائن کے نزدیک ترائن میں ہوئی۔ محل وقوع سے متعلق بحث کر کے دیکھئے اپنڈکس۔ بی۔

26۔ تاج المعاصر ، ص ۔ 118 ، انڈین آفس لنڈن Ms شمارہ نمبر 1486 صفحہ ذیل 36 فرشتہ ، i ، ص۔ 58 سے رجوع کیجئے جس نے صریحاً ابن الاثیر ، ix ، ص۔ 4۔ 43۔ سے یہ قصہ مستعار لیا ہے کہ کس طرح معزالدین نے دھوکے بازی سے پرتھوی راج کو اپنی حفاظت کی طرف سے بے خبر کرنے کی چال چلی جو بہت کامیاب رہی۔

اور جس سے اس نے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ م۔ بہ۔ رے (RAY): ڈائنسٹک ہسٹری (DYNOSTIC HISTORY) ii، ص ص 3: 101-1010 جہاں اسے ریورٹی (RAVERTY) کے تاج المعاصر سے لیے گئے مفروضہ حوالے سے پوری طرح نقل کیا گیا ہے۔ لیکن حسن نظامی نے اس کہانی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے — اور ابن الاثیر کا بیان بلاشک وشبہ قابل گرفت اسناد پر مبنی ہے۔

معز الدین نے کسی انوکھے طریقہ پر ہاتھیوں کی کمی پوری کی جن کی ہندوستانی فوج میں موجودگی سے اس کے گھوڑے بھڑکتے تھے۔ دیکھیے آسامی: فتوح السلاطین ص۔ 72- 71۔ پرتھوی راج۔ وجے کاویہ اور ہمیرہ مہاکاویہ میں اس واقعہ کے حوالے کے لیے دیکھیے ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل، v ص ص۔ 112- 109۔

27- فرشتہ، i ص۔ 58۔

28- اس وقت اپنائی گئی حکمت علمی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 9۔

29- منہاج، ص۔ 120۔

30- تاج المعاصر۔ صفحہ ذیل، 44 بی۔ منہاج کا بیان ہے کہ اس کو فوراً سزائے موت دیدی گئی۔ چاند بردائی کے لایعنی قصہ کے لیے کس طرح پرتھوی راج نے اندھے اور غزنی میں مقید ہونے کے باوجود سزائے موت پانے سے پہلے ہی خود چاند کی مدد سے معز الدین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

31- تھامس (THOMAS): کرانکلس (CHRONICLES) ص۔ 12 شمارہ۔ 15۔ ایک تقریباً ہم عصر سنسکرت تذکرے ورِدھ وِردھی؛ وِدھونس (VIRUDHAVIDHI-VIDHAVANSA-) میں یہ بھی مذکور ہے کہ پرتھوی راج کو اس خیال سے اجمیر لے جایا گیا تھا کہ اسے دوبارہ تخت پر بٹھایا جائے۔ انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی، 1940، ص ص 97 567۔

32- منہاج، ص۔ 120؛ فخر مدبّر۔ ص۔ 22۔

33- حسن نظامی نے اسے کولا یا گولا کہتا ہے (LIT ناجائز بیٹا) اس کا ذکر ہمیرا مہاکاویہ میں نہیں ہے جس میں مذکور ہے کہ اس کے بھائی ہری راجا نے پرتھوی راج کی

آخری رسومات ادا کیں اور پھر تخت پر بیٹھا۔ ویدیا: ڈاؤن فال آف ہندو رول ان انڈیا، iii، ص۔ 339، اس شہزادے کو رائے سنی کہتا ہے۔ جبکہ اوجھا: راجپوتانہ، i، ص 270 گوند رائے کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ آدمی جس کا نام آخر میں دیا گیا ہے بہرحال ہمیر امہا کاویہ کے مطابق پرتھوی راج کا پوتا تھا: انڈین اینٹی کیوری، 1879ء، ص۔ 55۔ اس آخری نکتہ کے لیے دیکھئے رے (RAY): ڈائنسٹک ہسٹری (DYNASTIC HISTORY)، ii، ص 1093، نوٹ۔

34- تاج المعاصر، صفحہ ذیل۔ 46۔

35- تاج المعاصر، صفحہ ذیل۔ 55 اے اور 60، اے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "باگر" ایک عام اصطلاح تھی جو مغربی راجپوتانہ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

36- ایضاً صفحہ ذیل۔ 76 اے۔

37- ان کے قبضہ میں میرٹھ، علی گڑھ، بلند شہر، متھرا، ایٹہ اور گنگا کے اس پار مراد آباد میں طویل و عریض علاقے تھے۔ ان کی تاریخ کے لیے دیکھئے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1879ء، ص 273۔

38- دیکھئے ضمیمہ اپنڈکس (APPENDIX)۔ اے؛ ڈور کی روایتوں کے مطابق 1194ء میں مسلمانوں کے خلاف برن کا دفاع کرتے ہوئے چندر سین نے جان دی یہ تاریخ مسلم سرگزشتوں (CHRONICLESS) میں دی گئی تاریخ 1192ء کے مقابلے میں صریحاً غلط ہے۔

39- منہاج: ص۔ 139 پر میرٹھ پر قبضہ کی تاریخ 587ھ/ 1191ء ہے لیکن ص۔ 120۔ پر دی گئی تاریخ 588ھ/ 1192ء زیادہ صحیح ہے۔

40- تاج المعاصر، صفحہ ذیل 67 بی دہلی کی فتح کو 588ھ/ 1192ء کے اواخر میں رکھتا ہے جیسا کہ منہاج ص۔ 120 تاریخِ مبارک شاہی، ص، ii، طبقات اکبری، i، ص 38۔ 39 اور فرشتہ، i، ص۔ 58 نے بھی لکھا ہے۔ تھامس (THOMAS) نے قطب مینار کے کتبہ کی تاریخ 587ھ پڑھی: کرانکلس (CHRONICLES) ص۔ 22 لیکن اس کو 589ھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

41- تاج المعاصر، صفحہ ذیل، 70 اے؛ فخر مدبر، ص۔ 22 ہری راجہ کی بیوی پرتاپ دیوی

کے عطا کیے ہوئے۔ ایک گاؤں کے ہبہ نامے مورخہ 1194ء کے لیے دیکھیے۔
رپورٹس آف راجپوتانہ میوزیم 1911 - 1912 -

42- تاج المعاصر، صفحہ ذیل - 72 بی -

43- تاج المعاصر، صفحہ ذیل - 75 بی، ابن بطوطہ، ii، ص - 19 - 30 نے ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے کہ کس طرح اس کے مالک نے خفیہ طور پر طلب کر کے اپنے اُن دشمنوں کو زک پہنچائی جنہوں نے غداری کا الزام لگایا تھا۔

44- تاج المعاصر، صفحہ ذیل - 103 بی۔ منہاج اس کو 589ھ کا واقعہ بتاتا ہے، ص- 120۔

45- تاج المعاصر۔ صفحہ ذیل 123 بی - تاریخ علفی صفحہ - 485 لکھتا ہے کہ جے چند 100 ہزار گھوڑوں اور 700 ہاتھیوں کی فوج لے کر خود معزالدین کے علاقے پر حملہ آور ہوا تھا۔

46- شروع کی اس جھڑپ کا ذکر صرف فرشتہ نے کیا ہے۔ i، ص- 58 -

47- فخر مدبر ص 23 تاج المعاصر صفحہ ذیل 112، 117 - 118 ؛ ابن الاثیر، xii ص- 49-

48- تاج المعاصر، صفحہ ذیل 123 بی ؛ 1197ء میں قنوج جونپور اور مرزا پور وغیرہ جے چند کے بیٹے ہریش چندر کے قبضے میں تھے۔ ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل، v، ص- 55 -

49- ایگرافیا انڈیکا، x، ص ص 93 - 98 -

50- جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (این-ایس)، vii، ص 757 روایت ہے کہ بعد کے گڑھوالوں کا دارالسلطنت جونپور کے قریب ظفرآباد تھا۔

51- اُس نے اس کی فتح پر یادگاری سکے جاری کیے۔ کیٹلاگ آف کوئنس ان دی انڈین میوزیم، ii، PT، i، ص- 21 شمارہ 39 - پھر بھی اسمتھ کا اصرار ہے کہ گڑھوالوں کے زوال کے بعد آٹھ پشتوں تک قنوج چندیلوں کے زیر حکومت رہا، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1881ء ص 9-48۔

52- تاج المعاصر، صفحہ ذیل 136، دیکھو حوالہ ہسٹری کلچر آف انڈین پیوپل، v، ص- 84 -

53- حسن نظامی نے اسے کیالہ لکھا ہے صفحہ ذیل 144 اے کرولی (KERAVLI)

کی جادوں بھٹی خاندان کے اجداد کے وقائع میں کمار پال کا ذکر ہے ؛ کننگھم :
رپورٹس ، XX ص ص 8 ، 7 ، 6 ۔

54- تاج المعاصر صفحہ ذیل ۔144بی ؛ منہاج ص 144 ، نے اس واقعہ کی تاریخ 591ھ/1195ء لیکن فخر مدبر ص ، 23 نظامی کی تائید کرتا ہے۔ ہندی کے ایک مقامی طور پر مقبول عام شعر میں مسلمان افسر کا نام اور تاریخ محفوظ ہے کننگھم (CUNNINGHAM):
رپورٹس ، vi ص۔ 55 ۔

55- تاج المعاصر صفحہ ذیل ۔146 بی ۔ کننگھم کے مطابق اس کو غالباً " لہنگ دیو (LAHANG DEV)" سے پہچانا جا سکتا ہے۔ جس کا پیرا من منشی کے گوالیار نامہ صفحہ ذیل ، 9 ۔ اے میں دی ہوئی راجاؤں کی فہرست میں پانچواں ہے ۔ موتی رام اور خوش حال کا نقطۂ نظر بھی ملاحظہ کیجیے۔ انڈین آفس لندن ، Ms 860 صفحہ ذیل 8 بی ۔ جھانسی میں پائے گئے ایک جزوی کتبہ میں شہزادہ سلکنتا سنہا کا ذکر ہے کہ وہ جواناؤں (JAWANAS) سے لڑنے میں مشغول تھا لیکن اس پر کوئی تاریخ نہیں ہے ؛ اپگرافیا انڈیکا ، i ص - 15 - 214 -

56- تاج المعاصر صفحہ ذیل 146 ۔اے ۔ منہاج ص ۔ 145 -

57- منہاج ص ۔ 145 ، اس پر مکمل قبضے کا ذکر نہ تو حسن نظامی نے کیا ہے گوالیار نامہ اس کا تذکرہ ہے ۔ فخر مدبر نے اس واقع کی تاریخ 597ھ/1-1200ء لکھی ہے ۔

58- تاج المعاصر کے ان تمام مخطوطوں میں جن کو میں جانچ سکا ہوں ۔ اس قبیلہ کا نام طونیر یا ناطر (NATIR یا TUNIR) لکھا ہوا ہے ۔ فرشتہ نے بھی یہی شکل دی ہے ، i ص ۔ 62 ۔ پھر بھی ایلیٹ ii ص ۔ 228 ، اس مذکورہ بالا طریقہ سے ہی لکھتا ہے ۔ جو بہر طور اس قبیلے کا نام تھا جو اصل میں جے پور میں بسے ہوئے تھے ۔ کننگھم ؛ رپورٹس ، vi ص ۔ 8 بھی دیکھیے ۔

59- تاج المعاصر ؛ صفحہ ذیل 156 ۔ اے ۔

60- حسن نظامی کلہان (KALHANA) کو کاروان رائے (KARWANA RAI) کہتا ہے ۔ اس کے کتبہ کے لیے جس میں اس واقعہ کا حوالہ ہے دیکھیے ۔ اپگرافیا

انڈیکا، x i رص ص ۔ 46 ۔ 51 ۔

61- منہاج رص ۔ 140۔

62- اوجھا : راجپوتانہ ر i رص ۔ 271۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے واقعات کی ترتیب کو گڈمڈ کر دیا ہے۔

63- i، ص ۔ 52۔

64- اپگرافیا انڈیکا ر i رص 22 ر 9 ۔ 338 ر ii رص ۔ 439۔ الکامل فی التواریخ ر xii رص ۔ 79۔

65- ایشیاٹک ریسرچیز ر (ASIATIC RESERCHES) رص ۔ 289 ر اپگرافیا انڈیکا ر 1877ء وص ۔ 187۔

66- فخر مدبر رص ۔ 24 ۔ تاریخ المعاصر وصفحہ ذیل ر 176 بی نے 599ھ/1202-1203ء میں ایبک کے بدایوں میں قیام کا ذکر کیا ہے۔

67- ص ۔ 140 منہاج نے اس واقعہ کا مبہم حوالہ دیا ہے کہ ایبک نے اجین تک کا علاقہ اپنے زیر نگیں کر لیا تھا رص ۔

68- ارسکن (ERSKINE) : صفحہ ذیل ۔ راجپوتانہ گزیٹر (RAJPUTANA GUZETTERS) ص ۔ 237 ز 1197 میں ایبک کے ناڈول پر حملہ سے متعلق راجپوت حوالے کے لیے دیکھیے ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین ر v رص ۔ 87۔

69- تاج المعاصر صفحہ ذیل 185 بی ز فخر مدبر رص ۔ 25 زم ۔ بہ کنگھم : رپورٹس ر ii ر ص ۔ 456 جو اس بات پر غلط اصرار کرتا ہے کہ کالنجر پر دوبارہ حملہ ہوا پہلی بار 1196ء میں اور دوبارہ 1202ء میں۔

70- حالانکہ ریورٹی کو محمد اور بختیار کے درمیان بن کی جگہ اضافت لگانے پر اصرار ہے پھر بھی میں طبقات ناصری برٹش میوزیم مخطوطہ کے چھپے ہوئے متن میں مذکورہ نام کی آسان شکل کو فوقیت دیتا ہوں۔

71- منہاج ۔ ص 7 ۔ 146 ز حاشیہ میں دیئے گئے ایک مختلف بیان میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزنی میں ناکامیاب ہو جانے کے بعد بختیار نے قنوج کے مقطعی کے یہاں ملازمت کی۔ جبکہ اسامی بختیار کی اولین ملازمت جنور کے

جے سنگھ کے یہاں بتاتا ہے (گیہولیٹ خاندان (GUHELOT CLAN) کا جیتر سنہا (JAITRA SINHA) چتوڑ سے ستر میل دور مغرب میں نگدا (NAGDA) پر حکومت کرتا تھا (ص۔ 95۔

72۔ مطبوعہ متن میں سہلت اور سہلی ہے لیکن ریورٹی کے رائے کو عام طور پر مان لیا گیا ہے۔ ہودی والا (HODI VALA) ؛ اسٹڈیز ان انڈو مسلم ہسٹری (STUDIES IN INDO MUSLIM HISTORY) ص - 206 - فرشتہ اور طبقات اکبری (بالترتیب i ،ص۔ 292 اور i (ص۔ 47) میں "کمپلا" KAMPILHA اور پٹیالی (PATIALI) نزد بدایوں ہے۔ یہ غلطی کی پتتاہ (PATITAH) اور کنتلہ میں صوتی مماثلت کی وجہ سے ہوتی ہے جو بھگوت (BHAGWAT) اور بھیولی (BHIULI) کی جو چنار کے نواح میں قریب قریب واقع ہیں (کنگھم : رپورٹس xi ، ص۔ 128۔

73۔ منہاج (ص۔ 147 اُدّند پر دیس (UDDNDA PURDESA) کے لیے دیکھئے کنگھم : رپورٹس iii (ص - 118 ؛ viii (ص -75 ؛ xi (ص۔ 185 - اُدّند پور شروع کے ان حملوں میں سے ایک کا ذکر غالباً تارا ناتھ نے کیا ہے۔ جو 500 ترکشا فوج کی شکست کا بیان کرتا ہے ؛ سمّدر (SAMADDAR) : گلوریز آف مگدھ (GLORIES OF MAGADH) (ص - 131 - 132 ملاحظہ ہو۔ ایس۔ سی۔ سرکار کو پروسیڈنگس آف دی اینڈ ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن ، 1942 ء میں سم ٹبٹن رفرنسز ٹو مسلم ایڈوانس ان بہار اینڈ بنگال (SOME TIBETAN REFRENCES TO MUSLIM ADVANCE IN BIHAR & BANGAL

74۔ منہاج (ص - 147۔

75۔ منہاج (ص 148 ام۔ بہ۔ آر۔ ڈی۔ بنرجی : بنگلار اتہاس (BANGLAR IT HAS) i (ص - 3 - 252 جن کا خیال ہے کہ یہ گوند پال ہی تھا جو اس وقت اُدّند پور، نالندہ اور وکرم شلا کے آس پاس کے علاقے پر حکومت کر رہا تھا۔ اور اسی موقع پر بختیار کی فوجوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ م۔ بہ۔ اس نظریے کو جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، 1921 (ص اور رے (RAY) ؛ ڈائنسٹک

ہسٹری (DYNSTIC HISTORY)، ا ص۔ 369۔ سرامانوں (SRMANAS)
کی مدافعت کے مسئلہ پر دیکھئے تارناتھ بحوالہ سمددر (SAMADDAR)، ح وس،
ص 126 اور 148۔

76۔ بنرجی کے اس بیان کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تمام کتابیں برباد کر دی گئی تھیں
دیکھئے حوالہ ، ا ص 322 دیکھئے منہاج ص۔ 148۔

77۔ انڈین اینٹی کیوری ، 17 ص۔ 366۔ 367۔

78۔ فخر مدبر ص۔ 25 نے بدر (بہار) کی فتح کا ذکر 600/4 - 1203 حسن نظامی ح۔
س۔ صفحہ ذیل لکھتا ہے کہ 599/3 - 1202 میں کالنجر کی فتح کے بعد بدایوں میں
ایبک نے بختیار کا خیر مقدم کیا جو "اُدند بہار" (UDAND BIHAR) کی
طرف سے آیا تھا۔ منہاج نے بھی ص 147 اور 150 پر اس کی طرف اشارہ کیا
ہے۔ تاج المعاصر میں دی گئی تاریخ 599 کے بارے میں دیکھئے ریورٹی (REVERTY)
ح۔س۔ اپنڈکس۔ ڈی۔

79۔ اُدند پور پر بختیار کا اور کالنجر پر ایبک کا قبضہ تقریباً ایک ساتھ ہی ہوا جس
کی تاریخ حسن نظامی 1203 دی ہے۔ تاج المعاصر، صفحہ ذیل 176 بی۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے۔ کہ فخر مدبر نے بھی 600ھ/1203ء میں بہار کا حوالہ دیا ہے۔ جیسے وہ
بدر (BIDUR) پر قبضہ کی تاریخ قرار دیتا ہے (9) تاریخ ص۔ 25۔ اگلے
سال منہاج 150 کے مطابق ہمیں 1204 میں لے آئے گا۔ 1203 اور 6 - 1205ء
(25 ویں اور 26 ویں سال) میں دھریاگرام (DHARYAGRAMA) سے جو غالباً
بھاگرتی پر ہے لکشمن سین عطیات دے رہا تھا۔ جرنل آف دی ایشیاٹک
سوسائٹی آف بنگال ، 1942 ص ص 70 - 72 مارچ 1206ء میں بختیار کی فوج
برنادی پل (BARNADI BRIDGE) پر تباہ کر دی گئی۔ دیکھئے آگے لکشمن سین
1206ء میں یقیناً زندہ تھا جیسا کہ سُدکتی کرنامیترا (SADUTI KARNA MITRA)
کے پیش لفظ سے ثابت ہے۔ دیکھئے رے (RAY) : ڈائنسٹک ہسٹری ——
(DYNASTIC HISTORY) ، ا، ص۔ 374۔ اس واقع کی تاریخ پہلے رکھنے
سے منہاج کے اس بیان سے اختلاف ہو جائے گا۔ کہ سین بادشاہ کی وفات

ندیا کی بربادی کے فوراً بعد بنگ میں ہوگئی تھی۔ پھر بھی دیکھئے ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال ، ا ، ص ص 233 ۔ 224 ۔ 232 اور 247 جو تبتی تذکرے پگ۔ سیم۔فون۔زونگ (PAG-SAM-FON-ZONG) اور بعد کو جمع کیے گئے شیکا سبھودیا (SHEKA SUBHODAYA) کی بنیاد پر ندیا کی بربادی 1202ء میں ہوئی۔ یہ بھی ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال ، ii ، ص 334 کی دی ہوئی تاریخ جنوری 1201ء سے متصادم ہے۔

80- منہاج ، ص ۔ 150 ۔

81- منہاج ، ص ۔ 150 ۔ 151 ۔

82- مثال کے لیے دیکھئے ، ویدیہ (VAIDYA) ح۔س۔ ص ص ۔ 126 ۔ 29 ؛ و بنرجی دیکھئے حوالہ ص 25 ۔ 324 ؛ انڈین کلچر ، 1935 ص ص 133 ۔ 136 ۔

83- سیر حاصل بحث کے لیے دیکھئے ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال ، ا ، 230-238 اور 242 - 246 -

84- سندربن علاقے کے ایک آزاد حکمراں سامنتا موڈمن پال (SAMANTA MODAMAN PALA) کے ایک ہبہ نامہ مورخ 118 ساکہ 1196 کے لیے دیکھئے انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی ، x ، ص 321 ۔ سین انتظام حکومت کے لیے دیکھئے : رے۔این۔آر (RAY-N.R.) ؛ بنگلا اتہاس (BANGLA ITIHASA) ص ص 516 - 529 ۔

85- منہاج ۔ ص ۔ 150 ۔

86- جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، 1942 - ص 17 - 21 صرف بڑی آفتوں اور بلاؤں سے بچنے کے لیے اینڈری مہاسانتی (ANIDRI MAHASANTI) کہلانے والی رسم ادا کی جاتی ہے۔

87- امپیریل گزیٹیر آف انڈیا ۔ xii ، ص ۔ 18 ؛ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (این - ایس) ، ii ، ص ۔ 282 ۔

88- جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، لیٹرز ، 1942 ص۔ 71 - 72 -

89- منہاج ؛ ص ۔ 151 ۔ 150 م۔ بہ فرشتہ ، ii ، ص ۔ 282 جو اس کا مطلب اڑیسہ

میں جگن ناتھ بتاتا ہے۔ مذہبی تقدس رکھنے والی جگہ کی حیثیت سے جگن ناتھ تیرھویں صدی کے پہلے ۲۵ برسوں میں ہی اہم مقام حاصل کرسکا۔ سنکاکوٹ (SAMI AKOT) کے لیے دیکھیے انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی۔ 1940۔ ص۔ 705۔ 706۔ میں دتہ (DUTTA) ویشیا میڈیول بنگال (VAISYA IN MEDIEVAL BANGAL) دیکھیے۔

90۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ 1896۔ ص۔ 20۔

91۔ منہاج۔ ص 157 میں لکھنوتی دیا ہوا ہے۔ لیکن اس کی سمت بتانے میں جاج نگر کے ساتھ ملایا گیا ہے اس کی جائے وقوع کے لیے دیکھیے۔ اسٹیورٹ: ہسٹری آف بنگال ص۔ 62 جو اس کو بیر بھوم میں نگر سے شناخت کرتا ہے جو لکھنوتی سے تقریباً پچاس میل جنوب مغرب میں ہے (بنرجی: ہسٹری آف اڑیسہ، i، ص 248 اس کی تائید کرتا ہے۔) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کننگھم بھی اس شناخت کو تسلیم کرتا ہے (رپورٹس، vii، 146) لیکن بعد کو وہ بھی شبہ میں مبتلا ہو گیا، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (N.S.)، v، ص 15۔ 214 اسے موجودہ ضلع مرشد آباد میں واقع کوئی جگہ ماننے کی طرف مائل اور لکھنور بلاشبہہ جنوب مغرب میں اڑیسہ کی سرحد پر واقع تھا۔ منہاج کا یہ بیان کہ دیوکوٹ اور لکھنور دونوں کا فاصلہ لکھنوتی سے برابر تھا اسٹیورٹ کی شناخت کی تائید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

92۔ لگھو بھارت (LAGHU BHARATA) نام کے ایک ہندو تذکرے میں بختیار کے ہاتھوں بوگرہ کے قریب جوگی بھاین کے تاجروں کی لوٹ کھسوٹ اور کرتیا (KARATAYA) کے کنارے حکمراں سینوں کی دولت پر قبضہ کرنے کا ذکر ہے (ڈھاکہ یونیورسٹی آف بنگال، ii، ص۔ 34۔

93۔ اس کے رخ میں تبدیلی کے لیے دیکھیے ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال، ii، ص 5-6

94۔ منہاج۔ ص۔ 152۔

95۔ ایضاً۔ ص۔ 154۔

96۔ ایضاً۔ ص۔ 153۔

97۔ ایضاً۔ ص۔ 156۔

98- یہ بوگرہ سے 20 میل دور دریائے کراتویا کے کنارے واقع ہے۔
99- ریورٹی اور بلاک مین (BOCK MAN) دونوں نے سکم کے راستے دارجلنگ کے لیے مہمات کی سربراہی کی تھی۔ ان دونوں کے نظریات کے لیے دیکھیے۔ ترجمہ (i) طبقات ناصری۔ ص ص۔ 665۔ نوٹ۔ اور (ب) جرنل آف دی ایشیاٹک سوسوسائٹی آف بنگال۔ 1875ء ص۔ 283۔ سلہاکو پل (SILHAK BRIDGE) کے لیے جسے کرنل ہینی (CAL. HANAY) نے دریافت کیا تھا۔ دیکھیے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1851ء ص ص 29۔ 94 کنائیہ واسی باسہ (KANAI BA DASI BASA) نام کی جگہ پائے گئے کتبہ کا ذکر پہلی بار بھٹاچاریہ (BHATTACHARYA) نے کیا ہے: کام روپ ساسن بلی (KAMROUP SASANWALI) ص ص۔ 44۔ 24۔ اس میں ترکوں کو "سماگتیہ" (SAMAGATYA) کہا گیا ہے "جو آئے تھے" نہ کہ "وہ جنھوں نے حملہ کیا تھا۔ بختیار کے راستہ کے سوال پر سب سے بہتر کام بھٹا شالی (BHATTA SHALI) نے کیا ہے:۔ انڈین ہسٹاریکل کواٹرلی۔ 1927ء ص ص۔ 49 59۔ بیگ متی یا بانگ متی نام کی وجہ سے تھوڑا سا شبہہ پیدا ہوتا ہے کیوں کہ بنگال میں اس نام کا کوئی دریا نہیں ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ منہاج نے غلطی سے رنگامتی (برہم پتر کے موڑ پر ایک قدیم مقام ہے) اس کا نام کراتویا (KARATOYA) کے لیے استعمال کر لیا ہو اور تحریر کی مزید غلطی کی وجہ سے رنگامتی کی جگہ بانگ لکھا گیا ہے۔ یا تو اس کے بجائے بارندی ممکن ہے بانگ متی ہو گیا ہو۔ ایک نیا خیال یہ ہے کہ نیپال کی بانگ متی دریا کسی زمانے میں کوسی کی طرح بنگال میں ہی بہتی رہی ہو اور کراتویا سے مل گئی ہو۔
100- منہاج ص۔ 157۔
101- تاج المعاصر صفحہ ذیل 178 بی: اس واقعہ کی طرف ایک مبہم اشارہ منہاج نے ص۔ 122 پر کیا ہے جو معزور کو حسین خارمیل (HUSAIN KHARMIL) کہتا ہے۔ دیکھیے گزیدہ ص 411۔ 412 جہاں سے فرشتہ (i) ص 59 نے معزالدین کے دوسرے افسروں میں سے "الادگیز (ILADGIZ) نام کے ایک

افسر کا قصہ نقل کیا ہے جس کے اس موقع پر غزنی ہی پر قبضہ کر لیا تھا۔

102- ابن الاسیر: ii x ، ص. 96 کا کہنا ہے کہ اس نے اس سے پہلے ایک موقع پر اسلام قبول کیا تھا۔ تاج المعاصر صفحہ ذیل رہ 180 نے باکان (BAKAN) اور سرکار (SAR KAR) کا ذکر کھوکھر کے بیٹوں کی حیثیت سے کیا ہے جس کا مطلب غالباً کھوکھروں کے دو ذیلی جماعتوں (SUB DIVISIONS) سے ہے۔

103- فخر مدبر، ص. 27 نے باغی قبیلہ کا نام 'سیاہا' (SIAHA) بتایا ہے [سیہی؟ (SEHI ?)- روز [RUSE: گلاسیری آف پنجاب ٹرائبس (GLOSSORY OF PUNJAB TRIBES)، iii، 394- جامنس (JAMUNS) ایضاً، iii، ص 325، ہرہرس (HARHERS) رہرس (HARS) رایضاً۔ ص 327 اور ناہن (NAHAN)۔ کھوکھروں اور اُن کے قبول اسلام کے مفروضہ کے متعلق جس کا ذکر فرشتہ نے ، i، ص۔ 60 - 59 پر کیا ہے اپنڈکس۔سی دیکھیے۔

104- ابن الاسیر، xii، ص۔ 97۔

105- تاج المعاصر، صفحہ ذیل 198 اے؛ منہاج، ص۔ 124۔

106- تاج المعاصر۔ صفحہ ذیل، 197 بی؛ منہاج، یہ حوالے آگے بھی ہیں، تاریخ مبارک شاہی ص۔ 12 حاجی دبیر، ص 602، ریورٹی (RAVERTY)، ح۔ س۔ ص 450 نوٹ بھی دیکھیے۔

107- گزیدہ، i، ص 412، جوینی، i، ص۔ 59 مراۃ جہاں نما؛ اورنٹیل منسکرپٹ ان دی برٹش میوزیم، 1898 صفحہ ذیل 50 اے؛ طبقات اکبری، i، ص 40۔

108- ابن الاسیر، xii، ص 99 لکھتا ہے کہ جب قاتلوں کو گرفتار کیا گیا تو اُن میں سے دو مسلمان نکلے (ختنہ کیا ہوا تھا) ؛ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں غیر مسلم بھی تھے کیوں کہ یہ قرامطہ (QARAMITAH) اور کھوکھروں کی ملی بھگت تھی۔

109- م۔ بہ بارتولڈ؛ ترکستان، ص 339 اور ص۔ 352 اس کی اور خوارزم شاہ کی حکمرانی کا موازنہ۔

110- فخر الدین رازی نے اپنی ایک تصنیف "لطائف غیاثی" کو معز الدین کے بڑے بھائی غیاث الدین کے نام معنون ہے۔ نظامی عروضی علاؤالدین جہاں سوز کا

بہت عزیز دوست تھا اور غیاث الدین اور معزالدین کے زمانے تک غور کے دربار سے متعلق رہا۔ ز چہار مقالہ (پیش لفظ) دوسری اہم ادبی شخصیت جسے معزالدین کی سرپرستی حاصل تھی فخرالدین مبارک شاہ تھا۔ جس کی بہت سی دوسری تصانیف میں شجروں کی ایک ضخیم کتاب کے علاوہ شنسبانی خاندان شاہی کی منظوم تاریخ شامل ہے۔ اس کے والد ایک مشہور بزرگ تھے اور فیروزکوہ کے دربار سے منسلک تھے۔ دیکھیے عجائب نامہ ای۔ جی۔ براون پریزنٹیشن والیوم (E. G. BROWN PRESENTATION VOLUME) 393-94 اور 409 ز منہاج بھی دیکھیے۔ ص۔ 27۔

چوتھا باب

سلطنت دہلی

1206ء - 1235ء

معزالدین کی موت نے ہندوستان میں مقیم اس کے افسران کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ دہلی سرکار استحکام کی منزل سے بہت دور تھی عام وفاداری کے فقدان کی وجہ سے شخصی بغض و عناد کے فروغ کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ گذشتہ سرکشی کی وجہ سے غزنی سے رابطہ پیدا کرنے والے خبر رسانی کے ذرائع ابھی تک غیر محفوظ تھے۔ غزنی بہرکیف جنگجو خوارزم شاہ کی گرفت میں آسانی سے آجانے والے شکار کی مانند نظر آرہا تھا لیکن اب سب سے بڑا خطرہ ہندوؤں کی طرف سے لاحق ہو گیا تھا۔ ہندو فوجی طاقت جو حملہ آوروں کی پے در پے کامیابیوں کی وجہ سے مبہوت سی ہو گئی تھی اس میں اب نہ صرف دوبارہ زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ جارحانہ کارروائی بھی کرنے لگی تھی۔ 1206ء میں کالنجر کو دوبارہ واپس لے لیا گیا تھا اور چندیلا فرمانروا نے جنوب کی طرف کی جانے والی پیش قدمی کو بڑی کامیابی سے روک دیا تھا۔[1] گنگا کے میدانی علاقے میں بھی متعدد سرداروں نے کھلم کھلا عدول حکمی شروع کر دی تھی۔[2] گہا دوالا فرمانروائی ابھی تک ایک حقیقت تھی کیوں کہ ہریش چندر رانے فرخ آباد اور بدایوں کے اضلاع میں اپنے قدم جمانے کا راستہ تلاش کر لیا تھا۔[3] یہاں تک کہ پریہاروں میں بھی زندگی کی لہر جاگ اٹھی اور انھوں نے گوالیار پر دوبارہ قبضہ کر لیا جسے کئی برسوں بعد

دوبارہ فتح کرنا پڑا تھا۔ مشرق میں بھی مسلمانوں کی فوج پر ایک شدید آفت نازل ہوئی۔ لکھنوتی کا دو سالہ قبضہ فاصلے کی دوری کی وجہ سے غیر محفوظ اور خلجی فرقہ بندی کی وجہ سے مصیبت بن کر گلے پڑا تھا۔ ترکوں نے تقریباً سارے شمالی ہند کو تاخت و تاراج کر دیا تھا لیکن معزالدین کی موت پر انھیں پتہ چلا کہ صرف سندھ اور پنجاب کے کچھ علاقے مکمل طور پر اُن کے قبضے میں ہیں اور وادیٔ گنگا میں راجپوتوں کی مدافعت بڑھتی چلی جارہی ہے۔

صورت حال فوری اقدام اور متحدہ قیادت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ معزالدین نے اپنے پیچھے کوئی بیٹا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا بھتیجا غیاث الدین محمدؒ جو غور پر قابض تھا اس میں نہ تو قیادت کی صلاحیت معلوم ہوتی تھی اور نہ اس میں مستعد کاروائی کرنے کی اہلیت تھی۔ خوارزم شاہ غزنی اور غور کی طرف دہشت ناک طریقے پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ سیاسی دور اندیشی کا مطالبہ تھا کہ دہلی سے سندھ کے پار کا تعلق منقطع کر دیا جائے۔ معزالدین کے افسران میں سے تین کے پاس بہت اہم فوجی دستے تھے اور تینوں جذبۂ خود مختاری کی آبیاری کر رہے تھے۔ افغانستان سے بالائی سندھ کی طرف جانے والے راستے پر واقع کرمان اور سنکورن (SANKURAN) تاج الدین یلدوز کے تحت اور عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ غزنی کے حاکم کی حیثیت سے تاج الدین یلدوز کو منتخب کیا جا چکا تھا۔ لطف و کرم سے نوازا جانے والا دوسرا غلام یلدوز کا داماد نصر الدین قباچہ تھا۔شہ اور ابھی حال ہی میں اچھ اس کی سپردگی میں دیا گیا تھا۔ ان سب سے کہیں زیادہ باصلاحیت اور وفادار غلام قطب الدین ایبک تھا۔ یہ بڑی کم عمری میں خرید اگیا تھا اور اپنی جانبازی اور فیاضی کے لیے مشہور تھا۔ اسے اپنے آقا کا پورا اعتماد حاصل تھا۔ اسی لیے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ترائن کی فتح کے بعد اسے ہندوستانی فتوحات کا انچارج بننا تھا۔ بعد ازاں اس نے معزالدین کے نمائندے کے طور پر دہلی میں بیٹھ کر نہ صرف وائسرائے کے فرائض انجام دیئے بلکہ مملکت میں مقیم تمام فوج کا سپہ سالار بھی رہا۔ شہ 1206ء میں اس کو باقاعدہ طور پر وائسرائے کے اختیارات سونپ دیئے گئے اور "ملک" کے عہدے سے سرفراز کر دیا گیا۔ شہ لاہور کے شہریوں کی دعوت پر جب اس نے

دہلی سے آکر اقتدار اعلیٰ کی باگ ڈور سنبھالی تو اس کا یہ عمل دراصل اس کے آقا کی خواہش کی تکمیل تھا۔ باقاعدہ تخت نشینی کی رسم معزالدین کی موت کے تین مہینے سے زیادہ کی مدت گزرنے کے بعد ۱۷ ذیقعد 602ھ/24 جون 1206ء میں ادا کی گئی۔[7] یہ مدت غالباً اس کو حمائتیوں کی جماعت مجتمع کرنے میں لگی۔ اصولی طور پر وہ ابھی تک صرف ایک غلام تھا۔ حالانکہ غور کے غیاث الدین محمود نے اسے نہ صرف شاہی نشان امتیاز اور پرچم بھیج دیا تھا بلکہ اُسے سلطان کا خطاب بھی عطا کر دیا تھا۔[8] تاہم غلامی سے باقاعدہ آزادی اسے 1208ء/ 605ھ تک نہیں ملی تھی فرمانوں وغیرہ میں 'ملک' یا 'سپہ سالار' سے زیادہ بڑے خطابات نہیں استعمال کیے گئے ہیں۔[9] اور اس بیان کو کہ اس کے "سکے جاری ہوئے اور سارے ہندوستان میں اس کے نام کے خطبے پڑھے گئے۔" محض ایک روائتی انداز سمجھنا چاہیئے جو اس کے اقتدار کی اہمیت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا کیوں کہ اس کا جاری کیا ہوا سونے یا چاندی کا سکہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔[10]

ایبک کا عہد سلطنت مختصر تھا جس کا بیشتر وقت خارجی مسائل میں صرف ہوا۔ یلدوز نے غزنی کو اپنے قبضے میں رکھا اور ایک طرف غیاث الدین محمود نے اور دوسری طرف خوارزم شاہ نے حکمت عملی کا کھیل شروع کر دیا۔ ان میں سے آخرالذکر ایران اور مشرق وسطیٰ کو مکمّل طور پر تقسیم کرنے کے بعد اب غزنی پر للچائی ہوئی نظر ڈال رہا تھا۔ ایبک کے لیے حالات اور زیادہ پریشان کن ہو گئے جب کہ یلدوز جو کہ معزالدین کی سلطنت کے دارالخلافہ کا مالک تھا، اپنے آقا کی ساری سلطنت پر جس میں دہلی بھی شامل تھا، ملکیت کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس دعوے کا اگر پورے دم خم سے مقابلہ نہ کیا جاتا تو پھر یہ نہ صرف دہلی کے اقتدارِ اعلیٰ کے خلاف ہوتا بلکہ خوارزم شاہ کی ہندوستان کو فتح کرنے کی خواہش کی توسیع بھی ثابت ہوتا۔ اس لیے شمال مغرب کی صورت حال پر کڑی نظر رکھنا ناگزیر تھا اور اس مسئلہ کی اہمیت کے سامنے دوسرے تمام امور کو پس پشت ڈالنا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس پسِ منظر میں ایبک کا مستقل طور پر لاہور میں قیام کرنا ایک سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لاہور سے کبھی باہر نہیں گیا۔[12]

خوارزم شاہ کے مقابلے میں یلدوز کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ غزنی میں خوارزم شاہ کے حامی موجود تھے۔ وہاں کے باشندے محبت اور تعلق کے سلسلے میں اپنی متلون مزاجی کے لیے مشہور تھے۔ آخر خوارزم شاہ کے حمائتیوں کے دباؤ میں آکر 1208ء / 605ھ میں یلدوز شہر چھوڑ کر پنجاب کی طرف ہٹ جانے کے لیے مجبور ہونا پڑا ایبک نے جیسا سوچا تھا وہی ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس لیے اب پیش بینی کے طور پر خوارزم شاہ کو الگ کرکے شہر پر قبضہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہاں کے شہریوں کی ایک جماعت کے دل میں بھی دفعتاً اس سے محبت کا جذبہ بیدار ہو گیا اور انھوں نے ایبک کو مدعو کر لیا۔ یلدوز کو پنجاب میں پناہ لینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ اسے فوراً اس کی سابقہ ملکیت کرمان اور سنکورن سے دھکیل دیا گیا۔ ایبک قبضہ کرنے کے خیال سے غزنی پہنچ گیا۔ اس کے بعد کے حالات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ایبک کا یہ قدم بہت جلدی میں اٹھایا گیا تھا اور فوجی نقطۂ نظر سے بے سہارا بھی تھا۔ چالیس دنوں کے اندر وہاں کے شہریوں کے دل میں اس کی حکومت کے خلاف نفرت بیٹھ چکی تھی۔ ایبک کا ایک زمانے سے اُن لوگوں سے براہ راست رابطہ نہیں تھا چنانچہ ایک بار پھر یلدوز کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔ آخر الذکر کی غیر متوقع پیش قدمی کی وجہ سے ایبک کو مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔[12] اس اقدام نے صورت حال کو بہتر بنانے میں کوئی مدد نہ کی اور اب یلدوز کی دشمنی نے اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔

ایسی صورت میں راجپوتوں کے خلاف کسی قسم کی جارحانہ فوجی کاروائی کرنے کے لیے حالات بالکل سازگار نہ تھے۔ یہاں تک کہ لکھنوتی کے حالات جو اپنی جگہ بہت اہم تھے۔ دم بھر سے زیادہ اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کر سکے۔ بختیار کے قتل نے جو کم سے کم خطرہ سر پر لا کھڑا کیا وہ یہ تھا کہ دہلی کے روابط منقطع ہو جائیں اور صوبہ ایک دوسرے سے حسد کرنے والے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جائے۔ قاتل علی مردان کو پکڑنے اور گرفتار کرنے کے بعد خلجی سرداروں نے محمد شیرانی کو سالار بنانے کے لیے منتخب کیا جس نے دہلی کی کم سے کم ماتحتی کا وعدہ کیا تھا۔[13] علی مردان کسی نہ کسی طرح حراست سے بھاگ نکلا اور دہلی پہنچ کر اس نے ایبک کو لکھنوتی کے معاملات

میں مداخلت کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ نظم و نسق کے قیام کے لیے جب دہلی کا ایجنٹ قیماز رومی (QAIMAZ RUMI) آگے بڑھا تو خلجیوں نے اس کے عہدے اور اقتدار کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تاہم ایک خلجی سردار حسام الدین عیوض کی شکل میں ایک مہرہ ہاتھ آگیا۔ جسے اس نے صوبہ کی عارضی ذمہ داری دے کر دیو کوٹ پر چھوڑ دیا لیکن رومی کے رخصت ہونے سے ہی اُسے نکال دیا گیا۔ رومی پھر پلٹا، شیرانی اور اس کے ساتھیوں سے شدید مقابلہ کرنے کے بعد اس نے عیوض کو دوبارہ بحال کیا۔[14] اس دوران علی مردان نے جو ابھی تک لاہور میں مقیم تھا بالآخر ایبک کو اس بات پر تیار کر لیا کہ اسے صوبے کا گورنر مقرر کر دیا جائے۔ جہاں وہ عنقریب ایک دہشتناک دور کا آغاز کرنے والا تھا۔[15]

مشرقی صوبے پر اقتدار کا اس طرح مسلط کرنا کوئی زیادہ تسلی بخش نہیں تھا کیونکہ موجودہ حالات میں دہلی کی ریاست کو اقتدار سے زیادہ سیاسی استحکام کی ضرورت تھی۔ ایبک چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا۔[16] اور پھر انھیں زخموں نے جب 1210ء / 607ھ میں اس کی جان لی تو شمال مغرب کی طرف مصیبتوں کے کالے بادل بڑی تیزی سے گھرے ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے ان علامتوں کو پڑھ لیا تھا اور اسی لیے دہلی کے الگ وجود کو قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنے مقدور بھر انتظام بھی کر دیا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی طور پر سرگرم اور اعلیٰ پیمانہ کا فوجی لیڈر تھا۔ اس کی شخصیت میں ترکوں کی شجاعت اور ایرانیوں کی سخاوت اور اعلیٰ ذوق یک جا ہو گئی تھی۔ اس کی بے پایاں فیاضی نے اسے "لکھ بخش" کا لقب عطا کیا تھا۔ اپنی فطرت کے عین مطابق کہتے ہیں کہ اس نے قتل بھی لاکھوں کی تعداد میں کیے تھے۔[17] حسن نظامی اور فخر مدبر دونوں ہی اسے قدردانی کرنے والا سرپرست سمجھتے تھے اور اسی لیے دونوں نے اپنی تخلیقات کو اس کے نام معنون بھی کیا تھا۔[18] کم سے کم دو موقعے ایسے آئے جب اس نے مغلوب کیے ہوئے ہندو راجکماروں کی اپنے آقا سے سفارش کی۔[19] اس بات پر زور دینا ضروری نہیں ہے کہ ہندوستان میں معز الدین کی بیشتر کامیابی کا سبب ایبک کی انتھک محنت اور بے لوث خدمت تھی۔ معز الدین تو محض محرک تھا لیکن ایبک تفصیلی منصوبے اور دہلی کی ریاست کے آغاز کا ذمہ دار تھا۔

اس کی موت پر لاہور کے افسران نے سرداری کے لیے اس کے لڑکے آرام شاہ کو نامزد کیا۔ لیکن اس اقدام کو دہلی میں پسند نہیں کیا گیا۔ شہریوں نے چیف مجسٹریٹ کی قیادت میں، التمش، کو تخت پر بیٹھنے کے لیے مدعو کیا۔ التمش دراصل ایبک کا داماد اور بدایوں کا گورنر تھا۔ لاہور کے حامیوں کے سہارے آرام شاہ دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ لیکن التمش نے اسے آسانی سے شکست بھی دے دی اور غالباً قتل بھی کر دیا۔ آرام کا غیر واقعاتی دورِ حکومت آٹھ مہینوں سے زیادہ نہ چل سکا۔[20]

بالآخر التمش دہلی کی ریاست کا حاکم مطلق بن گیا۔ لیکن فرقہ بندی نے باہری علاقوں پر بڑا غلط اثر ڈالا۔ جہاں اس کا اقتدار نسبتاً کمزور تھا۔ لکھنوتی میں علی مردان نے خود مختار فرمارواں کا رتبہ حاصل کر کے بادشاہوں کا انداز اختیار کر لیا۔[21] قباچہ نے ملتان پر قبضہ کر کے اپنی فرمارواں کو نہ صرف بھٹنڈا کہرام (KUHRAM) اور سرسوتی (SARSVTI) تک بڑھا لیا۔ بلکہ آرام کی موت کے بعد لاہور پر بھی قبضہ کر لیا۔[22] راجپوت سرداروں نے اپنی اطاعت کو ترک کر کے خراج کی ادائیگی بند کر دی۔ جالور میں چوہانوں کی چھوٹی سی حکومت نے جسے ایبک نے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا آزادی کا اعلان کر دیا۔ رنتھمبور جسے پرتھوی راج کے بیٹے کی گذر بسر کے لیے دیا گیا تھا اب وہ بھی تابعداری سے منحرف ہو گیا۔

فوری اقدام کرنے کے لیے نئے بادشاہ کی حیثیت ابھی غیر مستحکم تھی۔ اس نے ابھی اپنے کو اتنا محفوظ بھی نہیں محسوس کیا تھا کہ فرمارواں کی وجاہت کو اور وقار کو اپنائے۔ حقیقت پسند ہونے کی وجہ سے مصالحت کو عقلمندی کا تقاضہ سمجھتے ہوئے اس نے یلدوز سے شاہی نشان، امتیاز، چھتر اور گرز لینا قبول کر لیا۔ جو اب ایبک کی موت کے بعد آزادی کا دعویٰ کرنے کے لیے اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔[23] التمش کو ایک بڑے خطرے کا سامنا اس وقت کرنا پڑا۔ جب دہلی کے ترک محافظ دستے، جاندار دں نے آرام شاہ کے سپاہیوں سے مل کر کھلم کھلا بغاوت کر دی اور اس کی تخت نشینی کے مخالف بن گئے۔ ایک خون ریز جنگ نے التمش کو اس مصیبت سے نجات دلائی[24] دہلی سے ملحقہ اضلاع سے اپنے اقتدار کو منوانے کے لیے اسے کئی مہینوں تک بڑی سخت اور مصلحت آمیز کارروائی کرنی پڑی۔ یہ اضلاع ایسے افسران کے ماتحت تھے

جن کے عہدے اصلاً خود اس کے برابر تھے۔ اس وقت بھی ایسا لگتا ہے کہ اس کی حکومت مشرق میں بنارس اور مغرب میں سوالک پہاڑوں کے آگے باثر نہیں تھی۔[25]

افغانستان میں ہونے والی تبدیلیوں نے اس کی حیثیت کو مزید خطرے میں ڈال دیا 1215ء/ 612ھ سے قبل کسی وقت یلدوز کی فوجوں نے قباچہ کو لاہور سے بھگانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور پنجاب کے بیشتر حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔[26] بلاشبہ اس کی وجہ سے کہرام، سرستی پر موخر الذکر کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ لیکن التتمش کے لیے یہ ایک سنجیدہ خطرہ ضرور تھا۔ کیوں کہ پنجاب پر یلدوز کے قبضے کا مطلب تھا کہ خوارزم شاہ کے لیے ایک براہ راست دعوت نامہ جس کے لیے غزنی کا الحاق محض چند لمحوں کی بات تھی۔ جس مسئلہ کے حل کی خاطر ایبک نے غزنی پر قبضہ کیا تھا وہ ایک دفعہ پھر سامنے آ گیا تھا۔ شہر پر قبضہ رکھنے کی ناکام مثال چونکہ التتمش کے سامنے تھی اس لیے مسئلہ کا وہی پرانا حل اختیار کر کے وہ طاقتور خوارزم شاہ سے نبرد آزمائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مصلحت کا تقاضہ تھا کہ مدافعت کی پالیسی اختیار کی جائے چنانچہ اس نے صحیح وقت کا انتظار کیا۔ جو بہت جلد آ گیا 1215ء/ 613ھ یلدوز کو غزنی چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ غزنی سے نکل کر وہ لاہور گیا۔[27] یہاں پر پہنچ کر اس نے اپنے اقتدار اعلیٰ کا ایک دفعہ پھر دعویٰ کر کے اس جنگ کا قبل از وقت آغاز کرا دیا جس کے لیے التتمش پوری طرح تیار تھا۔ وہ اپنی فوجیں لے کر نکل پڑا۔ ترائن کے میدان میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور اسے شکست ہوئی پھر گرفتاری عمل میں آئی۔[28] اس فتح نے ایبک کے کام کو مکمل کر دیا۔ اس سے نہ صرف دہلی کی آزادی میں حائل ہونے والی آخری رکاوٹ دور ہو گئی بلکہ وسطی ایشیا میں ہونے والی اقتدار و قوت کی سیاست سے بھی اس کا تعلق ختم ہو گیا۔ اور اب دہلی حقیقت میں نہ سہی اصولی طور پر ایک آزاد خود مختار ریاست ہو گئی۔

لاہور کا فوری طور پر الحاق نہیں کیا گیا۔ لیکن ایسا قیاس ہے کہ اسے قباچہ کے سپرد کر دیا گیا۔ حسن نظامی نے اس معاہدے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی خلاف ورزی کے تحت 1217ء/ 614ھ میں التتمش کو اعلان جنگ کا جواز مل گیا۔ چنانچہ اس نے صوبہ پر قبضہ کر لیا۔[29] دہلی کی افواج نے جب کوچ کیا تو لاہور قباچہ کے

قبضے میں تھا۔ فوجوں نے جوں ہی بیاس عبور کیا قباچہ نے بھاگ کر اُچھ میں پناہ لی۔ چنانچہ التتمش نے بغیر کسی مقابلے کے لاہور پر قبضہ کر لیا اور پہلی دفعہ وہاں خود اپنے گورنر کو تعینات کیا۔[31]

تاہم اس کامیابی کی وجہ سے سارا پنجاب اس کے قبضے میں نہیں آیا۔ قباچہ سندھ کی حدود سے باہر نہ نکل سکا۔ لیکن چناب اور جہلم کی وادیوں کے الحاق کے سلسلے میں التتمش کو کچھ سال لگ گئے۔ کھوکھروں کی بغاوت کے بعد سے سالٹ رینج کے پاس کا ضلع عملی طور پر ابھی باغی قبائل کے قبضے میں تھا۔ لاہور پر قبضہ کیے ہوئے ابھی تین سال بھی نہ گزرے تھے کہ سندھ کے پار ایک طوفان اُٹھا تھا اور جو آب آندھی کی طرح وسط ایشیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تاتاری کے بالائی حصّے سے برآمد ہونے والے منگولوں نے تیموجن کی قیادت میں جس کے شاہی خطابات کو ایرانی چنگیز خاں کہتے ہیں۔ خوارزم شاہ کی وسیع حکومت کو حقیقی معنوں میں ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اب تلوار اور آتش زنی کے سہارے مشرق میں اسلامی تہذیب کی عظیم الشان عمارت کو تہس نہس کر رہے تھے۔ خوارزم شاہ کو بھگا دیا گیا تھا اور اس نے بھاگ کر کیسپین کے ساحل پر پناہ لی تھی لیکن اس کے شہزادے جلال الدین منگ برنی کا خراسان کے پار تک پیچھا کیا گیا۔ وہ بمشکل تمام پنجاب کی سرحد میں داخل ہو کر بچ نکلا لیکن التتمش کو موقعہ سے ہاتھ دھونا پڑا جو اس نے ابھی حال ہی میں حاصل کیا تھا۔ منگ برنی سندھ ساگر کے دوآب کے بالائی حصّے میں جم کر بیٹھ گیا اور اس نے شادی کر کے سالٹ رینج کے سردار اعلیٰ سے رشتہ قائم کر لیا۔[32] اس سے اس کو نہ صرف ایک بہانہ مل گیا بلکہ قباچہ کو ذلیل کر کے اپنی گرفت کے دائرے کو وسیع کرنے میں مدد بھی ملی۔ کیونکہ پہاڑی سردار سے قباچہ کی مسلسل دشمنی چلی آ رہی تھی۔ نتیجے کے طور پر یوں سمجھیے کہ قباچہ کو سندھ ساگر دوآب سے عملی طور پر بالکل نکال دیا گیا۔ مغربی پنجاب میں منگ برنی کے تین سال کے عارضی قیام نے التتمش کی راوی اور چناب کے علاقوں کی گرفت پر اثر ڈالا۔ شہزادے نے سیالکوٹ ضلع کے بسرور یا پسرور کے قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور خود اپنے کو مضبوط بنانے کے لیے اس نے دریائی راستوں کو تباہ و برباد کر دیا۔[33] اس نے لاہور تک پیش قدمی

کے امکانات دیکھے اور یہاں سے اس نے دہلی میں پناہ حاصل کرنے کی درخواست کی[34]

پناہ کی درخواست کے سلسلے میں مہمان نوازی کے اصولوں کے مطابق صرف ایک ہی جواب تھا لیکن التتمش بہت بڑا حقیقت پسند تھا۔ اس موقعہ پر ایک کی اور خود اپنی خارجی پالیسی کو بدلنا اور ایک مفرور شہزادے کو پناہ دے کر کہیں زیادہ خطرناک طاقت کو ناخوش کرنا نہ صرف کم عقلی کی بات ہوتی بلکہ یہ عمل خودکشی کے مترادف بھی ہوتا۔ اس نے بڑے سلیقے سے منگ برنی کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ اور جب اس نے انتقام کے طور پر پنجاب پر مزید حملوں کی تیاری کی تو التتمش فوجی کاروائی کے لیے تیار ہو گیا[35] لیکن باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی کیونکہ شہزادے نے قباچہ کی طرف توجہ دینے ہی میں مصلحت سمجھی[36] منگ برنی 1224ء میں ہندوستان سے چلا گیا۔ لیکن مغربی پنجاب تیز رفتار سیاسی تبدیلیوں سے برابر دوچار ہوتا رہا۔ ان تبدیلیوں پر جو التتمش کے دور سے کہیں زیادہ آگے تک جاتی ہیں مکمل مباحثہ کی ضرورت ہے[37] لیکن یہاں اُن کا صرف سرسری حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ ان تبدیلیوں نے التتمش کے ان منصوبوں کو درہم برہم کر دیا جو اس نے مغربی علاقے کے استحکام کے لیے بنائے تھے لیکن اُن سے اپنے رقیب قباچہ کو تباہ کرنے میں ضرور مدد ملی[38] لیکن منگ برنی کے حملوں اور اس کے بعد کے اثرات کا بھگتان آخرالذکر کو ہی بھگتنا پڑا۔ جس سے اس کی دفاعی طاقت خطرناک حد تک کمزور ہو کر رہ گئی۔ خوارزمی مفرور کے عین پیچھے منگول اس کا تعاقب کرتے ہوئے ملتان تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد منگ برنی کے خلجی حامیوں نے اتنے بڑے پیمانہ پر ہجرت شروع کی کہ ان کو دیکھ کر کسی حملہ آور فوج کا گمان ہوتا تھا۔ التتمش کو یہ دیکھ کر اطمینان حاصل ہوا کہ ان حالات نے قباچہ کو تقریباً کچل کر رکھ دیا تھا۔ اور اب اس کو بھٹنڈا کہرام اور سرسوتی اور دریائے ہکرا (HAKRA) کے راستوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ایک معمولی فوجی کاروائی کی ضرورت تھی[39]

افغانستان سے چنگیز خاں کی واپسی نے التتمش کے دماغ پر چھائے ہوئے ایک بڑے خطرے کو دور کر دیا۔ زیریں سندھ کے علاقے میں قباچہ کو بیرونی حملہ آوروں

کے خلاف جدوجہد میں مصروف دیکھ کر لاہور پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے التتمش نے اپنے کو آزاد محسوس کیا۔[41] تھوڑے ہی عرصہ بعد 1228ء/625ھ میں وہ آخری حملہ کرنے کے لیے پورے طور پر تیار ہو گیا۔[41] لاہور کے گورنر کو ملتان پر حملہ کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے وہ اپنی فوجوں کو لے کر اچھ پر ٹوٹ پڑا۔ سامنے سے مدافعت نہ کر سکنے کی وجہ سے شہر میں ایک مدافعتی دستے کو چھوڑ کر وہ زیریں سندھ میں بھاکر (BHAKAR) کے مدافعتی قلعہ کی حفاظت میں چلا گیا۔[42] تین مہینے کے بعد اچھ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔[43] لیکن جب دہلی کے ایک دستے نے جو وزیر کی نگرانی میں تھا بھاکر کا اصل ملک سے سلسلہ منقطع کر کے محاصرہ کر لیا تو بھاکر میں پناہ گزینی اس کے کام نہ آسکی۔ پریشانی کے عالم میں اس نے اپنے بیٹے کو صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے التتمش کے پاس بھیجا۔[44] آخرالذکر نے کسی شرائط کے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا۔ قباچہ کے انکار پر جب اس کی آخری جائے پناہ پر حملہ کیا گیا تو اس نے اپنے آپ کو دریائے سندھ میں غرقاب کر دیا۔[45]

اور اس طرح جب قباچہ کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تو متحدہ دہلی کے اختیارات کو وسعت دے کر معزالدین کے مغربی ہندوستان کے صوبوں کو قابو میں لانے کے امکانات پیدا ہو گئے۔ ملتان اور اچھ کا الحاق کر کے ان کو گورنر کے صوبے بنا دیا گیا۔ دیبال کے سمرا فرمارواسنان الدین چانیشاء نے اپنی وفاداری دہلی کی طرف منتقل کر دی۔ چنانچہ اس کو باج گذار بنا لیا گیا۔[46] حسن نظامی کے مطابق اس موقع پر تقریباً بارہ مشہور حفاظتی قلعوں پر قبضہ کر لیا گیا۔" ساحل سمندر تک سولستان (SEHWAN) درۂ لاک (LAKKI PASS?) بھی التتمش کے تحت آگئے۔ سکے ڈھالے گئے اور کسدر (KUSDAR) اور مکران تک اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔"[47] تاہم یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ سندھ ساگر دوآب کی سمت بڑھنے میں اس نے کوئی فوری کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں سالٹ رینج کے ان قبیلوں کا غلبہ تھا جن پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا تھا۔ مغربی حصے پر جس کو ہم عصر مورخ بنیان (BANIYAN) کہتے تھے اور جو دراصل منگ برنی کی ہندوستانی فتوحات کا ایک حصہ تھا۔ اب اس کے لفٹنٹ سیف الدین قرلغ

کو حتی الامکان اس پر اپنے آقا کے لیے قبضہ رکھنا تھا۔[49] منگ برنی اور سالٹ رینج کے سردار کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرلغ کا اثر بھی کافی دور تک ہوگا۔ تاہم شمالی مشرقی پنجاب میں ایسا لگتا ہے کہ التتمش سیالکوٹ جاتیسر (HAJNER) اور غالباً جالندھر کو جو محمود کے ابتدائی زمانے میں شاید دہلی کا حصّہ تھا اپنی حکومت کے تحت لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

لاہور اور ملتان کے ماتحت صوبے پہاڑی قبیلوں کی یلغار کے لیے کھلے ہوئے تھے اور ان کا قلع قمع کرنا ضروری تھا۔ اس لیے یقیناً اس کے منصوبوں میں شامل ہوگا۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ گورنروں کو اس بات کی ہدایت دی گئی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ جہلم اور دریائے سندھ کے راستوں کو ختم کرنا شروع کریں۔ سالٹ رینج علاقے میں نندانا (NANDANAH) کے مضبوط قلعے پر قبضہ جیسا کہ منہاج[50] نے لکھا ہے اسی قسم کی کاروائی کا نتیجہ رہا ہوگا۔ کوجاہ (KUJAH) جس کا ذکر نندانا کے ساتھ آیا ہے جس کو ملک ایتگن کی سپردگی میں دیدیا گیا تھا، اُسے اسی مفتوح علاقے میں شامل کرنا چاہیئے جس کے نتیجے کے طور پر اس پر قبضہ کیا گیا۔[51] التتمش کی آخری مہم کا رخ بنیان کی طرف تھا جسے بیماری کی وجہ سے بعد میں ترک کرنا پڑا۔[52] اس موضوع پر آگے چل کر تبصرہ کیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ اس کی موت کے وقت مغربی پنجاب پر دہلی کی گرفت بہت کمزور پڑ چکی تھی۔

تاہم دوسری اور سمتوں میں وہ بہت زیادہ کامیاب تھا۔ 1225ء کے بعد اس کو اتنی فرصت ملی کہ وہ مشرق کی طرف توجہ کرے جہاں ایبک کی موت کے بعد سے دہلی کی حاکمیت مکمل طور پر منفی ہو چکی تھی۔ لکھنوتی میں علی مردان کے مظالم دو سال تک بے روک ٹوک جاری رہے۔ بالآخر جب اس کے مشتعل افسروں نے خود اس کو قتل کیا تو ظلم و ستم کی شب تاریک اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس کی موت کے بعد ایک دفعہ پھر حسام الدین عوض کو اقتدار اعلیٰ سونپ دیا گیا۔[53] حسام الدین عوض نے جس کی تخت نشینی غالباً[54] 1211ء کے بعد ہوئی ہوگی۔ سلطان غیاث الدین کا لقب اختیار کیا اور فرماں روا کا مرتبہ حاصل کر لیا۔[55] وہ ایک فراخ دل اور قابل حکمراں تھا۔ اس نے عوام کی بہبودی کے لیے متعدد کام شروع کرائے۔ انھیں میں سے ایک

پتھروں کا راستہ بنوانا بھی تھا۔ جو لکھنوتی کو لکھنور اور دیوکوٹ سے ملاتا تھا۔ یہ راستہ بارش کے زمانے میں انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ اس کے کچھ حصّوں کے آثار آج بھی ملتے ہیں۔[66] التتمش اپنی دھن میں لگے ہونے کی وجہ سے پریشانیوں سے بچ گیا۔[67] اس نے بہار پر قبضہ کرنے کے راستے ڈھونڈھ لیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے جاج نگر، ترہٹ، بنگ اور کامرود کی پڑوسی ریاستوں کو ٹھیک کر کے باجگزار بنا لیا۔[68] تاہم متھیلا کی برہمن سلطنت کے روزناموں میں ان حملوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔[69] جنوب مغربی علاقوں پر بھی ان کارروائیوں سے سرحد پر کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔
اُڑیسہ کے بادشاہ اننگام بھیم سوم (ANANGABHIMA III) نے (1211ء - 1238ء) اپنے کتبوں میں راڑھ (RARH) اور ورندری[70] (VARENDRI) کے جوانوں (JAVANAS) کو ختم کرنے کا دعویٰ کیا ہے مشرق میں کراتویا کے پار صرف وہی سرحدی کشمکش ہوئی ہوں گی اور جن کا فریقین کے لیے کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا ہوگا۔[71] کامروپ کو باج گذار بنانے کا تعلق کبھی کبھار کیے جانے والے ان حملوں سے ہوگا جو کراتویا کے پار والے علاقے کے عرض میں پھیلے ہوئے شمال مشرقی حصّے پر کیے جاتے تھے۔ جو کم ازکم تیرھویں صدی سے جغرافیائی اصطلاح کے مطابق کامروپ میں شامل تھے۔[72] شمالی بہار میں عوض نے بھاگلپور ضلع کے کچھ حصّوں پر کنٹرول دکھایا ہوگا کیوں کہ اسی جگہ سے دہلی سے لکھنوتی جانے والی شاہراہ گزرتی تھی۔[73]
منگولوں کا خطرہ جونہی سر سے ٹلا التتمش نے عوض کے خلاف کارروائی کا آغاز کردیا۔ ابتدائی اقدام کے طور پر دریائے گنگا کے جنوب میں بہار کے ضلع پر اس نے قبضہ کر کے خود اسے اپنے گورنر کے تحت کر دیا اس نے کس طرح یہ قبضہ کیا، اس کا روزناموں میں ذکر نہیں ملتا ہے۔[74] 1225ء / 622ھ میں اس نے بالآخر گنگا کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ عوض بھی اپنی فوجیں دریا تک لے آیا۔ اس نے بہار میں مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ فریقین میں کوئی جنگ نہیں ہوئی کیوں کہ دونوں میں ایک معاہدہ ہوگیا جس کی رو سے عوض التتمش کی فرمانروائی کو تسلیم کر کے لگان دینے پر راضی ہوگیا۔[75] اس نے بہار پر اپنے دعوے کو بھی ختم کردیا۔ التتمش نے بہار کو ملک جانی کی سپردگی میں دے دیا۔[76] تاہم

بادشاہ کی واپسی کے فوراً بعد عوض نے جو معاہدے پر عمل درآمد کی نیت نہیں رکھتا تھا، جانی کو بھگا کر اپنی آزادی کا دوبارہ اعلان کر دیا۔ چنانچہ التتمش نے اپنے لڑکے نصیرالدین محمود کو، جو اس وقت اودھ کا گورنر تھا عوض پر نظر رکھنے کا حکم دیا اور کہا کہ موقعہ ملتے ہی خلجی بادشاہ کو ختم کر دیا جائے۔ یہ موقعہ 1226ء / 624ھ میں ہاتھ آیا۔ جبکہ مشرق کی مہم پر جانے کی وجہ سے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اُٹھا کر محمود نے لکھنوتی شہر پر قبضہ کر لیا۔ عوض تیزی سے لوٹا، جنگ ہوئی لیکن جنگ میں وہ مارا گیا۔[67] اور اس طرح لکھنوتی پر دہلی کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

محمود نے باپ کی ناگہانی موت تک صوبے پر راج کیا لیکن اپنے باپ کے نائب کی حیثیت سے۔ باپ کی موت کے بعد مصیبتوں کے لیے راہیں کھل گئیں۔ جن حالات میں اس کی موت ہوئی اس کی تفصیل روزناچوں میں نہیں ملتی۔ لیکن بعد میں ہونے والی ایک شخص بلکا خلجی کی بغاوت سے اس کا واضح تعلق معلوم ہوتا ہے۔[68] اس شخص کے بارے میں کچھ بتانا مشکل ہے۔ منہاج کچھ غیر معروف اور ناقابلِ یقین واقعات اس سے متعلق بتاتا ہے سوائے اس کے کہ اس کو علاءالدین دولت شاہ بن مودود کے مماثل ثابت کر دیا جائے جس نے وہ عجیب و غریب سکّہ جاری کیا۔ جس کا ذکر ٹامسن نے کیا تھا۔[70] نہیں تو بلکا، جو عوض کا اگر بیٹا نہیں تو رشتے دار ضرور تھا۔ تمام خلجی سرداروں کا سربراہ بن گیا تھا۔ یہ سردار اپنے مرحوم آقا سے وفاداری کی وجہ سے دہلی کے حکمرانوں کے سامنے جھکنے کو ناقابلِ برداشت تصوّر کرتے تھے۔ اگر ہم یہ یاد کر لیں کہ علاءالدین دولت شاہ کے سکے پر لکھی ہوئی تاریخ 30-1229ء/627ھ ٹھیک طور پر پڑھ لی گئی ہے تو پھر یہ سکّہ کسی ایسے شخص نے جاری کیا ہوگا اور سکّوں پر التتمش کی رضامندی لے لی ہوگی۔[71] اپنے آپ ہی کو تخت پر بٹھانے والے اس غلام فرمارروا کا کس خاندان اور قبیلے سے تعلق تھا، اس کی چھان بین کرنا غیر ضروری ہوگا کیوں کہ خود اختیاری سے دلچسپی رکھنے والی خلجیوں کی قوم نے بلکا کی سربراہی میں جلد ہی اس کو معزول کر دیا اور اس طرح سال کے آخر میں (8 نومبر 1230ء)[72] لکھنوتی پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے التتمش کے لیے بہانہ فراہم کر دیا۔ بلکا کو شکست ہوئی اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ اب لکھنوتی اور بہار دو مختلف صوبے بن گئے۔[73]

سلطنت دہلی پر چھا جانے والے خطرات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن تمام برسوں میں راجپوتوں نے اپنے علاقوں کو تیزی کے ساتھ واپس لینے کی کوشش کی۔ کالنجر پر چندیلیوں کے قبضے کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اجے گڑھ میں پائے جانے والے کتبوں سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس پوری صدی میں پڑوسی علاقوں پر اُن کا قبضہ قایم رہا۔[74] گوالیار میں جہاں التتمش کا پہلا تقرر ہوا تھا، مقامی روزناموں میں 1231ء تک پر پہاروں کی مستقل حکومت کی تفصیلات ملتی ہیں۔[75] اس خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک شہزادے ملایا اور مادیوا کے سکّے اور کتبے نارور، گوالیار اور جھانسی میں ملے ہیں۔ جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ 1220ء - 1233ء تک وہ اس کے مستقل قبضے میں رہے تھے۔[76] راجپوتانہ میں رنتھمبور کے چوہان خاندان نے شمال کے راجکماروں پر اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو قائم کرنا ممکن سمجھا۔ منگلانا (MANGLANA) (جودھپور اسٹیٹ) میں پائے جانے والے 1215ء کے ایک کتبہ میں مقامی سردار جیترا سنہا نے رنتھمبور کے ولانا دیو کو اپنا آقا تسلیم کر لیا۔ حالانکہ چوگنی پور کے "سورت رانا لیتی تمشی" (SURAT RANA LITITIMISHI) سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ التتمش ابھی تک حاکم تصوّر کیا جاتا تھا۔[77] ایک اور شہزادے چہارادیوا کے سکّوں پر التتمش کا نام ساماسورالادیوا (SAMA-SORALA-DEVA) کی حیثیت سے ملتا ہے۔ یہ شہزادہ بظاہر ایک جزوی اجازت نامے کے مصنّف کے مماثل لگتا ہے جو اپنے چوہان نصب پر فخر کرتا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ رنتھمبور کا حکمراں ہو۔[78] یہ دستاویز منگلانا کتبے کی مانند یقیناً التتمش کی دورِ حکومت کے ابتدائی زمانے کی ہوگی۔ کیوں کہ بعد میں رنتھمبور کو اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے فوجی کارروائی کی ضرورت پڑی تھی۔ جالور کی چوہانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی تصدیق ادے سنہا کے پوتے (حسین) نظامی کے مطابق ادی سا (UDISAH) کے کتبے سے ہو جاتی ہے جس میں اول الذکر کی حکمرانی میں نادول، جالور، مندور، بھارمیر، رتنا پور، سنچور، رادھا دھارا، کھیر، رام سین اور بھن مل کو شامل کیا گیا۔ اس میں ترشکاؤں کے غرور کو کچلنے کا بھی ذکر ہے۔[79] شمالی مشرقی راجپوتانہ میں جادوں، بھٹیوں نے کمان، تجارا (TITARA) اور سرہٹا (شمالی الور) کے علاقوں میں اپنی حیثیت بہت مضبوط کر لی تھی۔[80] اگر التتمش کی

فتوحات کو دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ اجمیر، بیانہ اور تھان گیر (THANGIR) بھی ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔[81]

1226ء سے کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس لینے کی کارروائی شروع ہوئی۔ اسی سال اس نے راجپوتانہ کی طرف پیش قدمی کر کے رنتھمبور کا محاصرہ کر لیا۔ بغیر کسی مشکل کا سامنا کیے قبضہ کر کے حفاظتی فوج کو متعین کر دیا گیا۔[82] اگلے سال اس نے مندور پر چڑھائی کر دی۔ مندور بھی آسانی سے قبضے میں آگیا۔ اغلب ہے کہ اس کا بھی الحاق کر لیا گیا۔[83] قباچہ کو فیصلہ کن شکست دینے کے بعد اس کو ہندو ریاستوں کی طرف پوری توجہ مرکوز کرنے کا موقعہ ملا۔ اسی زمانے میں غالباً جالور کو بھی تحویل میں لے لیا گیا۔ حسن نظامی کا خیال ہے کہ یہ کارروائی تخت نشینی کے فوراً بعد کی گئی تھی۔[84] اودے سنہا کا محاصرہ کر کے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اسے باجگزار کی حیثیت دے دی گئی۔[85] راجپوتوں کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ التتمش کے گوہلاٹ (GUHELOTS) کے دارالخلافہ ناگدا پر بھی حملہ کیا گیا لیکن وہاں کے فرمانروا راجکمار جیترا سنہا نے شدید مقابلہ کر کے بھاری نقصان کے ساتھ حملے کو پسپا کر دیا تھا۔[86] اسی طرح کا ایک ناکام حملہ گجرات کے چالوکیہ پر بھی کیا گیا تھا۔[87] لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کی کوششیں مشرقی اور شمالی راجپوتانہ میں کامیاب رہی تھیں۔ جہاں سے بیانا اور تھنگیر دوبارہ تسخیر کر لیے گئے تھے۔[88] فرمانروائی کے اختتام پر اجمیر کے ارد گرد لاواہ، کاسیلی اور سانبھر کے علاقے اس کے گورنروں کے تحت آ چکے تھے۔[89] ایسا لگتا ہے کہ یہ جارحانہ کارروائیاں اس کے گورنروں نے راجستھان میں جاری رکھی تھیں۔ بلکہ ان میں سے ایک گورنر کو بندی کے حملے میں جان بھی دینا پڑی تھی۔[90] جودھ پور کے صوبے میں ناگور، جو مسعود کے زمانے میں دہلی کے قبضے میں تھا اس زمانے میں غالباً پھر واپس لے لیا گیا تھا۔ راجپوتانہ پر جارحانہ کارروائیوں کے سلسلے میں 1234-5ء / 632ھ التتمش کی مالوہ کی مہم، بھیلسا اور اجین کی غارت گری کا ذکر بھی ضروری ہے۔[91] اس حملے کو لوٹ مار سے بس کچھ ہی زیادہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اس موقعہ پر پرمار فرمانروائی کو کسی قسم کا خلافائی نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ اس صدی کے اختتام تک وہ آزاد ہی رہی تھی۔[92]

1231ء / 629ھ میں التتمش نے گوالیار کا محاصرہ کیا۔ وہاں کا پڑیہار فرمانروا جسے

منہاج نے منگل دیو لکھا ہے غالباً یہ ملایا اور مادیوا ہوگا۔ اس نے ایک سال تک مدافعت کی اس کے بعد پوشیدہ طور پر قلعہ خالی کر کے نکل گیا اگلی صبح اس پر قبضہ کر کے رشید الدین کی کمان میں دے دیا گیا[93]

تاہم جمنا کے جنوبی حصے میں کاروائیاں زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں۔ بیانا اور گوالیار کے فوج کے سربراہ ملک تیاسائی (MALIK TAYASAI) کو 4-1233ء/631ھ قنوجی فوجوں کو لے کر کالنجر کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا گیا۔ اس کے کوچ کرتے ہی وہاں کا فرمارواجس کا نام غالباً ترائی لوکیا ورما (TRAILOKY VARMA) تھا وہاں سے بھاگ نکلا۔ چنانچہ تیاسائی نے متعدد شہروں کو بڑی آسانی سے لوٹ کر بے شمار مالِ غنیمت جمع کر لیا[94] تاہم ایسا لگتا ہے کہ کالنجر پر دوبارہ قبضہ نہیں کیا جاسکا تھا۔ آس پاس کے شہروں سے ملنے والی ہندو دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر دہلی کی افواج کو بہت مختصر سا علاقائی فائدہ پہنچا ہوگا لیکن تیاسائی نے راجا کے جھنڈے اور نقارے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی غالباً وہ اس کو ایک بڑا فوجی معرکہ سمجھا ہوگا۔ اس مہم کے سلسلے میں ایک اور جگہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کو منہاج نے جمو (JAMU) کہا ہے اور جسے کنگھم، باگھیل کھنڈ میں واقع بندھو گڑھ بتاتا ہے۔ اس جگہ پر ابھی حال میں بگھیلا سلطنت نے اپنے آپ کو مستحکم کر لیا تھا اور اس کی طاقت بڑھتی جارہی تھی[95] تیاسائی واپسی میں جب ایک تنگ گھاٹی پر پہنچا تو رانا چاہرا جاری (RANA CHAHIR AJARI) نے اس کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ راناجج پیلا (JAJAPELLA) سلطنت کا چہارا دیوا معلوم ہوتا ہے۔ جس نے بعد میں مارواڑ میں پرمہار کی جگہ لے لی تھی[96] بڑی جدوجہد کے بعد تیاسائی اپنی فوجوں کو نکال کر گوالیار پہنچا۔ وادیٔ گنگا میں ہندوؤں کی جارحانہ کاروائیوں کو روکنے کی ضرورت بھی شدید تھی۔ التتمش کی فتوحات میں بدایوں، قنوج اور بنارس کو شامل کرنا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ جگہیں ہندوؤں کے پاس چلی گئی تھیں۔ تخت نشینی سے پہلے دراصل اس کا آخری مورچہ بدایوں تھا[97] اس سے پہلے ہم بدایوں میں گہادوالا خاندان کے اثر اور رسوخ اور قیام کا ذکر کر چکے ہیں۔ راشٹر کُٹا (RASHTRA KUTA) خاندان کے وجود کا قائم رہنا

جس کی نمائندگی لکھن پال کرتا تھا، بعید از قیاس نہیں کہی جاسکتی[98] مشرقی روہیلکھنڈ میں کھتری راجپوتوں نے اہی چھترا (AHICCHATRA) آج کل اسے آنولہ کہتے ہیں کے مضبوط گڑھ کو قائم رکھا۔ یہ جگہ بدایوں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ التتمش کی فتوحات میں کیٹھار کی شمولیت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے کاروائیوں کو کس حد تک پھیلا دیا تھا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس نہ ہوگی کہ بہرائچ اور دریائے گھاگھرا کے شمالی اضلاع کی تسخیر کا کام بھی اسی زمانے میں کیا گیا ہوگا۔ اودھ اور دو آب میں بھی مسلمانوں کی حکومت کو طاقت کے ذریعہ قائم کرنا پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اودھ میں شہزادہ نصیرالدین محمد کے تفرر کے بعد نصیرالدین نے سرکش ہندو قبائل کے خلاف ایک مسلسل جہاد شروع کر کے وہاں کے سردار اعلیٰ برٹو (BARTU) یا پرتھیو (PRITHU) کو مغلوب کرایا تھا۔ اسی سردار کی تلوار کے نیچے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کی شہادت ہوئی تھی۔[99] دوآب کی مہم کا برٹو سے تعلق ہونے کا حوالہ "طبقات" میں ملتا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ چند وار کی مہم میں ملک تیمور خاں نے رائے کے بیٹے کو گرفتار کر لیا تھا۔[100] یہ بات مشکوک ہے کہ شمالی بہار کی طرف کوئی قابلِ ذکر پیش قدمی کی جاسکی ہو۔ تاہم منہاج نے ترہٹ کو التتمش کی فتوحات میں شامل کیا ہے در اصل اس کو ایک کامیاب حملے سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔[101]

اپریل 1236ء میں التتمش کا ایک بیماری کے سبب انتقال ہوا۔ یہ بیماری اس کو شمالی مغربی مہم کے دوران لگی تھی۔ اس کا عہد حکومت ایک غیر معمولی کامیاب دور تھا۔ اس نے ایبک کے نامکمل کام کو سنبھالا تھا اور انتہائی ناخوشگوار حالات اور نامکمل بنیاد پر ایک ایسی سلطنت قائم کی تھی جس کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی سیاسی سوجھ بوجھ درکار تھی۔ اس کی تعمیری سیاست دانی کا اندازہ لگانے کے لیے یہ کافی ہے کہ ایک سابق غلام نے اپنے بیٹوں کے لیے ورثے میں تاج چھوڑا۔ امور خارجہ کے سلسلے میں اس کی حقیقت پسندی ثابت قدمی اور دور اندیشی کی خصوصیات بڑی صاف اور واضح نظر آتی ہیں۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان پر اس کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اُس منگول خطرے سے نجات دلائی جو کہیں زیادہ طاقتور اور قدیم سلطنتوں کو تخت و تاراج کر چکا تھا۔ اس کے مستحکم اور پرجوش اقدام نے سلطنت کو متحد رکھا

اور منتشر ہونے سے بچا لیا۔ راجپوتوں کے خلاف اس کی باشعور اور ذہین حکمت عملی پورے طور پر نہ صرف کامیاب رہی بلکہ اس سے ایسے نتائج سامنے آئے جو اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حامل تھے۔ انھوں نے نئی نئی قائم ہونے والی مسلم ریاست پر ہندوؤں کے پہلے حملے کا مؤثر جواب بھی فراہم کیا۔ معزالدین کے مقبوضات کو واپس لینے کے علاوہ اس نے وادی گنگا کے پار کے راستوں اور راجپوتانہ کی طرف نمایاں پیش قدمی بھی کی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے وادیِ سندھ کی سرحدوں کو دوبارہ ترتیب دینے میں بھی نمایاں کام کیا۔ وہ ایک صحیح انداز کرنے والا ماہر منتظم بھی تھا۔ انتظامی طریقوں کے لیے خاکہ بنانے کا سہرا بھی اسی کے سر جاتا ہے۔ التتمش نے مطلق العنان شہنشاہیت کی بنیاد رکھی۔ جو بعد ازاں خلجیوں کے دورِ حکومت میں فوجی شہنشاہیت کا آلہ کار بنی۔ مذہبی رہنماؤں سے ایک باکمال سمجھوتے کے ذریعہ اس نے اخلاقی مخالفت کو بے دست و پا کر دیا تھا۔[103] دوسری طرف فوجی طبقہ اس کے توسیعی منصوبوں میں نہ صرف مصروف ہو گیا بلکہ اس سے فائدہ بھی اٹھا رہا تھا۔

22 ربیع الاوّل 626ھ/19 فروری 1229ء میں جب بغداد سے عبّاسی خلیفہ کے سفیروں نے اسے اسلامی بادشاہ کے اختیارات سونپے تو نہ صرف اس کے تاج اور فرمانروائی کو بلکہ اس کی ریاست کو اعلیٰ ترین عزّت نصیب ہوئی۔ اس کی اولوالعزمی کو تکمیل کا انعام ملا۔[104] اس طرح ایبک کا مقصد بالآخر حاصل ہو گیا۔ اور دہلی کی ریاست ایک مکمّل قانونی وجود بن گئی۔ التتمش کو عظیم کہنا بلاشبہ مبالغہ ہوگا لیکن وہ ایک غیر معمولی طور پر سمجھدار حکمراں تھا۔ جس نے سلطنت کے ہر پہلو پر اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد برسوں بعد تک بلکہ اس کے موروثی سلاطین کے ہٹ جانے کے بعد بھی لوگ اس کے خوشحال اور شاندار دورِ حکومت کو چاہت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔[105] ایبک نے دہلی سلطنت کا خاکہ بنایا تھا اس کو آزادانہ حیثیت دی تھی۔ التتمش بلاشبہ اس سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا۔

حوالاجات

۱۔ پرماروی دیوا کے وارث ترلوکیہ ورما کے کتبوں میں ترکوں کو اپنی سلطنت سے نکالنے کا ذکر ہے، ایپگرافیا انڈیکا، i ص۔ 327 اس کے قدیم ترین کتبہ مورخہ 1206ء میں ایک افسر کو دیئے گئے عطیہ زمین کے تذکرہ میں اسے کالنجر کا آقا کہا گیا ہے۔ اس کے والد نے ترکوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے جان دی تھی؛ اپی گرافیا انڈکا، xvi، ص۔ 273 دوسری بار اس قلعے کا ذکر منہاج چند سال بعد "رائے کالنجر" کے خلاف بھیجی گئی مہم کے بیان میں کیا ہے اس سے پہلے نہیں۔

2۔ مرزا پور ضلع میں دریافت ہوئے ایک کتبہ مورخہ 1279 وکرمی/1223ء میں اُن میں سے ایک جاپلا کے مہارانکا پرتاپ دھولا (MAHARAKA PRATAPA DHOVALA OF JAPILA) کے ہاتھوں "جوانا وں (JAWANALA) کی بربادی کا ذکر ہے۔ اپی گرانیا انڈیکا، iv، ص ص 310 - 312۔

3۔ (REU) ریو، ہسٹری آف دی راٹھورس (HISTORY OF RATHORS) اشوتوش سلور جبلی والیومس (ASUTOSH SILVER OF BE VOLUMES iii) ص۔ 265۔

4۔ ریورٹی (REVERTY): ح۔س۔ص۔ 531، نوٹ 8، نے اس نے کے تلفظ کے سلسلے میں بڑی طویل بحث کی ہے۔ اس کے خیال میں اس کا تلفظ کاباجاہ (KABAJAH) ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کی مذکورہ بالا شکل ہندی رسم الخط میں اس کے ایک سکّے پر پائی گئی ہے۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف برٹین۔ 1887، ص۔ 171

5۔ کول کی کمانداری کے لیے اس نے حسن ارنال کا تقرر کیا؛ تاج المعاصر۔ صفحہ ذیل 26 بی۔ بہار کے اقطاع پر بختیار کا تقرر اس کے رتبہ کو صاف ظاہر کرتا ہے۔

6- فخر مدبر: تاریخ ص - 28 طبقات اکبری ر ا رص 47 بھی دیکھیے۔ تاج المعاصر صفحہ ذیل 83 اس پر دلالت کرتا ہے کہ ایبک 1193ء میں ہی وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔

7- فخر مدبر: تاریخ، ص- 30 اور 32 رمنہاج رص- 140 -

8- منہاج رص - 98 اور 140 تاریخ مبارک شاہی- 14 رم- طبقات اکبری ر ا ر ص- 42 -

9- ایپی گرافیا انڈو مسلکا، 1911 - 12، ص- 1 -

10- تاج المعاصر، صفحہ ذیل- 202 اے؛ منہاج، 141! روجرس (RODGERS): جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین ر 1894 شمارہ 37 - 40 نے تانبے کے چار سکوں کو ایبک سے منسوب کیا ہے۔ جس پر القطبی کا لقب موجود ہے ان سکوں کے لیے رائٹ (WRIGHT) ص- 69 دیکھیے۔ جن کا خیال ہے کہ ان کو کارمان ٹکسال سے منسوب کیا جانا چاہیے۔

11- غیور اور عوز سے پالاوز کی مصلحتی گفتگو کے سلسلہ جنبانی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ منہاج ص ص، 89 - 96؛ خواندامیر: روضۃ الصفا ر 17 رص 7 - 126! ایبک کے مسائل کے لیے دیکھیے فرشتہ ر ا رص- 63 -

12- تاج المعاصر؛ صفحہ: 202 - اے- منہاج- ص 140! اور ص- 98 زم- بہ فرشتہ ر ا رص 63 جس نے اس واقعہ کی تاریخ 603 ھ/1207ء بتائی ہے۔

13- منہاج رص- 158! ؛ م- بہ طبقات اکبری ر ا رص- 51 -

14- شیران جلد ہی اپنی پارٹی سے جھگڑے میں مارا گیا اور اسے اترائی ر ATRAI) کے کنارے ماہی گنج کے قریب مقصیدا اور سنتوش ر MAKSIDAH AND SANTOSH) میں دفن کیا گیا؛ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1875، ص- 284، م- بہ- تاریخ الفی، صفحہ ذیل، 616 اے رجس کا بیان ہے کہ وہ ہندو راجاؤں سے جنگ میں مارا گیا۔

15- منہاج، ص- 159 -

16- ایضاً، ص- 141؛ تاریخ مبارک شاہی، ص- 15 ؛م- بہ سر آف جہاں نما صفحہ ذیل 53. جو اس کی تاریخ وفات 609 ھ/ 1212ء بتاتا ہے جبکہ ایبک

کے آخری کتبے پر رمضان 607 ھ/1210ء کی تاریخ ہے۔

17- منہاج ؛ ص۔ -

18- تاج المعاصر، صفحہ ذیل ۔ 7 بی ؛ فخر مدبّر : تاریخ ص۔ 72 ۔ معزالدین کے یہاں ملازمت کرنے سے پہلے ایبک نے ادب میں لیاقت پیدا کر لی تھی۔

19- تاج المعاصر، صفحہ ذیل 143 بی اور 194 بی۔

20- منہاج ص 141 ؛ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 16 ؛ انڈین اینٹی کویری ۔ص۔ 55 ۔ ریورٹی (REWERTY) کا اصرار ہے کہ وہ ایبک کا گود لیا ہوا بیٹا تھا۔ جس کا کوئی مصدّقہ ثبوت موجود نہیں ہے۔ حاجی دبیر ii ص 286 بھی دیکھیے۔ سلاطین دہلی کے سکوں سے متعلق بیانات پر مشتمل ایک گمنام مصنّف کی تفصیل سکّہ نام کی تصنیف، صفحہ ذیل، 8 کے مفروضہ ثبوت کی بنیاد پر ریورٹی (REVERTY) ح۔س۔ ص 589 نوٹ 4 کا اصرار ہے کہ آرام نے 1215 تک حکومت کی لیکن التتمش کا سب سے پہلا سکّہ 608ھ/ 1211ء میں جاری کیا گیا۔ اور اس کے کتبے پر جمادی الاوّل 608ھ/ 1211ء تاریخ ہے۔ دیکھیے کیٹلاگ آف کوائنس ان دی انڈین میوزیم، ii، پیش لفظ ص۔ 6 ۔ ایپی گرافیا انڈو مسلکا 1911 - 1912، ص۔ 3 ۔

21- اس کی ظالمانہ حکومت اور ناقابلِ برداشت شیخی کے لیے دیکھیے ؛ منہاج 60 ۔ 159 طبقات اکبری ر i ر ص۔ 53 کا بیان ہے کہ اس نے سلطان علاءالدین کے نام سے سکّے جاری کیے۔ ایسا کوئی سکّہ دستیاب نہیں ہے۔

22- منہاج ، ص۔ 143 ۔

23- منہاج ، ص۔ 170 ؛ حاجی دبیر ؛ ii ، ص 688 کا بیان ہے کہ التتمش نے یالدوز سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ یہ تقریباً غیر ممکن ہے اگر اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نے پہلے ہی شاہی نشانات قبول کر لیے تھے۔

24- تاج المعاصر، صفحہ ذیل، 215 - 216 منہاج ، ص۔ 170 ۔

25- منہاج ، ص۔ 171 ۔

26- ایضاً، ص۔ 135 ، 143 اور 171 یالدوز کے جس وزیر نے اس موقع پر لاہور پر قبضہ کیا تھا اسے 612ھ / 1215ء میں شہر پر خوارزمی فوج کے قبضہ سے کچھ پہلے

ہی قتل کر دیا گیا تھا۔

27- تاج المعاصر، صفحہ ذیل، 230ب؛ فرشتہ ، ص۔ 65 کا بیان ہے کہ اس نے تھانیشور کی طرف بھی پیش رفت کی تھی۔

28- منہاج، ص۔ 135 ، تاج المعاصر، صفحہ ذیل؛ 238 اے کا بیان ہے کہ لڑائی سمانا میں لڑی گئی۔ یالدوز لڑائی میں زخمی ہوکر گرفتار ہوا اور بدایوں میں ہی قید میں وفات پائی۔

29- تاج المعاصر صفحہ ذیل ؛ 241ب، فرشتہ کا بیان ہے کہ قباچہ نے سرہند پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے التمش کو آخر کار اس کے خلاف اقدام کرنا پڑا۔

30- منہاج۔ ص، 171 ؛ تاج المعاصر، صفحہ ذیل، 245م۔ بہ طبقات اکبری ، i ، ص۔ 5809 ۔

31- تاج المعاصر، صفحہ ذیل۔ 248 اے۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کو نگران مقرر کیا گیا۔

32- جوینی ، ii ، ص۔ 145 ۔

33- ایضاً، ص۔ 147 ۔ اس کی شناخت کے لیے دیکھئے کنگھم رپورٹس، XIV ، ص۔ 46۔ 47۔

34- محمود کے ہانسی تبادلہ کے بعد 1228ء تک کسی دوسرے صوبہ دار کے تقرر کا ذکر نہیں ہے۔ 621ھ/ 1226ء میں جب ایک منگول فوج نے منگبرنی کا پیچھا کیا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے صوبہ لاہور کو تاراج کیا، جوینی ، ii ، ص 142 ۔

35- ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منہاج نے اس واقعہ کے بیان میں صاف گوئی سے کام نہیں لیا ہے۔ ریورٹی (REVERTY) کے ترجمہ میں ص۔ 293 پر وہ لکھتا ہے کہ التمش نے منگبرنی کے خلاف ایک فوج روانہ کی ؛ لیکن متن میں ، ص۔ 171 پر بیان کرتا ہے کہ خود التمش نے "خوارزم شاہی فتنے کے خلاف فوج کشی کی" بعد کے اسی بیان کو حاجی دبیر نے نقل کیا ہے، ii ، ص 916 ۔

36- لیکن نسادی (NASSAVI) ، ص۔ 88 لکھتا ہے کہ التمش نے سپاہیوں سے قباچہ

کی مدد کی جو کہ تقریباً خارج از امکان ہے۔ منہاج صرف یہ اضافہ کرتا ہے کہ التتمش کی آمد پر منگبرنی ایک طرف ہو گیا۔

37- دیکھئے باب، ix، الفرا۔

38- تحفۃ الکرام (TUHFA - TUL- KIRAM)، صفحہ ذیل، 262 بی۔ نے سات راناؤں (RANAS) کے ناموں کا ذکر کیا ہے جو قباچہ کو خراج دیتے تھے۔ ان کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں دو راٹھور اور سولنکی راجپوتوں سے متعلق ہوں گے۔

39- 1227ء سے کچھ دنوں قبل بھٹنڈا میں گورنر کا تقرر کیا گیا؛ منہاج۔ ص۔ 232۔ روایت ہے کہ اس نے قباچہ کے علاقے پر دست درازی کی اور صوبہ ملتان میں ونجرت (WANJRUT) [ریاست بھاولپور میں وجنوٹ (VIJNOT) (IN BHAWALPUR STATE)] پر قبضہ کر لیا؟ ریورٹی (REVERTY) ح۔ س۔ ص۔ 723 چھپے ہوئے متن میں ونجروت کی جگہ گجرات ہے۔ انڈین اینٹی کیوری، 1882؛ ص 1- 9 بھی دیکھئے۔

40- منہاج، ص۔ 236۔

41- منہاج نے اس واقعہ کی متضاد تاریخیں دی ہیں؛ ص۔ 114 پر 624ھ/1227ء ص ص 172 اور 234 پر 625/1228ء جوامع الحکایات کے مصنف نورالدین عوفی نے اس وقت قباچہ کے ساتھ رہتے تھے، آخرالذکر تاریخ کی تائید کی ہے؛ صفحہ ذیل 3 اے؛ حاجی دبیر بھی دیکھئے، ii ص۔ 696؛ م۔ بہ۔ فرشتہ، i، ص۔ 65 اور طبقات اکبری، ii، ص۔ 317؛ تاریخ معصومی، صفحہ ذیل، 31 اے بھی دیکھئے۔

42- منہاج، ص۔ 144۔

43- ایضاً، ص۔ 173 طبقات اکبری، i، ص 57 بھی دیکھئے۔

44- الیٹ علی گڑھ ایڈیشن (ALLIOT) میں تاج المعاصر، ii، ص۔ 242؛ منہاج ص۔ 144۔

45- ایضاً، ص۔ 173؛ عوفی؛ ح۔ س۔ صفحہ ذیل 4 اے۔ اس کی وفات 19 جمادی

الثانی۔ 625 مطابق 26 ، مئی 1228 کو ہوئی۔

46۔ منہاج ؛ ص۔ 173 ؛ سندھ کے مورخ اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتے۔ دیکھیے ریورٹی (RAVERTY) ح۔ س، ص۔ 615 نوٹ ؛ الیٹ علی گڑھ ایڈیشن (ELLIOT) بھی، i ، ص۔ 485۔

47۔ الیٹ علی گڑھ ایڈیشن میں تاج المعاصر ، ii ، ص۔ 242۔

48۔ نساوی (NESSAVI) ، ص۔ 92 ۔بنیان کا ذکر تقریباً ہمیشہ ہی غازن، کامران اور "ملک سندھ" کے ساتھ آتا ہے ؛ منہاج ص ص۔ 238 اور 392 ذ ریورٹی بھی (ح۔ س۔ ز ص۔ 530 (نوٹ۔ 7 ۔

49۔ اس کی فتح کی فہرست میں سیالکوٹ اور ہنجیر (HAJNER) شامل ہیں (منہاج (ص۔ 179 (ہنجیر کی جائے وقوع کے لیے (جسے متن میں خنجیر لکھا گیا ہے۔) دیکھیے باب IX انفرا (INFRA) جالندھر کا ذکر پہلی بار ص۔ 210 پر ہے۔

50۔ منہاج، ص 179 پر اسے التتمش کی فتوحات میں شامل کیا گیا ہے ؛ عتبی (UTBI) نے اُسے ناردین (NARDIN) بتایا ہے : تاریخ یمینی ، ص۔ 26 ؛ بعد کے ہندو ساہیہ بادشاہوں نے اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے جائے وقوع کے لیے دیکھیے ریورٹی (REVERTY) ح۔ س۔ ص 524 نوٹ (i ، امپیریل گزیٹر آف انڈیا ، viii ص۔ 349 ؛ ناظم بھی دیکھیے۔ ص۔ 91 ۔

51۔ منہاج ، ص۔ 253 ۔

52۔ ایضاً ، ص ، 176 ، م۔ بہ حاجی دبیر ، ii ، ص۔ 699 جس کا خیال تھا کہ یہ خراسان کے خلاف تھا۔ باب IX بھی دیکھیے۔

53۔ منہاج ، ص۔ 160 ۔

54۔ غزنی سے واپسی کے فوراً بعد ایبک نے علی مردان کا تقرر کیا۔ جس نے دو سال تک حکومت کی۔ اس طرح اگر 607 کے کچھ قبل سے گنا جائے تو ایبک کا سنہ وفات ہے) 608 کے اختتام / 1211ء یا 1212ء کی تاریخ آتی ہے۔ م۔ بہ اس مسئلہ کے لیے دیکھیے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (این۔ ایس) ۔ iv ، 1540۔

55۔ منہاج (ص ، 161 اس کا قدیم ترین سکہ پر 616 ھ / 1219ء کی تاریخ ہے (جرنل

اف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین (این ۔ ایس) ، vi ، ص ۔ 352 ۔

56۔ مفصل بیان کے لیے دیکھئے عابد علی خاں : میموائرسس آف غور اینڈ پنڈوا (MEMOIRS OF GOUR AND PUNDNAH) ، ص ۔ 13 اور نوٹ ۔ 1 ۔

57۔ م ۔ بہ ۔ رائٹ (WRIGHT) ، ص ۔ 16 ۔ 15 شمارے 149 ایف ؛ 49 ایچ اور 49 جی سے جو التتمش کے ایک طلائی اور چند نقرئی سکّوں کو بنگال کی ٹکسال کا بتاتا ہے اور اس طرح تھومس (THOMAS) کی تائید کرتا ہے ۔ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین ، VI ص 348 جس کا خیال تھا کہ ان برسوں کے دوران عوض (IWAZ) نے التتمش کی فرمارروائی ضرور تسلیم کرلی ہوگی ۔ لیکن یہ نسبت مصدقہ نہیں ہے ۔ اس لفظ کو ناگور بھی پڑھا جا سکتا ہے جیسا کہ 608 جاری کردہ سکّوں میں ایک سکّے پر ہے :۔ تھامس (THOMAS) : کرانکلز (CHRONICLES) ص ، 78 ، شمارہ 59 ۔ بنگال کے لیے غور (GOUR) بہت بعد تک مستعمل نہیں تھا ۔ تذکروں اور سکّوں میں اس کا ذکر ہمیشہ لکھنوتی کے نام سے ہوا ہے ۔ بنگال ٹکسال کا اوّلین ذکر صاف طور پر رضیہ کے ایک تنکہ (TANKAH) پر ملتا ہے ۔ جس پر لکھنوتی کا نام ہے ؛ تھامس (THOMAS) : کرانکلز (CHRIOCIELES) ص ۔ 107 شمارہ 90 ۔ کسی دوسرے سکّے پر غور (GAUR) کا نام ٹکسال کے لیے نہیں ملتا ۔ اس کے علاوہ یہ بھی غیر ممکن ہے کہ عوض نے التتمش کی برتری اس وقت تسلیم کر لی ہو جب کہ ابھی التتمش تخت پر محفوظ نہیں تھا ۔ اور پھر جیسا کہ سکّوں سے ثابت ہوتا ہے اس نے اپنی آزادی کا اعلان عین اس وقت کیا ہو جبکہ دہلی کا سلطان دوسرے تمام خطرات پر قابو پالینے کے بعد اپنی فرمارروائی کو منوانے کے قابل ہو گیا ہو ۔

58۔ منہاج ، ص ۔ 163 ۔

59۔ ان کی تاریخ کے لیے دیکھئے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (این ۔ ایس) ، xi ، ص ص ۔ 406 ۔ 408 کنگھم (CANNGHAM) : رپورٹس (REPORTS) ، vi ، ص ۔ 159 ۔

60۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال ؛ 1898 ، ص ص 317 ۔ 327 ؛ 1903 ،

ص ۔ 109 ، ایپی گرافیا انڈیکا ر xiii ، ص ۔ 150 ، جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف برٹین 505 ۔ 506 ۔

61۔ لکشمن سین کے وارثوں کیسو اور وسوروپ (VISWARUPA) کے دیئے ہوئے دو عطیات دستاویزوں میں ان کی گرگا جوانوں (GARGA JAVANAS) سے کامیاب لڑائیوں کا ذکر ہے ؛ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1896ء ص ص ، 9 - 15 ز (این۔ایس) ، X ، ص ص 99 - 104 ۔

62۔ بروا (BARVA) ارلی ہسٹری آف کامروپ (EARLY HISTORY OF KAMRUP) ، ص ۔ 224 کا بیان ہے کہ 1227 میں عوض برہمہ پترا کے کنارے کنارے گوہاٹی تک پہنچ گیا جہاں اُسے زبردست نقصانات کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا گیا۔ یہ بیان غالباً اس کے گوہاٹی میں پائے گئے 621 سکوں میں سے کچھ کے ناکافی ثبوت پر مبنی ہے ، بھٹا چاریہ بھی دیکھئے۔ مغل نارتھ ایسٹ فرنٹیر پالیسی ص۔ 55 ۔ نوٹ اور گیٹ (GAIT) : ہسٹری آف آسام (HISTORY OF ASSAM) ، 37 بھی دیکھئے۔

63۔ اس راستے کے استعمال کے متعلق۔ منہاج ، ص ۔ 159 ر دیکھئے۔

64۔ ایضاً ، 163 ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن نظامی نے بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الیٹ (ELLIOT) علی گڑھ ایڈیشن ر ii ر ص ۔ 241 ۔

65۔ منہاج ، 163 ۔ 171 ؛ لیکن الفی کا بیان ہے کہ یہ معاہدہ بہت شدید جھڑپ کے بعد ہوا ؛ صفحہ ذیل 615 م ۔ بہ ۔ سلیم : ریاض السلاطین ، ص ۔ 72 ۔

66۔ منہاج ، ص 189 ۔

67۔ ایضاً ، ص ۔ 164 ۔

68۔ منہاج ، ص ۔ 181 ۔

69۔ ایضاً ، ص ۔ 163 اُسے اختیار الدین بلکا کہا گیا ہے۔ لیکن ص ۔ 174 اوپر صرف بلکا ملک خلجی ہے۔ التتمش کے ملکوں (MALIKS) کی فہرست میں لکھنوتی کے ملک دولت شاہ خلجی کا ذکر ہے ، لیکن بلکا کا نہیں۔ اس کا امکان نہیں ہے کہ اس فہرست میں کسی باغی کا نام ہو۔ ریورٹی (REVERTY) نے اس الجھن کو اور

بڑھا دیا ہے، کیونکہ اسے طبقات کے دو پرانے مخطوطوں میں اختیار الدین دولت شاہ بلکا بن حسام الدین عوض خلجی کا ذکر ملا اور دوسروں میں کسی ایران شاہ بلکا خلجی کا ذکر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں دو مختلف شخصیتوں سے بحث کر رہے ہیں۔ اور دولت شاہ کو بلکا سے نہیں بلکہ تھامس (THOMAS) کے سکے میں مذکورہ دولت شاہ سے شناخت کرنا چاہیے۔ اس رائے کے لیے میں اپنے پرانے طالب علم اور موجودہ رفیق کار عبدالماجد خاں کا ممنون احسان ہوں۔

70- جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (این۔ ایس)، xi، ص۔ 362 شمارہ، 2، رائٹ (WRIGHT) بھی، ص۔ 21 شمارہ 53 اے۔ اس میں بہت سی خصوصیات ہیں۔ التتمش کی کنیت عبدالفتح بتائی گئی ہے جبکہ اس کے تمام دوسرے سکوں پر صرف ابوالمظفر ہے۔ دولت شاہ اپنے آپ کو شہنشاہ کہتا ہے۔ جو کسی ایسے شخص کے لیے خلاف معمول ہے جو دوسرے کی برتری تسلیم کرتا ہو۔ م۔ بہ۔ پھر بھی ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال (ii (ص 44۔ میں بلکا خلجی کو تھامس کے سکے میں مذکور دولت شاہ بن مودود سے شناخت کیا گیا ہے۔

71- اس مسئلہ کے لیے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (این۔ ایس) iv، ص 154 دیکھیے۔

72- منہاج۔ ص۔ 174 یہ تاریخ بھی دولت شاہ کے سکہ کی تاریخ کی ہی طرح مشتبہ ہے۔ کیونکہ ریورٹی (REVERTY) نے بعض پرانے مخطوطوں میں یہ تاریخ 628 پائی؛ حاجی دبیر، ii، ص 698 پر 627 ہے۔

73- منہاج، ص ص۔ 231 اور 242 ملک علاءالدین جانی کا تقرر لکھنوتی کے لیے ہوا جب کہ بہار کو ملک سیف الدین ایبک کے تحت کر دیا گیا۔

74- کنہگم (CUNNINGHAM): رپورٹس (REPORTS)، xxi، ص ص۔ 49-52۔

75- گوالیار نامہ، صفحہ ذیل، کنہگم (CUNNINGHAM): رپورٹس (REPORTS) بھی دیکھیے، ii، ص ص 378-381۔

76- کنہگم (CUNNINGHAM): رپورٹس (REPORTS)، ii، ص۔ 315؛ کوائنس آف مڈیول انڈیا (COINS OF MEDIEVAL INDIA)، ص۔ 80۔ 90۔ اوجھا راجپوتانہ i، ص۔ 166، انڈین اینٹی کویری، 1918، ص۔ 241۔

77- انڈین اینٹی کویری، xvi، ص۔ 86، اس ولانا دیو (VALLANA DEVA) کو گوندرائے کا بیٹے اور ہمیرہ مہاکاویہ کا ولانا دیوا (VALLANA DEVA) ہی ہونا چاہیئے انڈین اینٹی کویری، 1879، ص۔ 62 روایت ہے کہ آخرالذکر نے جو اجمیر کے پرتھوی راج کا پوتا تھا، اپنے قوت بازو سے ریاست رنتھمبور کی بنیاد ڈالی۔

78- تھومس (THOMAS)؛ کرانکلس (CHRONICLES)، ص، 70؛ کنہگم بھی: کوئنس آف مڈیول انڈیا (COINS OF MEDIEVAL INDIA) ص، 92۔ تاہم دونوں ہی اس کو ناروَر کے ایک دوسرے چہار دیو (CHAHAR DEVA) سے منسوب کرتے ہیں جو دراصل چوہان نہیں تھا اور بعد کی تاریخی سامنے آتا ہے۔ سکّے پر چوہانوں کے مخصوص نشان "بیل اور گھوڑ سوار" اور لفظ اسواری اس کو کسی حد تک کتبے کے چہار دیوا سے متعلق ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ اس پر تاریخ نہیں ہے لیکن فن کتب خوانی کی بنیاد پر ایسے اسی زمانے اور اسی شہزادے سے منسوب کیا گیا ہے، ای۔ آئی، xii، ص۔ 223۔ 224۔ لیکن چہار دیوا کا ذکر ہمیرہ مہاکاویہ کی فہرست میں نہیں ہے۔

79- ایپی گرافیا انڈکا، xi، ص۔ 72۔ 73۔

80- کنہگم (CUNNINGHAM): رپورٹس (REPORTS) xx، ص۔ 10۔ 11۔

81- منہاج: ترجمہ ریورٹی، ص۔ 627۔

82- منہاج: ص۔ 172 اصل متن میں رتن پور ہے لیکن ریورٹی (RAVERTY) دیکھئے ترجمہ، ص۔ 610۔ بہ۔ ہمیرہ مہاکاویہ جس میں اس واقعہ کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ نوجوان شہزادے ویر نرائن پر اس وقت جوگن پور کے حکمراں جلال الدین کی فوجوں نے حملہ کیا جب وہ گوالیار کی کچھواہا شہزادی سے شادی کرنے جارہا تھا۔ لیکن چونکہ جنگ کا فیصلہ نہیں ہوسکا اس لیے جلال الدین نے دوستی اور انعامات کا وعدہ کرکے شہزادے کو دہلی آنے کی ترغیب دی۔

جہاں اسے دغابازی سے قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کا وزیر بھاگوت (BHAGWAT) مالوہ چلا گیا اور نتیجہ کے طور پر بغیر کسی رکاوٹ کے رنتھمبور (RANTHAM BOR) کے قلعے پر جلال الدین کی فوجی نے قبضہ کر لیا۔ حالانکہ جلال الدین رضیہ کے سرکاری ناموں میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے معروف ہے۔ جس کی حکومت کے دوران اس قلعے پر چوہانوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ پھر بھی اس کی تسخیر کے بیان میں التتمش کی مہم کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ بھاگوت (BHAGWAT) نے بعد میں قلعہ کو پھر سے حاصل کر لیا اور اس شاہی خاندان کی بنیاد رکھی جس کا نمائندہ ہمیرہ تھا۔ جس کے لیے مسلمہ طور پر یہ تذکرہ لکھا گیا تھا۔ انڈین اینٹی کویری، 1879، ص۔ 63۔

83۔ منہاج، ص۔ 182 تاج المعاصر: الیٹ (ELLIOT) علی گڑھ ایڈیشن، ii، ص۔ 241 میں منڈور کا ذکر ہے۔

84۔ تاج المعاصر۔ صفحہ ذیل ر 200 اے منہاج نے جالور کو التتمش کی فتوحات میں شامل کیا ہے، ص۔ 179 - بہ۔ ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل، V، ص۔ 88 ۔اس بیان کے لیے کہ چند سال بعد جب التتمش گجرات کی مہم پر وہاں گیا تو یہ چوہان شہزادہ ادے سنہا التتمش کی اطاعت قبول کرنے کے باوجود (جس کی تاریخ 1211 اور 1216 کے درمیان بتائی جاتی ہے) اُسے پسپا کرنے کی غرض سے گجرات کے بگھیلا بادشاہ ویر دھولا (VIR DHAVLA) کی فوج میں شامل ہو گیا۔

85۔ اپنے کتبہ میں ادے سنہا نے ترکوں سے اپنے ٹکراؤ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے قدیم ترین دستاویز کی تاریخ 1205ء ہے۔ ایپی گرافیا انڈیکا، xii، ص۔ 53۔

86۔ اوجھا: راجپوتانہ، i، ص۔ 272؛ انڈین اینٹی کیوری، 1928، ص۔ 55۔ روایت ہے کہ گجرات کے وارد ھابالا (VIRADHABALA) نے اس مہم میں جیترا سنہا کی مدد کے لیے ایک فوج بھیجی ممکن ہے یہی التتمش کی آئندہ گجرات مہم کا سبب رہا ہو۔

87۔ اوجھا: راجپوتانہ، ii، ص 462۔

88۔ یہ تمام جگہیں التتمش کی فتوحات کی فہرست میں شامل ہیں۔ منہاج: ص، 179۔ کا تھینگر کے قریب کامان میں اس نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو اب چونسٹھ کھمبا کے

نام سے مشہور ؛ دیکھئے کنہگم (CUNNINGHAM) ؛ رپورٹس (REPORTS) XX ،
ص ص 11 اور 56 ۔

89۔ منہاج ، ص۔ 236 ۔

90۔ ایضاً ، ص ۔ 176 ۔

91۔ منہاج ، ص۔ 176 ۔

92۔ اوجھا ؛ راجپوتانہ ، i ، ص۔ 201-202 ۔

93۔ منہاج ، ص 175 ، م۔ بہ۔ گوالیار نامہ صفحہ ذیل 11 ۔

94۔ منہاج ، ص۔ 240 ۔

95۔ کنہگم ؛ رپورٹس ، XXI ، ص۔ 104۔ ریورٹی ؛ ح۔ س۔ ص ، 824 نوٹ نے اس کی شناخت صوبہ متوسط میں دموہ (DAMOH) سے کی ہے ؛ لیکن یہ جنوب میں بہت فاصلے پر واقع ہے۔

96۔ ایپی گرافیا انڈیکا ، VIII ص۔ 223-224 ؛ کنہگم : کوئنس آف مڈیول انڈیا (COINS OF MEDIVAL INDIA) ص 91 ۔ ان دونوں کا غذات میں چہیرا جاری (CHAHIR AJARI) کو غلطی سے رنتھمبور کا ناہر دیو (NAHARDEVA) سمجھ لیا گیا ہے۔ اسی لیے بیان کیا جاتا ہے کہ تباسئ مہم اسی کے خلاف تھی۔ منہاج نے رنتھمبور کے ساتھ چہارا جاری کا ذکر نہیں کیا۔ جس کے رانا کا نام مسلسل ناہر دیو بتایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ، ص ۔ 292 ریورٹی کا ترجمہ ، ص۔ 818 ۔ اس نکتہ کے لیے ۔م۔ بہ ، انڈین اینٹی کویری۔ 1918 ص۔ 242-243 ۔

97۔ منہاج ، ص۔ 179 ، قنوج کے خراج سے التمش نے ایک یادگاری سکہ جاری کیا ، رائٹ (WRITE) ، شمارہ۔ 52 اور ص 71- 72 ۔

98۔ اس کتبے کو بارھویں صدی کے اختتام اور تیرھویں صدی کی ابتدا کے درمیانی زمانے سے منسوب کیا جاتا ہے ؛ ایپی گرافیا انڈیکا ، i ، ص ص 61 - 62 - ایک مہان منت راشٹر کوٹ سلسلے کا بھارہ دیو (BHARAHA DEVA) کانیہ کبج دیس " کے ملک میں کہیں حکومت کر رہا تھا۔ ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین

پیپل V، ص. 50-51۔

99۔ منہاج، ص 170، م۔ بہ۔ بڑوا: ح۔ س، ص 224 اور کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، iii، ص۔ 54۔ جس میں بارتو (BARTU) کو آسام کے ایک رویتی بادشاہ سمجھا گیا ہے اور اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نے بختیار اور عوض (IWAZ) دونوں ہی کی مخالفت کی۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ بارتو کا ذکر اودھ کے سلسلے میں آیا ہے۔ دیکھئے رے (RAY): ڈائنٹک ہسٹری (DYN TIC HISTORY) i، ص 545، جو اپنا تعلق گڑھوال خاندان سے ظاہر کرتا ہے پھر بھی بارتو کی شناخت بھارت پال (BHARA PALA) سے کی جا سکتی ہے۔ جو چوہان شہزادے اہوا ملا (AHAWA MALLA) کا جد امجد تھا۔ اور جس کا وزیر کاہنا (KAN HA) اپھیرنش میں انوایا۔ ریانا۔ پایو (ANVAYA- RAYANE- PAIU) کے مصنف جین شاعر لکھنا کا سرپرست تھا۔ یہ تصنیف 1256ء میں رائے بھار (RAI BHA) میں کی گئی جہاں بھرت پال (BHARHT PALA) نے اپنا دار السلطنت چندوار سے منتقل کر دیا تھا۔ چندوار آگرہ ضلع میں فیروز آباد کے قریب ہے۔ ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل، V، ص 349-350۔

100۔ منہاج، ص۔ 247۔ اس سلسلے میں جونپور کے قریب اینٹ پر لکھے ہوئے ایک کتبے مورخہ 1273 وکرمی مطابق 1217ء کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ جس میں کچھ [illegible] مہاجنوں نے کسی زمین سے متعلق رہن کی یادداشت لکھی ہے۔ جس میں مروجہ سکہ کا ذکر شبدودِک ڈرما (SHABODIK DRAMA) [شہاب الدین کا درہم (SHAHABUDDIN'S DIRHAM)] کے نام سے ہے۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال، XIX، ص۔ 454-456۔

101۔ منہاج: ص۔ 179۔ چھپے ہوئے متن میں دربھنگا کا ذکر اس کی فتوحات میں شامل ہے۔

102۔ یہ تاریخ منہاج نے ص 176 پر 20 رشعبان 633ھ / 30 راپریل 1236ء دی ہے۔

103۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی میں اس کی احتیاط کے لیے دیکھئے فرشتہ، i، ص۔ 7-9۔

اس کے دل میں صوفیوں کا بڑا احترام تھا ۔ منہاج ، ص ص ۔ 166 - 168 ؛ برنی
نے ص ص ۔ 103 - 137 پر ایسے دُرویشوں کے لیے اس کی محبت کا مفصل ذکر کیا ہے
جو دنیا کی مادّی دلچسپیوں کو خیر باد کہہ دیتے ہیں ۔ دیکھئے فوائد الفواد صفحہ ذیل 65،
اس مثال کے لیے کہ کس طرح اس مذہبیت نے اس کے سامراجی ارادوں کی تکمیل
میں ذکر جام اولیائے دہلی صفحہ ذیل 201 اے ۔

104۔ منہاج ، ص ۔ 174 ۔

105۔ برنی ؛ ص ۔ 63 - 64 ۔

پانچواں باب

موروثی جھگڑے اور بغاوتیں

1236ء - 1265ء

خلیفہ کی طرف سے اعزاز ملنے کی خوشیاں مناتے ہوئے ابھی چھ ہفتے ہی ہوئے تھے کہ التتمش کو ولی عہد شہزادے نصرالدین محمود کی وفات کی خبر موصول ہوئی۔[1] یہ خبر سنتے ہی اس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ کیوں کہ موروثی سلطنت کا جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ اسے منتشر ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ سلطنت کی ابتدائی مشکلات ختم ہو چکی تھی اس لیے موروثی تبدیلی مشکلات پیدا کر سکتی تھی کیوں کہ ایک مستقل اور مستحکم بغاوت ناگزیر ہو چکی تھی۔ لیکن اسے اپنے لڑکوں میں کوئی ایسا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس کے کندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی جا سکے۔ سب سے بڑا لڑکا فیروز کاہل اور غیر ذمہ دار تھا اور دوسرے لڑکے بہت کم عمر تھے۔ اپنی اولادوں میں سے اُسے صرف ایک اولاد ایسی نظر آ رہی تھی جس میں ہمت اور ہوشیاری کی ضروری جھلک نظر آتی تھی اور وہ تھی اس کی سب سے بڑی لڑکی رضیہ۔ جس کو اگر ضروری تربیت دی جاتی تو شاید وہ اس مشکل ذمہ داری کو سنبھالنے کے لائق ہو سکتی تھی۔ فرمانروا ملکہ ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کے لیے ایک انوکھا تجربہ ہو لیکن ایک ایرانی نژاد کے لیے یہ بات نئی نہیں تھی۔ کیوں کہ اس کی نسل اور تہذیبی روایات، صنف نازک کی فرمانروائی سے آشنا تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ شریعت اس خیال کی مخالفت کرنے کے

یے طرح طرح کے جواز اور دلیلیں پیش کرے گی۔ لیکن التتمش اپنی اس تربیت پر بھروسہ کرسکتا تھا جو اس نے دینی امور میں حاصل کی تھی اور اس کے سہارے وہ ان احکامات سے انحراف کر سکتا تھا۔ جن کی تاویل کی روایات صدیوں سے چلی آرہی تھیں۔[2] مگر اس کو شبہ یہ تھا کہ سب سے زیادہ مخالفت اس کے بیٹوں اور ان کے درباری اور فوجی حمایتوں کی طرف سے ہوگی۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ درباریوں اور افسران کی خواہش کے خلاف تاج کو سنبھال لے گی، یقیناً ایک حماقت آمیز رجائیت پسندانہ بات تھی اس میں شبہ نہیں کہ اگر التتمش چاہتا تو لوگوں کو اس بات پر مجبور کرسکتا تھا کہ وہ ایک عورت کو وارثِ سلطنت کے طور پر تسلیم کرلیں لیکن سمجھداری، احتیاط کا تقاضا کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ فیروز کے کردار کی بروقت تبدیلی بہر کیف اس مسئلے کو حل کرسکتی تھی۔

1268ء/625ھ فیروز کو پہلی ذمہ داری بدایوں کی دی گئی۔ اگلے کچھ برسوں تک التتمش نے اس کو پرکھنے کی کوشش کی اور برابر مشورے دیتا رہا۔ ایک طرف تو اس کی نظر عوامی امور میں فیروز کے رویئے پر تھی۔ دوسری طرف اس نے رضیہ کو انتظامی کاموں میں شامل کرنا بھی شروع کر دیا۔ لیکن سب سے بڑا قدم اس نے اس وقت اٹھایا جب 1231ء/ 629ھ میں گوالیار کی مہم کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ اس موقعہ پر اس نے دارالخلافہ کی نگرانی رضیہ کے سپرد کردی[3] اس کا نتیجہ یقیناً ہمت افزا رہا ہوگا۔ کیوں کہ اس تجربے نے اس سوال کا جواب فراہم کر دیا۔ فیروز ابھی تک اپنی صلاحیتوں کو ثابت نہیں کر سکا تھا۔ اور اب اس مسئلہ کو ملتوی کرنا ناعاقبت اندیشی کے مترادف ثابت ہوتا۔ چنانچہ اپنی واپسی کے فوراً بعد اس نے رضیہ کی تخت نشینی کے فرمان کا مسودہ تیار کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس طرح دراصل اس نے اپنے درباریوں کے لیے اپنی اپنی رائے کو ظاہر کرنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ جیسا کہ اس کو امید تھی اعتراض ہوا۔ لیکن قانونی بنیادوں پر نہیں بلکہ جوان بیٹے اور اولوالعزم ماں کے مقابلے میں ایک لڑکی کو سامنے لانے پر[4] تاہم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی رضیہ کی صلاحیتوں پر کیے جانے والے شبہ کو آسانی سے دور کر دیا گیا۔ کیوں کہ اس کی صلاحیتوں کو عام طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔

رضیہ کی نامزدگی کو زیادہ سے زیادہ شہرت دینے کے خیال سے اسی کے نام کو چاندی کے ٹنکوں میں شامل کر دیا گیا[5]

یہ ایک معقول انتخاب تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا التتمش کو اپنے منصوبوں کی تکمیل مشکل نظر آنے لگی۔ اپنی نااہلیت کی وجہ سے وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ فیروز کی فضول خرچی میں لوگوں کو اپنی طرف کر لینے کی کشش ضرور ہے۔ اس کی ماں شاہ ترکان ایک ماہر سازشی تھی۔ جس کے ہمدرد ریاست کے افسروں میں موجود تھے۔ روزنامچوں سے ہمیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ متوقع تبدیلی کا اثر فیروز کے چال چلن پر تھا یا درباریوں کی گپ شپ نے التتمش کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان اندیشوں کو ان خدشوں سے زیادہ اہمیت دے دے جو نیک نیتی پر مشتمل تھے۔ اس سے صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ التتمش 1226ء کی مہم سے واپس ہوتے وقت جب لاہور سے فیروز کو اپنے ساتھ واپس لایا تو وہ اُسے کچھ مزید رعایات دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فیروز کا ابھی حال ہی میں لاہور تبادلہ کیا گیا تھا۔ اور چوں کہ اس کے جو لڑکے زندہ تھے ان میں وہ سب سے بڑا تھا اس لیے لوگوں کی آنکھیں اس کی طرف لگی تھیں۔[6]

تاہم ایسی کوئی دستاویز موجود نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ پہلے فرمان شاہی کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ التتمش کی موت کے وقت تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا تھا۔ التتمش نے فیروز کے سلسلے میں جو آخری قدم اٹھایا تھا اس سے فیروز کو اپنی بہن کے مقابلے پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ شاہ ترکان نے فوری کارروائی کی۔ اسی رات اپنے بیٹے کی تاج پوشی کر کے "رکن الدین فیروز" کے نام سے اس کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔[7]

اس کی تخت نشینی دراصل عملی طور پر رضیہ کی منسوخی تھی اور یہ ان صوبائی افسروں کا کام تھا جو آخری معرکہ میں مرحوم بادشاہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کارروائی کو ریاست سے متعلق تمام لوگوں کی تائید حاصل تھی۔ اگر تائید نہیں حاصل تھی تو وہ صرف دہلی کے عام باشندوں کی جنھوں نے اس وقت تک اطاعت کا رسمی حلف نہیں اٹھایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھول تھوڑا

وقت گزرنے پر سدھار دی جاتی لیکن صوبائی افسران کی روانگی کے فوراً ہی بعد فیروز نے اپنے رویئے سے اپنے باپ کے خدشوں کو صحیح کر دکھایا۔ اس نے رنگ رلیوں اور عیش و عشرت کی زندگی کا اب کھولا اور اس طرح عنان حکومت اس کی ماں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ وہ ایک حاسد عورت تھی۔ اس نے التمش کی دوسری بیویوں اور ان کے بچوں کو بڑی بے رحمی سے اذیت پہنچانا شروع کر دی۔ سلطنت کا خزانہ سلطان کی عیاشیوں نے خالی کر دیا۔ بغض و حسد کے اس زنانے راج کا فطری ردِّ عمل ہوا۔ خود اس کے اپنے ہمدردوں نے اپنی جلد بازی میں کیے جانے والے فیصلے کی اصلاح کا تہیہ کیا۔ یہاں تک کہ وزیر جنیدی بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر اُن صوبے داروں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جو دارالسلطنت کے خلاف پیش قدمی کی تیاری کر رہے تھے۔

فیروز کے چھوٹے بھائی غیاث الدین کا تقرر اودھ میں کیا گیا تھا۔ اس نے دہلی آتے ہوئے لکھنوتی کے لگان پر قبضہ کر کے بغاوت کر کے سرکشی کا آغاز کیا۔ راستے میں اس نے ہندوستان کے متعدد شہروں کو تباہ و برباد کر کے لوٹ لیا[۸] ملتان، لاہور، ہانسی اور بدایوں کے گورنر اپنی فوجیں یک جا کر کے منصور پور پہنچ گئے۔ فیروز اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلا لیکن راستے ہی میں اس کے فوجی افسروں نے بغاوت کر دی اور اس کے ذاتی نگہبانوں کو قتل کر کے دارالخلافہ لوٹ آئے۔[۹]

یہاں اُن کی رضامندی سے حالات نے ایسا پلٹا کھایا جس کی توقع شہر کی طرف بڑھنے والے صوبے دار نہیں کر سکتے تھے۔ فیروز کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رضیہ نے بڑی چالاکی سے اس کی ماں کی حکومت کے خلاف پیدا ہونے والی بے اطمینانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ روایتی سرخ ماتمی لباس میں، وہ جمعہ کی نماز کے لیے جمع ہونے والے عام آدمیوں کے مجمع میں پہنچ گئی اور وہاں اس نے شاہ ترکان کی فتنہ پرور اور سازشی حکومت کے خلاف امداد کے لیے التمش کے نام پر عوام سے اپیل کی[۱۰] رضیہ کے اس ڈرامائی انداز نے التمش سے وفاداری کے جذبہ کو بھڑکا دیا۔ اور پھر اس کے فرمان شاہی کو بروئے کار لانے کے لیے عوام میں انتہائی جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ اِسامی ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے عوام سے معاہدہ تک کر لیا تھا۔ "کہ اسے اپنی صلاحیتوں کو ثابت کرنے کا موقعہ دیا جائے اور اگر وہ

مردوں سے بہتر نہ ثابت ہو تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔[12] فوجی افسروں نے اس کارروائی کے لیے اپنا سارا زور لگایا۔ اس سے پہلے کہ فیروز شہر واپس پہنچتا رضیہ کی تخت نشینی مکمل ہو چکی تھی اور شاہ ترکان کو جیل میں ڈالا جا چکا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد فیروز کو حراست میں لے کر قتل کر دیا گیا اور اس طرح سات مہینے کی شرمناک حکومت کا اختتام ہوا۔

رضیہ کے سر پر تاج رکھ کر فوجی افسران اور عوام ظاہر ہے التمش کی اس خواہش کی تکمیل کر رہے تھے جس کا اس نے اظہار کیا تھا۔ لیکن درحقیقت اُن کی اس کارروائی نے صوبے داروں کے ان حقوق کو منسوخ کر دیا تھا جو اُنھوں نے فیروز کے سلسلے میں مستقل بنیاد پر منوا لیے تھے جن کے تحت بادشاہ کی نامزدگی میں اُن کی آواز کو برتری حاصل تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ فیروز کے تخت سے ہٹا دیے جانے سے ان کا فوری مطالبہ پورا ہو جاتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے دہلی کی سمت اپنی جارحانہ پیش قدمی جاری رکھی۔ ان کے رویے سے ظاہر تھا کہ اُنھوں نے اس اٹل فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ رضیہ کو قانونی طور پر حق حاصل نہ تھا۔ بلکہ اُن کا اعتراض تو اس تمام کارروائی کی مبینہ بے قاعدگی پر تھا۔ ریاست کا مشیرِ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے وزیر نے بھی محسوس کیا کہ جیسے اسے نظرانداز کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ بغاوت جاری رہی۔ ان سب لوگوں نے شہر کے سامنے ڈیرا ڈال کر جارحانہ کارروائی شروع کر دی۔ ملک نیا سائی کو رضیہ نے اودھ کا گورنر بنا کر اپنا ہمنوا بنا لیا تھا اس نے کمک پہنچانے کی کوشش کی مگر باغیوں نے اسے پکڑ لیا اور قید خانے میں اس کی موت واقع ہوئی۔[13] فوجی نقطہ نظر سے اس کی پوزیشن یقیناً کمزور تھی لیکن اس کی دورخی سیاست زبردست نجات دہندہ ثابت ہوئی۔ وہ بیرونِ شہر نکل کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے مُلک سالاری اور مُلک کبیر خان کو اس یقین دہانی پر پوشیدہ طور پر ملا لیا کہ وزیر کوچی اور جانی کو حراست میں لے لیا جائے گا۔ رضیہ نے اس پوشیدہ معاہدہ کی خبر آخرالذکر لوگوں کے درمیان اُڑا دی۔ چنانچہ وہ لوگ ڈر کے بھاگ نکلے۔ ان کا پیچھا کیا گیا۔ جانی اور کوچی پکڑ کر قتل کر دیے گئے۔ وزیر سرمور نے پہاڑوں پر تن

تنہا ایک مفرور کی حیثیت سے جان دے دی[14]

اس کامیابی سے اس کی پوزیشن مستحکم ہو گئی۔ اور پھر اس نے حکومت کو منظم کرنے کی کاروائی شروع کی۔ وزارت کا عہدہ خواجہ مہذب الدین کے سپرد کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد، ایبک کے مرتے ہی ملک حسن غوری نے فوج کی کمان سنبھال لی۔ اپنے ساتھیوں سے غداری کرنے کے انعام میں کبیر خان کو لاہور کی گورنری دے دی گئی۔ التتمش کے دور حکومت کے آخری حصے میں جب ملک جانی کو صوبے سے ہٹا کر سیف الدین ایبک کو لکھنوتی منتقل کیا گیا تو اس کی جگہ طغرل تغان خاں کو بہار کی گورنری سونپی گئی تھی۔ لیکن تین سال بعد جب ملک ایبک کا انتقال ہو گیا تو تغان خان نے بزور لکھنوتی پر قبضہ کر کے دونوں صوبوں کو ملا دیا۔ یہ کاروائی دراصل کھلم کھلا طور پر دہلی کے اقتدار کی خلاف ورزی کے مترادف تھی جو رکن الدین فیروز کے دور حکومت میں پیدا ہونے والے انتشار کی وجہ سے بالکل غیر موثر ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے رضیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس لیے اس کو ترقی دے کر وائسرائے کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اچھ کو ہندو خاں کے سپرد کر کے بدایوں کو ملک اتیگین کے تحت دے دیا گیا[15] روزنامچے میں بیان کیا گیا ہے کہ" دیبل سے لے کر لکھنوتی تک ملکوں اور امیروں نے واضح طور پر اطاعت قبول کر کے اپنے آپ کو حوالے کر دیا[16]

رضیہ کی برتری کو تسلیم کرنے کی اس کاروائی میں جیسا کہ انجام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دراصل ایک دبی ہوئی مخالفت پنہاں تھی۔ فیروز کے خلاف بغاوت کرنے والے افسر اپنے کو آسانی سے ایک ایسی شہزادی کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے جو خود ان کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ شہزادی کو خود بھی اپنے باپ کے ان ترکی افسران اور غلاموں کی خطرناک طاقت کا اندازہ تھا۔ جنھوں نے ریاست کی ساری طاقت کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ تاہم رضیہ نے صوبائی حکام کو نہ صرف کچل ڈالا بلکہ خطرناک قسم کی آئینی نظیر بھی نہیں بننے دی۔ تاج کی لاج رکھ لی۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ شہنشاہیت کو صحیح مقام دینے کے لیے اس کاروائی کو جاری رکھا جائے۔ ترکوں کے سامنے اس وقت جو صورت حال تھی اس میں موروثی قیادت صرف اسی وقت

اچھے نتائج پیدا کرسکتی تھی جبکہ اس کو قطعی برتری حاصل ہو۔ تیرھویں صدی کے ہندوستان میں بادشاہ کے وجود کا جواز صرف اس کے استقلال اور استواری میں تھا اس لیے ہمت اور اٹوٹ حوصلہ مندی رضیہ کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اخلاق اور سیرت کے استحکام سے اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ "مردوں سے بہتر ہے۔" اس سلسلے میں اس نے جو اقدامات کیے اُن کی تفصیل تحریری طور پر نہیں ملتی۔ لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ عورتوں کی پوشاک کو چھوڑ کر۔ عوام کے سامنے شہہ سواری کر کے اور کھلے ہوئے دربار لگاکر[17] وہ اپنے مزاج کے استحکام اور دم خم پر زور دینا چاہتی تھی۔ حالاں کہ بعد میں رضیہ کی انھیں باتوں کو مخالفین نے اہانت آمیز اور رسوا کرنے والا ٹھیرایا۔

اس جگہ یہ سوچنا نامناسب بات نہ ہوگی کہ شاہی اصطبل کے ایک حبشی عہدہ دار ابیسینا کے باشندے جمال الدین یاقوت پر لطف وکرم اور نوازشوں کی بارش اسی دور میں ہوئی ہوگی۔[18] ترکی امراء نے اہم عہدوں پر جو اجارہ داری قائم کر رکھی تھی یہ عمل دراصل اس اجارہ داری کو توڑنے کے لیے کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ امیر حاجب کی طرح امیر اخور کے ساتھ عظیم استحقاق اور طاقت وابستہ تھی۔ اور غالباً یہ جگہ ہمیشہ ترکوں کے قبضے میں رہی تھی۔ اسامی کا بیان ہے کہ یاقوت دراصل فیروز کی تخت نشینی کے وقت سے رضیہ کے موقف کا حامی تھا۔[19] اس لیے لطف وکرم کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ملکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے رضیہ کا اس پر دار و مدار بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

برسر حکومت آنے کے تیسرے ہی سال شہزادی کا اصل مقصد کھل کر سامنے آچکا تھا۔ اس کی ہر حرکت سے اعلیٰ فوجی افراد یہی سمجھتے تھے کہ رضیہ اُن کے تسلط کو للکار رہی ہے اس لیے اس میں تعجب کی گنجائش نہیں کہ امیروں اور ملکوں کی خفیہ سازش تیز ہوگئی تھی۔ یہ امیر دربار میں اور پڑوسی صوبوں میں پھیلے ہوئے تھے اور اُن کا مقصد نہ صرف رضیہ کو تخت سے ہٹانا تھا بلکہ مستقبل میں تخت سنبھالنے والے بادشاہ کو مستقل طور پر اور قانونی لحاظ سے بے اثر بنانا تھا۔[19] اس سازش کا سربراہ بدایوں کا سابق گورنر اور موجودہ امیر حاجب ایتگن تھا جس کی ملکہ سے قربت اس کام کے لیے بڑی کارآمد تھی۔ یہ بھٹنڈا کے سپرنٹنڈنٹ

ملک التونیہ کا بہت بڑا دوست تھا۔[21] لیکن اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا فیروز کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل نظر آرہا تھا کیوں کہ شہر میں ملکہ کے بے پناہ ہمدرد موجود تھے۔ اور اس کی کڑی نگرانی کی وجہ سے محل میں انقلاب کا کوئی امکان نہ تھا۔ شہر کا فوجی محاصرہ کرنے سے اب کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر محاصرہ کرنا ہی تھا تو حکومت کے ابتدائی دور میں کرنا چاہئے تھا۔ اس لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ اسے ورغلا کر کسی دور دراز صوبے میں ایک عظیم الشان فوجی طاقت کے ذریعہ پکڑ لیا جائے اور پھر دارالخلافہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ 1240ء کی ابتدا میں کبیر خاں نے لاہور میں بغاوت کر دی۔ براہ راست شہادت تو نہیں ملتی۔ لیکن بعد میں ہونے والے واقعات اسے سازشوں کے عام منصوبے سے جوڑ دیتے ہیں۔ ملکہ نے فوری کارروائی کی۔ جیسے ہی اس نے بغاوت کی خبر سنی تو جتنی فوج بھی اس وقت مہیا ہو سکی اُسے لے کر نکل کھڑی ہوئی۔ اور اس طرح اس نے موقعہ واردات پر اُن لوگوں کو فوجیں جمع کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔ کوئی مدد نہ پہنچنے کی وجہ سے کبیر خاں زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکا اس لیے وہ پسپا ہو کر مغرب کی طرف چلا گیا۔ مغرب میں اُسے چناب کے پاس رکنا پڑا کیوں کہ چناب کے اُس پار منگولوں کی فوجی نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ ملکہ کی فوجیں پیش قدمی کر کے جب اس کے پاس پہنچیں تو اس نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔[22]

رضیہ کی بر وقت کارروائی نے فتنہ پردازوں کی پہلی چال کو ناکام کر دیا۔ اس کی واپسی کو ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ بھٹنڈا سے سرکشی کی خبر موصول ہوئی ایتگین کے دوست التونیہ نے کھلم کھلا بغاوت کر دی تھی۔ وہ مخالفت کو ابتدا ہی میں کچل دینے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی اس لیے آرام لیے بغیر گرمی کی شدت اور رمضان کے مہینے کی تکلیفوں کو نظر انداز کر کے وہ فوراً روانہ ہو گئی۔[23] اس دفعہ فتنہ پردازوں نے اپنی چالوں کا بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا تھا۔ جب وہ بھٹنڈا پہنچی تو اس کے ماتحت افسروں نے یاقوت پر اپنا سارا غصہ اتارا اور اسے قتل کر دیا۔ اس کارروائی کی تفصیلات دستاویزیں نہیں ملتیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ رضیہ کے ہمدردوں میں سے ایک کو راستے سے ہٹا کر فتنہ پردازوں کو اسے گرفتار

کرنے میں آسانی ہوگئی۔ چنانچہ انھوں نے اُسے گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔[24]
شاہی فوجیں چوں کہ دہلی سے دور تھیں اس لیے شہری مؤثر طور پر فتنہ پردازوں کا
مقابلہ نہ کر سکے۔ موقعہ دیکھ کر سازش کرنے والوں نے اپنے سیاسی منصوبے کو عملی
جامہ پہنانے کی کوشش شروع کر دی۔ رضیہ کی گرفتاری کی خبر پاکر اگلے بادشاہ
کا انتخاب فوراً کر لیا گیا۔ انھوں نے التتمش کے تیسرے بیٹے بہرام کو تخت پر بٹھا دیا۔
اس نے اپنے جلوس پر معزالدین کا نام اختیار کیا۔ اور سرخ محل میں بیٹھ کر ہمدردوں
اور ساتھیوں سے مبارکباد قبول کرنا شروع کر دی۔ دوسری طرف بھٹنڈا کے
قلعے میں التونیہ کے تحت رضیہ کو مستقل طور پر حراست میں لے لیا گیا۔ اب سازش
کے لیڈر بڑے اطمینان سے دہلی واپس لوٹے تاکہ وفاداری کا رسمی حلف اٹھا کر
بہرام کی تخت نشینی کی منظوری دیں۔[25]

رضیہ کی معزولی دراصل اعلیٰ ترکی فوجی افسران کی فتح تھی یعنی مُلک اور امیروں
کی۔ ایسا لگتا ہے کہ بہرام کو دراصل تخت پر بیٹھنے کا کام اس شرط پر سپرد ہوا تھا کہ
وہ فرمارَوائی کا حق اُن افسروں کے سپرد کر دے گا وہ صرف فرمارَوا رہے گا اور
حکم افسروں کا چلے گا۔ ایک نیا محکمہ "نائب مملکت" کے نام سے کھول کر اس معاہدے
کو ایک ٹھوس شکل دے دی گئی۔ اس کے بعد بہرام کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ
ایک تحریری فرمان کے ذریعہ اپنے تمام اختیارات نائب مملکت کے سپرد کر دے۔
سازش کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے یہ عہدہ ایتگن کو دیا گیا اور وزیر مہذب الدین
بھی چونکہ اس کارروائی کا ایک فرد تھا اس لیے اس کی حیثیت ثانوی رکھی گئی۔[26]
ایتگن اس عہدے پر بڑے کرّوفر اور رعب سے سامنے آیا بلکہ اس نے کچھ اختیارات
شاہی بھی اپنا لیے مثلاً اس کے دروازے پر ہاتھی جھومنے لگا اور نوبت بجنے لگی۔
اس نے بادشاہ کی ایک بہن سے شادی بھی کر لی۔ اپنے عہدے سے اس طرح کے غلط
فائدے اٹھاتے دیکھ کر بہرام کو اس سارے ماحول سے گھٹن آنے لگی۔ وہ اس بات
کو خوشی سے ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس کے اختیارات شاہی اس طرح سے
چھین لیے جائیں اور نائب کی اس دیدہ دلیری کو وہ آسانی سے ہضم بھی نہ کر سکتا
تھا۔ چنانچہ وہ اس جبریہ معاہدے سے نکلنے کی سوچنے لگا۔ بالآخر وہ نائب کو اس

دفتر میں قتل کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

التونیہ سے وعدہ کیا تھا کہ فتنہ پردازوں کی فتح سے جو مالِ غنیمت ہاتھ لگے گا اس کا ایک بڑا حصہ اس کو دیا جائے گا۔ لیکن ایتگین کے قتل سے اس کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس وقت اس کی پارٹی بہت غیر منظم تھی۔ اسی رازداری کے ساتھ اور اسی بنیاد پر پارٹی کو ایک بار پھر جمع کرنے کے لیے نہ صرف ایک لمبا عرصہ درکار تھا بلکہ پہلے سے زیادہ موقعہ ملنے کی ضرورت تھی جس کی اب وہ امید نہیں کرسکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہرام نے اپنے پرانے ہمدردوں کو مستقل طور پر اپنے آپ سے الگ کردیا تھا۔ اس کے حمائتی ملک سالاری اور قراقش اس کے دربار سے نکل کر بھٹنڈا میں التونیہ سے مل گئے تھے۔ لیکن ایک اچھا منصوبہ خود بخود سامنے آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اسیر شہزادی سے شادی کرے اور پھر فوجی طاقت کے ذریعہ تخت کا دعویٰ کرے تو کام آسان بھی ہو جائے گا اور نتائج بھی اچھے نکلیں گے۔ یہ منصوبہ رضیہ کے لیے بھی مناسب تھا۔ چنانچہ اسی سال اگست کے مہینے میں رضیہ نے اپنے سابق باغی سے شادی کرلی اور شاہی نشان امتیاز کو لے کر انھوں نے طاقت کے ذریعہ دارالخلافہ پر قبضہ کرنے کے لیے پیش قدمی شروع کردی۔[29] بہرام کی باقاعدہ افواج اس کی کرائے کی افواج پر پوری طرح غالب رہیں۔ چنانچہ ان کو بھٹنڈا واپس بھگا دیا گیا۔ واپسی میں کیتھل کے مقام پر اس کے فوجی چھوڑ بھاگے۔ اور 25 ربیع الثانی 638ھ/13 دسمبر 1240ء کو جب وہ ایک درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے تو کچھ ہندو ڈاکوؤں نے دونوں کو قتل کردیا۔[30]

ایتگین کا زوال دراصل سلطان کی فتح تھی۔ کسی دوسرے نائب کا تقرر نہیں کیا گیا۔ لیکن اب نئے امیر حاجب بدرالدین سنقار نے آمرانہ اختیارات حاصل کرلیے یہاں تک کہ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر نئے فرمان تک جاری کردیے۔[31] وزیر کو اس طرح بالا بالا نظرانداز کیا جائے اس لیے وہ بدلہ لینے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے امیر صاحب کو تباہ کرنے کی چال چلی۔ امیر کے خلاف جھوٹے الزامات سننے کے لیے اس نے سلطان کو تیار پایا۔ اپنی سلامتی کے بارے میں مشکوک اور وزیر کی سازش سے بے خبر سنقار نے بہرام کو ہٹانے کی سازش کے سلسلے میں شہر

کے مذہبی پیشواؤں کو ملانے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ اسی قسم کے ایک خفیہ جلسے میں اس نے وزیر کو بھی مدعو کر لیا۔ اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر اس نے بدلہ لینے کی خاطر اس مساوی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ نتیجہ کے طور پر سنقار کو جلاوطن کر کے بدایوں بھیج دیا گیا۔ اور جب وہ اجازت کے بغیر آیا تو اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔[32] اس کے حمائیتوں کو بھی اسی قسم کی سزا دی گئی۔

مُلکوں سے بہرام نے جو معاہدہ کیا تھا۔ اب ایتگن کی موت کے ساتھ ختم ہو گیا اور اب سنقار کی موت نے اس قطع تعلق کو مزید توسیع دے دی۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں میں سے کچھ کو سزا دے کر اس نے اس فرقہ کو بھی برگشتہ کر دیا۔ بہرام کے ایک ناعاقبت اندیش اقدام کی وجہ سے مہر کے قاضی کو موت کی سزا ملی اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ اس کے سخت دشمن بن گئے۔[33] وزیر ایک کینہ پرور اور بد معاش آدمی تھا وہ اس موقعہ کا انتظار کر رہا تھا کہ سلطان سے اپنا بدلہ چکائے۔ یہ موقعہ بہت جلد دستیاب ہو گیا۔ 639ھ/1241ء میں منگولوں کے ایک دستے نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ شہر کو آزاد کرانے کے لیے فوج کا بھیجنا ضروری ہو گیا۔ وزیر ان کے ساتھ گیا اور جب فوج لاہور کے پاس پہنچی تو اس نے افسروں کو سلطان کا ایک خفیہ حکم نامہ دکھا کر خوفزدہ کر دیا۔ جس میں ان افسروں کو گرفتار کر کے قتل کرنے کا حکم تھا۔ اس غدّاری سے برانگیختہ ہو کر فوج نے نہ صرف بغاوت کر دی بلکہ فوج دہلی جا کر ظالم بادشاہ کو تخت سے ہٹانے کے لیے تیار ہو گئی۔ فوج کے ان خدشات کو دور کرنے کے لیے بہرام نے شیخ الاسلام کو روانہ کیا۔ لیکن وہ خود اس سازش میں ملا ہوا تھا۔ اس نے بغاوت کے شعلوں کو اور بھڑکا دیا۔ چنانچہ وزیر اور شیخ الاسلام کے ساتھ فوج دہلی کا محاصرہ کرنے کے لیے روانہ ہو گئی۔ دہلی میں فوجیں نہیں تھیں پھر بھی شہریوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں وزیر کے حمایتی شہر میں بغاوت پھیلاتے میں کامیاب ہو گئے۔ اس میں قاضی اوّل جو بہرام کے نمایاں حامیوں میں سے تھا، بری طرح زخمی ہوا۔ اگلے دن شہر پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔ بہرام کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔[34]

بہرام کے زوال کی وجہ سے ایک دفعہ پھر تاج شاہی کو شکست کا منہہ دیکھنا نصیب ہوا۔ فیروز کے سب سے چھوٹے بیٹے مسعود کو علاء الدین کے نام سے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن شرائط وہی رکھی گئیں جو اس کے چچا کے ساتھ تھیں۔ حکومت قائم ہوئی۔ اس میں مختلف پارٹیوں کی نمائندگی میں بڑی نمایاں تبدیلی تھی۔ نائب کا محکمہ مُلک قطب الدین حسن کے سپرد کر دیا گیا۔ جو غور کا ایک تارک وطن شہزادہ تھا اور شمشی غلاموں کے حلقے سے باہر کا آدمی تھا۔[35] مُلک قراقش خاں نے امیر حاجب کا عہدہ سنبھال لیا۔ بہرام کے مخالف لیڈروں میں سے ایک لیڈر کاشلی خاں کے سپرد راجپوتانہ کی ناگور، مندور اور اجمیر کی وسیع ریاست کی گئی۔[36] منہاج سراج کے استعفیٰ دینے کی وجہ سے امام الدین شفرقانی کو بڑا قاضی بنایا گیا۔[37] تاہم ساری حکومت پر وزیر کا غلبہ تھا جو کہ بغاوت کا اصل بانی تھا اور تمام ترکی مُلکوں کی پوزیشن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ سارے اختیارات وزیر کے پاس تھے بلکہ اس نے شاہی نمود و نمائش کے لیے بہت کچھ اختیارات حاصل کر رکھے تھے۔[38] نائب کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے اعلیٰ افسروں کو ریاستی عہدوں سے الگ کرنا شروع کیا۔ تاہم یہ اقدام ایسا تھا جسے وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ افسروں نے وزیر کو قتل کر کے اس صورت حال سے چھٹکارا پا لیا۔[39] اب اختیارات مکمل طور پر اُن کے ہاتھ میں تھے۔ انھوں نے نجم الدین بکر کو زیادہ اطاعت شعار وزیر پایا۔ مختلف پارٹیوں کا الحاق چوں کہ ختم ہو چکا تھا اس لیے قراقش خاں کو امیر حاجب کے عہدے سے الگ کر کے یہ عہدہ اُن کے ادنیٰ ساتھی بلبن کے سپرد کر دیا گیا۔[40]

صورت حال کے دھارے کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کا کام آخرالذکر کے مقدر میں لکھا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کا تقرر ایک امیدوار کے طور پر ہوا تھا لیکن بلبن نے بہت جلد تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور برتر صلاحیتوں کی مدد سے کل اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ریاست کے انتظامیہ کو اپنے قبضہ میں لے کر اس نے اپنے اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کی طاقت کو راجپوتوں اور منگولوں کے خلاف مہم پر لگا دیا کیوں کہ اس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اس سے پہلے کی حکومتوں کے انتشار

کا سب سے بڑا سبب فوجی کارروائیوں کا فقدان تھا اور دراصل یہی کارروائی تھی جس کی وجہ سے مسعود کی چار سالہ حکومت نسبتاً پرسکون تھی۔

اس کی برطرفی کے حالات تفصیل سے نہیں بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ وہی پرانی اور طاقتیں اس موقعہ پر بھی سرگرم رہی ہوں گی۔ منہاج کا بیان مشکل ہی سے باور کیا جاسکتا ہے [41] جبکہ اس کی فوجوں نے منگولوں پر بڑی اہم فتح حاصل کر لی ہو اور اس کے چچا محمود (نصیر الدین محمود) کی تخت نشینی پرسکون ہو ایسے موقعہ پر اس کی اچانک برطرفی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ مُلکوں کی طاقت بڑی حد تک نہ صرف کم ہو گئی تھی بلکہ غیر منظم بھی ہو چکی تھی۔ بہر کیف اس کے بعد ہم نے مشروط انتخاب کا ذکر دوبارہ نہیں سنا۔ اگلی عملداری تک بلبن کی طاقت اور حیثیت میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہوئی۔ یہ حقائق ایسے ہیں جو اس امکان کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مسعود کی برطرفی کی وجہ اس کی ذاتی ہوس اور محل کا معاملا تھا۔ اور یہ بھی ایک قیاس معلوم ہوتا ہے کہ بلبن نے محمود کی ماں کے ساتھ سازباز کر لی تھی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ روزنامچوں نے اس واقعہ کی تفصیلات دینے سے کیوں تامل کیا۔

نئی عملداری نے جو 23 محرم 644ھ/10 جون 1246ء میں شروع ہوئی [42] ریاست کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی جواب مستحکم طور پر بلبن کے ہاتھ میں تھی۔ 1249ء / 647ھ میں اپنی لڑکی کی شادی نوجوان سلطان سے کر کے بلبن نے اپنی حیثیت اور مضبوط کر لی [43] ایسا لگتا ہے کہ مسعود کا نائب مملکت قطب الدین حسن اس کے بعد تک زندہ نہیں رہا تھا۔ لیکن اس جگہ پر کسی کا تقرر نہیں کیا گیا تھا یہاں تک کہ 50-1249ء میں اس عہدے پر خود بلبن نے اپنا تقرر کر لیا [44] اس کے بھائی کشلی خان کو امیر حاجب بنا دیا گیا۔ اور اس کے چچازاد بھائی شیر خان کے سپرد لاہور اور بھٹنڈا جیسی اہم گورنری کر دی گئی [45] اطاعت شعار ابو بکر بدستور وزیر کے عہدے پر قائم رہا اور غالباً وہ بلبن کے حمایتیوں میں ایک ہو گیا۔ چنانچہ تمام اہم عہدے بلبن کے اپنے آدمیوں کے پاس آگئے۔ اس طرح حکومت پر بلبن کا تسلط مسلم ہو گیا۔ اس صورت حال میں بادشاہ کے خلوت پسندانہ مزاج اور اس کی کمزوری نے مزید اضافہ کر دیا۔ یعنی نائب کے لیے طاقت ہاتھ میں لینا آسان کر دیا۔ دراصل یہ وہ سہولت

تھی جو ایبک کو حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

محمود کے مزاج کی کمزوری کی وجہ سے اسے آسانی سے قائل کیا جا سکتا تھا۔ 1253ء/ 651ھ میں ہندوستانی مسلمانوں اور بلبن اور اس کے بھائی کو دربار سے الگ کرنے کے لیے اچانک حکم جاری کر دیا۔ اس پارٹی کا سربراہ ایک شخص امادالدین ریحان تھا۔ بلبن اور اس کے بھائی کو دہلی چھوڑ کر اپنے اپنے تفویض کیے ہوئے کاموں پر روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا گیا۔[46] ایک نئی حکومت تشکیل کی گئی۔ وکیل دار، امادالدین ریحان اس کا سردار بن گیا۔ وزیر ابو بکر کو غالباً بلبن کا طرفدار ہونے کی وجہ سے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ جنید کا تقرر کر دیا گیا۔ شیر خاں کو بھٹنڈا اور ملتان چھوڑنے پر مجبور کر کے ان دونوں جگہوں کو ارسلان خان کے سپرد کیا گیا، جو نئے گروہ کا ایک نمایاں ممبر تھا۔ یہاں تک کہ منہاج کو بھی اس کے عہدے سے نکال دیا گیا اس کی جگہ ریحان کے نمایندے شمس الدین کو قاضی اوّل بنا دیا گیا۔[47]

اس طرح ریحان نے تمام اہم عہدوں پر اپنے آدمیوں کو مسلط کرنے کی کوشش کی۔ جس کی وجہ سے انتظامیہ کا ترکی حلقہ پس پشت پڑ گیا۔ سیاسی حقیقت پسندی کا تقاضہ تھا کہ اب بلبن غیر ترکی عملے سے بخوشی رابطہ قائم کرے۔ کیوں کہ اب وہ حالات بدل چکے تھے جس میں التتمش مقامی مسلمانوں کو الگ رکھنے پر موثر طور پر اصرار کر سکتا تھا۔ دس سال پہلے مہذب الدین کے عمل کے معاملے کی طرح چھچھورے ہندی خواجہ سرا کی حکومت ترکوں کے لیے قطعی ناقابلِ برداشت تھی۔ مخالفین کے دلوں میں نفرت بھر چکی تھی اور جلد ہی اس نفرت نے بلبن کی سربراہی میں فوجی کاروائی کا روپ دھار لیا۔ ترکی افسروں کی اکثریت نے جو دارالخلافہ کے گرد تعینات کی گئی تھی اپنے فوجیوں کو جمع کیا اور 1254ء رمضان 652ھ میں بادشاہ پر اپنی مرضی اور خواہش مسلط کرنے کے لیے شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ محمود کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ شاہی فوجوں کو لے کر مقابلے کے لیے نکلے۔ اس نے سمانا کے قریب ڈیرا ڈالا جہاں سے وہ باغیوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ جنگ ناگزیر معلوم ہوتی تھی اور ریحان نے اس کی حتی الامکان کوشش بھی کی۔ مگر محمود نے ہمت ہار دی۔ صلح کی تجویزوں پر غور کرنے کے لیے بخوشی راضی ہو گیا۔ بلبن کی جماعت نے اس شرط پر اطاعت قبول کرنے

کی پیش کش کی کہ ریحان کو معزول کر دیا جائے۔ چنانچہ آخرالذکر کا بدایوں کے صوبے میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اور اس کے فوراً بعد اسے بہرائچ بھیج دیا گیا۔ بلبن کو دوبارہ نائب کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ اس کے عزیز اور حمائتی دوبارہ بحال ہوئے۔ اس طرح منہاج اور ابو بکر کو بھی اُن کے عہدے واپس مل گئے۔[48]

تاہم اس مختصر سی خلل اندازی کا اثر حکومت کی پالیسی پر نہیں پڑا۔ بلکہ اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ مرکزی حکومت کے اقتدار کو زیادہ اہمیت دی گئی جو اس کش مکش سے ثابت اور سالم نکل آئی تھی۔ آخر میں ترک باغیوں کا ساتھ دیکر بادشاہ نے اپنے لیے ایک مستحکم سہارا یقینی بنا لیا۔ اس طرح محمود کی فرمارروائی نے اعلیٰ نصب ترکوں کی حکومت کی ضمانت دے دی۔

دارالخلافہ کی سیاسی تبدیلیوں کا بیرونی صوبوں پر اثر پڑنا ضروری تھا۔ جہاں مرکز کی دوری حوصلہ مند لوگوں کو آزادی حاصل کرنے کے لیے اکثر اکساتی رہتی تھی۔ سیاسی اتحاد کی بنیاد پر سلطنت ابھی مشکل سے مجتمع ہوئی تھی کہ التتمش کی موت نے انتشار کا راستہ کھول دیا۔ اس کی بہترین مثال لکھنوتی کی تاریخ میں ملتی ہے۔ آٹھ سال کے دوران دو زبردست معرکے ہوئے تب کہیں جاکر خلجی سرداروں سے اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کروایا جاسکا۔ گورنر کے اختیارات کو کم کرنے کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ صوبے کو بہار سے الگ کر دیا جائے۔ لیکن یہ تبدیلی صرف اس کی موت تک قائم رہ سکی۔ تغان خاں گو کہ ابھی تک اپنی وفاداری رضیہ اور بہرام سے ظاہر کر رہا تھا لیکن اس کے اعمال سے اطاعت گذاری ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ لکھنور کے گورنر سے لڑکر جو غالباً ایک علیحدہ فوجی دستہ تھا اس نے لکھنور پر قبضہ کر لیا۔ بہرام کے دور حکومت کے اختتام پر اس نے بہار کا دوبارہ الحاق کر لیا۔[50] اگلے دور حکومت کے ابتدائی حصے میں اس نے کڑہ، مانک پور اور اودھ کے صوبوں بلکہ اس سے آگے کچھ شمالی اضلاع پر بعض فاتحانہ معرکوں کی سربراہی کی۔[51] مرکزی حکومت کے لیے اس کی یہ حرکت ایک کھلم کھلا چیلنج تھی۔ کیونکہ اودھ میں وہ بادشاہ کے نمائندے کو ہی معزول کرنے کے درپے رہا۔ تاہم مسعود کی حکومت کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ مداخلت کرتی۔ ایسا لگتا ہے کہ، اودھ کا گورنر تیمور خاں اپنے

عہدے کو بچانے کے لیے بڑی مختصر سی فوجی امداد حاصل کر سکا۔ تغان خاں شہر تک پہنچ گیا اور جب وہ مسند نشینی کی تیاری کر رہا تھا اس کا معزز دوست منہاج لکھنوتی میں ملا اور اس نے اسے واپس لوٹنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

اس غیر قانونی حملے کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا اس کی تقدیر میں لکھا تھا کیونکہ بلبن کی ہوشیاری اتنی ہی کامیاب ثابت ہوئی جتنی کوئی فوجی کاروائی ہو سکتی تھی۔ تغان ابھی حال ہی میں جاج نگر (اڑیسہ) کی ہندو فوجوں سے شکست کھا چکا تھا۔ لیکن اب آخر الذکر نے جنگ کو لکھنوتی تک پہنچا دینے کی دھمکی دی تھی۔ اس متوقع خطرے کا مقابلہ کر سکنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے اسے دہلی سے امداد کی درخواست کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جسے بلبن نے فوراً قبول کر لیا۔ ظاہرا طور پر اسے اس کے عہدے پر مستقل کر دیا گیا اور اودھ کے گورنر تیمور خاں کو اپنی فوجیں دے کر اس کی مدد کے لیے روانہ کر دیا۔ تاہم تیمور خاں کے سپرد اصل کام کو راز میں رکھا گیا۔ یہ راز صرف اس وقت کھلا جب اس کی فوجوں نے وہاں پہنچ کر لکھنوتی کے سامنے ڈیرا ڈال دیا۔ اس عرصے میں ہندو فوجیں واپس لوٹ چکی تھیں۔ لیکن تیمور خاں نے تغان سے جھگڑا کر لیا جو جلد ہی ہتھیاروں کی لڑائی میں تبدیل ہو گیا۔ یہ بات اب بالکل واضح ہو چکی تھی کہ شہر محصور ہو چکا ہے۔ تغان شہر کی حدود میں رہ کر اپنے دفاع کی پوری کوشش کی لیکن آخر میں وہ صلح کی بات چیت پر مجبور ہوا اور اسے صوبے کو تیمور خاں کے حوالے کر دینا پڑا۔ اس طرح دہلی کی سلطنت کا مقصد پورا ہو گیا لیکن بعد میں اودھ کا صوبہ اس کے سپرد کر دیا گیا جو ابھی تک اس کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ تغان خاں کی دل جوئی کے لیے اس کے بعد ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ جس پر کچھ چہ می گوئیاں بھی ہوئی ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ 1246ء/ 644ھ میں تغان اور تیمور خاں دونوں کی موت بالکل ایک ہی وقت میں اپنے اپنے ٹھکانے پر ہوئی [52]۔

اگلے آنے والے کچھ برسوں کی لکھنوتی کی تاریخ بالکل واضح اور صاف نہیں ہے روزنامچے میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا ہے کہ تیمور خاں کا جانشین کون تھا۔ [53] یزبک طغرل خاں کے بارے میں جس کا بعد میں لکھنوتی کے تقرر کے سلسلے میں ذکر آتا ہے کہا جاتا ہے کہ شہزادہ جلال الدین کے بعد قنوج اس کے پاس تھا۔ جہاں

اسے 1248ء / 646ھ میں سنبھل اور بدایوں[54] سے منتقل کیا گیا تھا۔ بعد ازاں یزبک کے پاس اودھ تھا جہاں سے وہ لکھنوتی کا عہدہ سنبھالنے کے لیے آیا تھا۔ ضلع دیناج پور میں گنگا رام پور کے مقام پر ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس پر 1249ء / 647ھ کی تاریخ درج ہے۔ یہ کتبہ جلال الدین مسعود شاہ جانی کے وائسرائے کی تصدیق کرتا ہے۔ جو بعد میں غالباً تیمور خاں کا جانشین ہوا تھا۔[55] مسعود کا دور حکومت کب ختم ہوا تھا اس کی صحیح تاریخ کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن نصیر الدین محمود اور یزبک (یزبک طغرل خاں) کے نام پر لکھنوتی کا ڈھالا ہوا ایک سکّہ دستیاب ہوا جس پر کوئی تاریخ بھی پڑی ہے جو 1252ء / 650ھ سے قبل کی نہیں ہو سکتی۔[56]

یزبک بہت جلد تغان کے جوش و خروش کو اپنا کر اس کی مثال پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ جاج نگر کے فاتحانہ معرکے کے بعد وہ اپنی فوجوں کو لے کر اودھ پہنچ گیا۔ اس نے شہر پر دو ہفتے تک اپنا قبضہ رکھا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔[57] تاہم جب اسے دہلی سے شاہی افواج کی آمد کی خبر ملی تو وہ بہت تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن ابھی اسے بڑے حوصلے نکالنے تھے مرکزی حکومت اس بغاوت کو کچلنے میں مصروف تھی جو ریحان کے بعد ہوئی تھی۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یزبک نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ سلطان مغیث الدین کا شاہی لقب اختیار کر کے اس نے اپنے نام کے سکّے جاری کر دیئے۔[58] شاہی لقب کے ساتھ جاری کیے ہوئے سکّے اوّلین سکّوں کی تاریخ 1255ء / 653ھ ملتی ہے۔[59] ایسا لگتا ہے کہ اس کا دور حکومت زیادہ دن نہیں چلا۔ وہ کام روپ کو فتح کر کے اس پر قبضہ جمانے کی ناعاقبت اندیش مہم پر نکل پڑا لیکن ہندو فوجوں نے اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔[60] اس کی موت 1257ء / 655ھ سے کچھ ہی پہلے واقع ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ اسی سال لکھنوتی سے جاری کیے جانے والے سکّے پر صرف محمود کا نام ہے[61] جو اس کی بحالی کا بیّن ثبوت ہے۔ اگلا نامزد وائسرائے مسعود جانی تھا جس کے تقرر کا اندراج 1258ء / 656ھ[62] میں ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس نے اس موقعہ پر عہدے کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالی تھیں۔ اگلے سال کے اوائل

میں ہم سنتے ہیں کہ عزالدین بلبن اُزبکی نے جو یزبک کے مصاحبوں میں سے ایک تھا لکھنوتی سے بے شمار ہاتھی روانہ کیے متذکرہ سکّہ 655 اسی نے چلایا ہوگا۔ اور اسی بنا پر اسے لکھنوتی کا اقطع توثیق کر دیا ہوگا[63] اس سے صرف یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یزبک کی درخواست پر مسعود جانی کے تقرر کو منسوخ کر دیا گیا ہوگا تاہم یزبکی زیادہ دن حکومت نہ کر سکا۔

657ھ/1259ء کے اختتام پر یا 658ھ/1260ء کی ابتداء میں کڑا کے گورنر ارسلان خاں نے اچانک لکھنوتی کی طرف پیش قدمی کر دی۔ یزبکی مشرقی بنگال کی طرف گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھا کر ارسلان خاں نے دارالخلافہ پر زبردستی قبضہ کر لیا۔[64] یزبکی ایک دم واپس لوٹا لیکن اس کو شکست ہوئی اور مارا گیا تغان اور یزبک کی طرح کا یہ غیر قانونی قبضہ بھی کھلم کھلا نافرمانی تھی۔ لیکن محمود کی حکومت اس وقت گوناگوں مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے کوئی فوری قدم نہ اُٹھا سکی۔ منہاج نے جب اپنا کھاتا بند کیا (1260 کا آخری حصّہ) تو اس وقت ارسلان خاں لکھنوتی پر ایک باغی کی حیثیت سے حکومت کر رہا تھا۔ چوں کہ اس کے زمانے کا کوئی سکّہ دستیاب نہیں ہوسکا اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اس کو مکمل فرمارِوائی حاصل نہیں ہوگی۔ حالانکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے محمود کے اقتدار کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا[65] بارہ دری بہار شریف میں 665ھ/1266-67ء کا ایک کتبہ ہے جس میں سلطان شاہ کے لیے مقبرہ تعمیر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ "سلطان شاہ" کا نام غالباً ارسلان خاں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو 18 رجادی اول 663ھ/1264ء میں فوت ہوا۔ اس مقبرے کو اس کے بیٹے اور جانشین تاتار خاں کے حکم سے تعمیر کیا گیا تھا اور کم و بیش یہی تاریخ اس کے دورِ حکومت کے اختتام کی ہے[66] بنگال کے برعکس، دارالخلافہ کے نزدیکی صوبوں کی تاریخ مقابلتاً پرسکون تھی تاہم اُن کی قربت کا لازمی نتیجہ تھا کہ مرکزی حکومت میں ہونے والے واقعات سے زیادہ متاثر ہوتے ۔ فیروز، رضیہ اور بہرام کے خلاف جو بغاوتیں ہوئی ہیں جیساکہ اوپر کہا جاچکا ہے ان بغاوتوں نے اودھ اور دوآب میں زور پکڑا تھا۔ لکھنوتی کے نیم آزاد صوبہ داروں کی جارحانہ کارروائیاں ایسا لگتا تھا کہ اس علاقے کی ایک دائمی خصوصیت بن گئی تھیں۔ گنگا اور جمنا کا علاقہ دہلی کی سلطنت کا دل ہے اس

لیے اس پر قابو رکھنے کے مسائل کا مطالبہ تھا کہ اس کو ترجیح دی جائے۔ چنانچہ بلبن کے تقرر کی وجہ سے پالیسی اور عمل میں تسلسل کی ضمانت ہوگئی تھی۔ اس طرح دہلی پہلے سے زیادہ اُن صوبوں کے قریب آگیا تھا۔ بلبن تقریباً ہر سال "ہندوستان" پر ایک جنگی کاروائی کرتا تھا جس کی وجہ سے سرکشی کا جذبہ ابھرنے نہیں پاتا تھا۔

بہرام کی عملداری کے بعد سے منگولوں کا مسئلہ انتہائی اہم ہوگیا تھا اور التتمش کے زمانے میں دہلی کی حکومت مجبوراً منقسم ہوتی جارہی تھی 1255ء/653ھ میں وہ بڑے خطرناک طور پر آئے تھے جس کی وجہ سے پنجاب اور سندھ کے علاقوں کے حالات بہت زیادہ الجھ گئے تھے۔ حالانکہ محمود کی حکومت نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تمام ذرائع اکٹھا کر لیے تھے۔ لیکن اودھ کے باغیوں کو مزید طاقتور ہونے کا موقع ملا۔ سلطان کا سوتیلا باپ قتلغ خاں جس کے قبضے میں صوبہ تھا۔ دراصل ترکوں کے مخالف فرقے سے تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے بلبن کی عارضی طور سے معزولی ہوئی تھی[67] ریحان کے عہدے سے ہٹنے کے بعد قتلغ اس کا سب سے قریبی ساتھی بن گیا۔ چنانچہ اب اودھ اور بہرائچ کے ملحقہ صوبوں سے یہ دونوں محمود کے اقتدار کو منفی کرنے کے لیے نکل پڑے۔ ان کے باغیانہ منصوبہ پر یقین رکھتے ہوئے بلبن نے ریحان کو اس کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ قتلغ اپنے دوست کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے سنجر کو راستے میں روک کر گرفتار کر لیا۔ تاہم سنجر کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ اس نے ایک مختصر سی فوج جمع کی اور سرجو کو پار کرکے ریحان سے جنگ لڑی اور بالآخر اُسے قتل کر دیا۔[68] اس کے فوراً بعد قتلغ کو حکم دیا گیا کہ وہ بہرائچ لے لے اور اودھ کو چھوڑ دے۔ اس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ اس کو دبانے کے لیے جو فوج بھیجی گئی تھی اس کو بھی قتلغ نے پسپا کرکے اس کے ایک سپہ سالار کو مار دیا۔[69] اس طرح اودھ کو دہلی سے منقطع ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا چنانچہ اب بلبن نے بذاتِ خود کمان سنبھال لی۔ باغی بھاگ نکلے اور اُنھوں نے ہمالیہ کی ترائی میں پناہ لی۔ بلبن نے ان کا پیچھا کیا لیکن جب اُن کا پتہ نہ چل سکا تو اس نے اپنی تسکین کے لیے ان پڑوسی ہندو قبیلوں اور راجاؤں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ جن پر باغیوں کو پناہ دینے کا شبہ تھا۔[70]

بلبن کی واپسی کے فوراً بعد 1252ء/ 654 ھ کے ابتدائی زمانے میں اپنے مورچے پر واپس آکر قتلغ نے نہ صرف اودھ پر دوبارہ قبضہ کر لیا بلکہ کڑا اور مانک پور کے الحاق کی بھی کوشش کی۔[71] ارسلان خاں جس کے قبضے میں اس وقت یہ صوبہ تھا اس کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوا چنانچہ قتلغ کو ایک دفعہ پھر پیچھے ہٹ کر سرمور پہاڑیوں میں سنتور گڑھ کے سردار کے پاس پناہ لینا پڑی۔[72] رانا نے جس کو منہاج نے زن پال کہا ہے اس کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بلبن کو مجبوراً 1257ء/655ھ میں اس کے علاقے کو دارالخلافہ تک تباہ برباد کر دینا پڑا۔ لیکن باغی گرفتار ہونے سے برابر بچتا رہا۔ جیساکہ آگے چل کر پتہ چلے گا وہ دہلی کو اس سے زیادہ سخت دھکا پہنچانے کے مقصد کو بے کر جی رہا تھا۔

سندھ اور پنجاب کے مغربی صوبے میں بھی مرکزی حکومت کے اقتدار کے لیے حالات یکساں طور پر موافق نہ تھے اور اس کی وجہ فاصلہ کی دوری کے علاوہ منگولوں کا مسلسل دباؤ بھی تھا۔ ایران اور عراق میں منگ برنی اُن کے خلاف مدافعت کو منظم کرنے میں ناکام ہو چکا تھا۔ منگول اس کو کبھی پکڑ نہ سکے لیکن اتنی بڑی طاقت سے اس کا بہادرانہ مقابلہ اس کے دلیرانہ انفرادی کیریکٹر کو نمایاں کرنے سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کی موت سے پہلے ہی غزنی منگول صوبہ بن چکا تھا۔ منگول خانیوں پر اکتائی خاں کی تخت نشینی دراصل الحاق کا وہ فیصلہ تھا جس کے تحت سب سے پہلے دریائے سندھ تک کے سارے علاقے کو ایک کر کے الحاق کی کوششوں کو ہندوستانی صوبوں تک پہنچا دیتا تھا۔[73] رضیہ کے دور حکومت کے اختتام پر منگول چناب تک پہنچ چکے تھے اور مغربی صوبوں کے صوبہ داروں کے لیے تنہا مدافعت کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں دہلی سے کوئی مدد نہ ملنے پر ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ یا تو علاقہ خالی کر دیں اور یا پھر حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ 1241ء/ 639ھ میں لاہور پر پہلا منظم حملہ ہوا۔ مقامی صوبے دار نے کمک کے لیے درخواست کی لیکن وزیر کی سازشوں نے شاہی فوج کو دارالخلافہ واپس بھیج دیا۔ چنانچہ صوبے دار کو محصور شہر سے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلی صبح کو شہر پر قبضہ کر لیا گیا۔[74] حالانکہ منگول

بہت جلد واپس لوٹ گئے اور لاہور پر دوبارہ قبضہ بھی ہو گیا۔ لیکن اب لاہور ایسی سرحد بن چکا تھا جہاں جاہ طلب صوبے داروں کو انفرادی اقتدار جمانے کے لیے اچھا میدان مل جاتا تھا۔

مسعود کی تخت نشینی کے فوراً بعد ملتان کے صوبے دار کبیر خاں نے بغاوت کر دی۔ وہ نہ صرف مکمل فرماروا بن بیٹھا بلکہ اس نے جبراً پڑوسی صوبے اُچھ پر بھی قبضہ کر لیا۔[75] دہلی سلطنت کے پاس اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اسے ہٹا دیتی۔ یہی نہیں بلکہ دہلی کو 1241ء/ 639ھ میں اس کے بیٹے ابوبکر کو بھی جانشین ہوتے دیکھنا پڑا۔[76] ابوبکر جلد ہی چل بسا لیکن اس کی موت سے بھی دہلی کے حالات نہیں سدھرے کیونکہ حسن قرلغ متعدد کوششوں کے بعد اب ملتان پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔[77] تاہم 1245ء میں جب منگولوں نے دوسرا حملہ کیا تو دہلی کو ایک مرتبہ اپنا اقتدار پھر سے جمانے کا موقعہ ملا۔ منگولوں کی آمد کی خبر سن کر حسن قرلغ ملتان چھوڑ کر سندھ کے نچلے علاقے کی طرف بھاگ گیا۔ کبیر خاں کی اولاد[78] جو اُچھ پر قابض تھی، منگولوں کا مقابلہ کرنے میں بے بس تھا۔ انھوں نے فوراً دہلی سے مدد کی درخواست کی۔ اس طرح انھوں نے محمود کی فرماروائی کو خاموشی سے تسلیم کر لیا۔ بلبن نے امداد کی درخواست کا فوراً جواب دیا اور ایک طاقتور فوج کو ساتھ لے کر نکل پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منگول واپس لوٹ گئے۔[79] اس واقعہ سے دہلی کا سندھ پر پھر سے قبضہ ہو گیا۔ ملتان کو کشلو خاں کے ماتحت کرنے کے بعد اُچھ کو عارضی طور پر کبیر خاں کے خاندان کے پاس چھوڑ دیا گیا۔[80] کشلو خاں کو اُچھ پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی گئی لیکن اس سمجھوتے پر کہ وہ ناگور سے دست کش ہو جائے گا جو پہلے سے اس کے قبضے میں تھا۔ تاہم اس شرط کو بزور شمشیر بنوانا پڑا۔[81] 1249ء میں قرلغ سندھ کے نچلے علاقے سے واپس لوٹا اور ملتان پر دوبارہ حملے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ اس نے کشلو خاں کو شہر اس کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس پر قبضہ قائم رکھنا قرلغ کی قسمت میں نہیں تھا کیوں کہ تھوڑے ہی دنوں بعد بھٹنڈا کے صوبیدار شیر خاں نے ملتان کو اس سے چھین لیا۔[82] غالباً بلبن کی ہدایت کے مطابق اس نے نہ صرف کشلو خاں کے سپرد کرنے سے انکار کیا بلکہ 1251ء/ 649ھ میں اس

نے اُچھ اس کے قبضہ سے نکال لیا۔[83]

البتہ اس کے بدلے میں کشلو خاں کو بدایوں کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اس کے دل میں رنجش پل رہی تھی۔ چنانچہ اس نے خفیہ طور پر بلبن کے مخالف گروپ سے ساز باز کرلی بلبن کو معزول کرانے کے سلسلے میں اس نے پہلا قدم یہ اُٹھایا تھا کہ ریحان اور قتلغ خاں کی مدد سے شیر خاں کو معزول کرنے کے لیے محمود کو تیار کر لیا اور غالباً 1252ء/ 651ھ میں اُچھ اور ملتان پر چڑھائی کرنے کے پیچھے یہی مقصد کار فرما تھا۔ اس معرکے میں مخالف گروہ کے تمام نمایاں لیڈروں کو خاص طور پر یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ موجود رہیں۔[84] چنانچہ اس مہم کے دوران بلبن کو 1253ء/ 651ھ بیاس کے ڈیرے سے باقاعدہ طور پر معزول کر دیا گیا۔ شیر خاں نے جب دیکھا کہ اس کے دشمن اقتدار حاصل کر چکے ہیں تو وہ سندھ سے بھاگ کر ترکستان چلا گیا۔ اچھ ملتان اور بھٹنڈا کے صوبوں کو اُن لوگوں سے جن کے سپرد شیر خاں نے یہ صوبے کیے تھے واپس لے کر عارضی طور پر ارسلان خاں کے سپرد کر دیا گیا۔ جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قتلغ کی جماعت میں شریک ہو گیا تھا۔[85] ریحان کی بالآخر معزولی اور اودھ کی منتقلی کے بعد 1255ء/ 653ھ کے فوراً بعد کشلو خاں کو اس کے پُرانے صوبے ملتان اور اچھ واپس کر دیئے گئے۔[86] جب کشلو خاں وہاں مضبوطی سے جم گیا تو اس نے وفاداری کا نقلی چہرہ اتار پھینکا اور اپنی وفاداری کو ہلاکو کی طرف منتقل کر دیا۔ جو ابھی حال ہی میں منگولوں کی طرف سے ایران کا نیا وائسرائے بن کر آیا تھا بلکہ اس نے ایک منگول ایجنٹ کا خیر مقدم بھی کیا۔[87] دراصل اس غداری کے ذریعہ اس نے پورے سندھ کو بطور نذرانہ منگولوں کے حوالے کر دیا۔ محمود کی حکومت کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ اسے واپس لینے کی کوشش بھی کر سکیں۔ کیوں کہ خونخوار منگولوں سے براہِ راست دشمنی مول لینا اس کے وسائل سے باہر تھا۔

اس طرح منگولوں کی سرپرستی میں اپنے آپ کو محفوظ پا کر کشلو خاں کو بلبن سے اپنی پرانی دشمنی یاد آئی چنانچہ اس نے بدلہ لینے کا منصوبہ تیار کیا۔ 1257ء/ 655ھ کے اوائل میں وہ اپنی فوجوں کو بیاس کے ساتھ ساتھ ہمالیہ کے دامن کی طرف لے چلا تا کہ وہاں اپنے پرانے دوست اور ساتھی قتلغ خاں سے مل جائے۔ جیسے بلبن

سرمور پہاڑیوں میں تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور پھر دونوں کی مشترکہ فوج نے دہلی کی طرف کوچ شروع کر دیا۔[88] یہ دھمکی کافی بڑی دھمکی تھی اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی۔ بلبن نے ایک طاقتور فوج تیار کی اور سمانا کے قریب ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ جس وقت دونوں فوجیں جنگ کے لیے تیار کھڑی تھیں دہلی کے مذہبی پیشواؤں نے کشلو خاں کو ایک خفیہ دعوت نامہ بھیجا جس میں وعدہ کیا کہ شہر اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ خبر کسی نہ کسی طرح پھیل کر بلبن تک پہنچی۔ جس نے فوراً دہلی کے سلطان کو ہدایت کی کہ وہ تمام سازشوں کو ختم کر دے۔ کشلو خاں حالات کی اس تبدیلی سے واقف نہ تھا اس سے تو یہ امید تھی کہ وہ آسانی سے شہر میں داخل ہو جائے گا۔ چنانچہ کشلو نے آمنے سامنے ہو کر لڑنے سے احتراز کیا اور بلبن کی فوجوں کو دھوکہ دیتے ہوئے دہلی پہنچ گیا۔ دہلی پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ اس کے تمام حمائتی نکالے جا چکے ہیں۔ اور تمام شہری مستحکم مدافعت کا تہیہ کر چکے ہیں۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ قتلغ کا کیا حشر ہوا کیوں کہ اس کے بعد اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ کشلو خاں اپنے منصوبے کو ترک کر کے اُچھ چلا گیا۔[89] اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ ہلاکو سے ملنے عراق گیا۔[90] جس کا مقصد دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے ہلاکو کو فوجی امداد دینے پر آمادہ کرنا تھا۔ بہرکیف 1257ء/655ھ کے آخر میں سالی بہادر (SALI BAHADUR) کی قیادت میں ایک منگول فوج سندھ میں ڈیرا ڈالنے کے لیے وارد ہوئی۔[91] تاہم منگولوں نے دہلی پر حملہ نہیں کیا۔ 1258ء/656ھ کی ابتدا میں بلبن نے فوجی تیاریاں کی تھیں، وہ شہر کے باہر ایک فوجی مظاہرہ کر کے ختم ہوگئیں۔

یہ بات اطمینان بخش طور پر کبھی نہیں معلوم ہو سکی کہ کشلو خاں کی بغاوت کب اور کن حالات میں ختم ہوئی۔ کیوں کہ یہاں پہنچ کر منہاج ایک دم خاموش ہو جاتا ہے۔ اسامی نے ایک بار ضرور بلبن کی اس مہم کا ذکر کیا ہے۔ جو ملتان پر کی گئی تھی یہ مہم کشلو خاں (اس کی عرفیت بلبن ساز درج ہے) کے خلاف 1258ء/656ھ کے بعد کسی سال شروع کی گئی تھی۔ بس اسی تذکرے سے اس مسئلہ پر کسی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ دہلی کی افواج کی آمد سن کر کشلو نے ملتان کو اپنے بیٹے محمد[؟] کے

کے پاس چھوڑا اور خود پنجاب کو اپنے قبضے میں کرنے کے خیال سے پنجاب کی طرف نکل گیا۔ ملتان کے لوگوں نے بلبن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اور محمدؒ بھاگ کر اپنے باپ سے مل گیا۔ جب کشلو خاں کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا تو اس نے پنجاب چھوڑ کر بنیان میں ڈیرا ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سے اس نے دو دفعہ منگولوں کی مدد سے ملتان کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی [92] اسی طرح سندھ میں سالی بہادر کی کاروائیاں بھی مبہم ہیں۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ بلبن اپنی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے ہلاکو سے جنگ نہ کرنے کا کوئی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوگا اور سندھ کی واپسی کی بڑی وجہ بھی کوئی باہمی معاہدہ ہوگا نہ کہ فوجی کاروائی [93] چھ سال بعد جب برنی ایک دفعہ پھر پردا اٹھاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ تخت نشینی کے کچھ سال بعد بلبن سندھ کے وائسرائے کا عہدہ اپنے لڑکے کے سپرد کر رہا ہے اور اس جگہ منگولوں سے حالیہ بحالی کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

حوالاجات

1- اسے پرانی دہلی کے قریب ملک پور گاؤں میں ایک مقبرے میں دفنایا گیا جو اب سلطان غازی کے نام سے مشہور ہے۔ عمارت کی تعمیر سے متعلق کتبے پر 629/ 1231-32 کی تاریخ ہے؛ ایپی گرافیا انڈو مسلمکا 1909-1910، ص۔ 70۔

2- سلطانہ رضیہ سے متعلق اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کے لیے دیکھئے انڈین ہسٹاریکل کواٹرلی، 1940ص ص 750-772 میں حبیب اللہ: سلطانہ رضیہ۔

3- فرشتہ، i، ص۔ 68، اسامی بھی دیکھئے، ص۔ 126۔ التتمش نے شاہی مُہر اسے سونپ دی تھی۔

4- منہاج، ص۔ 185-186۔

5- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1896، ص۔ 218، شمارہ 30۔ رائٹ (WRIGHT)، ص۔ 240۔ شمارہ 161 اے سکوں کے اجزاء کو خود رضیہ سے ہی منسوب کرتا ہے۔ اور ایک بہتر طور محفوظ نمونے کی بنیاد پر اس کی تاریخ 625ھ/ 1237ء مقرر کرتا ہے۔

6- منہاج، ص۔ 182۔

7- IDEM متن میں منگل 29 شعبان ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کیوں کہ منگل 28 کو تھا۔ حاشیہ میں منقول ایک دوسرے بیان میں 21 کی شب بروز منگل بتائی گئی ہے۔ یہ بات ریورٹی کے مخطوطے سے مطابقت رکھتی ہے۔

8- ایضاً، ص۔ 183۔

9- منہاج، ص۔ 183، حاجی دبیر، ii، ص 708 م۔ بہ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 22-23۔

۱۰۔ ابن بطوطہ؛ کتاب الرحلہ، ii، ص۔ 25۔ 26۔

۱۱۔ فتوح السلاطین، ص۔ 127۔

12۔ منہاج، ص۔ ۱۸۴۔ اس کے سکّوں پر 633ھ اور 634ھ کی تاریخیں ہیں۔ اس کی حکومت ۲۱ شعبان 633ھ سے ۱۱ ربیع الاول 634ھ مطابق ۳۰ اپریل 1236ء تک رہی۔

13۔ ایضاً، ص۔ 186۔

14۔ منہاج، ص۔ 185۔ 186، م، بہ، ریورٹی، ص۔ 640۔ 641 اور نوٹ رضیہ کی حکومت علی سے متعلق عبارت کا ترجمہ غلط ہوا ہے۔

15۔ ایضاً، ص ص۔ ۱۹۷۔ 249۔ 235 اور 293۔

16۔ ایضاً، ص۔ 187۔

17۔ منہاج ص 188۔ اسامی نے، ص۔ ۱۲۹ پر یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ تبدیلیاں اس کے دور حکومت کے آخری دنوں میں ہوئیں؛ یحییٰ سرہندی؛ تاریخ مبارک شاہی، ص 26 کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو متفقہ طور پر اُن آداب کو اپنانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

18۔ منہاج (IDEM) اس واقعہ کی تاریخ نہیں بتاتا کہ اسے 635ھ/ 1237ء سے قبل کے واقعات کے ساتھ ہی بیان کرتا ہے۔ اسامی؛ ص۔ 129۔ کا مافی الضمیر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاقوت کو کسی عہدے پر منتقل کیا گیا جس پر وہ اس کے والد کے زمانے سے کام کر رہا تھا۔؛ تاریخ مبارک شاہی؛ ص۔ 26 صاف صاف لکھتا ہے کہ اس عہدے پر رضیہ نے ہی پہلی بار اُس کا تقرر کیا۔ فرشتہ کے اس بیان کی تصدیق مشکل ہے کہ اسے ترقی دے کر امیر الامراء کا عہدہ دیا گیا، i، ص۔ 68۔

19 ۔ ص۔ 129۔

20۔ تمام تاجک۔ غوری اور ترک افسران اس سازش میں شامل تھے۔ ص 253۔

21۔ منہاج، ص۔ 188 اور 251۔

22۔ ایضاً، ص۔ 188، ص۔ 235 پر اس کی تاریخ 635 درج ہے۔

23- وہ 19 ر شعبان کو واپس آئی اور 9 ر رمضان مطابق 4 ر اپریل 1240ء کو دوبارہ بھٹنڈا کے لیے روانہ ہوئی ؛ ایضاً، ص۔ 188۔ منہاج مزید بیان کرتا ہے کہ دربار کے کچھ امراء خفیہ طور پر التونیہ کے ساتھ شریک تھے۔

24- منہاج، 89 - 188 -

25- ایضاً، ص۔ 189 اور 191 - بھٹنڈا مہم پر رضیہ کی روانگی کے 18 دن بعد بہرام 27 ر رمضان 637ھ مطابق 12 ر اپریل 1240ء کو تخت نشین ہوا۔ عہد وفاداری کی رسم بھٹنڈا سے ملکوں کی واپسی کے بعد 11 ر شوال کو منعقد ہوئی۔

26- منہاج، ص۔ 191 - 192 اور ص۔ 253 - "بادشاہ کی نوعمری" کی وجہ سے اختیارات کی تفویض کم سے کم ایک سال کے لیے کی گئی۔

27- ایضاً، ص 192 اور ص ص 253 - 254 - اس موقع پر وزیر پر بھی حملہ ہوا لیکن وہ بچ گیا۔

28- منہاج، ص۔ 190 -

29- ایضاً، ص۔ 190 اور 253 ؛ حاجی دبیر، ii، ص۔ 704 بھی دیکھیے۔

30- منہاج، ص۔ 190 اور 192۔ لیکن وہ ص۔ 252 پھر لکھتا ہے کہ رضیہ کو کیتھل کے قریب اور التونیہ کو منور پور کے قریب گرفتار کیا گیا اور دونوں کو دوسرے روز 25 ر ربیع الاوّل، 638ھ کو شہادت نصیب ہوئی۔ اس نقطہ نظر کو کہ ان دونوں کو ہندوؤں نے قتل کر دیا تھا ؛ فرشتہ، i، ص 68، طبقات اکبری، i، ص۔ 68 اور مرآت جہاں نما، صفحہ ذیل، 53 کی تائید حاصل ہے تاریخ مبارک شاہی، ص۔ کا بیان ہے کہ ان کو قیدی بنا کر دہلی لے جایا گیا جہاں انھیں بہرام کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ رضیہ کی اخلاقی کمزوری کا ذکر اس لیے ضروری نہیں ہے کہ اب سنجیدہ تاریخ میں اس کہانی کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی کیوں کہ صرف ابن بطوطہ کی عنیب اور فرشتہ کا اشارہ ہی اس کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ منہاج کے قول "قربت افتاد" کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا ایبک کے اپنے آقا سے تعلقات کے بیان میں بھی یہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ص۔ 139، تاریخ مبارک شاہی نے یہ فقرہ من و

من منہاج سے نقل کیا ہے۔ حاجی دبیر نے جو بہت محتاط اور با اصول لکھنے والے ہیں۔ منہاج کے فقرہ کا اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ اس میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا۔ ابن بطوطہ کی کہانی کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل حوالے سے ہوجاتا ہے؛ ii، ص۔ 26 "رضیہ نے 4 سال تک حکومت کی۔ بے پردہ ہوکر مردوں کی طرح سواری کرنا اس کی عادت تھی۔ پھر اس پر اپنے حبشی غلاموں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھنے کی تہمت لگائی گئی۔ اس لیے لوگ اس کی شادی اسی کے ایک رشتہ دار سے کرنے پر متفق ہو گئے۔ اور اس طرح سلطنت اس کے بھائی ناصرالدین کو منتقل ہو گئی۔" منہاج کے چھپے متن کے ص۔ 253 پر ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس الزام پر یقین تھا۔ لیکن یہی شعر تاریخ مبارک شاہی میں بھی موجود ہے جو کہ ظاہر ہے کہ بعد کا اضافہ ہے کیونکہ پرانے مخطوطات میں ریورٹی کو یہ شعر نہیں ملا۔ اس مسئلہ پر دیکھئے انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی، 1940، ص ص 769 - 772 ۔ اس نے (رضیہ) 2 ربیع الاول 634ھ / مطابق 13 دسمبر 1236ء سے رمضان 637 / مطابق 22 اپریل 1240 تک حکومت کی۔ اس کے جو سکے ابھی تک ملے ہیں اُن پر 634ھ، 635ھ اور 636ھ کی تاریخیں ہیں۔

31- منہاج ص ص۔ 193 اور 255 ۔

32- منہاج، ص ۔ 255 ۔

33- ایضاً، ص ۔ 195 ۔ ایک تارک الدنیا شخص ایوب ترکمان نے بہرام کی نظروں میں بڑی عزت حاصل کر لی تھی۔ اس کے کہنے پر مہر کے قاضی شمس الدین کو جس کی وجہ سے ترکمان کو پہلے کبھی نقصان پہنچا تھا، سلطان نے ہاتھی کے پیروں تلے کچلوا دیا تھا۔

34- منہاج، ص۔ 196 - 197 یہ محاصرہ تین ماہ سے زائد کھنچ گیا تھا۔ جس کے لیے منہاج فخرالدین مبارک شاہ فرخی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے کیوں کہ وہ بہرام کے ذاتی خدمت گاروں میں ایک تھا۔ اور اس کے مشیروں میں اُسے خاص اہمیت حاصل تھی لیکن اس نے مصالحت کی تجاویز کی طرف توجہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بہرام نے 27 رمضان 637ھ سے 18 ذوالقعد 638ھ / 22 اپریل

سے 20 رمئی 1242ء تک حکومت کی۔ ابھی تک اس کے جاری کردہ سکوں میں
سے 638 ھ کے جاری کیے ہوئے سکے ہی دستیاب ہیں۔

35- ایضاً، ص۔ 198 ۔

36- ایضاً، ص ص۔ 250 اور 261 ۔

37- IDEM

38- اس نے دو امتیازی نشانات۔ ہاتھی اور نوبت اپنا لیے۔

39- منہاج، ص۔ 250 ۔

40- ایضاً، ص۔ 258 ۔

41- 12 رذی الحجہ کو اُوچھ کی مہم سے واپس ہونے کے بعد مسعود نے "برے طریقے اپنائے اور اپنے مَلِکوں کو پکڑنا اور ختم کرنا شروع کر دیا" ص۔ 189 ۔ اس کے کردار میں اچانک تبدیلی اور اس ایک ہی ماہ میں اس کا ناقابل برداشت ہو جانا ایک تعجب خیز امر ہے۔ جس کے بعد اسے تخت سے ہٹا کر 12 رمحرم کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ص ۔ 201 ۔ اپنی والدہ کے ہمراہ رات کے وقت عورت کے بھیس میں بہرائچ سے دہلی کے محل میں تاجپوشی کے لیے محمود کی آمد سے متعلق بیان ایک سوچی سمجھی سازش کو ظاہر کرتا ہے۔ 639 ھ، 640 ھ اور 642 ھ میں جاری کیے گئے مسعود کے سکے دستیاب ہیں۔

42- منہاج، ص۔ 208 ۔

43- ایضاً، ص 213 ۔م۔ بہ، ابن بطوطہ، ii ، ص۔ 28 جس کا اصرار ہے کہ بلبن التتمش کا داماد تھا۔

44- منہاج، ص۔ 294 ۔

45- ایضاً، ص ص 277 اور 280 ۔

46- منہاج، ص ص۔ 217 ، 280 اور 298 ۔

47- ایضاً، ص ص۔ 217 - 217 ، 298 - 299 ۔

48- منہاج، ص ص 203 - 204 ، 218 - 220 ، 300 - 301 چونکہ منہاج کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا تھا اس لیے وہ بڑی نفرت سے ریحان

کے نیچ ذات ہونے کا بیان کرتا ہے۔ ریحان یقیناً ایک ہندوستانی نومسلم تھا۔

49۔ منہاج، ص 242 ۔ 243 ۔اس جگہ لکھنوتی۔ لکھنور، اس لیے بتایا گیا ہے تاکہ گنگا کے جنوبی علاقے کو جس میں لکھنور واقع ہے مخصوص کیا جاسکے۔۔ اس ضلع کا تذکرہ دوبارہ نہیں ملتا، شاید اس کو مستقلاً لکھنوتی میں ضم کر دیا گیا ہوگا۔

50۔ بڑی درگاہ۔ بہار شریف میں پائے گئے کتبے مورخہ 640 / 1242ء میں جو طغان خان کے حکم سے لکھا گیا تھا، اس کو شاہی خطابات سے نوازا گیا ہے اور اس میں دہلی کے حکمراں کا ذکر تک نہیں ہے دجرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1873، ص-45، کننگھم: رپورٹس، xv، ص-45-اپی گرافیا انڈو مسلکا 1913 - 1914، ص ص- 16 - 17 -

51۔ منہاج، ص-243، ریورٹی بھی دیکھیے، ح۔س۔ص۔ 737 نوٹ۔ 9۔

52۔ منہاج، ص ص-244-246۔

53۔ م۔ بہ، سلیم: ریاض السلاطین، ص-73 جس کا بیان ہے کہ تیمور خان نے 10 سال تک حکومت کی اور 655ھ/ 1257ء میں وفات پائی۔

54۔ منہاج، ص۔ 212 اور ص 262۔

55۔ اپی گرافیا انڈو مسلمکا 1913-1914، ص ص۔ 22 - 19 ۔کنہگم: رپورٹس؛ xv، ص ص 45 اور 171۔ وہ یقیناً علاءالدین جانی کا بیٹا قتلغ خاں مسعود جانی ہی ہوگا جس کا ذکر محمود کے ملکوں میں سے ایک کی حیثیت سے کیا گیا ہے؛ منہاج، ص۔206۔اس کا ذکر لکھنوتی اور کڑہ کے مُلک کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ آخر الذکر مقام اس نے آگے چل کر حاصل کیا۔ سلیم اس کا ذکر جلال الدین خاں کے نام سے کرتا ہے۔

56۔ کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی انڈین میوزیم، II، ص۔23 شمارہ 140، سکہ اپنی اصل حالت میں نہیں ہے پھر بھی محمود۔ ازبک (YAZBAK) اور لکھنوتی ٹکسال کے ناموں کے علاوہ لفظ خمسینہ پڑھنے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے، رائٹ بھی دیکھیے: ص۔ 55 نمبر 225 ڈی۔

57۔ منہاج، ص۔ 263۔

58- IDEM ، م۔ بہ۔ سلیم ، ص۔74 جس نے ازبک (YAZBAK) کی حکومت کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے۔

59- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال۔ 1881ء ص۔ 61 شمارہ 11 اور 12 و کٹیلاک آف کوئنس اِن دی انڈین میوزیم ، ii ، ص۔ 146۔ شمارہ۔ 61۔

60- تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ INFORA۔

61- رائٹ ، ص۔ 55 نمبر 225 سی ، کٹیلاک آف کوائنس دی انڈین میوزیم ، ii ، شمارہ۔ 138۔

62- منہاج ، ص۔ 225۔ 226۔

63- منہاج ، ص۔ 226 اور 313۔

64- ایضاً ، ص 267 م۔ بہ۔ سلیم۔ ح۔ س۔ ص۔ 74۔

65- برنی ، ص 66 م۔ بہ۔ سلیم ص ، 74 جس نے صاف طور پر غلطی کی اور ازبکی (YAZBAKI) کو ارسلان سمجھ کر یہ بیان کیا ہے کہ آخرالذکر نے 1259ء / 657ھ میں دہلی کے سلطان کو تحائف بھیجے۔

66- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، 1874 ، ص۔ 247 ایک بہتر تحریر ایپی گرافیا انڈو مسلمکا 1913۔1914۔ ص ص۔ 23۔ 25۔ پڑھیے گی۔

67- منہاج ، ص۔ 220۔

68- ایضاً ، ص۔ 304۔

69- منہاج ، ص۔ 21۔ 220۔

70- ایضاً ، ص۔ 306۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بلبن اس موقع پر لشن پور اور ترہٹ تک پہنچ گیا تھا۔

71- ایضاً ، ص۔ 221۔

72- ایضاً ، ص۔ 266 اور 306 I (رائی)

73- منہاج ، ص ص 823۔ 382 ، 388 ، 392۔393 ؛ ہوورتھ بھی دیکھیے: ہسٹری آف دی منگولس (HISTORY OF THE MONGOLES) i ، ص 126-127۔

74- تفصیلات کے لیے آگے دیکھئے (INFRA) الفرا۔

75- منہاج، ص۔ 235۔

76- IDEM

77- ایضاً، ص۔ 399۔

78- منہاج، ص 287، ص 399 بھی دیکھئے۔

79- ایضاً، ص ص۔ 200۔ 287 اور 399۔

80- ایضاً، ص۔ 269۔

81- ایضاً، ص 270۔

82- ملتان پر حسن قارلوغ کا دوبارہ قبضہ نتیجہ خیز ہے۔ شہر پر شیر خاں کے دوبارہ قبضے کی تاریخ 648ھ/1250ء بتائی گئی ہے۔ یہ واقعہ اس کے ساتھ سے ناگور نکل جانے کے بعد ہوگا جو کشلو خاں کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا۔ کشلو خاں کو 647ھ میں اسی وقت امیر حاجب بھی مقرر کیا گیا۔ دیکھئے ص ص 214 اور 295۔

83- منہاج، ص۔ 271۔ 272۔ ملتان میں شیر خاں کے نائب ملک کریز (KUREZ) نے بہت سے منگول قیدیوں کو 648ھ/ 1250ء میں بھیجا۔ حاجی دبیر دیکھئے، ii ص۔ 715۔

84- منہاج، ص ص۔ 216، 266 اور 271، م۔ بہ۔ حاجی دبیر، ii، ص۔ 723۔

85- منہاج، ص ص۔ 218 اور 266۔

86- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 655ھ/ 1257ء سے قبل کسی وقت ملتان اور اُوچھ پر قبضہ تھا؛ منہاج، ص۔ 272۔

87 ایضاً، ص۔ 271۔

88 ایضاً، ص۔ 272۔

89- منہاج، ص ص۔ 310۔ 307۔

90- ایضاً، ص۔ 273۔

91- ایضاً، ص۔ 225 اور 310۔

92- فتوح السلاطین، ص ص۔ 150۔ 147۔ تاریخ کے لیے دیکھئے ص۔ 141۔

93- اس قیاس آرائی کی وجوہات کے لیے آگے دیکھئے (INFRA) الفرا باب نہم۔

چھٹا باب

ہندو جارحیت 1235ء-1265ء

التمش کی موت کے بعد جو سب سے نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے وہ ہندو فوجی طاقت کی بحالی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بدنظمیوں اور بدعنوانیوں کے نتیجے کے طور پر ایک فوجی جمود طاری ہو چکا تھا جس کی وجہ سے التمش کے تمام کام نہ صرف کالعدم ہو چکے تھے بلکہ مقامی طاقتوں کو اپنے علاقوں کو واپس لینے کا موقعہ بھی مل گیا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے فاتحین کو بے دخل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ حالانکہ فاتحین کو نکالنے میں انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن اُن کی مزید توسیع کو تو یقیناً روک دیا گیا۔

اس سے پہلے اُڑیسہ کے بادشاہوں کے ساتھ جارحانہ کاروائی کی ابتدا کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ مشرقی گنگا کے موروثی سلسلے کے دوسرے عظیم بادشاہ نرسنہا (NARASINHA) اوّل (1238ء-1264ء) کو ترکی ریاست کی مفلوج کر دینے والی پھوٹ اور نااتفاقی کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے لکھنوتی کے خلاف زبردست مہم کا آغاز کیا اور شہر پر قبضہ کرنے میں تقریباً کامیاب بھی ہو گیا۔ اس سے قبل لکھنوتی کی سرحد پار جو حملے کیے جاتے تھے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُڑیسہ میں جوابی کاروائی کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔ لیکن نرسنہا نے ترکی طاقت کا بہت صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ اودھ کی مہم پر تغان خاں کی ناکامی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اڑیسہ کی فوجوں نے 1243ء/ 661ھ میں اس کے سرحدی اڈے پر فوراً

حملہ کر دیا۔ حملہ نہ صرف بنگال بلکہ دوسرے تمام محاذوں پر اجتماعی ہندو حملوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تغان خاں نے حملے کو پسپا کر کے جاج نگر پر دھاوا بول دیا وہ ایک مقام تک پہنچ گیا جس کو روزنامچے میں کٹاسن (KATASIN) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ جگہ غالباً نرسنہا کی سلطنت کے شمالی مشرقی حصے میں واقع تھی[۴۶] اس جگہ عارضی کامیابی کے بعد تغان کی فوجوں کو پسپا کر دیا گیا۔ اس کی فوجیں بڑی بے ترتیبی اور پریشانی کی حالت میں دارالخلافہ کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ اور نرسنہا کی فوجیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اس وقت تغان نے دہلی سے فوری امداد کی درخواست کی۔ تاہم جائے وقوع تک پہنچنے کے لیے وقت درکار تھا۔ چنانچہ اس دوران اڑیسہ کی فوج نے سامنت رائے کی قیادت میں سرحد پار کر کے لکھنوٴ پر قبضہ کر لیا۔ اور جب حملہ آور لکھنوتی کی طرف بڑھے تو تغان شہر کی فصیل میں گھس کر بڑی بے کسی کے عالم میں دیکھتا رہا کہ ہندو فوجیں بغیر کسی مزاحمت کے اس کے دارالخلافہ کی طرف بڑھی چلی آرہی ہیں۔ مایوسی کے عالم میں اس نے جنگ کرنا چاہی لیکن بڑی آسانی سے اسے شکست دے دی گئی۔ وہ بھاگ کر شہر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا جس کا پورے طور پر محاصرہ نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم تیمور خاں کی قیادت میں دہلی سے آنے والی کمک کی خبر بروقت پہنچی۔ جس کی وجہ سے حالات سدھر گئے اور سامنت رائے ہمت ہار کر محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن واپسی میں اس نے دیہاتیوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔[۴۷]

ایبک کے زمانے کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک مقامی فوج مسلمانوں کے شہر پر حملہ کر کے، بغیر کسی پریشانی کے واپس لوٹ آئی ہو۔ اس کا کوئی واضح فوجی نتیجہ نہیں نکلا تھا سوائے اس کے کہ شاید لکھنوٴ کا سرحدی اڈا ہاتھ سے نکل گیا۔ ہاں ایک بات قطعی طور پر واضح ہو گئی تھی اور وہ تھی سلطنت کی کمزوری۔ اس کاروائی کا اخلاقی اثر تقریباً ساحرانہ تھا کیونکہ چند برسوں کے اندر سارا ہندو ہندوستان جارحانہ فوجی کاروائی کے لیے جاگ اٹھا تھا۔

اڑیسہ سے جنگ کے بعد کیا حشر ہوا روزنامچوں میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ تیمور خاں اور مسعود جانی کی حکومت کی تفصیلات بھی نہیں ملتی ہیں۔ یہ بات کہ اڑیسہ

نے اس فتح کے بعد صلح جویانہ رویہ اختیار کر لیا ہوگا بعد از قیاس معلوم ہوتی ہے برمدی شہر لکھنور کا دوبارہ ذکر نہیں ملتا۔ بنگال میں نرسنہا کی فرمانروائی کی توسیع کے بارے میں بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کچھ واقعات نے 1252ء 653ھ میں یزبک کے تقرر کے فوراً بعد جارحانہ کاروائیاں دوبارہ شروع کر دیں۔ اڑیسہ کی سرزمین پر دو فتوحات کے بعد اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اہمیت کے اعتبار سے یہ غالباً ویسی ہی شکست ہوگی جیسے تغان کے حصے میں آئی تھی۔ کیوں کہ اُسی کی طرح اس نے بھی دہلی سے امداد کی درخواست کی اور جب وہاں سے کمک پہنچ گئی تو اُس نے چوتھی مرتبہ اڑیسہ پر حملہ کیا اور (RAI) " رائی کی راجدھانی " عمردان یا اُمردان (تین مختلف نام ہیں) تک گھستا ہوا چلا گیا۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اس کے خزانے اور خاندان تک پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔[4] یہ بات مشکوک ہے کہ یہ فتح نتیجہ خیز ثابت ہوئی یا اس سے کوئی علاقائی فائدہ حاصل ہوا ہوگا۔ کیوں کہ نرسنہا نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ جوناؤں (JAVANAS) کو شکست دے کر بلکہ راڑھ اور ویندری (RARH AND VAREDRI) کے جوناؤں کو ختم کرکے فاتحین کی طرح گنگا تک پہنچ گیا۔[5] اس کے علاوہ نرسنہا کے دارالخلافہ ہونے کی بات تو الگ رہی " اُمردان " جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ اڑیسہ کے اندرونی علاقے میں اس نام کی کوئی جگہ نہیں ملتی۔ بظاہر معقول بات معلوم ہوتی ہے کہ اس علاقے کو ہگلی ضلع آرام باغ ڈویژن میں تلاش کیا جائے۔[7] زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ یزبک نے سرحد کے کچھ مقامی جاگیرداروں پر فتح حاصل کر لی ہو۔ تاہم اس امکان کو خارج نہیں کیا کہ اس نے اس علاقے کے کچھ ہارے ہوئے حصوں کو واپس لے لیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اسی طرح کے فائدے چاہے وہ علاقائی ہوں یا باجگذاری کی صورت میں ہوں بہرحال اس کی یادگار کے طور پر اس نے 1255ء/ 652ھ میں چاندی کا سکہ جاری کیا۔ جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ سکہ ارزبدان (ARZ BADAN) (اُمردان) اور نادیا کے خراج سے تیار کیا گیا۔[8]

یزبک کی موت کے بعد اُڑیسہ سے ہونے والی کسی دوسری لڑائی کا ذکر مسلمان مورخین نے نہیں کیا ہے تاہم جنگ جویانہ صورت حال کی موجودگی کے بارے میں

ضرور قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ 1296ء میں نرسنہا دوم نے جو حکم نامہ صادر کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ یہ اس وقت جاری کیا گیا تھا جب کہ بادشاہ ایک تسخیری معرکے کے سلسلے میں گنگا پر ڈیرا جمائے تھا۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اڑیسہ کے بادشاہ جنوب مغربی بنگال میں اپنی اپنی جگہوں پر قائم تھے۔ بلبن کے توسیعی پالیسی چھوڑنے کے بعد لکھنوتی بمشکل تمام اپنا وجود قائم کیے ہوئے تھا۔

یزبک کے یادگاری سکے پر نادیا کے نام کا درج ہونا (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔) اس بات کی قطعی واحد شہادت ہے کہ بختیار کے لکھنوتی۔ دیوکوٹ پر قبضہ کے بعد علاقائی توسیع ہوئی۔ لکشمن سنہا کی موت کے بعد سیناؤں نے جنوب مغربی بنگال کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہوگا۔ یہ ایک بحث طلب بات ہے۔ تاہم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ بختیار کے نادیا سے لوٹنے کے بعد مسلمانوں نے بھاگیرتی کے علاقے پر قبضہ کیا ہوگا۔ لکشمن کی موت کے بعد چھوٹے چھوٹے معمولی شہزادے جنوبی بنگال پر راج کر رہے تھے اور نادیا اور اس کے پڑوسی علاقے پر اُن کے راج کی توسیع کو خارج از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف اڑیسہ میں گنگا کے بادشاہوں کا راڑھ کے بڑے حصے پر قبضہ تھا اور ابھی تک انھیں اپنے اقتدار پر پورا کنٹرول تھا۔ سیناؤں سے اُن کی ماضی کی دشمنی ان کی املاک کا نادیا سے ربط اور قربت اور گنگا تک پہنچنے (مراد بھاگیرتی) کا بار بار تذکرہ اس امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انھوں نے سینوں (SENAS) کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر سہما (SUHMA) کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ نادیا کا 'ارزبادان' کے ساتھ ذکر اگر آخرالذکر کو روزنامچے کے مطابق امردان سمجھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ دونوں جگہوں کو ایک ہی دشمن سے چھینا گیا تھا۔ نادیا اور ارزباذان سے خراج وصول کرنے کا ذکر غالباً براہ راست الحاق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مشرقی بنگال (بنگ اور کمرود) میں کی جانے والی کارروائیاں جن کا علم ہے وہ حملے ہیں جو گاہے بہ گاہے کیے گئے ان کا فائدہ محض چھوٹے چھوٹے علاقوں تک ہی محدود تھا۔ لکشمن سین کے جانشین وشوا روپ (VISWARUPA) اور کیشو (KESHVA) وکرم پور (ضلع ڈھاکہ) سے مشرقی اور جنوب مغربی بنگال پر حکومت کر رہے تھے۔

انھوں نے "گرگ جوناؤں شاہ" کو شکست دے کر پسپا کر دیا تھا۔ سیف الدین ایبک کے بعد سے کسی مہم کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔ سوائے یزبکی کے جسے اس وقت لکھنوتی سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ جبکہ وہ مشرق میں حملے کر رہا تھا۔ اس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

کامروپ کی پڑوسی سلطنت بھی فوجی اعتبار سے بہت طاقت ور ثابت ہوئی۔ لکھنوتی گورنروں کی ہاتھیوں کے شکار کی مہم پہلے سے کہیں زیادہ پُر خطر ثابت ہوتی تھی۔ کام روپ ایک وسیع سلطنت تھی جو کراٹویا اور شمال مشرقی میمن سنگھ سے لے کر گوہاٹی تک جہاں غالباً دارالخلافہ واقعہ تھا، پھیلی ہوئی تھی۔ بختیار کی تباہ کن مہم کے علاوہ برہمپتر کی وادی میں گھسنے کی کوئی دوسری بڑی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ کامروپ نے بختیار کی مثال کی نقل کرنے والے کو شکست فاش دینے کے لیے کافی بڑی طاقت جمع کر لی تھی۔ حوصلہ مند یزبک اس پھندے میں پھنس گیا۔ اس نے سوچا کہ اس کے حوصلوں کے لیے لکھنوتی بہت چھوٹی جگہ ہے۔ چنانچہ 1255ء کے فوراً بعد وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ کارٹویا پار کر کے کام روپ پہنچ گیا۔ اُسے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیوں کہ بادشاہ اپنی روایتی فوجی حکمت عملی سے کام لے رہا تھا۔ وہ پہاڑیوں میں چھپ گیا اور حملہ آوروں کو بغیر کسی مقابلے کے دارالخلافہ تک پہنچنے کی اجازت دے دی۔ یزبک وہاں پہنچ کر اپنے آپ کو لکھنوتی اور "کامروپ" کا بادشاہ کہنے لگا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے جمعہ کا مذہبی اجتماع بھی شروع کیا۔ اس طرح اسلام کی نشانیاں کامروپ میں بھی آشکار ہوگئیں۔" اب ہندو بادشاہ نے اپنی اطاعت گزاری کی پیش کش بھیجی اور درخواست کی کہ اسے باجگزار جاگیر دار بنا دیا جائے۔ اور یہ وعدہ کیا کہ وہ یزبک کے نام پر خطبہ اور سکہ جاری رکھے گا۔ آخرالذکر نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ مطلب ظاہر تھا۔ وہ خود وہاں رہنا چاہتا تھا۔ مُلک کی سرسبز پھولتی پھلتی فصل پر پھر بھروسہ کرتے ہوئے اور مجرمانہ کوتاہ اندیشی سے کام لے کر اس نے غلے کے سارے ذخیرے کامروپ بادشاہ کے دلالوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ جو حملہ آوروں کو بھوکا مار دینے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا تھوڑے ہی دنوں بعد یزبک کو ایک انتہائی خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جب اُسے پتہ چلا کہ کامروپ کی فوجوں نے دریا کے کناروں کو دیدہ و دانستہ

کاٹ کر ملک کی ساری فصل کو سیلاب سے تباہ کر دیا ہے تو اس کے سامنے ایک ہیبت ناک صورت حال تھی۔ انتہائی فاقہ کشی اور قحط کے امکانات کا جائزہ لے کر اس نے واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ طغیانی کی وجہ سے میدانی علاقے سے گزرنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کو گارد اور کھاسی کی پہاڑیوں کے دامن سے ہو کر یمن سنگھ تک چلنا پڑا۔ اور جب اس کی فوجیں پہاڑوں کے تنگ راستے سے گزر رہی تھیں پیچھے سے آگئیں۔ اور انھوں نے پہاڑی لوگوں کی مدد سے تقریباً ساری فوج کو نیست و نابود کر دیا۔ خود یہ بک زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ بعد میں انہی زخموں سے اس کی موت واقع ہوگئی[11] یہ دراصل پانسہ پلٹنے والی بات تھی اور یہ بھی اسی بختیار کی سطح کی تھی، اس فتح نے شمالی ہند کے رجواڑوں کو اور زیادہ جارحانہ کارروائیوں کے لیے مزید دلیر بنا دیا تھا۔

مگدھ (جنوبی بہار) پر مسلمانوں کا قبضہ زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا۔ گنگا کے کنارے ایک مختصر سا راستہ تھا جو اودند اپور و بہار کی اصل املاک پر مشتمل تھا۔ یہ راستہ بنارس سے شاہ آباد، پٹنہ، منگھیر اور بھاگلپور کے اضلاع میں لے جاتا تھا۔ جنوب میں سینا گہادوالا (SENA - GAHADVALA) کی سلطنت سے بچ جانے والے خودمختار رجواڑوں کی فرمانروائی تھی۔ دستاویزات کے مطابق ان رجواڑوں کا سلسلہ جو اپنے کو پیتھی پتی (PITHI PATIS) کہتے تھے اور جن کا کتبہ بودھ گیا کے قریب جانی بگھار (JANIBIGHA) میں دستیاب ہوا، تیرھویں صدی تک پہنچا۔ اس میں ان ترکوں کا باجگزار بتایا گیا ہے[12] خود بودھ گیا میں کاماں (KAMA) (کمایوں) اور سپادالکشن کے برسر اقتدار سرداروں کی ایسی دستاویز ہیں جو انھوں نے کندہ کرائیں اور جن کی تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ضلع پر ہندوں کا مسلسل یا کم از کم بلبن کے دورِ حکومت تک قبضہ رہا ہے[13] یہ بات غیر یقینی ہے کہ رہتاس گڑھ کے مہانائک (MAHANAYAKAS) جس کے جاگیرداروں میں سے ایک کو 1197ء میں سسارام (SASARAM) کے قریب زمینوں کو تحفے میں دیتے ہوئے پایا گیا ہے[14] تیرھویں صدی تک باقی تھے لیکن اس صدی کے پہلے نصف میں مسلمانوں کی طاقت کے جنوب میں پھیلنے کا نہ تو روزنامچوں میں ذکر ہے اور نہ یہ بات قرین قیاس ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہار

کا شہر بھی ہندوں کے حملے سے نہیں بچا تھا۔ کیوں کہ محمود کے دور حکومت کے ابتدائی حصّے میں کہتے ہیں کہ صوبے دار کربیت خاں کو اس حملے کے پسپا کرتے میں جو بظاہر ایک محاصرہ تھا اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا ایکلہ اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم ہے کہ اس علاقے میں مسلم حکومت دوبارہ کیسے قائم ہوئی۔ بہرکیف یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ عمل بلبن کی تخت نشینی سے پہلے ہوا ہوگا۔ کیوں کہ 1265ء میں بہار یقیناً مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ گیا کے ایک باشندے ونا راجا (VANARAJA) کے سنسکرت کے کتبے میں بلبن کے نام کی شمولیت (بیروبانا (BIRUBANA) لکھا ہے) سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بلبن کی فرمارو ائی کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کتبے کی تاریخ 1325ء ہے۔ اگر ان شاعرانہ تحریروں پر اعتبار کیا جائے جن میں راجپوتوں کی ان کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے تیرھویں صدی میں "گیا" اور دوسرے متبرک مقامات کو ترکوں سے آزاد کرنے کے سلسلے میں کی تھیں ۱۷ھ تو ضلع کے براہ راست الحاق کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بالکل بعید از قیاس بات ہو گی۔ بلبن کی مدافعتی استحکام کی کھلی ہوئی پالیسی پر مبنی دستاویز میں اس بات کو تسلیم کرنے میں زور دیا گیا کہ وہ پھیلتی ہوئی سے بہت زیادہ برتر تھا۔

ایک مسلسل عمل کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو سلطنت کی جنوبی سرحد پر ہندو حملہ بہت زیادہ نمایاں اور واضح نظر آتا ہے۔ التمش کے باریابی کے منصوبے کو بظاہر ایسا لگتا ہے صرف عارضی کامیابی حاصل ہوئی کیوں کہ اس کے بعد اس کی سلطنت کہیں زیادہ مداخلت کا مرکز نہیں تھی۔ ریوا میں پائے جانے والے دو اجازت ناموں میں جنھیں ککریدی (KAKAREDI) کے مہارانکا (MAHARANKA) نے بالترتیب 1240ء اور 1241ء میں جاری کیا تھا۔ کالنجر کے ترائی لوکیا ورما (TRAILOKYA VARAMA) کو فرمارو اتسلیم کیا گیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشرق میں چنڈیل حکومت کی توسیع ہوئی تھی۔ ۱۸ھ مغرب کی طرف چندیلوں نے پہلے ہی اپنی حکومت کو للت پور تک پہنچا دیا تھا۔ اس کا ثبوت 1207ء میں جاری کیے جانے والے ترائی لوکیا ورما کی تہری (TEHARI) کے اجازت نامے سے مل جاتا ہے۔ اس علاقے پر اُن کا مسلسل قبضہ ہونا جھانسی میں دستیاب ہونے والے ایک اور چنڈیل کتبے سے بھی ظاہر

ہوتا ہے جس کی تاریخ 1263ء ہے[19] ترائی لوکیا ورما کے جانشین ویراورما (VIRAVARMA) 1280ء/ 1337ء اور کرمی سمبت کی داہی ر DAHI) تانبے کی پلیٹ پر ایک شخص کو کچھ گاؤں انعام میں دینے کا ذکر ہے۔ یہ آدمی وہ تھا جس نے ترشکاوس، نل پورنلدواڑ) کے راجاؤں، مدھوبن (متھرا) کے حکمران گوپال اور گوپاگری (گوالیار) کے حکمران ہری راجہ (HARI RAJA) پر فتح حاصل کی تھی[20] ویر ورما نے اپنے ایک اور اجازت نامے میں جس کی تاریخ 1254ء ہے اور اس کے جانشین ہمیراورما نے 1289ء کے اجازت نامے میں اپنے آپ کو "کالنجر کا فرماں روا" لکھا ہے[21] بندیل کھنڈ کے شمال مغرب میں مہوبا اور ہمیر پور کے علاقے کی روایتوں سے ایسا لگتا ہے کہ اس حصے کو پھر راج پوتوں نے واپس لے لیا جنھوں نے 1252ء سے 1280ء تک حکومت کی تھی[22] جمنا کے جنوب میں کٹرا کے اقطاعے تقریباً سو میل دور ایک نئی سلطنت وجود میں آئی تھی جسے اب بندیل کھنڈ کہتے ہیں۔ ریوا اور ویا گھرا (VYAGHRA) کے بگھیلاوس کے روزنامچوں کے مطابق سلطنت کے بانی نے اپنے آپ کو کالپی اور چنار کے درمیان کے بیشتر ممالک کا فرماں روا بنالیا تھا اور اس کے بیٹے کرنا دیوا نے بعد میں دریائے تونس کی وادی کو بھی اس میں شامل کر دیا تھا۔[23] اور اس طرح جمنا کے زیادہ تر جنوبی شہر راجپوتوں کے قبضے میں آگئے تھے۔

اس علاقے میں ہندو راجکماروں کے خلاف جو بھی مہمیں شروع ہوئیں اُن کو بڑی محدود کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ان سے صرف فوجی مسئلے کی نشاندہی ہوئی۔ اودھ کے گورنر تیمور خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بھائی گور (BHATIGHOR) کو جو تونس کی وادی کا پرانا نام ہے[24] تباہ کرنے کے لیے متعدد بار دھاوا بولا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حملے ابھرتی ہوئی بگھیلا طاقت کو کچلنے کے لیے کیے گئے تھے۔[25] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بدایوں کا صوبے دار ملک گنلوک جب زہر سے مرا ہے تو اس وقت وہ کالنجر اور مہوبا پر فوجی چڑھائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔[26] 1247ء/ 645ھ میں خود بلبن نے ایک طاقت ور فوج لے کر ایک ہندو سردار پر چڑھائی کی تھی اس سردار کو منہاج نے "دلاکی وملاکی" (DALAKI-WA-MALAKI) کہا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے کالنجر اور کٹرا کے درمیانی ملک میں اپنے کو مستحکم کر لیا تھا۔ کہا

جاتا ہے کہ وہ کالنجر اور مالوہ کے رایوں (RAIS) سے آزاد اور انتہائی طاقتور تھا[27]
لیکن بلبن کو اس کے صرف ایک علاقے کو تباہ کرنے اور اس کے مضبوط اڈے پر قبضہ
کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ سردار نے بڑی زبردست مدافعت کے بعد اپنی ساری
فوج کو لے کر ہٹنا ہی مناسب سمجھا[28]

گوالیار کے آس پاس جمنا کے جنوب میں ایک اور بڑی طاقت چہار دیوا کی شکل میں
مستحکم ہو گئی تھی۔ چہار دیوا نے 1247ء کے بعد مارواڑ کے پری ہاروں کو نکال کر
جا جا پیلا (JAJAPELLA) سلطنت قائم کی تھی۔ اس ابھرتی ہوئی طاقت کا تذکرہ
ہم ملک تیاسائی کی مہموں کے سلسلے میں کر چکے ہیں۔ یہ مہمیں التمش کے آخری دور
میں ہوئی تھیں۔ گولیار، جھانسی اور نروار میں پائے جانے والے سکوں پر جو سب سے
پرانی تاریخ ہم کو ملتی ہے وہ 1233ء سے قبل کی نہیں ہو سکتی[29] اس کی طاقت یقیناً
بہت تیزی سے بڑھی ہو گی کیوں کہ مارواڑ میں قیام کے فوراً بعد مسلم روزنامچوں میں
اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ "وہ ہندوستان کے رایوں (RAIS) کا سب
سے زیادہ عظیم الشان رائے تھا اور اس کے تحت ایک زبردست فوج تھی"[30]
اس نے مارواڑ سے گوالیار مسلم محافظ فوج کے خلاف کارروائی شروع کی تھی۔ ظاہر ہے
یہ کارروائی اس فوجی قلعے کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے تھی، جہاں رضیہ نے اپنے
ابتدائی دور میں تیمور[31] کی سربراہی میں گولیار اور مالوہ، کے لیے مہم روانہ کی تھی۔
تاہم بہت جلد صورت حال غیر مستحکم ہو گئی۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے[32] کہ رضیہ
نے ایک اور فوج روانہ کی تاکہ فوجیوں اور شہری عاملہ کو اپنی حفاظت میں دہلی
واپس لے آئے۔ اس طرح گوالیار کو چہار دیوا کے لیے خالی کر دیا گیا۔ جس نے مسلم
سلطنتوں پر حملے کرنے کے لیے اس مقام کو محفوظ پایا۔ 1251ء/649ھ میں بلبن نے
رانا چاہر اجاری کے خلاف بڑے پیمانے پر حملہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس سلطنت کی
وسعت کا اندازہ غالباً اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس موقعہ پر بلبن نے جن جگہوں پر
پیش قدمی کی تھی اس میں گوالیار، چندیری، نارواڑ اور مالوہ کے نام لیے گئے ہیں[33]
اس مہم میں بلبن کو تھوڑی کامیابی ضرور ہوئی۔ اس نے نارواڑ اور گوالیار پر قبضہ بھی
کر لیا۔ لیکن چہار دیوا کی ہزیمت عارضی ثابت ہوئی[33] سکوں کی شہادت کی بنا

پر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کم از کم 1259ء تک آزادانہ حکومت کی تھی[34] اس کے جانشین کی دستاویزات بھی گوالیار اور نار وار میں ملی ہیں۔ اس کے جانشین اسّال دیوا (ASALLADEVA) کے سکّوں کی آخری تاریخ غالباً 1297ء ہے۔ اس سلطنت کے دو آخری راجکماروں گوپال اور گنپتی کا ذکر متعدد کتبوں میں ملتا ہے۔ جن کی تاریخ 1280ء۔ 1298ء ہے۔[35]

راجپوتانہ پر قبضہ بھی بہت بری طرح خطرے میں پڑ گیا تھا۔ التتمش کی موت کے بعد بھاگ وتا (BHAGAVATA) کی قیادت میں معزول شدہ چوہانوں نے بہت ڈٹ کر رنتھمبور پر حملہ شروع کر دیا تھا۔ رضیہ کے ابتدائی دور حکومت میں دباؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے محافظ قلعے کے لیے کمک بھیجنا پڑی۔ گوالیار کی طرح اس قلعے پر بھی قبضہ رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ بعد میں اس کی محافظ دیواروں کو توڑ دیا گیا تھا۔ اور حفاظتی دستے کو ہٹا لیا گیا[36] رنتھمبور کی آزادی اور پھر چوہان فرماں روائی کی بنیاد کا حوالہ دیتے ہوئے ہمیرا کا یو یہ (HAMMIRA- MAHA- KAVYA) نے مزید لکھا ہے کہ بھاگ وتا نے کھاراپراوں (KHARAPARAS) سے معاہدہ کر لیا۔ جن کی ایک لمبے عرصے سے مسلمانوں سے دشمنی چلی آرہی تھی[36] چوہاں سلطنت کے حدود کا تعین کرنا اس وقت مشکل ہے۔ مسلم مورخین نے جس علاقے کو میوات لکھا ہے غالباً انھوں نے چوہان فرمارروائی کو تسلیم کر لیا ہے۔ کیوں کہ اس علاقے کو منہاج نے رنتھمبور سے وابستہ کیا ہے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بندی حکومت پر بھی اُن کا اقتدار تھا۔ یہ فرماں روائی ٹاڈ (TOD) کے مطابق کچھ سال پہلے وجود میں آئی تھی[38] کوٹہ صوبے میں پائے جانے والے ایک کتبے میں لکھا ہے کہ بھاگ وتا کے جانشین اور بیٹے جیترا سنہا نے مالوہ کے پرماروں کو بار بار شکست دی تھی اور آخر میں رنتھمبور کے راجا کو قید کر دیا تھا[39] چوہان سلطنت کی تجدید اور اس کے اقتدار کی وسعت نے دراصل راجپوتانہ میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے خلاف کام کیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ میواڑ کے گوہلاٹ کی طاقت بھی زور پکڑ رہی تھی۔ جیترا سنہا نے اپنے کتبوں میں جس کی تاریخ 1213ء سے 1252ء کے درمیان ہے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مالوہ، گجرات، مارواڑ کے فرمارواؤں اور ترشکاؤں کو

شکست دی تھی ۴۳؎ راجپوتانہ میں مسلمانوں کے اقتدار کے زوال کی طرف یہ حقیقت بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہم لیوا کے اقطع کا کوئی ذکر نہیں سنتے اور التتمش کے دور کی تاریخ میں کاسیلی اور سانبھر کا ذکر بار بار نہیں ملتا ہے۔

چوہانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے 1248ء/ 646ھ میں بلبن نے رنتھمبور اور میوات پر چڑھائی کی ۴۳؎ روزناچوں سے پتہ چلتا ہے کہ بے شمار شہر تباہ ہوئے تھے لیکن بالآخر بلبن کو پسپا کر دیا گیا تھا اور اسی معرکے میں اس کے چند بہت اہم سپہ سالار مارے گئے تھے۔ اس موقعہ پر رنتھمبور کے خلاف تھوڑا آگے بڑھنے کی حقیقت اس بات سے بھی ثابت ہو جاتی ہے جب وہ دربار کے حکم کے مطابق اپنے ناگور کے اقطاع سے گیا تو اس نے رنتھمبور، منڈی اور چترور کے علاقوں پر کامیاب حملے کیے تھے۔ حالانکہ رائے نے جسے منہاج نے ویہادر دیو، لکھا ہے ایک بڑی فوج سے مقابلہ کیا تھا لیکن پھر بھی کہا جاتا ہے کہ بلبن نے لوٹ مار سے بہت سامال غنیمت حاصل کیا تھا اور اسے ساتھ لے کر لوٹا تھا ۴۳؎ اس قسم کے معرکے اس کی تخت نشینی کے وقت تک جاری رہے 1258ء/ 657ھ میں ہمیں ایک دفعہ پھر رنتھمبور کے ملحدوں کے خلاف کی جانے والی مہم کی خبر ملتی ہے لیکن اس معرکہ میں انھیں کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا ۴۴؎

اس سے پہلے باب میں ہم بیانا کے جادوں بھٹی راجپوتوں کی ایک شاخ کے شمالی الور میں قیام کا ذکر کر چکے ہیں جن کو روزناچوں میں میوات کا کوہ پایا" کہا گیا ہے۔ اس حقیقت کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ راجپوت میوؤں اور خانزادوں کے جدّ امجد تھے جنھوں نے سولہویں صدی میں کافی شہرت حاصل کی تھی اور جو کننگھم کی روایت کے مطابق فیروز تغلق کے زمانے تک مذہب تبدیل کر کے مسلمان نہیں ہوئے تھے ۴۵؎ اسی لیے پوری تیرھویں صدی کے دوران میوات کا سارا علاقہ ہندو جادو بھٹیوں کے قبضے میں تھا جنھوں نے بیانا کے مضبوط مسلمان اڈے کو تقریباً ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا تھا۔ مشرقی راجپوتانہ میں چوہانوں اور دوسری حکومتوں سے مل کر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی تھی۔ بہرام کے دورِ حکومت میں بلبن کو کوہ پایا کے ہندو باغیوں کی سرزنش کے

لیے ریواڑی کے اقطع (میوات کے قریب ضلع گڑ گاؤں) سے ایک تعزیتی دستہ بھیجنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔[46] میوات[47] میں جو کاروائیاں کی گئی ہیں اس سلسلے میں اکثر رنتھمبور کا ذکر آنے سے میواتی باغیوں اور چوہانوں کے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ اسی لیے یہ بات بہت زیادہ قرین قیاس ہو جاتی ہے کہ میواتی تلاطم دراصل دہلی کے خلاف کی جانے والی ایک منظم جارحانہ کاروائی تھی۔ راجپوت اس جارحانہ کاروائی کو دہلی کے علاقے تک لے آئے تھے۔ 1256ء/ 655ھ میں محمود کی حکومت جب قتلغ خاں کی بغاوت اور منگول پیش قدمی کو روکنے میں مصروف تھی میواتیوں نے ایک شخص مُلکا (MALKA) کی قیادت میں ہانسی پر بڑی بہادری سے حملہ کر دیا۔ یہ اپنے ساتھ مویشیوں کو بھگا لے گئے۔ یہ مویشی انھوں نے رنتھمبور تک رہنے والے راجپوتوں میں تقسیم کر دیئے۔[48] انھوں نے ہریانہ (صوبہ دہلی) اور سوالکھ اور بیانا کے اضلاع پر بھی حملہ کیا تھا۔ محمود کے دور حکومت کے آخری حصے میں ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ وہ دارالخلافہ میں دن دہاڑے ڈکیتی اور لوٹ مار کرنے لگے تھے۔ 1258ء/ 658ھ میں بلبن نے دو بظاہر ناکام معرکے کیے لیکن اس میں کچھ میواتی دیہاتوں کو لوٹنے اور بہتوں کو قتل کرنے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ قتل ہونے والوں میں مُلکا بھی تھا۔[49] برنی کی تاریخ کے ابتدائی بیانات سے راجپوت حملوں کی شدت کا کافی ثبوت مل جاتا ہے۔ جیترا سنہا اور اس کے مشہور بہادر بیٹے ہمیر اکی قیادت میں رنتھمبور کی طاقت بڑی تیزی سے بڑھی۔ آخر الذکر کے کتبے میں جیترا سنہا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے مالوہ، آمیر اور "کیر کار لاگیری" (KERKARALAGIRI) کے بادشاہوں کو ختم کر دیا تھا۔[50] ہمیر انے مالوہ، چتوڑ، آبو، اجمیر، سانبھر اور سارے شمالی راجپوتانہ پر اپنا اقتدار جما لیا تھا۔[51] یہاں تک کہ میواڑ کے راول سمارا سنہا (RAWAL SAMARASINHA) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے "ترشکھا سمندر میں گہری ڈوبی ہوئی گرجارا (GURJAPRA) سرزمین کو اوپر اٹھا لیا تھا۔[52]

جنوب مغرب میں بھی جالور کے چوہانوں نے اودے سنہا پر التمش کے لگائے ہوئے لگان کو ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے جانشین چاچی گادیواتے نہ صرف اپنی خود مختاری منوالی تھی بلکہ اس نے مندور کو پرماروں

سے چھین کر تسخیر کا کام شروع کر دیا تھا۔[53] بالآخر صدی کے آخر میں اس کے جانشینوں نے چندرواتی میں اس کے دارالخلافہ کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔[54] راجپوتانہ کے مغربی اطراف میں جیسلمیر کے بھٹیوں نے اس علاقے میں مسلمانوں کو پیر جمانے سے بڑے موثر طریقے پر روک دیا تھا۔

دہلی کے اقتدار کو ہر جگہ رد کیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اودھ اور دوآب میں جو ان کی سلطنت کا دل تھا۔ ہندوؤں نے جارحانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 1244ء/642ھ میں جرالی اور داتولی کے قبائل ہندوستان کے جنگلوں اور بڑی شاہراہوں میں ہر طرف پھیل گئے تھے[56] اس علاقے پر عارضی قبضہ کرنے کے لیے بلبن کو 1249ء اور 1244ء میں دو خونریز معرکے کرنا پڑے تھے[57] ایک ہندو سردار نے قنوج ضلع کے تلسندا قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا جسے واپس لینے کے لیے 1247ء/645ھ میں ایک بڑی فوج روانہ کرنی پڑی تھی[58] گنگا پار کے علاقے میں اہی چھترا کے قلعہ سے کتھیریاؤں نے اکثر بدایوں اور سمبھل کے اضلاع پر حملے کیے۔ 1242ء میں بدایوں کے صوبے دار نے ایک مہم کی قیادت کی جس میں متعدد کتھیریا (KATEHRIYA) ملحدوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ مہم غیر موثر ثابت ہوئی کیوں کہ 1254ء میں ایک دفعہ پھر بڑے پیمانے پر یہ کارروائی دہرانا پڑی۔[59] اس موقعہ پر دہلی کی فوجیں بلبن کی قیادت میں گنگا پار کر کے بجنور اور باردرا اور رام گنگا تک پہنچ گئیں۔ کتھیریاؤں نے جم کر مدافعت کی اور بلبن کے ایک افسر کو موت کے گھاٹ اتار دیا[60] حالاں کہ روزنامچے میں لکھا ہے کہ اس موقعہ پر ان کو مثالی سزا دی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو ختم نہ کیا جا سکا۔ کیونکہ بلبن کے دور حکومت کے ابتدائی حصے میں اس سے بھی زیادہ طاقت کے ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ میرٹھ کے صوبے دار کشلو خاں کی کامیابی دیرپا نہیں تھی جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے گنگا پار بجنور کے قریب روہیلکھنڈ کے ایک حصے کو مغلوب کر لیا تھا اور جس نے راناؤں اور روڑکی اور میاں پور میں آباد آزاد ہندو قبائل کو شکست دے دی تھی[61] اس کی کارروائیوں کا ایک واضح نتیجہ اس بیرونی فوجی چوکی کی صورت میں نظر آتا ہے جو امروہہ میں قائم ہوئی تھی اور جسے بلبن کے دور کے ابتدائی حصے میں اقطاع سے منسوب کیا گیا تھا[62]

حوالاجات

۱- بنرجی: ہسٹری آف اڑیسہ، ۱، ص- 263 -

2- منہاج، ص- 243 . مورخ نے " جارج نگر کے رائے " کا ذکر کیا ہے —— عام طور پر علماء اس بات سے متفق ہیں کہ اس کا مطلب اڑیسہ ہے. مسلمان عام طور پر ملک کا ذکر اس کے دارالسلطنت کے نام سے کرتے تھے اس لیے یہ غالباً وتیرنی کے کنارے واقع جارج پور ہی تھا اور جو ۱۸ ویں صدی تک جارج نگر کے نام سے مشہور تھا، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1875ء، ص- 285. بنرجی کا خیال تھا کہ جاج نگر سے صوبہ متوسط کے چھتیس گڑھ ڈویژن میں واقع جاجلنگر (JAJALLANGAR) مراد ہے، ہسٹری آف اڑیسہ، ۱، 249 لیکن مباندی کے کنارے جاجتی نگر نام کا ایک شہر تھا ممکن ہے کہ اسے فارسی میں جاج نگر کر دیا گیا ہو- دیکھئے. ایپی گرافیا انڈکا، iii، ص 365 . اس کا ذکر دھوئی (DHOYI) کے پوناڈتم (PANANADUTOM) میں ہوائی پیغامبر (WIND MASSENGER) کے ملک سہا (جنوب مرکزی بنگال) میں داخل ہونے سے قبل کی منزل کی حیثیت سے کہا گیا ہے۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1905، ص- 44 -

3- منہاج، ص- 244 ریورٹی کی شناخت کی رو سے اگر کٹاسن کو مباندی پر واقع کٹاسنگھ مان لیا جائے تو اڑیسہ کی مشرقی سرحد موجودہ بنگال کی جنوب مغربی سرحد سے دو سو میل دور قرار پائے گی. جبکہ یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اڑیسہ میں جنوبی مغربی بنگال کا کافی بڑا علاقہ شامل تھا، بنرجی: ہسٹری آف اڑیسہ میں

جنوبی مغربی بنگال کا کافی بڑا علاقہ شامل تھا؛ بنرجی: ہسٹری آف اڑیسہ، i، ص۔ 264۔ مدناپور میں واقع رائے بانیا گڑھ (RAI BNIA GARH) سے کی گئی این واسو کی شناخت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ وانگیا ساہتیہ پریشت پتریکا (VANGIA SAHITYA PARISAT PATRIKA)، ص۔ 132۔ نوٹ 1۔ این کے بھٹاشالی کی رائے اسے کتھا سنگ (KATHASANGA) سے شناخت کرنے کے حق میں ہیں۔ جو بنکرہ ضلع میں بشن پور کی سرحد پر دریائے دامودر کے جنوب میں 12 میل کی دوری پر واقع ہے۔ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین، جنوری 1935ء ص۔ 109۔ ڈھاکہ یونیورسٹی آف بنگال، ii، ص۔ 48 نوٹ۔ 1۔

4۔ منہاج، ص۔ 244۔ 245۔

5۔ منہاج، ص۔ 262۔ 263۔

6۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، LXV، ص۔ 229۔ 237۔ ایکاولی (EKAVALI) نام کی ایک سنسکرت تصنیف میں نرسنگھ کو "جوانا (JAVANA)" سلطنت کا مالک بتایا گیا ہے۔ دیکھئے بنرجی: ہسٹری آف اڑیسہ، ص۔ 267؛ بنگلا اتہاس (BANGLAR ITIHASA)، ii، ص۔ 75۔

7۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، V، (این۔ ایس)، ص 216۔ 217 میں ایم۔ چکرورتی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس نے مندرا (MANDAR) یا مندران (MANDARAN) مراد ہو سکتا ہے۔ جو مدناپور کی سرحد پر واقع کافی قدیم مقام ہے۔ پورے عہد وسطیٰ کے دوران منڈران کے قلعے کی بڑی دفاعی اہمیت تھی۔ اور یہ بردوان سے اڑیسہ جانے والی شاہراہ کی کمان کرتا تھا۔ ریورٹی کا نوٹ بھی دیکھئے۔ ترجمہ طبقات ناصری، ص۔ 763۔ کٹیلاگ آف کوئنس ان دی انڈین میوزیم، ص۔ 146 نمبر۔ 61۔

8۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، LXV، ص۔ 229۔ این۔ این۔

9 واسو بھی دیکھئے: وِسو کوسا (VISVA KOSA) میں گنگیا پر مقالہ، م۔ بہ۔ بنرجی، ہسٹری آف اڑیسہ، i، ص۔ 273۔

۱۰- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1896، ص ص۔ 9 - 15 و x دائی۔
ایس) ص ص، 99 - 104؛ این۔ جی۔ مجمدار بھی دیکھیے: انسکرپشنز آف بنگال
(INSCRIPTIONS OF BENGAL)، iii، ص ص۔ 118 S9

۱۱- منہاج، ص، 263 - 265 - روایت ہے کہ کامروپ جاتے ہوئے یزبک نے
دریائے باگ متی کو پار کیا، اس کا مطلب یا تو 'کراتویا' ہے یا برہم پتر دیکھیے نوٹ۔ 3
سپرا، ص۔ 77 - ریورٹی کا اصرار ہے کہ کامرو... کا دارالسلطنت کامتا پور تھا جو کہ
گوہاٹی سے کافی دور مغرب میں دریائے دارلہ (DARLAA) پر واقع تھا، ترجمہ
طبقات ناصری، ص۔ 764 - لیکن دارالسلطنت کو گوہاٹی سے تیرھویں صدی کے
آخیر تک منتقل نہیں کیا گیا، دیکھیے بڑوا: ہسٹری آف کامروپ، ص۔ 199- گوہاٹی؛ میں
یزبک کے دو سکے ملے ہیں جن پر 653ھ کی تاریخ ہے۔ جرنل آف دی ایشیاٹک
سوسائٹی آف بنگال، 1910، ص۔ 261 -

12- رے (RAY) ڈائنسٹک ہسٹری (DYNASTIC HISTORY) i، ص۔ 939، انڈین
اینٹی کیوری، 1875، ص۔ 366؛ 1919، ص۔ 47، ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف
بنگال 261-295- بدھ سین کے بیٹے جے سین کے دور حکومت میں تحریر کردہ
جانی بیگھا کے کتبے کی تاریخ 1283-4 کے مطابق بتائی جاتی ہے۔ انڈین اینٹی کیوری
1890، ص ص۔ 1 - 3 بھی دیکھیے۔

13- کاما (KAMA) کے بادشاہ اسوکا کلا (ASOKACALLA) اس کے بھائی اور پجاری
کا ذکر ان کتبوں میں ہے جن کی تاریخیں لا۔ سام (LA-SAM) 51، 74 اور
1813 نروانا (NIRVANA) سنہ ہیں۔ جو فلیٹ (FLEET) کے مطابق 1270ء
کے مطابق ہیں۔ انڈین اینٹی کیوری، xii، ص۔ 27؛ جرنل ... ایشیاٹک
سوسائٹی آف بنگال، v، 658؛ انڈین اینٹی کیوری، x، ... 34؛ جرنل آف
دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1913، ص۔ 72 - 73 فلیٹ (FLEET)
کے لگائے ہوئے حسابی اندازے کے لیے دیکھیے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک
سوسائٹی آف بنگال، 1909، 48 - 49- لیکن بھنڈارکر کا خیال ہے کہ 1813
نروانا سنہ 1175ء کے مطابق ہونا چاہیے۔ انڈین اینٹی کیوری، xx، اپنڈکس

ص۔ 199 کیل ہارن کی فہرست بھی دیکھئے: انڈین اینٹی کویری، v، ص۔ 79 کتبہ نمبر 575۔ بھگوان لال اندراجی کے حساب سے 1182 کے مطابق ہونا چاہئے؛ انڈین اینٹی کویری، 1887، ص۔ 341۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال xvii (ایس۔ این) ص۔ 13۔ اس مفروضہ کی بنیاد پر کہ لا۔ سام سنہ 20-1119 سے شروع ہوتا ہے۔ ایچ۔ سی۔ رائے چودھری کا خیال تھا کہ بودھ گیا کے کتبوں میں مذکور 51 ویں اور چوہترویں سال کی مطابقت بالترتیب 71-1170 سے 1193-4 ہونی چاہیے۔ اسوتوش سلور جوبلی والیومس (ASUTOSH SILVER JUBLE VOLUMES) iii، حصہ دوم ص۔ 5۔ اس خیال کو ان مورّخوں نے تسلیم نہیں کیا جن کا خیال ہے کہ اس سنہ کی ابتدائی 1200ء سے مانی جانی چاہئے اس طرح 51 واں اور 74 واں سال 1251 اور 1274 کے مطابق ہوگا۔ یہ خیال فلیٹ کے حساب سے مطابقت رکھتا ہے جو 1813 نروانا سنہ کو 1270ء کے مطابق مانتا ہے جب کہ اسوکا چلا (ASOKA CHALLA) جس کا ذکر تینوں کتبوں میں ہے۔ حیات تھا۔ اس مسئلہ پر دیکھئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال (i، ص۔ 237-283؛ جے۔ این۔ بنرجی ولیوم۔ کلکتہ 1960 ص ص۔ 75-71 میں آر۔ سی۔ مجمدار کو بھی دیکھئے، نیو لائٹ آف دی انٹرپریٹیشن آف آتیسنہ راجیہ رسموت (NEW LIGHT ON THE ATILA RAJYA-SAMNAT)

14- ایپی گرافیا انڈکا، xxii، ص۔ 222۔

15- منہاج، ص۔ 265۔

کننگھم: رپورٹس، iii ص۔ 27؛ کیل ہارن کی فہرست: ایپی گرافیا انڈکا۔ v۔ نمبر 23 بھی دیکھئے۔

17- گیا گزٹیر، ص۔ 28۔

18- انڈین اینٹی کویری 1888، ص۔ 230۔ کننگھم: رپورٹس، ص 142-148؛ ڈائنسٹک ہسٹری، ii، ص 728۔ حال ہی میں پائے گئے ایک کتبے سے ثابت ہوتا ہے کہ چندیلہ بادشاہ وتر لوکیہ ورمانے 1212ء میں ہی ریواہ (REWAH) پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی؛ ایپی گرافیا انڈکا، xxv، ص۔ 126۔

19- اینول رپورٹ آف انڈین ایپی گرافی (ANNVAL REPORT OF INDION EPIGRAPHY) 147-146 نمبر 50 ؛ ایپی گرافیا انڈکا، v، ص۔ 33 نمبر 227؛ انڈین اینٹی کویری، xix، ص۔ 179 ۔ نمبر 128 ۔

20- کننگھم : رپورٹس، xxı، ص۔ 75 ۔ عطیے کا دستاویز اب دستیاب نہیں ہے۔

21- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1881، ص ص۔ 23-37 ۔ م۔ بہ۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1902، ص۔ 99 ۔ جہاں سترھویں صدی کی ایک بندیلہ تاریخ کی سند پر بیر بندیلہ کی سربراہی میں بندیلوں کے طاقت کے حصول کو تیرھویں صدی کے نصف اوّل کا واقعہ بتایا گیا ہے۔ روایت ہے کہ بندیل حکومت کالپی سے کالنجر کے علاوہ اودھ اور دوآب تک پھیلی ہوئی تھی۔

23- کننگھم : رپورٹس، xxı، ص۔ 104 ؛ دیکھیے میموائرس آف دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا ؛ نمبر 21، ص۔ 104 ۔ 11 سے

24- کننگھم بہ ج ۔ س۔، xxı، ص۔ 154 ۔

25- منہاج، ص۔ 247 ۔

26- ایضاً، ص۔ 257 ۔

27 ایضاً، ص۔ 291 ۔ کننگھم : ج۔ س۔ xxı، ص۔ 106 نے اس شخص کو بگھیلا تذکروں کے دلاکیشور اور ملاکیسور (DALAKESLVAR AND MALAKESWAR) سے شناخت کیا ہے۔ اسمتھ نے اس نام کو بھر سردار کا نام قرار دیا ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ ایٹہ و کان پور و فتح پور وغیرہ پر حکومت کرتا تھا اور تلوکی اور بلوکی کہلاتا تھا۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1881، ص۔ 34 ۔ رے کا خیال ہے کہ اس کو چندیلا خاندان کے تریلوکیہ ورما سے شناخت کیا جا سکتا ہے : ڈائنسٹک ہسٹری، ii، ص۔ 20-30 ۔ اس این۔ ایس۔ ہسٹری آف دی چندیلاز (HISTORY OF THE CHANDELAS) ص ۔ 109 ۔ بھی دیکھیے۔

28- منہاج، ص۔ 211 اور 292 ۔

29- کہننگم : کوائنس آف مڈ یول انڈیا، ص۔ 93 تھامس (THOMAS) : کرانکلز (CHRAMICLES) ص ۔ 70 ۔

30- منہاج، ص-215- 216 -
31- ایضاً، ص- 247-
32- ایضاً، 215- م. بہ کنہنگم: کوائنس آف مڈیول انڈیا: ص -91 اور ایپی گرافیا انڈکا، vii، ص - 223 - 224 جس میں چہار دیو کو ناہر دیو سمجھ لیا گیا ہے۔ جو منہاج کے بیان کے مطابق رنتھمبور پر حکومت کرتا تھا۔
33- منہاج، ص- 216 و 278 اور 297
34- کننگھم، کوائنس آف مڈیول انڈیا- ص-93-
35- انڈین اینٹی کویری، 1918ص- 241- انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی دسمبر 1956- ص 400 پر دیکھئے ڈ- سی- سرکار کو جو حال میں دریافت ہوئے کتبوں کی بنیاد پر گنپتی کی حکومت کو 1300ء تک مانتے ہیں۔
36- منہاج، ص- 187 -
37- انڈین اینٹی کویری 1879، ص-63 رضیہ کا ذکر جلال الدین کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ وہ سرکاری نام تھا جو اس نے اپنے کچھ سکوں اور کتبوں میں استعمال کیا۔ دیکھئے۔ کیٹلاک آف کوئنس ان دی انڈین میوزیم، ii، ص 2 اور نمبر 93؛ اور پالم کا سنسکرت کتبہ مورخہ 81 - 280 ایپی گرافیا انڈو مسلمکا، 1913، ص-43.
م- بہ- رسے: ح- س، ii، ص- 1095 -کھرپارا-
صوبہ متوسط میں داموہ (DAMOH) کے قریب پائے گئے ایک کتبے مورخہ 1328 میں کھرپارکاس (KHAR PARA KAS) اور کھرپارس (KHARPARAS) کا ایک ہی معلوم ہوتے ہیں جن کا ذکر ایک ہندو فوج کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ جس کی کمان جوگنی پورہ کے حکمراں محمود کے تحت چھیدی علاقے کا گورنر کر رہا تھا و ایپی گرافیا انڈکا، iii، ص- 44- کھاکروں (KHAKRAS) (کھوکروں) سے ان شناخت سے متعلق ایک تجویز کے لیے دیکھئے انڈین اینٹی کیوری 1879، ص-64-
38- انلز (ANALS)، ii، ص- 459- ارسکن: راجپوتانہ گزیٹر، ص- 236- 237-
39- اوجھا، راجپوتانہ، i، ص- 203 میں حوالہ
40- ویانا اورنٹیل جرنل (VIENNA ORIENTAL JOURNAL) XXI، "دی چروا

انسکرپشن" (THE CHIRWA INSCRIPTION)، انڈین اینٹی کویری، 1928، ص۔
32۔ بھاؤنگر انسکرپشنز (BHARNAGAR INSCRIPTION) بھی دیکھئے، ص۔93

41۔ منہاج، ص۔ 213۔

42۔ ایضاً، ص 293۔ 294۔

43۔ ایضاً، ص۔ 299 انڈین اینٹی کیوری، 1928، ص۔32 چتوڑ کے جیتر سنہا (JAITRA-SINHA) کے ایک کتبہ میں اس واقعہ کے حوالے کے لیے۔

44۔ منہاج، ص 266۔ تاہم ہمیرہ مہا کویہ میں مذکور ہے کہ جیتر سنہا دہلی کے سلطان کو خراج ادا کرتا تھا۔ دیکھئے ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل، v، ص۔85۔

45۔ کنگھم: رپورٹس، XX، ص۔ ii: منہاج ہمیشہ میواتیوں کو کافر ہی لکھتا ہے۔ اوجھا: راجپوتانہ، i، 238 بھی دیکھئے۔

46۔ منہاج، ص۔285۔

47۔ مثال کے لیے ص ص۔ 213 اور 292 دیکھئے۔

48۔ منہاج، ص۔ 313۔

49۔ ایضاً، ص ص۔ 314۔ 316۔

50۔ ایپی گرافیا انڈکا، xix، ص۔ 45۔ 47۔

51۔ انڈین اینٹی کویری، 1879، ص۔ 64۔ 65۔

52۔ انڈین اینٹی کویری، 1887، ص۔ 347۔

53۔ ایپی گرافیا انڈکا، ix، ص ص۔ 55۔ 73۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادے سنہا (UDAI SINHA) نے التتمش سے شکست کھانے کے فوراً بعد پھر سے آزادی حاصل کرلی۔ دیکھئے بامبے گزیٹر، i، حصہ I، ص ص۔474۔ 476۔

54۔ ایپی گرافیا انڈکا، xi، ص۔ 87؛ اوجھا: راجپوتانہ، i، ص۔ 180۔

55۔ م۔ بہ۔ ٹوڈ: انلز (ANALS)، i، ص۔247۔ جس کا اصرار ہے کہ ناگور کے گورنر کسی منظفر خاں کو کرم دیو (KURRAM DEO) نے شکست دی تھی۔ (1251/71)۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، iii، ص۔531 بھی دیکھئے۔

56۔ مقامات کے نام مشتبہ ہیں۔ ان کو جلالی اور دیولی بھی لکھا گیا ہے۔ جلالی علی گڑھ

کے نزدیک ہے۔ دیکھئے ریورٹی کا نوٹ : ترجمہ طبقات ناصری، ص۔ 809 ہودی والا ان کا محل وقوع اٹاوہ ضلع میں ماننے کو ترجیح دیتا ہے، ایلیٹ اینڈ ڈی سن میں کنٹری (علی گڑھ)، ii، ص۔ 737۔ 738۔

57۔ منہاج، ص ص۔ 213 اور 287۔

58۔ ایضاً، ص۔ 210۔ کننگھم نے تلسانڈہ (TALSANDA) کو موجودہ موضوع بلسر (BILSAR) سے شناخت کیا جو ایٹہ سے دس میل شمال میں ہے۔ رپورٹس، xi، ص۔ 21-22۔

59۔ منہاج، ص۔ 256۔

60۔ ایضاً، ص۔ 218 م۔ بہ پٹیالہ ریاست میں پنجور سے بردار (BARDAR) کی شناخت کننگھم : رپورٹس، xiv، ص۔ 70۔

61۔ منہاج، ص۔ 280۔

62۔ برنی، ص۔ 36۔

ساتواں باب

سلامتی اور استحکام

1265ء - 1287ء

محمود نے تقریباً بیس سال تک بادشاہت کی لیکن اس کا حکم کبھی نہیں چلا۔ اس کی پارسائی اور سادگی پر کچھ زیادہ ہی زور دیا گیا ہے لیکن اس بات پر تو شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی فطرت غیر ادعائی اور غیر یقینی اور قوت ارادی کمزور تھی۔ ایک فاتح نسل کا بادشاہ ہونے کے ناتے اس کی ضرورت سے زیادہ انکساری اس کے لیے نقصان دہ تھی۔ کیوں کہ التتمش کا وارث ہونے کے لیے لازمی شرط ایک مضبوط قوت ارادی تھی۔ بادشاہ میں دم خم کی کمی کی وجہ سے تاج شاہی کی عزت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اور اس کی اپنی زندگی میں بادشاہ کی تبدیلی ناگزیر ہو گئی تھی۔ لیکن محمود اپنے وفادار نائب بلبن، الغ خاں کی وفاداری اور مخلصانہ خدمات کی وجہ سے اس انجام سے بچ گیا جو اس کے بھائیوں کا ہوا تھا۔ بلبن، ترکوں کے الباری قبیلے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو بچپن ہی میں ایک غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا تھا۔ جسے بالآخر التتمش نے خرید لیا تھا۔ آئندہ ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ اس نے کس طرح شاہی مناصب میں ترقیاں حاصل کیں۔ محمود کی تخت نشینی ایک انقلاب کا نتیجہ تھی، جس میں بلبن کی ساز باز قرین قیاس سے زیادہ یقینی معلوم ہوتی ہیں۔ چوتھے سال اس نے اپنی لڑکی کی شادی نوجوان بادشاہ سے کر کے شاہی خاندان سے اپنا رشتہ جوڑا

لیا تھا۔ اس کے بعد بلبن کی (الغ خاں) کے عہدے پر ترقی اور نائب مملکت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی بات قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ ریحان کی سازش کی ناکامی نے اس کی حیثیت کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ اس طاقت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب ترکوں کی متحدہ طاقت کے سربراہ کی حیثیت سے وہ تخت نشینی سے معزولی کی دھمکی کا مقابلہ کرنے کے لیے جم کر سامنے آگیا۔

تاہم اس نے طاقت کو صرف تاج شاہی کے مفاد میں استعمال کیا۔ اس نے انتظامیہ کے بے جان محکمہ میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ اگرچہ اس کے آقا کی سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنا اور دائمی بنانا تقریباً ناممکن تھا، تاہم اس نے کم از کم اتنا تو ضرور کیا کہ بادشاہت کے مزید تنزل کو روک دیا۔ اس نے منتشر کرنے والی طاقتوں کو مسلسل للکارا اور مغلوب کیا۔ اس نے ہندو حملے کی بڑی ثابت قدمی سے مدافعت کی جیسا کہ اگلے باب میں آپ پڑھیں گے اس نے سیاست دانی اور فوجی کارروائیوں کے بڑے مدبرانہ امتزاج سے کام لے کر منگولوں کو روک دیا۔ ورنہ وہ بڑی آسانی سے فتح حاصل کر لیتے یہ صحیح ہے کہ ان مُلکوں کے اقتدار کو ختم کر کے ان کی جگہ اپنے آدمی تعینات کر دیئے۔ لیکن برنی کے تمہیدی جملوں میں اُن کی رائے زنی کے باوجود پتہ چلتا ہے کہ دہلی کی سلطنت محمود کے ابتدائی دور کے مقابلے میں آخری زمانے میں واضح طور پر زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔

یہ بات یقینی طور پر شاید کبھی نہ معلوم ہو سکے کہ محمود کا دور کس طرح ختم ہوا کیونکہ اس واقعہ سے پہلے ہی منہاج مر چکا تھا اور برنی کی تاریخ بلبن کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے۔ ابن بطوطہ اور اسامی نے چودھویں صدی کی تاریخ میں بلبن پر اپنے بادشاہ کو زہر دینے کا الزام لگایا ہے [2] تاہم اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے۔ بلبن کے شاہی خاندان سے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ مسعود اور محمود دونوں اس کے داماد تھے۔ خود اس کے اپنے بیٹے بغرا خاں کی شادی محمود کی اکلوتی بیٹی سے ہوئی تھی جو اس کی دوسری بیوی سے تھی [3]۔ اس لیے التتمش کا خاندانی سلسلہ بلبن کی ذات میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جہاں تک معلوم ہے محمود نے کوئی اولاد نرینہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ برنی لکھتا ہے کہ بلبن اپنی نیابت کے زمانے

میں بھی شاہی نشان امتیاز اپنے پاس رکھنا تھا۔[4] اس لیے 66 ء1266/ 664ھ میں اس کا تخت پر بیٹھنا[5] رائج طریق کار کو صرف ایک باقاعدہ شکل دینے کے مترادف تھا اور محض ایک رسمی معاملہ تھا۔ غالباً اس کی مخالفت بھی نہیں ہوئی تھی۔

اس کا اوّلین کام تاج شاہی کی عزّت کو بحال کرنا تھا اور اس کے تقدس اور اقتدار کے لیے لوگوں کے دلوں میں احترام پیدا کرنا تھا۔ ہندو اور منگول حملوں کا موثر جواب صرف ایک ایسی مستحکم ریاست ہی دے سکتی تھی جس کی علامت ایک مضبوط اور مطلق العنان حکومت ہو۔ سلطنت کو اس منزل تک پہنچانے کا کام بلبن کے سپرد تھا۔ اس کو اس امر کا احساس تھا کہ اُسے تخت شاہی کا موروثی حق نہیں ہے اس لیے اس نے اپنی ذاتی سلطنت اور شہرت بڑھانے کے لیے دعویٰ کیا کہ اس کا سلسلۂ نسب ترکی کے خیالی ہیرو افراسیاب سے جا ملتا ہے۔[6] اس نے قول اور فعل دونوں سے اس بات پر مسلسل زور دیا کہ بادشاہ کی حیثیت واجب التعظیم ہے اور اُسے لوگوں کے دلوں میں رعب، دبدبہ اور احترام پیدا کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو یہ بتایا تھا کہ "مطلق العنانی کی مادّی شکل کا نام بادشاہت ہوتا ہے"۔[7] بادشاہ کا دل خدا کی عنایتوں کا مخزن ہے اور اس میں کوئی انسان اس کا مدمقابل نہیں ہے۔ اس نے ایک اور موقعہ پر کہا تھا کہ "بادشاہ کی فوق البشری حیثیت ہوتی ہے اور یہی منصب لوگوں کی اطاعت کا ضامن ہو سکتا ہے"۔[8] اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس قسم کا استبداد بادشاہ کی جان کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ محافظوں کے پہرے میں رہتا تھا۔[9] اپنے بیٹوں کو تاج شاہی کے تقدس کی اہمیت سمجھانے سے وہ کبھی تھکتا نہیں تھا۔ بادشاہ کا احترام پیدا کرنے والے لمطراق کو سلطنت کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ اس نے دربار کے آداب پر نظر ثانی کی تاکہ اس میں سلطنت کے نظم اور جاہ و جلال کا اظہار ہو۔ اس کی تخت نشینی کے بعد 6-1259ء میں جب ایک دفعہ ہلاکو کے بھیجے ہوئے منگول سفیر دہلی آئے تو بلبن نے بہت سوچ سمجھ کر ان کے شاندار استقبال کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ ہلاکو کے سفیر جب دہلی سے واپس لوٹے تو اُن کے دل میں بادشاہ کی شان و شوکت کے لیے غیر معمولی احترام تھا۔[10] سلجوق اور خوارزمی بادشاہوں کے لوازم جشن تاج پوشی اور

دبدبہ خسروانہ کی نقل پوری طرح سے کی گئی تھی اور بادشاہ کے ارد گرد بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے نڈر محافظ رکھے گئے تھے تاکہ اُن کی کھینچی ہوئی اور سورج کی روشنی میں چمکتی ہوئی تلواروں سے دیکھنے والی نگاہیں خیرہ ہو جائیں۔ دربار میں اس نے سجدہ اور پائے بوسی پر اصرار کیا۔ اس نے اپنے لیے ایسی شاندار رسمیں رائج کیں جو اس سے پہلے دہلی کے کسی بادشاہ نے نہیں برتی تھیں [11] اس نے خود اپنی نجی رکھ رکھاؤ میں بھی انداز اختیار کیا جو شاہی احترام کی علامت بن جائے۔ ابتدائی زندگی میں زبردست یا بارش ہونے کے باوجود اس نے تخت نشینی کے ساتھ ہی شراب چھوڑ دی اور اسے درباریوں کے لیے بھی ممنوع قرار دیا۔ وہ عوام الناس سے بات تک نہیں کرتا تھا۔ دہلی کے ایک تاجر نے بادشاہ سے ملاقات کے لیے اپنی ساری دولت نذر کرنے کی پیش کش کی تھی لیکن اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکی۔ اس نے اپنے ذاتی ملازموں کو کبھی بے تکلف ہونے کا موقعہ نہیں دیا اور نہ کبھی اُن پر اپنے انسانی احساسات ظاہر ہونے دیئے۔ [12] لیکن ولی عہد کی موت نے ضعیف بادشاہ کا دل توڑ دیا اور وہ زار و قطار رو دیا۔ لیکن سب کے سامنے رونا یا اپنی کمزوری کا اظہار کرنا وہ کسر شان سمجھتا تھا۔ حاضرین کے سامنے پورے ضبط سے کام لینے کے بعد آدھی رات گئے اپنے کمرے کی تنہائی میں وہ دل خراش سسکیوں میں ڈوب جاتا۔ اس طرح اس نے بڑی بے رحمی سے اپنے آپ کو بادشاہت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ منگولوں کی بربادی نے اس کی ساکھ اور زیادہ بڑھا دی۔ کیونکہ یہی صرف اکیلی ایسی مسلم سلطنت تھی جو ابھی تک منگولوں کے ریلے میں نہیں بہی تھی۔ چنانچہ دہلی نے ممتاز اور مشہور شہزادوں اور عالموں کو اپنے دامن میں باعزت طور پر پناہ دی۔ جو اس کے دربار کی شان کو دوبالا کرتے تھے۔ اس نے انھیں رہنے کے لیے ایسے مکانات دیئے جن کے نام اُن کے اپنے ملکوں اور نسلوں کے نام پر رکھے گئے۔ اس سے یہ ہوا کہ ہندوستان کے باہر اس کی شہرت بہت بڑھ گئی اور وہ مسلم تہذیب کا پاسبان سمجھا جانے لگا [13] تاج شاہی کی عزت کو بڑھانے کے لیے اس نے انتہائی غیر جانبدارانہ عدل و انصاف سے کام لیا۔ اس کے اقتدار کو دھکا پہنچانے والی معمولی سے معمولی غلطی کی سزا اتنی سخت دی جاتی تھی جو ایک لحاظ سے

ظالمانہ ہوتی تھی۔ دو اعلیٰ عہدے دار، یعنی بدایوں اور اودھ کے گورنروں کو دوسروں کو سبق دینے کے لیے اسی انتہائی سزا کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ ان کے خلاف اپنے نجی غلاموں پر ظلم کرنے کا الزام تھا۔[93] سپہ سالار کو موت کی سزا صرف اس لیے دی گئی تھی کہ اس نے شاہی احکامات پر عمل نہیں کیا تھا اور بنگال کے گورنر تغرل کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔[94] اس نے فرائض کو ایمانداری اور چابک دستی سے انجام دینے کے لیے جاسوسی نظام کو ترقی دی اور تقریباً ہر محکمہ میں اپنے مخبر تعینات کر دیئے صحافیوں (BARID) کی وفاداری اور چال چلن کی چھان بین کے لیے وہ بڑی محنت کرتا۔ کیونکہ بلبن نے اپنی استبدادی حکومت کے لیے ان کو ایک بہت اہم پرزہ بنایا تھا۔[95]

بلبن کی مطلق العنانی آخری حد تک پہنچ چکی تھی جس میں اعلیٰ فوجی افسران کا حکومت پر چھا جانا تو الگ رہا انھیں اس میں حصّہ لینے تک کی اجازت نہ تھی۔ اس مطلق العنانیت کے حصول میں اسے بے مثال کامیابی حاصل ہوئی کیوں کہ اس کے بیس سالہ نیابت کے دور میں اعلیٰ خاندانوں کے بیشتر لیڈر جن کی تعداد چالیس تھی، یا تو مر چکے تھے اور یا پھر ان کو بالکل ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اپنے چچا زاد بھائی شیر خاں[96] کی حوصلہ مندی اور صلاحیتوں سے بلبن کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد پھر کوئی ایسا مخالف نہ رہا جو اس کی پالیسی کے عمل درآمد میں حائل ہوتا۔ شہنشاہ کی مطلق العنانی کے سلسلے میں اس کے دور کا سب سے اہم واقعہ یہی تبدیلی تھی۔ اس کے احتیاطی اقدامات کی کامیابی دراصل اسی تبدیلی کا براہ راست نتیجہ تھی۔ مورخین نے اس کے بیس سالہ دور حکومت کی تفصیلات دینے میں بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی انھوں نے اس کی کامیابیوں کو جتنا بھی قلمبند کیا اسے صرف ایک عنوان کے تحت لکھا جا سکتا ہے اور وہ ہے 'استحکام'، اس میں وہ اہتمام بھی شامل ہیں جو داخلی تحفظ کے لیے کیے گئے تھے یا پھر فوجی تنظیم کی اصلاحات اور ان ہندو طاقتوں سے متعلق پالیسی میں تبدیلی بھی شامل ہے جن کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلبن کی خارجہ پالیسی اور دفاعی اقدامات اس کے استحکام کے منصوبوں کے مطابق تھے۔ تاہم ان کا تفصیلی ذکر ہم ایک علیحدہ باب میں کریں گے۔

اپنے اقتدار کے جابرانہ آلا کار کو مستحکم و موثر بنانے کے لیے اس نے اپنی توجہ کا سب سے پہلا مرکز فوج کو بنایا۔ جس کی تنظیمی خرابیاں گذشتہ دور میں نمایاں ہو کر سامنے آگئی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر فوجی عملہ میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور کمان کے لیے ایسے افسران کا تقرر کیا گیا جن کی صلاحیت اور وفاداری ثابت ہو چکی تھی۔ اس نے سپاہیوں کی تنخواہ بڑھادی اور کچھ لوگوں کو نقد تنخواہ کی جگہ گاؤں دے دیے۔[19] تاہم جلد ہی اسی طرح دی جانے والی تنخواہ کے نقصان دہ اثرات ظاہر ہوئے۔ اپنی تخت نشینی کے دوسرے اور تیسرے سال میں لاہور کی مہم کے دوران اسے پتہ چلا کہ تقریباً دو ہزار سپاہی ایسے ہیں جن کو التتمش کے زمانے سے ذاتی خدمات کے معاوضہ کے سلسلے میں دو آبے میں گاؤں ملے ہوئے ہیں اور اب یہ لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برت رہے تھے ان میں سے بیشتر یا تو مر چکے تھے یا پھر اتنے بوڑھے ہو گئے تھے کہ فوجی خدمات کے لائق نہیں تھے باقی لوگ محکمہ جنگ (دیوان ارض) کی چشم پوشی کی وجہ سے گھر پر پڑے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ تو اپنا بدل یا کرایہ کے آدمیوں کو بھیج دیتے تھے جو نہ صرف یہ کہ اچھی طرح مسلح نہیں ہوئے تھے، بلکہ وہ فوجی کام کے لیے ناموزوں بھی ہوتے تھے۔ فوجیوں کے وارثین ورثے میں ملنے والے دیہاتوں کو یا تو محض تحفہ سمجھتے یا پھر اپنی گذشتہ خدمات کا انعام۔ یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ بدنام کرنے والی تھی بلکہ فوجی کارکردگی کا معیار بھی گرا رہی تھی۔ مکمل تفتیش کرانے کے بعد بلبن نے دیہاتوں کو ہرجانہ دے کر واپس لینے کا حکم صادر کیا۔ ضعیف سپاہیوں کے لیے ان کی سابقہ خدمات کے پیش نظر نقد پینشن منظور کر دی گئی۔ اسی قسم کی مراعات بیواؤں اور نابالغ وارثین کو بھی دی گئی۔ صحت مند لوگوں کو باقاعدہ فوج میں بھرتی کر کے ان کی تنخواہ گاؤں کے لگان میں سے دی جانے لگی۔ لگان وصول کرنے کا کام مرکزی محکمۂ خزانہ کے سپرد کیا گیا۔ تاہم متولیوں نے دیہاتوں کی واپسی کے لیے زبردست احتجاج کیا۔ ان بوڑھوں نے دہلی کے کوتوال فخرالدین سے ملاقات کی جس کے بادشاہ سے قریبی تعلقات تھے اور درخواست کی کہ وہ بیچ میں پڑ کر معاملے کو سلجھا دے۔ کوتوال نے معمر بادشاہ کے جذبات کو متاثر کر کے ضعیف افراد کے لیے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوروں پر اس حکم کا نفاذ ہوا۔[19] مورخ ہمیں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتا ہے کہ بلبن کے دور

حکومت میں فوجی عملے کو نقد تنخواہیں دینا ایک اصول بن گیا تھا۔ اس امر کی کوئی براہ راست شہادت نہیں ملتی کہ بلبن نے اپنے تعلیمی جانشین کی طرح فوج کو مرکزی نظام کے تحت لانے کی ضرورت کو سمجھا تھا یا نہیں۔ وقتی ذمہ داری سونپنے کا طریقہ یقیناً رائج رہا۔ صوبائی فوجوں کو بہتر بنانے کا کام گورنروں کے سپرد رہا۔ نقد ادائیگی کے اصول پر صرف اسی وقت عمل کیا جا سکتا تھا جب فوج کے لیے براہ راست بھرتی ہوئی۔ مندرجہ بالا اصطلاحات صرف مرکزی فوج تک محدود رہیں جو دیوان ارض، عماد الملک کے سپرد تھی۔ آخر الذکر کو بادشاہ کا اعتماد حاصل تھا۔ اس لیے وہ وزیر کے مالیاتی کنٹرول سے آزاد تھا۔ عماد الملک باصلاحیت اور ایماندار آدمی تھا۔ سپاہیوں کی بھرتی۔ تنخواہ اور فوج کے لیے ضروری سامان کی ایک ایک چیز پر پوری توجہ دینے کی وجہ سے لڑنے والی فوجوں میں جان پڑ گئی تھی۔ حالانکہ فوجی تنظیم میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ تاہم اصلاحات اور مذکورہ توسیع کی وجہ سے سلطنت کی امکانی قوت میں بلاشبہ اضافہ ہوا تھا۔ برنی نے جان و مال کے ان غیر یقینی حالات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو محمود کے دور حکومت کے آخری زمانے میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے بیان کو مبالغہ آمیز تسلیم کرنے کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بلبن نے پچھلے کچھ برسوں میں جتنی بھی کوششیں کی تھیں وہ غیر یقینی تھیں اور غیر فیصلہ کن ثابت ہوئیں۔ دوآبے اور اودھ میں سڑکوں کی حالت نہ صرف بہت خراب تھی بلکہ ان پر ڈاکوؤں کی کثرت بھی ہو گئی تھی۔ جنھوں نے مشرقی صوبوں سے خبر رسانی کے ذرائع تقریباً منقطع کر دیئے تھے۔ ہندو کسان مستقل طور پر بغاوت پر تلے ہوئے تھے[۵۶] جہاں ایک طرف دہلی کے قریب وجوار کے گھنے جنگل لٹیروں اور ڈاکوؤں کا مسکن تھے وہیں دوسری طرف میواتی بے خوف و خطر علاقوں کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ کھتری راجپوتوں میں بھی کسی قسم کی کمزوری کے آثار نہیں تھے بلکہ انھوں نے لوٹ مار کا سلسلہ بدایوں اور امروہہ تک بڑھا دیا تھا۔[۵۷] چونکہ گنگا پار کے علاقے کا صرف کچھ حصہ فتح ہو چکا تھا اور بہت سے راجپوت فرماں روا خاندان جنوب سے بھاگ کر اس علاقے میں پناہ گزیں تھے اس لیے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس علاقے کی عام بغاوتوں کے پیچھے ان بے دخل کیے ہوئے راجپوتوں کا ہاتھ ضرور تھا اور یہ سب بغاوتیں سیاسی نوعیت کی تھیں۔ فرخ آباد میں باغیوں کو پیٹیالی اور کمپل

میں مضبوط گڑھ مل گیا تھا، یہاں آخری دور کے گہادوالا راج کماروں نے اپنے پڑاو بنا لیے تھے۔

عوام کے فلاح و بہبود سے زیادہ خود بادشاہ کے اثر و رسوخ کا مطالبہ تھا کہ اس بدعنوانی کے خلاف پر زور اقدام کیا جائے۔ چنانچہ فوج کی تنظیم کے بعد بلبن نے سب سے پہلے باغیوں کی بیخ کنی کا فیصلہ کیا۔ اس کا یہ کام دارالسلطنت کے قرب و جوار سے شروع کیا۔ پورے ایک سال تک وہ شاہراہوں کے گرد چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو مارنے اور جنگلوں کو صاف کرنے میں لگا رہا۔ اس طرح جب اُن کی پناہ گاہیں تباہ ہوگئیں تو پھر اس نے شہر کی طرف آنے والے جنوب مغربی راستوں پر میواتیوں کی نگرانی کے لیے گوپال گیر میں ایک حفاظتی قلعہ قائم کیا۔ اس قلعہ پر تجربہ کار افغان دستوں کو تعینات کیا گیا۔ افغانی دستوں کی اس طرح کی دوسری چوکیاں صوبہ دہلی کے دوسرے کناروں پر قائم کی گئیں[22] اس طرح دہلی کے گرد ہر طرف سے پہرہ لگا کر اسے میواتی قزاقوں سے محفوظ کر دیا گیا۔ اور یہاں کے باشندوں نے برسہا برس کے بعد آزادی کا سانس لیا۔ اگلے سال بلبن نے دو آبے اور اودھ کی طرف توجہ دی۔ جہاں زندگی بالکل اسی طرح غیر محفوظ تھی۔ باغیوں سے موثر طور پر نپٹنے کے لیے اس نے اس علاقے کو متعدد فوجی کمانوں میں تقسیم کر دیا اور مختلف لوگوں کے سپرد کرنے کے بعد ان کو مستعد افسران کے تحت کر دیا گیا جن کا کام جنگلوں کو صاف کرکے باغیوں کے خلاف سنگ دلانہ مہم شروع کرنا تھا۔ اس اقدام کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور بہت تھوڑی مدت میں نظم و نسق قائم ہو گیا۔ ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور دیہاتیوں نے اطاعت قبول کرکے کھیتی باڑی شروع کر دی۔ بلبن خود بھی ایک سال تک کمپل اور پٹیالی کے گرد و نواح میں موجود رہا۔ تاکہ شاہراہوں کو صاف کیا جا سکے اور جنگلوں کے کھلے حصے پر سڑکیں بنائی جا سکیں۔ ان ریاستوں کی حفاظت کے لیے اس نے بدایوں کے قریب بھوج پور، پٹیالی اور کمپل کے علاقوں میں تجربہ کار افغان دستوں کو تعینات کر دیا۔ "ہندوستان"[23] جانے والے راستے پر واقع "جلالی" کے قدیمی قلعے کی مرمت کرا کے وہاں ایک مضبوط حفاظتی فوج تعینات کر دی[24] جلالی کی مسجد جو اس موقع پر تعمیر کی گئی تھی، اس کے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے کا دوبارہ بندوبست 665ھ / 1266ء میں ہوا تھا[25]

جس وقت بلبن ان کاروائیوں میں مصروف تھا، بدایوں اور امروہہ سے کیٹھریوں کی تازہ بغاوت کی خبر موصول ہوئی۔ وہ فوراً دہلی واپس لوٹا اور ایک بڑی فوج کے ساتھ بظاہر شکار کو نکلا لیکن اچانک کیٹھار (KATEHAR) کے سامنے پہنچ گیا۔ تقریباً پانچ ہزار تیر اندازوں کو، باغیوں کی بستیوں کو آگ لگانے اور ان کے بالغ مردوں کو قتل کرنے کے کام پر متعین کر دیا۔ یہ سزا بڑی ظالمانہ تھی اور دہشت پھیلانے کے خیال سے دی گئی۔ برنی نے لکھا ہے کہ کس طرح ہر گاؤں کے جنگل اور دیہاتوں میں لاشوں کے ڈھیر سڑ رہے تھے۔ ان کی بدبو گنگا تک پھیلی ہوئی تھی۔ ضلع کی تقریباً ساری آبادی ختم ہو چکی تھی لیکن اس اقدام نے کم از کم وقتی طور پر اپنے مقصد کو حاصل کر لیا تھا۔ قرب و جوار کے اضلاع میں دہشت پھیل چکی تھی اس لیے وہاں مزید کسی کاروائی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ جنگلات صاف کر دیئے گئے تھے۔ سڑکیں تعمیر ہو چکی تھیں اور شہری حکومت کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ اس دن کے بعد برن، امروہہ، سنبھل اور کنوری (KANAURI, KATIHAR) کے اقطاع محفوظ اور تاراج سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا گئے تھے۔[38] "تاریخ مبارک شاہی" کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس موقعہ پر بلبن نے اپنی کاروائیاں سنتور کے کوہ پایہ (KOHPAYAH) تک پہنچا دی تھیں[39] جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ باغیوں کو پہاڑی سرداروں سے مدد مل رہی تھی جو ماضی میں باغیوں کو پناہ دے کر ایک خاص قسم کے غیر دوستانہ رویہ کا اظہار کر چکے تھے۔

اس طرح داخلی تحفظ کو مکمل کرنے کے بعد اب وہ منزل آ پہنچی تھی جہاں توسیعی مہموں کے سلسلے میں ہندو علاقوں کی طرف قدم بڑھایا جا سکتا تھا۔ التمش کی کوشش اس پالیسی کی طرف پہلے ہی متوجہ کرا چکی تھی۔ اس کی موت کے بعد جارحانہ کاروائیوں کے بند ہونے سے ہندو جارحیت کی ہمت افزائی ہو گئی تھی اور اب جوابی حملہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ تاہم بلبن کی حقیقت پسندی اور تجربہ کاری نے ایک بالکل مختلف پالیسی پر عمل کرنے کا مشورہ دیا۔ حال میں ہونے والی داخلی بدنظمیوں سے ایک بات سامنے آ گئی جو غالباً التمش نہیں دیکھ سکتا تھا اور یہ بات تھی صوبائی تنظیم کی ناگفتہ صورت حال۔ ایک موروثی، استبدادی حکومت کی خود مختاری مرکزی اقتدار کو

غیر موثر بنانے پر مائل رہتی تھی اور تنظیمی عملے میں ہر جگہ وقتی پیوند کاری نظر آتی تھی۔
اور ان حالات میں نئے علاقوں کا الحاق یقیناً نئے مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔ اور ایسا
دباؤ ڈال سکتا تھا جو سلطنت کی تنظیمی صلاحیتوں کی کمر توڑ دیتا۔ ابھی تو بندوبست
شدہ علاقے میں غلبہ حاصل کرنے اور لوگوں کو مطمئن کرنے کا کام بھی پورا نہیں ہوا
تھا مسلح ہندوؤں کی مدافعت ابھی تک جاری تھی اور سب سے بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی
ایسا لگتا کہ سلطنت کے سارے وسائل انھیں سے نپٹنے میں صرف ہوں گے۔ ان سب
سے بڑھ کر منگولوں کا خطرہ کسی ایسی کارروائی کے لیے خطرناک تھا جو سرحدی دفاع کو
کمزور کر دے جیساکہ اس کتاب کے اگلے باب میں ہم دیکھیں گے۔ ان کے فوجی اور
سیاسی دباؤ نے دہلی کی سرحد کو بیاس تک واپس ڈھکیل دیا تھا۔ لاہور منگولوں
کے زیر اثر تھا اور ملتان اور سندھ پر اُن کے مسلسل حملے ہو رہے تھے۔ بلبن نے سفیروں
کے دوستانہ تبادلہ کے ذریعہ منگولوں کو خوش کرنے کی بے طرح کوششیں کیں لیکن
جب کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی تو اس نے فوجی دفاع کا سہارا لیا۔ ابتدائی
دور حکومت میں جو تجربہ التمش کو ہوا تھا وہی بلبن کو بھی ہوا۔ یعنی کہ دفاعی مسائل
نے اس کے ہاتھ باندھ دئے۔ ہندوستان میں ترکی باشندوں کی شدید کمی نے ایک
نئی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی اور اس کمی کا سبب یہ تھا کہ منگولوں نے دہلی اور ترکستان
کا رابطہ منقطع کر دیا تھا اور موجودہ ترکی فوجی عملے سے بہ یک وقت دو محاذوں
پر کام لینے کی اب صرف یہ صورت رہ گئی تھی کہ اور دوسری نسلوں کے لوگوں سے ریاست
کے کاموں میں مدد لی جائے۔ لیکن یہ عمل سلطنت کی نسلی بنیاد کی جڑ کاٹنے کے مترادف
ہوتا جس کے لیے بلبن بڑی حد تک پابند تھا۔ اس کی تفصیلات بعد میں بیان کی
جائیں گی۔

فوجی وسائل اور اپنے آدمیوں کی محدود تعداد کو بڑھانے کے لیے نئی فتوحات
کا سلسلہ شروع کرنا ایک ایسا طریقہ تھا جس کی غلطیوں کا احساس اسے اپنے عہد
کے ابتدائی دور میں ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا خیال ان لوگوں کو سمجھایا جو اسے نئے
علاقوں کی تسخیر کرنے کے لیے اکسا رہے تھے۔ دفاعی اقدام کے سلسلے میں سزا دینے
کے لیے مہم روانہ کرنا یا دولت جمع کرنا ایک بات ہے اور کسی جنگجو ہندو ریاست

پر حملہ کرنا یا اس پر قبضہ کرنا دوسری بات ہے. کیوں کہ اس کے لیے بیشمار فوجوں، وفادار افسروں کی ضرورت ہے. [۳۵]"میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے ملکوں کو چھین کر ان پر قبضہ کرنا حکومت کو محض نقصان پہنچانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔" اگر مسلمانوں کی حفاظت (منگولوں سے) میرا پہلا فرض نہیں ہے تو پھر میں دارالسلطنت میں ایک دن بھی قیام نہیں کروں گا بلکہ اپنی تیار فوجوں کو لے کر دور دراز کے راناؤں کی دولت، گھوڑے اور ہاتھیوں کو قبضے میں کرنے اور اسلام کے دشمنوں کو تباہ کرنے کے لیے نکل پڑوں گا۔" اس نے قدیم بادشاہوں کے دانشمندانہ مشورے یاد کیے۔ "اپنی سلطنت کو مضبوط اور مستحکم بناؤ کیوں کہ یہ عقلمندی کی بات ہے بہ نسبت اس کے کہ دوسروں کی سلطنت پر قبضہ کرو جنھیں قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے اور جو صرف تمہاری اپنی حکومت کو کمزور کر سکتے ہیں" [۳۶] بلبن قانع قسم کا امن پسند یقیناً نہیں تھا لیکن اس کی سب سے پہلے توجہ دفاع اور وسائل کے تحفظ پر تھی۔ چنانچہ داخلی استحکام اس کی پالیسی کا بنیادی اصول بن گیا اس لیے اس نے علاقائی توسیع کو باقاعدہ طور پر ملتوی کر دیا۔

اسی لیے اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں بلبن کا دورِ حکومت واضح طور پر مختلف نظر آتا ہے۔ اس دور میں توسیعی معرکوں، یہاں تک کہ بغاوتوں کے مقابلے میں امن اور تحفظ زیادہ نمایاں نظر آتا ہے مؤرخ اس دور کے فوجی واقعات لکھنے میں زیادہ معروف نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ ملک کے نظم و نسق اور طمانیت پر زیادہ زور دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ فاتح کی تلوار کو ہر وقت میان میں رکھ کر بلبن نے یقیناً وہ حالات پیدا کر دیئے تھے جو آئندہ خلجی فتوحات کے لیے اہم تھیں۔

بلبن کی حکومت قطعی طور پر استبدادی تھی۔ اقتدار کے خلاف اٹھنے والی معمولی سے معمولی سرکشی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے وہ تن من دھن کی بازی لگا دیتا تھا۔ اس کے دور کے اختتام پر ایک واقعہ ہوا جس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہ کتنی بے رحمی سے اپنی مطلق العنانی کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ یہ واقعہ تھا لکھنوتی کے گورنر کی سرکشی کا۔ تخت نشینی کے سال میں تاتار خاں نے لکھنوتی میں اپنے باغی "ارسلان" کی جگہ لی۔ اور بڑی مصلحت اندیشی سے اپنے آپ کو بلبن کے حوالے کر دیا۔ اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اس نے بہت سے ہاتھی بھی دہلی بھجوا دیئے [۳۷] چنانچہ بلبن نے اسے

اس عہدے پر مستقل کر دیا۔ اس نے وہاں کتنے دن حکومت کی اس کا کہیں اندراج نہیں ملتا۔ لیکن بعد کے اندراج سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اسے بلبن کے حکم کی بنا پر عہدے سے الگ کر دیا گیا تھا۔[31] اس کے بعد کا گورنر تغرل تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دراصل بلبن کا غلام تھا۔ وہ بہادر اور حوصلہ مند آدمی تھا اور اس نے قرب وجوار کی ہندو ریاستوں پر کامیاب معرکوں سے بے پناہ دولت جمع کر لی تھی۔[32] لکھنوتی کو بلغاک پور کا نام دیا تھا۔[33] اس نام کو صحیح ثابت کرتے ہوئے تغرل نے جسے اب اپنی طاقت پر بھروسہ ہو گیا تھا آزاد ہونے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ اس نے مال غنیمت میں سے بادشاہ کا حصہ (خمس) روک لیا۔ اس نے بالآخر آزادی کا اعلان کر کے یزبک کی طرح اپنا شاہی نام سلطان مغیث الدین رکھ لیا۔[34] اس نے عہدوں اور تنخواہوں کو اپنی طرف ملا لیا۔ بلبن کی ضعیفی اور مصروفیت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ طاقت سے لطف اندوز ہونے میں کوئی حارج بھی نہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ تغرل کو اپنے آقا کے کردار اور خراج کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ بلبن کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ غصے سے بپھر گیا۔ اور اس نے فوراً اودھ کے گورنر امین خاں کو حکم دیا کہ وہ فوج لے کر جائے اور تغرل کو اطاعت کے لیے قبول کرے۔[35] تغرل اپنی فوجیں لے کر سامنے آگیا اور اس نے امین خان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ شمالی بہار میں گوگرا کے قریب ہونے والی شاہی فوجوں کو مکمل شکست ہوئی دہلی کے کچھ فوجی دستے تغرل سے جا ملے۔ باقی جو پسپا ہو رہے تھے ان کو اودھ کے قبائلی ہندوؤں نے سخت نقصان پہنچایا۔ ناقابل تسخیر شہنشاہ کی عظمت کے لیے شکست کی یہ خبر مضرت رساں تھی۔ اس نے بلبن کے سکون قلب کو ختم کر دیا۔ اس نے طیش میں آکر حکم دیا کہ شکست خوردہ افسر کو اودھ کے دروازے پر پھانسی لگا دی جائے۔[36]

اگلے سال ترمتی کی قیادت میں جو فوج بھیجی اس کا بھی یہی انجام ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ تغرل نے اپنی طاقت خوب بڑھا لی تھی کیوں کہ یحیٰی سرہندی کے مطابق اس نے تیسری فوج کو بھی شکست دیدی جو شہاب الدین کی قیادت میں بھیجی گئی تھی۔ شہاب الدین نے اودھ میں امین خاں کی جگہ لی تھی۔[37]

متعدد شکستوں اور اقتدار کے خلاف کی جانے والی بغاوتوں کی وجہ سے بلبن غصے

سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس وقت اسّی سال کا تھا اور منگول خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے چوتھے معرکہ کی قیادت کی ذمہ داری اپنے سر لے کر تاج شاہی کے اقتدار کو سنبھالنے کے لیے سب کچھ داؤں پر لگا دیا۔ اس نے قسم کھائی کہ باغی کا سر لیے بغیر وہ نہ لوٹے گا۔ اس نے اپنے دوست فخرالدین کو توال کو قائم مقام بادشاہ مقرر کیا۔ دوسرے بیٹے بغرا خاں کو ساتھ لیا۔ وہ پورے عزم کے ساتھ ایک مہم کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ملحقہ صوبوں کے فوجی دستے طلب کر لیے اور اودھ سے تقریباً دو لاکھ سپاہیوں کو بھرتی کیا۔ برسات کا موسوم تقریباً قریب آ رہا تھا لیکن اس کے اپنے عزم کے سامنے کوئی رکاوٹ ٹک نہ سکی۔

ضعیف بادشاہ کی ہمت اور سنگدل قوت ارادی نے باغی کے حواس باختہ کر دیئے براہ راست مقابلہ کرنے سے ڈر کر تغرل اپنے حمایتیوں اور خزانے کو لے کر لکھنوتی سے برنی کے مطابق ' حاجی نگر' کی طرف بھاگا جو جنوب مشرق کی طرف واقع تھا۔[38] اس نے اپنے علاقے کے موسم اور دلدلی زمین کو مد نظر رکھتے ہوئے سوچا کہ دہلی کی فوجیں تھک جائیں گی اور جب بادشاہ کا صبر و تحمل جواب دے جائے گا تو وہ پھر پلٹ کر اپنے دارالسلطنت پر دوبارہ قبضہ کرے گا۔ بلبن نے انتہائی سرعت سے کام لیتے ہوئے خالی کیے ہوئے شہر پر قبضہ کر لیا۔ دہلی کے حالات سے باخبر رکھنے کی ہدایت کے ساتھ اس نے ملک حسام الدین کو وہاں کا انچارج بنا کر شہر اس کے حوالے کیا اور خود تغرل کے تعاقب میں فوراً نکل کھڑا ہوا۔ پیچھا کرتے کرتے وہ مشرقی بنگال تک آگیا اور جب وہ سنار گاؤں پہنچا تو کہا جاتا ہے کہ اس کی ملاقات مقامی راجا سے ہوئی جس نے باغی کو گرفتار کرنے میں اس کی مدد کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔[39] برنی نے اس ہندو راجا کا نام نوجا (NAUJA) لکھا ہے جو ظاہر ہے دلیا خاندان کا بادشاہ دانوجا دھواری راجا دسرتھ (DANUJAMADHAVA ARIRAJA DASARATHA) ہوگا۔ جس کے فرمان کے نامکمل حصے ڈھاکہ ضلع کے وکرم پور میں دستیاب ہوئے ہیں[40] دانوجا یقیناً آزاد فرماں روا ہوگا کیوں کہ تیکی سرہندی کے مطابق امداد کی درخواست کرتے وقت بلبن اس سے بہت عزت و احترام سے پیش آیا تھا جو ایک خود مختار فرماں روا کے شایان شان ہے۔[41] بلبن نے جب اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ اپنی

مملکت سے گزرنے والے دریا کے راستے سے تغرل کو بھاگنے نہیں دے گا۔ تو بلبن نے دوبارہ اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ اب وہ "حاجی نگر سرحد" سے ۱۴۰ میل دور تک پہنچ گیا۔[illegible] لیکن جب باغی کا وہاں بھی کوئی نام و نشان نہیں ملا تو اس نے فوج کے ایک حصے کو الگ کر کے بیکتار کی قیادت میں آگے بھیجدیا۔ اور خود پیچھے پیچھے چلتا رہا بیکتار کے رضاکاروں کو غیر متوقع طور پر پتہ چل گیا کہ تغرل حاجی نگر کی سرحد پر خیمہ زن ہے چنانچہ اس کی فوجیں اچانک تغرل کی فوجوں پر ٹوٹ پڑیں جو ایک تالاب کے کنارے آرام کر رہی تھیں۔ اس اچانک حملے سے اس کی فوجوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اور بھگدڑ مچ گئی۔ بالآخر خود تغرل بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا۔ فاتح افسر تغرل کا سر لے کر بلبن کی خدمت میں حاضر ہوا جسے بلبن نے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ لکھنوتی واپس آنے کے بعد فوجوں کو انعامات اور ترقیوں سے نوازا گیا۔ تغرل کے ساتھیوں کو مثالی سزائیں دی گئیں۔ تغرل کا ساتھ دینے کا جس پر ذرا بھی شبہ ہوا اس کا سر کاٹ کر لکھنوتی بازار کے دونوں طرف پھانسی کے تختوں پر لٹکا دیا گیا جن لوگوں نے شاہی فوج کے ساتھ غداری کی تھی ان کو بھی گرفتار کر کے زنجیروں میں جکڑ کر اسی قسم کی سزا کے لیے دہلی لایا گیا۔[illegible]

اقتدار کو بالآخر دوبارہ قائم کرنے کے بعد بلبن نے اس صوبے کو بغرا خاں کے سپرد کیا اور محل کی شہ نشین سے پھانسیوں پر لٹکتی ہوئی لاشوں کو دکھا کر کہنے لگا دہلی کے خلاف بغاوت کرنے کا یہ حشر ہوتا ہے۔ بغرا خاں کو اس کے فرائض سمجھانے کے بعد وہ واپس اپنے سفر پر چل پڑا۔ تین سال کی غیر حاضری کے بعد وہ بڑے فاتحانہ انداز میں دارالسلطنت میں داخل ہوا۔[illegible] فوجی قاضی کی التجا پر ان لوگوں کے رشتے داروں نے بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آمادہ کر لیا تھا، ان قیدیوں کو معافی دلا کر آزاد کرا دیا گیا۔ خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے گورنر اور جاگیردار اور سردار فاتح شہنشاہ کے گرد جمع ہو گئے۔ جس نے اپنے اقتدار اعلیٰ کو منوانے کے لیے اپنے ناقابلِ تسخیر ارادے کو بڑے موثر طریقے پر منوا لیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا لڑکا، محمدؒ، جو ملتان، لاہور اور دیپال پور کا وائسرائے تھا، زیریں سندھ کے معرکوں سے حاصل کیا ہوا مال غنیمت لے کر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہو گیا۔[illegible] اس کو جانشینی کے لیے پہلے

ہی نامزد کیا جا چکا تھا اب اسے مزید اعزاز اور انعام و اکرام دے کر واپس بھیج دیا گیا۔
برنی لکھتا ہے کہ تعزل کی سرزنش کے بعد شہنشاہ کے اقتدار کا رعب ہر ایک شخص کے دل میں بیٹھ چکا تھا۔ سلطنت کے چپے چپے پر امن اور نظم کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔[54] اس وقت بلبن اپنی طاقت اور شہرت و سطوت کی بلندیوں پر تھا۔ برسہا برس کے بعد ملک کو ایک ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت نصیب ہوئی تھی جو لوگوں کے جان و مال کے تحفظ کی ضامن تھی۔ بیرونی دشمنوں کے خلاف کی جانے والی اس کی تشویشناک تیاریوں کے نتائج اچھے نکلے تھے۔ اپنے عہد کے ابتدائی حصے میں وہ سالٹ رینج، کے منگو قبائلوں کی سرکوبی کرنے والی مہم کی قیادت کر چکا تھا۔ یہ قبائلی وقتاً فوقتاً نہ صرف بے بسائے اضلاع کو تباہ و برباد کر چکے تھے بلکہ یہ منگول حملہ آوروں سے ملے ہوئے بھی تھے اور اُن کے لیے رہبروں کا کام بھی انجام دے چکے تھے۔ لاہور، جو محمود کے زمانے سے تمام عملی کارروائیوں کے لیے بے کار ہو چکا تھا، اس پر پھر قبضہ کر لیا گیا اور اس کی از سر نو تعمیر ہوئی۔[56] اس ضلع کو سرحدی صوبے ملتان اور دیپال پور سے ملحق کر دیا گیا۔ جو شیر خاں کی موت کے بعد شہزادے محمد کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ سترہ اٹھارہ ہزار گھوڑوں پر مشتمل ایک فوج تو منگولوں کو موثر طریقے پر، بیاس، کے پاس روک دیا گیا۔[57] صوبے کی باقی ماندہ فوجیں باقاعدہ قواعد اور مشقوں کے ذریعے ہر وقت[58] حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے تیار رکھی گئیں۔

اپنی محنت کا پھل کھانے کے لیے بلبن کو لمبی عمر ملی تھی۔ امن اور نظم کے قیام میں اس کی کامیابی نے لوگوں پر اتنا زبردست اثر ڈالا تھا کہ لوگ التمش کے خوشحال دور کو تقریباً بھول چکے تھے۔ لوگوں کے دماغ میں سلطنت کا تصور بلبن اور اس کے خاندان کے ساتھ منسلک ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی فرماں روائی ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں خود اس کے ذہن میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنے جانشین، محمد، کو اس کے شاہی فرائض کے بارے میں نصیحت کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا تھا۔ برنی، امیر خسرو اور امیر حسن، شہزادے کے ذہنی اور اخلاقی جوہر کی بے پناہ تعریف کرتے تھے۔[59] وہ بلاشبہ ایک قابل حکمراں ثابت ہوتا لیکن قسمت نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ اور التمش کے بڑے لڑکے کی طرح شہزادہ محمد کی

قسمت میں بھی تاج پہننا نہیں تھا۔ منگول وقتاً فوقتاً لاہور، دیپال پور کے صوبے پر حملے کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک حملے کے دوران فروری 1282ء میں ایک بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس میں شہزادہ محمدؒ مارا گیا۔ شہزادہ محبوب اور باکمال بیٹے کی موت افواج کے لیے تو تباہ کن تھی ہی لیکن ضعیف شہنشاہ کے لیے تو یہ ایک جان لیوا صدمہ تھا۔ جس سے وہ آخر وقت تک جانبر نہ ہو سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی پالیسی اور اس کی فرماں روائی کی تقدیر میں رائیگاں جانا لکھا تھا۔ کیوں کہ اس کا دوسرا بیٹا بغرا خاں نہ صرف سہل پسند تھا نہایت معمولی صلاحیت کا آدمی تھا اور ذمہ داریوں سے گریز کرتا تھا۔ برنی اس شہنشاہ کے غم کا بڑا دل خراش بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بادشاہ سب کے سامنے تو اس واقعہ کو بڑے صبر و ضبط سے برداشت کرتا تھا۔ لیکن وہ راتوں کو پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا۔

ایک طرف یہ اور دوسری طرف سلطنت کے مستقبل کی پریشانی جس سلطنت کی تعمیر میں اس کی زندگی کے پچاس سال صرف ہوئے تھے۔ اس کی گرتی ہوئی صحت کے لیے یہ سب مضر ثابت ہوا۔ آخر بیماری نے اسے صاحب فراموش کر دیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ آخر وقت قریب آگیا ہے۔ اس لیے بلبن نے اپنے بیٹے بغرا کو بلا کر اسے اپنے بستر مرگ کے قریب رکھا۔ برنی بیان کرتا ہے کہ انتہائی مطلق العنان بادشاہ کس طرح اپنے بیٹے سے التجا کرتا تھا کہ وہ آخری وقت میں اُسے چھوڑ کر نہ جائے۔ "اس کے کوئی دوسرا بیٹا نہیں تھا اور اگر اس کے پوتے کیخسرو یا کیقباد اپنی نوعمری میں جانشین بنے تو سلطنت تباہ ہو جائے گی۔" یہ ایک واضح درخواست تھی جس کا مطلب تھا کہ تاج قبول کر لو۔ لیکن بے حس اور کم سمجھ بیٹے نے دور دراز لکھنوتی میں عیش و عشرت کی آسان زندگی کو ترجیح دی۔ لیکن کھلم کھلا اپنے باپ کو مایوس کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس لیے وہ تین ماہ رکا رہا اور جب بلبن کسی قدر بہتر ہوا تو وہ خاموشی سے اپنے مشرقی مسکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ سفر میں ہی تھا کہ اسے باپ کی حالت کے دوبارہ بگڑنے کی اطلاع ملی لیکن قدم واپس لوٹانا اور دہلی کی تاج پوشی قبول کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی بزدلی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے ضعیف بادشاہ کے لیے کوئی دوسری صورت نہ رہی سوائے اس کے شہزادہ نہ صرف ناتجربہ کار

تھا بلکہ اس کا انتخاب بھی مسلمہ طور پر غلط تھا۔ بلبن کے پاس اس کا کوئی بدل بھی نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے خاندانی سلسلے اور اپنی پالیسی کو تہہ کر کے الگ رکھ دے۔[52] کیخسرو اس کی کڑی نگرانی کے تحت پروان چڑھا تھا۔ اس سے کسی قدر یہ اُمید کی جاسکتی تھی کہ وہ تخت شاہی جو مختلف جھگڑالو طاقتوں کے درمیان بڑے خطرناک طریقے پر توازن قائم کیے ہوئے تھا، اسے بچانے کے لیے اس کی کچھ صفات اخذ کرے گا۔ بلبن کو اپنے وفادار مشیروں اور دوست کوتوال اور وزیر پر بھی قطعی بھروسہ تھا۔ اس نے ان سے وقت ضرورت شہزادے کو مشورے دینے اور اس کی حفاظت کرنے کی درخواست کی۔ کیخسرو کی نامزدگی کے چند دنوں کے اندر ہی 1286ء کے وسط میں اس کا انتقال ہو گیا۔[53]

برنی لکھتا ہے کہ "بلبن کی موت کے صدمے میں مُلکوں نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور سروں پر مٹی ڈال لی تھی وہ شہنشاہ کے جنازے کے ساتھ ننگے پیر دارالامن کے قبرستان کی طرف جارہے تھے۔ اُنھوں نے چالیس دن تک اس کا سوگ منایا اور ننگے فرش پر سوئے"۔[54] ایسے کٹر اور وحشت ناک بادشاہ کی مقبولیت پر یقین کرنا مشکل ہے یہ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کی صلاحیتوں کی عزت کرتے ہوں اور اس کی طاقت سے ڈرتے ہوں۔ اس موضوع پر غالباً اب ہم کافی روشنی ڈال چکے ہیں کہ سلطنت دہلی کے قیام میں بلبن کا کتنا بڑا ہاتھ تھا۔ ایبک اور التتمش کے ادھورے کاموں کو جاری رکھتے ہوئے اس نے طاقت اور تجربہ کا استعمال کیا۔ جس کی وجہ سے اس کے دشمنوں نے بھی اسے گرم جوشی سے خراج عقیدت پیش کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھنے کا سہرا بلبن کے سر ہے۔ مفتوحہ علاقوں کو مستحکم بنا کر اور طوائف الملوکی کی طاقتوں کو تباہ کر کے اس نے ایک تاریخی ضرورت کو پورا کر دیا تھا۔ اور اس نے ترقی کی اگلی منزل کے سلسلے میں سلطنت کو مزید علاقائی توسیع کے لیے تیار کر دیا تھا۔ بلبن کا عظیم ترین واحد کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شہنشاہیت کا احیا کر کے اُسے ریاست کا اہم ترین عنصر بنا دیا تھا۔ مرکزیت کو رائج کر کے، جس کی تفصیلی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ بلبن نے بروقت تنظیمی تبدیلیوں کے دور کو مختصر کر دیا تھا جو تیرھویں صدی کا نشان امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ

اس نے خلجی ریاستی نظام کے لیے میدان ہموار کر دیا تھا۔

تاہم اپنی پالیسی کے ایک پہلو میں اس کے یہاں ایک مدبرانہ نظر کی افسوس ناک کمی تھی اور یہ پہلو تھا نسلی برتاؤ کے سلسلے میں اس کا انتہائی کٹر پن جس کے سبب اس نے سلطنت کو ترکوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ وہ ان لوگوں کے اشتراک کے خیال سے سخت اکراہ محسوس کرتا تھا جنھیں وہ "نیچ نسب" کے لوگ کہا کرتا تھا۔ وہ اپنی حکومت میں مقامی مسلمانوں کی شکل تک دیکھنا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ ایک موقعہ پر اس نے اپنے درباریوں کو امروہہ میں کلرک کی ایک جگہ کے لیے ایک مقامی مسلمان کو منتخب کرنے پر ڈانٹ دیا تھا۔[55] اس کی استبدادی حکومت اس بات پر زور دینا چاہتی تھی کہ ترکوں کا غلبہ مسلمہ ہے جس کے لیے بحث یا شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ خود اس نے اپنی حکومت میں ان کو برائے نام حصّہ دیا تھا۔ اسی لیے بلبن کی حکومت کو چند سری حکومت (OLI GORCHY) کہنا غلط ہوگا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے کو مسلمانوں کا بادشاہ ہونے سے زیادہ ترک فرماں روائی کا محافظ سمجھتا تھا۔ اس عمل میں اپنے آقا التمش کی پیروی کر رہا تھا کیونکہ التمش کو بھی ہندوستانی مسلمانوں سے نفرت تھی لیکن جس چیز کو التمش کے زمانے میں کسی حد تک جائز قرار دیا جا سکتا تھا وہ بلبن کے زمانے میں تباہ کن نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ابتدائی فتح کے خمیر میں نسلی تحریک کارفرما تھی اور اتنی آسانی سے کامیابی حاصل کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ ہندوکش کے پار سے ترکوں کی مسلسل آمد جاری تھی۔ ایک کمزور سیاسی تنظیم کو جسے مشترکہ نسلی جذبات نے یکجا کر رکھا تھا۔ حالات نے اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی اس خصوصیت کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھے۔ فتوحات کا سلسلہ جاری رہنے کی وجہ سے نسلی برتری کا جذبہ اور ہم مذہبیت نے باہم مل کر انتہائی کارآمد ثابت ہوئے نسلی امتیاز پر اتنا زور دینے کی وجہ سے منگولوں کے نسلی حملے کا مقابلہ کرنے میں بڑی مدد ملی۔ بلبن نے جب عنان حکومت سنبھالی تو ان میں سے بیشتر اسباب اپنا جواز کھو چکے تھے۔ اب ترکستان سے بڑے پیمانے پر تارک وطن ہندوستان نہیں آسکتے تھے۔ ادھر تبدیل مذہب اور آپس میں شادی کی وجہ سے ترکی مسلمانوں کی تعداد بتدریج بڑھ گئی تھی۔ خود بلبن نے مسلسل علاقائی توسیع کے سلسلے کو بند کر کے مسلمان حکومت

گو ہندؤں اور منگولوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ تحفظ جس پر عام عنادی کی حیثیت سے زور دیا جاتا تھا وہ نسلی یہاں تک کہ مذہبی حدود سے بھی آگے بڑھ گیا۔ غیر محسوس تور پر لیکن ناقابلِ مزاحمت ترقی کے ساتھ ایک ملا جلا ہند۔ مسلم (INDO-MUSLIM) سماج وجود میں آتا جا رہا تھا اور اس طرح سلطنت آہستہ آہستہ ترکی ریاست کی جگہ ہند۔ مسلم ریاست بننے کے راستے پر جا رہی تھی اور اب اس عمل کو روکنا نہ صرف یہ کہ بیکار بلکہ غیر دانش مندانہ بھی تھا اور اس طرح برابر کم ہوتی ہوئی نجیب الطرفین ترکوں کی تعداد کے لیے اقتدار کا مقام رکھنا تقریباً ناممکن تھا۔ بلبن کی غیر مصالحت پسندانہ خواہش نے اس کو ایک غیر فطری زندگی ضرور دیدی تھی لیکن اس کی موت کا مطلب ہی تھا کہ ہندوستان کی تقدیر کو قابو میں رکھنے کا اختیار ترکوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔

اس کے تمام ہم عصروں پر مستقبل میں ہونے والی یہ تبدیلی بالکل واضح ہو چکی تھی جس وقت بلبن کی لاش قبر میں اتاری جا رہی تھی تو کوتوال نے جنازے میں شریک ہونے والوں سے خطاب کرتے ہوئے کہہ بھی دیا۔ "اب تو ہر نو دولتئے یا چھچھورے شخص کو تاج شاہی حاصل کرنے کی خواہش ہو گی۔ قدیم خاندان اور قدیم اشرافیہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے"[ھ] اس تبدیلی کی رفتار جو یقیناً بڑھتی چلی آ رہی تھی، نئی حکومت نے تیز کر دی۔ اس کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔

حوالاجات

1- ابن بطوطہ، ii، ص 260، حاجی دبیر، ا، ص۔ 726، طبقات اکبری، i، ترجمہ، ص 92-93؛ فرشتہ، I، ص۔ 74، اختصار الفنسٹن (ELPHINSTON)؛ ہسٹری آف انڈیا، ص۔ 371۔

2- کتاب الرّاحلہ، ii، ص۔ 29؛ اسامی، ص۔ 185، واصف (WASSAF) صفحہ ذیل 254۔ بی۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 39 پر محمود کی تاریخ وفات 11 جمادی الاول۔ 664 درج ہے۔

3- برنی، ص۔ 23 حاجی دبیر، ii، ص۔ 728، میر خسرو؛ قران السعدین، ص۔ 18۔

4- برنی۔ ص۔ 26۔

5- برنی کی تاریخ کے تمام مخطوطوں اور چھپے ہوئے متن میں بلبن کا سنہ جلوس 662ھ/1263ء دیا ہوا ہے۔ لیکن یہ قطعی غلط ہے کیوں کہ محمود کے آخری سکّوں پر 664ھ/1265-66ء کی تاریخ ہے۔ بلبن کے سکّے 664ھ سے شروع ہوتے ہیں۔ سی۔ بی۔ ایم دکیٹلاک آف کوئنس ان برٹش میوزیم،" دی سلطانس آف ڈہلی" ص۔ 26۔ نمبر 93؛ رائٹ (WRIGHT) یعنی کوائنس اینڈ مٹروجی، نمبر 224 اور 242 اے الفی (ALFI)، صفحہ ذیل 161 اے جلوس کو محمود کی وفات کے دو دن بعد مورخہ 13 جمادی الاول 664 مطابق 20 فروری 1266ء کو رکھا ہے۔ م۔ بہ۔ حاجی دبیر بھی۔ ii۔ ص۔ 725۔

6- برنی، ص۔ 102۔ افراسیابی ترکوں کے بیان کے لیے دیکھیئے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین۔ 1898 ص ص۔ 467-502؛ براؤن؛

ترجمہ چہار مقالہ، نوٹس، ص۔ 22 ریورٹی بھی: ترجمہ طبقات ناصری، ص۔ ۹۰۵-
۹۱۰، نوٹ

7۔ برنی، ص۔ 37، ص ص۔ 40 اور 71 - 70 بھی دیکھیے۔
8۔ ایضاً ص۔ 34۔ ممکن ہے اس نے ان الفاظ میں اظہار خیال نہ کیا ہو اور گمان غالب ہے کہ یہ خود برنی کے الفاظ ہوں گے لیکن یہ خیالات جو بلبن سے منسوب کیے گئے ہیں اس کے طرز عمل سے ضرور مطابقت رکھتے ہیں، تاہم م۔ یہ بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، 1957 ص ص۔ 21 - 315۔
9۔ اپنے دشمنوں سے ہوشیار رہنے اور قتل سے بچتے رہنے کا انتظام کرنے کے سلسلے میں ولی عہد کو اس کی نصیحت کے لیے ملاحظہ ہو، برنی، ص۔ 80۔ اس کے مطابق الفنانیت کے اس پہلو کی طرف اس سے بھی پہلے اشارہ آداب الحرب صفحہ ذیل، 12 پر ہے۔
10۔ منہاج، ص ص 317 - 319۔
11۔ برنی، ص۔ 30۔
12۔ ایضاً، ص۔ 33 - 34۔
13۔ فرشتہ، i، ص۔ 75، برنی بھی دیکھیے ص ص۔ 30 - 31 اور ص۔ 112۔
14۔ برنی، ص۔ 40۔ بدایوں کے اس خبر نویس کو بھی شارع عام پر پھانسی دی گئی۔ جس نے گورنر کے طرز عمل کے بارے میں اطلاع دینے میں کوتاہی کی تھی۔
15۔ ایضاً، ص۔ 74۔
16۔ ایضاً، ص۔ 44 - 45۔
17۔ برنی کے مطابق اسے بلبن کے حکم سے زہر دیدیا گیا تھا۔ روایت ہے کہ اس کی موت بلبن کی تخت نشینی کے چار پانچ سال بعد ہوئی۔
18۔ برنی، ص۔ 29۔
19۔ برنی، ص ص۔ 60 اور 61 - 64۔ تاریخ مبارک شاہی اور حاجی دبیر نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ فرشتہ، i، ص 78 نے صرف برنی کی نقل کی ہے۔ م۔ یہ۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، iii، ص۔ 77۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سارے اقدام کو ترک کر دیا گیا تھا۔ لیکن متن کے اس حصے کا یہ ترجمہ ممکن نہیں ہے۔

20۔ برنی۔ ص۔ 56۔

21۔ ایضاً۔ ص۔ 57۔

22۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 40، فرشتہ، ، ص۔ 77۔ بھی دیکھیے۔

23۔ فرشتہ نے ہندوستان کی توضیح کرتے ہوئے بتایا کہ اس اصطلاح سے صوبہ جونپور، بہار اور بنگال مراد ہے۔

24۔ جلالی علی گڑھ سے 11 میل دور مشرق میں واقع ہے۔ روایت ہے کہ یہ ایک پرانے شہر نیلاونی کی جائے وقوع پر قائم ہے۔ کارلائل۔ رپورٹ آف دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ xii ۔ ص۔ 12۔ امپیریل گزیٹر آف انڈیا۔ XIV ص 14-15 بھی دیکھو

25۔ رپورٹس آف آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا۔

26۔ برنی، ص۔ 59 لیکن 14 ویں صدی میں فیروز تغلق کی حکومت کے دوران ہم ایک بار پھر کہٹریوں کو سر اٹھاتے ہوئے پاتے ہیں۔

27۔ تاریخ مبارک شاہی۔ ص۔ 40۔

28۔ خزانوں کی تلاش میں جو مہمات گئیں ان کی مثال دیکھیے۔ منہاج طبقات ناصری بھی 291 الغ خاں نے محمود کو ایک عرض داشت پیش کی جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ چونکہ اس سال مغلوں نے کوئی حملہ نہیں کیا ہے اس لیے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رایوں اور راناؤں کے علاقوں کو تاراج کیا جائے تاکہ مال غنیمت اور کافروں سے جنگ کرنے کے وسائل حاصل ہوں۔

29۔ اس کے دلائل کی برنی نے پوری طرح وضاحت کی ہے۔ ص ص۔ 50-53 پھر بھی بلبن کی تقریر کی صورت میں پیش کیا ہے۔

30۔ ایضاً، ص۔ 53۔ م۔ بہ۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال، ii، ص۔ 56، نوٹ۔ 2۔

31۔ سلیم، ریاض السلاطین، ص۔ 75۔ تاتار خاں کے جانشین کے بارے میں الجھاوا ہے۔ حاجی دبیر، ii، ص۔ 733 طغرل کے تقرر کی تاریخ 664 جو بتاتا ہے۔ لیکن، iii، ص۔ 965 پر اس واقعہ کی تاریخ 657ھ/9-1258ء بتا کر خود اپنے اس بیان

کی تردید کرتا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی، ص 40 پر مذکور ہے کہ لکھنوتی کے مقطع شیر خاں (ممکن ہے غلطی سے تاتار خاں کی جگہ شیر خاں چھپ گیا ہو) کی جگہ امین خاں کا تقرر کیا گیا جس کی موت کی خبر بلبن کو اس وقت ہوئی جب گنگا کے کنارے پٹیالی اور بھوج پور کے قلعے تعمیر کرانے میں مصروف تھا۔ لیکن روایت ہے کہ امین خاں کے نائب طغرل نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اسے بے دخل کر دیا۔ اسٹیورٹ ہسٹری آف بنگال، ص۔ 69 کا بیان ہے کہ تاتار خاں کو بلبن نے مستقل کر دیا اور اس نے 1277ء میں اپنی وفات تک بنگال پر حکمرانی کی۔ اسٹیورٹ نے اس بیان کے لیے کسی سند کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ تاہم برنی طغرل کی بغاوت کو "بلبن کی تخت نشینی کے پندرویں یا سولہویں سال"، کا واقعہ بتاتا ہے۔ بلبن کے نام سے لکھنوتی سے جاری کردہ سب سے پرانے سکے پر جو کہ دستیاب ہے 667 (یا 669) پر مطابق 69۔ 1268ء کی تاریخ ہے۔ آئی۔ ایم۔ سی، ii، نمبر 40 15 رائٹ؛ مٹرولوجی؛ 59 نمبر 243 اے۔ ممکن ہے اسے تاتار خاں نے جاری کیا ہو جس کی وفات یا اختتام حکمرانی کا اندازہ اس بنا پر نہیں لگایا جانا چاہیے۔ م۔ ب۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال، ii، ص۔ 57۔

برنی، ص۔ 82 جن ریاستوں پر اس نے یورش کی ان میں برنی نے جاج نگر یا حاجی نگر (مطبوعہ متن میں حاجی نگرم) کا بھی ذکر کیا ہے، انڈیا آفس لندن کا مخطوطہ 177 صفحہ ذیل 53 بی، 57 بی میں مسلسل حاجی نگر مذکور ہے۔ فرشتہ نے بھی حاجی نگر لکھا ہے ر I، ص۔ 79-80 الیٹ علی گڑھ ایڈیشن (ELLIAT) ' iii ' ص 112 اور 120 کا خیال کہ یہ اڑلیسہ نہیں ہو سکتا، صحیح تھا۔ اسٹیورٹ؛ ح۔ س، ص۔ 170 سے حاجی نگر تپیرہ (TAJINAGER TIPPERAH) کہتا ہے۔ ریورٹی کی شناخت کے مطابق اڑلیسہ ہے جسے بنرجی؛ بنگلار اتہاس، ii، ص۔ 70- 71 کی تائید حاصل ہے یقیناً ناقابل مدافعت ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال، ii، ص ص۔ 60۔ 66 حاجی نگر کی شناخت بیرم بھوم۔ بنگڑہ بردوان اور رہوگلی ضلعوں پر مشتمل علاقوں سے کرتا ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی ثبوت پیش کیا گیا ہے اور نہ ہی اس خیال کو طغرل اور بلبن کی نقل و حرکت سے متعلق جغرافیائی معلومات سے ہم آہنگ

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ اس کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ "یقینی معلومات کی عدم موجودگی کی وجہ سے طغرل کی واپسی کے راستے سے متعلق خیال آرائی کرنا بے معنی ہوگا۔" (ص۔ 66) اس نے ایک مقام پر جس کا نام تاریخ مبارک شاہی (ص۔ 41) پر نرکلاہ تحریر ہے طغرل کے بنوائے ہوئے قلعہ کا ذکر ضرورت سے زیادہ تفصیل سے کیا ہے۔ اس مقام کی شناخت لوریکول (LORICOL) نے ڈھاکہ سے 25 میل دور جنوب میں ایک پرتگالی قلعے کی جائے وقوع سے کیا ہے اس کا ذکر برنی نے نہیں کیا ہے۔ اگر اس کا ذرا سا بھی تعلق طغرل کی جاج نگر واپسی کے راستے سے ہوتا تو اس مقام کو سمت جنوب مشرق کی طرف ہوتی نہ کہ جنوب مغرب کی طرف۔ جاج نگر کی طرف مغرور طغرل کی جستجو میں بلبن کی سونار گاؤں میں آمد اور باغی کے لیے دریاؤں کے کنارے ہوکر فرار ہونے کی راہیں مسدود کرنے کے سلسلے میں ایک مقامی راجا سے سمجھوتہ یہ دونوں ہی باتیں جنوب مشرقی بنگال کے علاقے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اسٹیورٹ نے اس کی شناخت ٹپیرہ کے تذکروں میں غور کے ترکشا بادشاہ کا ذکر ہے جس نے تیرھویں صدی اور آخر میں ٹپیرہ تخت و تاج کے دو دعویداروں میں سے ایک کی فوجی امداد کی تھی اور جس نے رتنا بھا (RATNAPHA) نام کے حکمراں کو مانکیہ (MANKYA) کا خطاب بھی دیا تھا۔ اس خطاب کو ٹپیرہ کے حکمراں اسی وقت سے برابر استعمال کرتے آئے ہیں؛ راج مالا، مرتب، کے۔ سی۔ سنہا، ص ص۔ 29 - 31؛ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1850ء ص 533 Sq میں لانگ (LONG) کا تجزیہ اور تلخیص بھی دیکھیے۔ اگر طغرل کو ہی وہ ترکستان بادشاہ مان لیا جائے تو ایسے علاقے کی طرف اس کا فرار سمجھ میں آسکتا ہے جہاں ایک احسان مند حکمراں سے اسے خیر مقدم کی امید تھی۔ ماضی قریب میں ہی اس کے علاقوں پر مبینہ حملے کی وجہ سے اسے (طغرل) اڑیسہ کے حکمراں سے ایسی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن راج مالا بعد کی مرتب کی ہوئی اور ترکشا بادشاہ کی شناخت بھی شبہہ سے بالاتر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کی نہ تو کتابی سند موجود ہے اور نہ ہی آثار قدیمہ کی شہادتوں سے (EPIGRAPHIC)

ایسا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ تپیرہ اس زمانے میں کوئی اہم ریاست تھی۔ اس کے برعکس حال ہی میں ایسے ثبوت دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ تپیرہ لواکھالی اور میگھنا کے علاقوں میں ایک خوشحال ریاست تھی جس کا دارالسلطنت پتیکیرہ (PATTIKERA) تھا جو اب کومِلا (COMILLA) کے قریب کسی مینامتی (MAINAMATI) پہاڑیوں کے پاس واقع ہے۔ علم آثار قدیمہ نے جو ثبوت فراہم کیے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہاں کے قدیم شاہی خاندان کی جگہ 13 ویں صدی کے وسط میں ان حکمرانوں کے سلسلے نے لے لی جن کے نام 'دلوا' پر ختم ہوتے ہیں۔ ابھی تک اس سلسلے کے صرف دو بادشاہوں کا پتہ چل سکا ہے جنھوں نے نہ صرف پتی کیرا اسلطنت کو وسعت دی بلکہ وکرم پور اور ڈھاکہ سے بعد کے سین بادشاہوں کو اکھاڑ کر اپنے قدم جمائے۔ کیوں کہ دوسرا بادشاہ جس کا نام دھنج مادھو دسرتھ دیو (DHANUJA MADHUA DASRATHA DAVA) سکوں اور کتبوں سے متعلق علم کے ماہروں کے مطابق وہی بادشاہ ہے جس کا ذکر برنی نے دھنج رائے کے نام سے کیا ہے (اور ابوالفضل نے راجانوجا کے نام سے) پتی کیرا اسلطنت اور "دیوا" شاہی خاندان کے لیے دیکھیے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال، i، ص ص۔ 254-259۔ یہ بات غور طلب ہے کہ طغرل اسی پتی کیرا اسلطنت کی طرف فرار ہوا تھا یا نہیں۔ ایسی صورت میں باغی کی گرفتاری کے سلسلے میں مدد کرنے کے لیے دھنج رائے کی آمادگی کو بلبن کی خوشنودگی حاصل کرنے کی کوشش نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی وجہ غالباً دھنج رائے کے علاقوں پر طغرل کے حالیہ حملے کی وجہ سے پیدا کردہ دشمنی تھی۔ غالباً صحیح نام حاجی نگر ہونا چاہیے جسے بہ آسانی جہاج نگر سے منسوب کیا جا سکتا ہے جہاج نگر عرف عام میں میگھنا پدما سنگم پر تپیرہ لواکھالی علاقے کو کہتے ہیں۔ فرشتہ، i، ص 79 اور حاجی دبیر، iii ص۔ 966۔ جاج نگر پر طغرل کے حملے کی تاریخ 671 / 1272ء بتائی ہے۔ اسٹیورٹ، ج۔ اس، ص۔ 70 پر 1279 درج ہے۔

33- برنی، ص۔ 82۔

34- م۔ یہ۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 41 جس سے غالباً فرشتہ نے یہ بیان نقل کیا

ہے کہ اس وقت بلبن بیمار پڑ گیا اور اس کی وفات کی افواہ لکھنوتی تک پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے طغرل نے آزادی کا اعلان کر دیا اور مغیر الدین کا خطاب اختیار کر لیا۔ دیکھیے، برنی، ص۔ 82-83۔

35- فرشتہ، ا، ص۔ 79 کا بیان ہے کہ اسی موقع پر امین خاں کو لکھنوتی کا گورنر مقرر کیا گیا۔ بلاک مین بھی دیکھیے، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1874 ص 287 جس نے بدایوں کا بیان نقل کیا ہے، منتخب التواریخ، ا، ص۔ 127۔

36- برنی، ص۔ 84۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 41 کا بیان ہے کہ سپہ سالار کو گرفتار کر لیا گیا اور طغرل نے اسے نرکلا میں قید کر دیا۔

37- تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 41 - 42۔

38- برنی، ص 86۔ 85، تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 42 کا بیان ہے کہ وہ نرکلاہ بھاگ گیا۔ دیکھیے حاجی دبیر، iii، ص۔ 967 جو اسے جاج نگر بتاتا ہے۔

39- دیکھیے، رنل (RENNEL): میوائرس آف اور میپ آف ہندوستان (MEWAIRS OF MAP OF HINDUSTHON) سونار گاؤں کی جائے وقوع کے لیے۔

40- ابھی اس کو پوری طرح مرتب نہیں کیا گیا ہے اس کی آزمائشی تدوین، بھارت درشن، میں شائع ہوئی تھی؛ پی۔ ایس۔ 1332؛ حصہ دوم، ص ص 78 - 81 جس سے مجمدار این جی نے انسکرپشنز آف بنگال، iii، ص۔ 181 پر ایک بیان نقل کیا ہے۔ 1231 اور 1243 میں تانبے کی تختیوں پر کسی دامودری راجا چانور مادھو (DAMODRA ARIRAJA CHANUR MADHVA) کے دیئے گئے عطیات کے لیے دیکھیے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہسٹری آف بنگال، ا، ص ص۔ 253-255 یہ راجہ وقت تپیرہ، نوا کھالی اور چٹا گانگ ضلعوں پر حکومت کر رہا تھا۔

41- تاریخ مبارک شاہی، ص ص۔ 42-43 بلبن کے فوجی سفر کی یہ ترتیب تفصیل دی ہے ۔ اس نے دہلی سے باہر نکلتے ہی طغرل دریائے سار وایا سرو کے راستے نرکلاہ بھاگ گیا، بلبن نے بیکتاروں کو اس کا پیچھا کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اسی موقع پر دنج رائے کی یہ درخواست موصول ہوئی کہ اگر اس کی آمد پر سلطان کھڑے

ہو کر اس کی عزت افزائی کرے تو وہ حاضری کے لیے تیار ہے، بلبن کو کسی کافر کی عزت افزائی کرنے میں تامل تھا لیکن بیکتروں نے رائے دی کہ سلطان کو اپنے سر پر ایک شکرا (باز) بٹھائے اور رائے کے آتے ہی کھڑے ہو کر اسے کسی پرندے کے پیچھے لگا دے تاکہ دیکھنے والوں کو سلطان کے اس عمل کی اہمیت کا اندازہ ہی نہ ہو سکے چنانچہ رائے آیا اور باغی کو گرفتار کرنے کے لیے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اس طرح بلبن لکھنوتی پہنچا اور اس کے ہراول دستے کے مخبروں نے ایک جنگل میں اچانک طغرل کے کیمپ کو جا لیا۔

42۔ امیر خسرو کے تحریر کردہ فتح نامے میں لکھنوتی میں بیکتروں کی فتوحات کا بیان ہے لیکن طغرل کی بغاوت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ امیر خسرو اس مہم میں لکھنوتی تک بغرا خاں کے ہمراہ تھا۔ روایت ہے کہ اسے (بیختر) جاج نگر اور اودھ کو تابعدار بنانے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ جاج نگر پہنچ کر اس نے رائے کی ایک مضبوط فوج کو شکست دی جس کی کمانداری مالدیو رانا کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ جہاں بار؟ تک بڑھتا چلا گیا۔ (ایڈیشنل مینسکرپٹس ان دی برٹش میوزیم، 16842، صفحہ ذیل، 513 بی میں مہا بنار میں تحریر ہے) جہاں رائے کی رہائش تھی۔ اس نے رواتوں کو شکست دے کر اسیر گاؤں کے مضبوط قلعے پر بھی قبضہ کر لیا (برٹش میوزیم کے دونوں مخطوطوں میں گاؤں سنار ہے، جس سے غالباً سنار گاؤں مراد ہے) چنانچہ رائے بیراجیت مل نے مصالحت کی درخواست کی اور مسلمانوں کی برتری محسوس کرنے کے علاوہ خراج ادا کرنے کی پیش کش بھی کی۔ اس پیش کش کی منظوری کے بعد رائے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے تابع داروں میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد مسلم فوج سلطان کے ہمراہ 5، شوال 680 / 1281ء کو دہلی واپس ہوئی (الجاز خسروی (مطبوعہ لکھنؤ)، ۷، ص ص۔ 5-14) اس بیان میں جن جگہوں کا ذکر ہے اُن کی شناخت مشکل ہے، اس میں اڑیسہ کی فتح کا ذکر ہونا مشکل ہے۔ اسیر گاؤں غالباً سونار گاؤں ہے جو اس کے بعد ہی مسلم حکومت میں شامل دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ اس بات کا علم نہیں ہے کہ دھنج مادھو کی حکومت کا دور کب سے کب تک تھا لیکن پھٹاشالی اس کی حکومت کے اختتام کو 1280 کے لگ بھگ

ماننے کی طرف مائل ہیں۔ اس سے پہلے ہی طغرل کا مزید پیچھا کیا جا سکتا ہے ممکن ہے کہ دھنج رائے کو بیکترس نے شکست دے دی ہو اور جس معاہدے کا ذکر موجود ہے وہ اس واقعے کے بعد کیا گیا ہوگا۔ ایسی صورت میں یہ ماننا ہوگا کہ برا جیت مل دھنج رائے کے سپہ سالار کا نام تھا۔ تاہم برنی (ص۔ 93) نے یہ بیان کرتے ہوئے بغرا خاں کو بلبن نے ان الفاظ میں خبردار کیا تھا کہ "ہند، سندھ، مالوہ، گجرات، لکھنوتی اور سنارگاؤں کے معطیعوں میں سے جو بھی دہلی کے خلاف بغاوت کرے گا۔ اس کا انجام طغرل کے انجام جیسا ہوگا۔ وہ سونارگاؤں کے الحاق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سونارگاؤں پر یقینی قبضہ کا ثبوت بغرا خاں کے بیٹے اور جانشین کیقاوس (KAIKAUS) کے جاری کردہ سکّے سے ملتا ہے یہ سکّہ (خراج آف بنگال) کی ٹکسال سے جاری کیا گیا تھا اور اس پر 690 / 1291ء کی تاریخ ہے 'جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' 1922، ص۔ 410۔

43۔ برنی، ص 92۔ 91۔

44۔ امیر خسرو نے اس کی تاریخ 1281 بتائی ہے۔ گڑھ مکتیشور۔ یو۔ پی۔ کی ایک مسجد کے کتبے سے ایسا ثبوت ملتا ہے جس سے اس کی تائید میں معلوم ہوتا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر ربیع الاول 682ھ/ 1283ء میں بیکترس السلطانی کی گورنری کے دوران ہوئی جو بنگال مہم میں بلبن کے ہراول دستے کا سپہ سالار تھا۔ ایپی گرافیا انڈو مسلمکا 14 - 1913ء کتبہ نمبر 29۔

45۔ امیر خسرو، غرۃ الکمال (GHURRATUL—KAMAL) دیباچہ بحوالہ بدایونی، ح۔ س۔ ترجمہ، ا، ص۔ 216، برنی، ص۔ 69۔

46۔ ص۔ 109۔

47۔ برنی، ص ص۔ 59۔ 61۔

48۔ برنی، ص۔ 81۔ سرحدوں سے متعلق صورت حال کی تفصیلات کے لیے دیکھئے باب نہم۔

49 دیکھئے برنی، ص ص۔ 54۔ 55 کس طرح وہ شکاری مہمات کے ذریعہ اپنی فوج کو مستعد رکھتا تھا۔

50- برنی، ص ص۔ 67۔ 69۔

51- ایضاً، ص۔ 109 تاریخ مبارک شاہی، ص ص 44۔ 45 نے امیر خسرو کے بیان سے شہزادے کی معرکہ آرائی اور نتیجتاً اس کی موت کا پورا حال نقل کیا ہے؛ بدایونی ج۔ س، ص۔ 138 (متن) نے امیر خسرو کی نظم کا حوالہ دیا ہے۔ اس غیر مصدقہ روایت کے لیے کس طرح شہزادے کا افسوس ناک انجام ملتان کے ایک ہم عصر بزرگ صدرالدین کی خفگی کا نتیجہ سمجھا گیا۔ دیکھیے۔ طبقات اکبری، ا، ص 88۔ شہزادے نے مدہوشی کی حالت میں اپنی بیوی کو جو خاندان التتمش کی بیٹی تھی طلاق دیدیا۔ بعد کو اس کی خواہش تھی کہ وہ اسے دوبارہ اپنے نکاح میں لائے جس کے لیے حلالہ ضروری ہے۔ جس کے لیے یہ بزرگ تیار ہو گئے لیکن بعد کو اس عورت نے شہزادے کے پاس واپس جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس بزرگ نے بھی طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر شہزادہ غصہ سے پاگل ہو اٹھا اور قسم کھائی کہ وہ صبح سب سے پہلے صدرالدین کو قتل کر دے گا؛ لیکن منگولوں کے حملہ کی وجہ سے اسے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی فیصلہ کن مہم پر روانہ ہونا پڑا۔

52- برنی، ص۔ 121۔ 122۔

53- تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 52 برنی نے اس کی کوئی تاریخ نہیں دی ہے۔ لیکن ص۔ 127 پر وہ کیقباد کی تخت نشینی کی تاریخ 685 بتاتا ہے جو غلط ہے۔

آٹھواں باب

مملوک سلسلہ سلاطین کا خاتمہ

1277ء - 1290ء

کیقباد اور کیومر

کیخسرو کی تخت نشینی کے امکانی نتائج پر قیاس آرائی کرنا بیکار ہوگی۔ کیونکہ بلبن کی موت کے فوراً بعد اسے ملتان بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ اپنے باپ کی جانشینی کے لیے مقرر کیا گیا۔[1] فخرالدین اور اس کے حمایتیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کا شہزادہ محمدؒ سے کچھ نجی جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ باوجود اس کے کہ بلبن نے ان سے آخری درخواست کی تھی کہ اس کے بیٹے کو تخت شاہی پر بیٹھنے کی اجازت دی جائے "تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے نقصان پہنچے"۔[2] ملک بیک سارق وزیر حسن بصری اور دبیر نے جب اس من مانے اقدام کی مخالفت کی تو کوتوال پارٹی نے انھیں جیل میں ڈالا بعد ازاں ملک بدر کر دیا۔[3] اس کے بعد بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو معزالدین کا لقب دے کر تخت شاہی پر بٹھا دیا گیا۔[4]

نوجوان بادشاہ کے دور حکومت کی رنگین اور بے فکر زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ برنی اپنی ضعیفی کو بھول گیا تھا۔ شہزادے کی عمر اس وقت اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ اس کی پرورش اپنے دادا کی سخت احتیاط اور نگرانی کے تحت ہوئی تھی۔ اس کے آداب اور ظاہری طور طریقے فطری طور پر بڑے دلفریب تھے۔ شاعری اور

موسیقی کے لیے اس کا مذاق مہذب اور اعلیٰ درجے کا تھا۔ بلبن جو اخلاقی اور مذہبی معاملات میں بہت زیادہ محتاط تھا اس نے اسے عنفوان شباب میں زندگی کے عیش و آرام سے لطف اندوز ہونے کا کبھی کوئی موقعہ نہیں دیا۔" نہ وہ خوبصورت چہرے کو نظر ملاکر دیکھ سکتا تھا اور نہ شراب سے بھرے ہوئے جام کو حلق کے نیچے اتار سکتا تھا۔" اور اب زندگی کے سب سے خطرناک موڑ پر، اچانک، غیر متوقع طور پر اس نے اپنے آپ کو اس مقام پر پایا۔ جہاں وہ نہ صرف اپنے اعمال کا بلکہ ایک امیر اور خوشحال سلطنت کا مالک و مختار تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ اسے شراب، عورت اور عیش و عشرت سے بے روک ٹوک لگاؤ میں اپنی گھٹی ہوئی خواہشات کے اظہار کا راستہ مل گیا۔

اس کا دربار مسخروں، گویوں اور رقاصاؤں سے بھر گیا۔ بلبن کے کٹرپن کی وجہ سے جن درباریوں اور شہریوں کی نفسانی خواہشات تشنہ رہ گئی تھیں۔ انھوں نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا اور اس طرح دہلی شراب سازندوں اور رقاصاؤں کا ایک سرگرم بازار بن گیا جو سلطنت کے ہر کونے سے دہلی میں داخل ہونے لگے تھے۔ عیش و عشرت کی جستجو زندگی کا مسلک بن گئی۔ یہاں تک کہ شعرا اور ادبا، علما اور فضلاء بھی عیش و عشرت کی محفلوں میں اپنی شاعری اور بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرکے داد قبول کرتے لگے۔ کیقباد نے اپنا دہلی کا مسکن چھوڑ کر جمنا سے کچھ میل دور کلوکھڑی میں ایک نیا محل تعمیر کرایا۔ شاہی درباری بھی وہیں منتقل ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یہ جگہ عمارتوں اور بھانت بھانت کے لوگوں سے بھر گئی۔ برنی کے اس بیان میں زیادہ مبالغہ نہیں ہے کہ کیقباد کے تین سالہ دور حکومت میں لوگوں کے پاس سوائے رنگ رلیوں کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ نوجوان بادشاہ کی ذاتی مقبولیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ مرحوم شہنشاہ کے سرکاری اقدامات معدوم ہوتے چلے گئے۔ محکمہ انتظامیہ کو خود اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ سازشیں کرنے والے من مانی کرنے لگے۔

اس عہد پر برنی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا بیشتر حصہ کیقباد کی محفلوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ تاہم ان رنگ رلیوں کے پیچھے وہ ابدی فتنہ پرداز موجود تھا جو ایسے حالات کا ایک ناگزیر حصہ ہوتا ہے۔ تخت نشینی کے موقعہ پر رسوم کے مطابق کیقباد نے پرانے افسران کی توثیق کر دی۔ ان ترقی پانے والوں میں پرانا نائب وزیر خواجہ خطیر

بھی تھا۔ جسے حسن بصری کے خالی عہدے پر متعین کر دیا گیا۔ نئے تقررات میں ملک توزکی کو امور خانہ داری کی دیکھ بھال کے لیے نجی میر حاجب بنا دیا گیا۔ ملک جوارجی کو سرفن دار اور ملک قوام الدین کو چیف سکریٹری کا عہدہ دیا گیا۔ آخرالذکر کے سپرد شاہی محل نائب وکیل در کی ذمہ داریاں بھی کی گئیں۔ کیقباد کے لیے جو تقرر سب سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوا وہ کوتوال فخرالدین کے داماد ملک نظام الدین کو دارالسلطنت کا مجسٹریٹ بنایا جانا تھا۔[7]

بوالہوس نظام الدین کی فطرت میں سازش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی جلدی سلطان کا اعتماد حاصل کر لیا۔ برنی لکھتا ہے کہ وہ حالاں کہ اس کے پاس عدالتی عہدہ تھا لیکن مختصر سے عرصے میں اس نے اپنے آپ کو عملی طور پر "نائب مملکت" بنا کر ریاست کے تمام محکموں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس میں ایک ذہین اور قابلِ منتظم کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس لیے برنی کہتا ہے کہ عیاش بادشاہ کے دور میں نظم و نسق قائم رکھنے کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔[8] اس نے اپنی بیوی کو محل میں رہنے اور سلطان حرم پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ کوتوال سے رشتے داری کی بنا پر جو شہر کا سب سے زیادہ باثر آدمی تھا نظام الدین نے مسلمہ اقتدار حاصل کر لیا تھا اور بیشتر درباری اس سے اپنی وفاداری جتانا مصلحت اندیشی سمجھنے لگے تھے۔

برنی اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ ایسا لائق تاج شاہی حاصل کرنے کی خواہش کا شکار ہوا۔ ہر سمجھدار آدمی موروثی تبدیلی کے انتظار میں تھا۔ ایسی صورت میں نظام الدین کی بوالہوسی کو جرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلبن کی اولادوں نے تاج شاہی کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر نااہل ثابت کر دیا۔ حکومت کو ضرورت تھی مضبوط اور بہادر لوگوں کی نہ کہ کمزور بغرا خاں یا عیاشی سے دلچسپی رکھنے والے کیقباد کی۔ منگولوں کے حملے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس لیے اب ایک جنگجو بادشاہ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے حالات میں موروثی حق ملکیت کو جذباتی لحاظ سے تسلیم کرنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ نظام الدین سپاہی نہیں تھا اس لیے اس کے خسر نے اسے اپنے منصوبوں سے اس بنیاد پر الگ رکھنے کی کوشش کی کہ سلاطین کی نسل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت ایک ناتواں موروثی

سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے کوئی جواز نہیں پیش کرسکی[9] نظام الدین اپنے اس کھیل کو پوری تندہی سے کھیلتا رہا۔ اور بڑے سلیقے سے اپنے مخالفین کو الگ کرتا رہا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ کیخسرو اس کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوا۔ چنانچہ اس کو ملتان سے طلب کیا گیا اور راستے میں روہتک کے قریب اسے کیقباد کے نشے میں جاری کیے ہوئے ایک حکم کے تحت قتل کر دیا گیا[10] نظام الدین کی اس حرکت سے اس کے خطرناک منصوبوں پر کیے جانے والے تمام شبہات ظاہر ہوگئے۔ اس کی بدنیتی کی وجہ سے ممتاز لوگوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ گئی تھی۔ نظم ونسق کے محکمے کا افسر خواجہ خطیر مورد عتاب ہوا۔ جس کو پہلے ہی اپنے عہدے سے الگ کیا جا چکا تھا۔ بلبن کے دور حکومت میں تبدیل مذہب کرنے والے منگولوں کی ایک بستی دہلی میں بس گئی تھی۔ اُن میں اکثر لوگ بلبن کی جماعت سے تعلق رکھنے والے بااثر لوگوں کے رشتے دار تھے ان لوگوں کو بغاوت کے جھوٹے الزام لگا کر قتل کر دیا گیا۔ ان مقتولوں میں سرجاندار اور امیر حاجب جیسے ممتاز افسر بھی شامل تھے۔ ان خالی جگہوں پر نظام الدین نے اپنے خاص معتمدوں کو متعین کیا۔[11] سلطان جواب مکمل طور پر نظام الدین کی بیوی کے قبضے میں تھا۔ اس کے خلاف کوئی شکایت سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ موروثی تبدیلی کی بات کھلم کھلا کی جانے لگی۔ ظاہر ہے کہ اب کسی وقت بھی کیقباد کی برطرفی ہوسکتی تھی۔

برنی لکھتا ہے کہ تقدیر کو یہ منظور نہ تھا اس نے اس تاریخی کام کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ منتخب کیا تھا۔ اپنی محنت کا پھل نظام الدین کی قسمت میں نہیں تھا۔ بلبن کی موت کے بعد لکھنوتی میں بغرا خاں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا[12] حالاں کہ اس کا مقصد ایک الگ سیاسی وجود قائم کرنا تھا۔ تاہم وہ دہلی کے واقعات سے آنکھیں نہیں بند کرسکتا تھا۔ کچھ مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ باپ کے تخت کے لیے اپنا حق جتانے پر تیار تھا۔ چاہے وہ نظام الدین کی مزاحمت ہی کی خاطر کیوں نہ ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ کیقباد کی اپنے کو تباہ کرنے والی مہم کی وجہ سے خاندان کے اُن لوگوں میں بھی موروثی مفاد کا جذبہ جاگ اٹھا تھا جو اس سے پہلے ہر ذمہ داری سے کتراتے تھے۔ اسے دہلی میں اپنے بیٹے کی حرکتوں کی خبر ملتی رہتی تھی۔ اس نے دہلی سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ اس کے خطوں میں نصیحت، ملامت اور تنبیہہ

ہوتی تھی۔ لیکن بیٹا تو انتقام الٰہی کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ اس میں اصلاح کی رمق تک نہیں پائی جاتی تھی۔ بالآخر بغرا خاں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کیا اور ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ اسے ملنے کی اجازت دے دی گئی اور ملاقات کی جگہ اودھ میں دریائے سرجو کے ساحل پر طے ہوئی۔[13] یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اس ملاقات سے بغرا کی نیت کیا تھی۔ اس عہد کے مورّخ اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ اس ملاقات کے پیچھے صرف پدرانہ محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ غالباً دوسروں کی طرح اس نے بھی اپنے باپ کی موروثی سلطنت کی تباہی کے مقدّر کو واضح طور پر پڑھ لیا۔ اس کو اپنے باپ کی وصیعت بھی یاد آتی تھی۔ اس لیے اب وہ تخت شاہی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کم از کم امیر خسرو اور بعد میں آنے والے کچھ مورّخین نے باپ بیٹے کی اس ملاقات کی متذکرہ بالا توجیہہ پیش کی ہے۔[14] بہرکیف اصل مقصد جو بھی رہا ہو بغرا اپنی فوج لے کر چل پڑا اور سرجو کے کنارے خیمے ڈال دیئے۔ دوسری طرف کیقباد بھی اپنا لشکر لے کر آرام سے پیش قدمی کرتا ہوا سرجو پہنچا اور دوسرے کنارے پر خیمہ زن ہوا۔ فوجی طاقت کی اس نمائش کا اصلی مقصد احتیاطی اقدام رہا ہوگا لیکن نظام الدین نے مدتوں سے بچھڑے ہوئے باپ سے ملاقات پر نوجوان بیٹے کے جذبات کو پہلے ہی سے سمجھ لیا تھا اس لیے اس نے دونوں کے درمیان جنگ چھیڑنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن بلبن کے خاندان کے کچھ وفاداروں کی مخلص کوشش کی وجہ سے یہ شدنی ٹل گئی۔ نظام الدین نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ بغرا سے کچھ ذلت آمیز اور نیچا دکھانے والی رسموں پر سختی سے عمل کرائے۔ بغرا سے کہا گیا کہ وہ خود آئے اور اپنے بیٹے سے اظہار وفاداری کرے جو بلبن کے تخت شاہی کا جانشین اور ہندوستان کا شہنشاہ ہے۔ طویل بحث و مباحثہ ہوا دھمکیاں دی گئیں گفت و شنید کے سلسلے کو منقطع ہونے سے بچا لیا گیا۔ صلح کرانے والوں پر بڑا برا وقت گزرا لیکن آخر میں بغرا کے احساس مرتبہ پر پدرانہ محبت غالب آئی اور وہ شہنشاہ دہلی کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔[15] اس کے بعد جو ملاقات ہوئی وہ قرون وسطیٰ کی تاریخ کا سب سے زیادہ نازک، محبت سے لبریز اور دل ہلا دینے والا واقعہ ہے۔ اس واقعہ نے امیر خسرو کو اپنی بہت مشہور نظم کے لیے مواد بھی فراہم کیا تھا۔ کیقباد کی وجاہت اور وقار نے سنگدلی کی چادر اوڑھ لی۔ اس نے ایک بے تعلق

اور شاہانہ انداز سے دیکھا کہ اس کا باپ کورنش بجالاتا ہے۔ جھکتا اور زمین کو سجدے کرتا ہوا تخت شاہی کی طرف بڑھ رہا ہے اور پھر وہ منہ کے بل اپنے بیٹے کے قدموں پر لیٹ گیا لیکن آخری لمحے میں بادشاہ کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ بغرا کے قدموں پر گر پڑا۔ اس کے آنسو دیکھنے والوں کا دل پگھلا رہے تھے۔ پھر وہ اپنے باپ کو اٹھا کر تخت شاہی پر لے آیا۔ دونوں کئی دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ اسی دوران بغرا نے اپنے بیٹے کو چال چلن بدلنے کی تلقین کی اور کہا اسے اپنی خاندانی روایات پر عمل کرنا چاہیئے۔ اپنے طور طریق بدلنے چاہئیں جو ایک دن اس کو تباہ کر کے چھوڑیں گے۔ آخری ملاقات میں اس نے بلبن کے انداز میں کیقباد کو انتظامی امور کے بارے میں ہدایات دیں اور چلتے چلتے اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اسے نظام الدین جیسے خبیث مشیروں کو ختم کر دینا چاہیئے۔[15] تحفے تحائف کے تبادلے کے بعد باپ اور بیٹے جدا ہوئے۔ تاہم باپ کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو آخری بار دیکھ رہا ہے۔ دوسری طرف کیقباد کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اس نے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرنے کا عزم کر لیا ہو۔

واپس لوٹتے وقت اس نے کچھ منزلوں تک نہ تو شراب کو چھوا اور نہ ساتھ آنے والی بے شمار طوائفوں کی طرف نظر اٹھائی۔ لیکن بالآخر ایک مخصوص دل لبھانے والی حسن کی اداؤں میں پھنس گیا۔ اور اس کے بے دلی سے کیے ہوئے عہد نے جواب دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلوکھڑی پہنچتے پہنچتے وہ پہلے سے زیادہ شرابی اور اوباش ہو چکا تھا۔[16]

ادھر نظام الدین نے اپنی چالیں جاری رکھیں۔ ملک شاہک جس نے امیر حاجب کی جگہ پر جوارجی کی جگہ لی تھی اور ملتان کا صوبے دار تھا۔ اس نے ابھی حال ہی میں منگولوں پر فتح پا کر بڑی شہرت اور اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس کی طاقت بڑھتے دیکھ کر نظام الدین کی نظر اس پر پڑی۔ چنانچہ ملک کو شمال کے پہاڑوں کی طرف بھاگنا پڑا جہاں اسی طرح کے کچھ اور ڈرے ہوئے شرفا بھی آکر اس سے مل گئے۔ سلطان کا خلوص دل سے وفادار ہونے کے ناطے جیسے ہی اس نے احکام سنے اطاعت کے لیے حاضر ہو گیا۔ لیکن وہ فوراً گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں اسے پھانسی دے دی گئی۔[19] اسی قسم کا برتاؤ ترکی کے ساتھ بھی کیا گیا جو ابھی حال میں فوج کا وزیر اور برن کا صوبے دار بنایا گیا تھا۔

لیکن بقول برنی کے اس کا ہر قدم خلجیوں کے لیے راستہ ہموار کر رہا تھا۔[19] اس سے پہلے کہ نظام الدین اپنے آخری منصوبے پر عمل کرتا کیقباد کو ایک دم اپنے باپ کی نصیحت یاد آ گئی۔ اس نے نظام الدین کو ملتان جا کر ملک شاہ بک کی جگہ لینے کا حکم دیا۔ سلطان کے اصل منشا سے واقف ہونے کی وجہ سے اس نے بہانہ ڈھونڈ کر روانگی میں دیر کی۔ اس دوران اس کے دشمنوں کو سلطان کے اصل مقصد کا اندازہ ہو گیا چنانچہ انھوں نے نظام الدین کو زہر دیدیا۔[20] اس میں شبہ نہیں کہ اس کی موت نے کیقباد کو سر پر منڈلانے والے قتل سے نجات دلا دی لیکن اس نے اپنے انتہائی قابل، واحد مہتمم اور منتظم کو بھی کھو دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں جو کچھ بندوبست اور نظم و نسق قائم تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس من موجی اور اضطراری بادشاہ کو اپنے باپ کی دوسری نصیحتیں کبھی یاد نہیں آئیں کم از کم اس نے اُن پر عمل کبھی نہیں کیا۔ بہر کیف اب وقت بھی گزر چکا تھا۔ مسلسل شراب نوشی اور عیاشی کی وجہ سے اس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ صاحب فراش ہو گیا۔[21]

برنی لکھتا ہے کہ نظام الدین کی موت کے بعد بلبن کے بہت سے پرانے افسر اور حمایتی جنھیں اس نے ابھی تک دور دور رکھا تھا واپس آ گئے اور بندوبست کے محکمے میں نوکری کی۔ لیکن برنی کے مطابق بندوبست دوبارہ قائم نہ ہو سکا۔ کیوں کہ اونچے عہدوں کے دعویدار افسران میں کوئی بھی اتنا زبردست نہیں تھا جو دوسروں سے اپنی بات منوا سکے چنانچہ حکومت اپنی یک رنگی اور طاقت کھو بیٹھی۔ محل میں امیر حاجب اور باربک کے عہدوں کے لازمی امیدوار ملک اعتماد اور ملک سرخا تھے۔ چوں کہ سلطان بھی ان کی نگرانی میں تھا اس لیے اپنی کارروائیوں کے لیے یہ اس کا نام بھی استعمال کرتے تھے۔ توزکی کے قتل کے بعد جو جگہ خالی ہوئی اس پر کیقباد نے ملک فیروز خلجی کا تقرر کیا جو پہلے سرجاندار اور سمانا کا صوبے دار تھا۔[22] فیروز کا لقب شائستہ خاں[23] تھا اور وہ بہت طاقت ور آدمی تھا۔ نہ صرف فوج اس کے تحت تھی بلکہ وہ ایک ایسے بڑے اور با اثر قبیلے کا سردار بھی تھا جو ساری سلطنت میں پھیلا ہوا تھا۔ فیروز اور محل کے اندر سے حکم چلانے والوں کے درمیان سخت نفرت پائی جاتی تھی۔ اس پر فیروز کے غیر ترکی ہونے نے نزاع کو اور بھی بڑھا دیا۔ ان سب

باتوں کا نتیجہ افراتفری میں ظاہر ہوا۔

خلجی دسویں صدی سے وادی ہیلمند (HELMAND) اور اس کے بعد لمغان (LAMGHAN) میں رہتے چلے آرہے تھے۔ اپنے وطن سے طویل غیر حاضری کی وجہ سے ان خلجیوں کو ترکستان سے نئے آنے والے، ترک نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے ترکوں سے محبت کرنے والی بلبن کی جماعت اور دہلی کے شہری حقارت سے انھیں "غیر ترک" کہتے تھے [29] چنانچہ جب فیروز کے سپرد فوج کی وزارت کی گئی اور اس کے نتیجے کے طور پر خلجیوں کا حکومت میں غلبہ ہوا تو ان لوگوں میں بڑی بے اطمینانی پھیل گئی جو حکومت میں ترکی تسلط کو محفوظ رکھنا چاہیئے تھا۔ اس جگہ سرخا اور کچن (KACCHAN) کی رقابت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ پچاس سال پہلے ریحان کے واقعہ میں ہوا تھا۔ ان کی قیادت میں ایک تحریک شروع کی گئی جس کا مقصد تمام غیر ترکی افسران کو ختم کر دینا تھا۔ ختم کیے جانے والوں کی خفیہ طور پر ایک فہرست تیار کی گئی۔ حقیقت میں یہ کوشش بلبن کے نسلی کٹر پن کا ایک لازمی نتیجہ تھی۔ اس نے پالیسی سے اپنے آپ کو اتنے نمایاں طور پر وابستہ کر لیا کہ پھر اس موروثی سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے اس پر عمل درآمد کرنا ضروری تھا۔ [25] مجرم قرار دیئے جانے والوں کی مجوزہ فہرست پر شاہی تصدیق ضروری تھی۔ لیکن کیقباد جسمانی طور پر قطعاً اس حالت میں نہیں تھا کہ وہ اس فہرست پر صاد کرے۔ اس لیے سازش کرنے والوں نے ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ حکمراں بادشاہ کو باقاعدہ طور پر معزول کرنے یا تخت چھوڑنے پر مجبور کیے بغیر یہ لوگ اس کے تین سالہ لڑکے کیومرث کو حرم سے لے آئے اور شمس الدین کے نام سے اسے تاج پہنا دیا جو کھلم کھلا طور پر اس کے باپ کی منسوخی کے مترادف تھا۔ [26] انھوں نے اپنے آدمیوں میں سے ایک کو اس شیر خوار بادشاہ کے لیے قائم مقام مقرر کر دیا گیا اور پھر نئی پالیسی کے تحت سرکاری دفاتر کی دوبارہ تنظیم کی گئی بعد ازاں قتل کیے جانے والوں کی مجوزہ فہرست کی توثیق بھی کرائی گئی۔ جس میں فیروز کا نام سرفہرست تھا۔ تخت نشینی کے سلسلے میں فوج کے وزیر سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا جس کے اسباب واضح تھے۔ حالانکہ ایک وفادار افسر کے ناتے اس نے نئی حکومت کو چپ چاپ تسلیم کر لیا نئے انتظامات کی اصل حقیقت سے ناواقف ہونے کے باوجود نئے افسران کی

طرف سے مشکوک ضرور تھا۔ کیوں کہ یہ لوگ فیروز سے متعلق اپنے احساسات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ سرفا نے فیروز کے قتل کی ذمہ داری اپنے سر لے کر منصوبے کو شروع کرنے کا پروگرام بنایا لیکن فیروز کا ایک رشتے دار احمد چاپ کچن کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس نے یہ خبر بروقت فیروز تک پہنچادی۔ چنانچہ احتیاطاً فیروز نے دارالسلطنت سے نکلنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے اپنی جماعت کو مضبوط بنایا کیوں کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ تصادم نزدیک ہے اس لیے اس نے اپنا مرکز دہلی سے کچھ دور غیاث پور میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد فیروز نے اپنے رشتے داروں کو برن سے یہ کہہ کر بلا لیا کہ وہاں منگول خطرہ بڑھ گیا ہے۔ اس دوران متذکرہ فہرست کے کچھ اور افسران بھی فیروز سے آن ملے تھے[27]

غیاث پور منتقل ہونے کے اگلے دن فیروز اپنی قنوج کی فوجوں کا معاینہ کر رہا تھا جب اسے کیومرث کے دربار سے فوراً حاضری کا حکم ملا۔ چنانچہ اب یہ ساری سازش واضح ہو چکی تھی اس لیے اس نے روانگی میں تاخیر کی۔ اس دوران کچن ایک اور ضروری پیغام لے کر خود پہنچ گیا۔ شاہی طلبی کی کھلم کھلا نافرمانی کرنے کے بجائے اس نے فوجی معائنے کی مصروفیت کا حوالہ دیتے ہوئے تھوڑی مہلت کی درخواست کی تاکہ ہاتھ میں لیا ہوا کام ختم ہو جائے۔ چنانچہ کچن کو مجبوراً انتظار کرنا پڑا۔ اس خیال سے کہ اس کی آمد کا اصل مقصد ابھی تک صیغۂ راز میں ہے وہ اپنے خیمے میں آرام کرنے چلا گیا۔ فیروز نے جیسے ہی دیکھا کہ کچن اب اتنا چوکس نہیں ہے اس نے اپنے لوگوں کو اشارہ کیا جنھوں نے اس کا سر کاٹ کر اس کا جسم جمنا میں پھینک دیا[28]

اس کارروائی نے چہروں پر سے نقاب ہٹا دیئے اور دونوں جماعتیں کھلم کھلا مقابلے پر آگئیں۔ فیروز نے سوچا کہ اگر اس موقعہ پر بادشاہ کے اقتدار کو اپنی جماعت کے حق میں استعمال کیا جائے تو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کے ہمراہ ایک فوج بھیجی تاکہ وہ کیومرس کو اپنے ساتھ لے آئے۔ اُنھوں نے محل پر قبضہ کر کے بادشاہ کو حاصل کر لیا۔ جب ترک افسروں کی ایک فوج ان کے تعاقب میں نکلی تو اس نے بیشتر ترکوں کو قتل کر دیا جو لوگ گرفتار کیے گئے ان میں کوتوال کے لڑکے بھی تھے[29] نفرت انگیز خلجیوں کے ہاتھوں اُن کے بادشاہ کے اغوا نے دہلی کے باشندوں کو جوابی کارروائی کے لیے مجبور کر دیا۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن

فخرالدین نے اُن لوگوں کو سمجھا بجھا کر واپس لوٹا دیا۔ کیوں کہ اسے اپنے بیٹوں کی جان کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ بادشاہ کو اپنے قبضے میں کر کے فیروز نے صورت حال پر مکمل طور پر قابو پا لیا یہاں تک کہ کچھ ترک افسروں نے بھی اس کا ساتھ دے کر، چپ چاپ اس کی برتری تسلیم کر لی۔[30]

برنی نے اس بدنصیب نابالغ بادشاہ کے دور حکومت کے واقعات کو تحریر نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے کچھ سکے ضرور دستیاب ہوئے ہیں۔[31] یحییٰ سرہندی کی تحریر کے مطابق اس نے تقریباً تین مہینے تک حکومت کی تھی۔[32] بالآخر اپنے تمام دشمنوں کو شکست دینے کے بعد فیروز نے بادشاہ کو کلوکھڑی میں اس کے باپ کے محل میں بٹھا دیا۔ اور اس کی طرف سے نظم ونسق کو ٹھیک کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس نے بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کو سلطنت کی نیابت کے فرائض سنبھالنے کی پیش کش کی اور ملتان، بھٹنڈا، دیپال پور کے صوبوں کو اپنے لیے طلب کیا۔ چھجو نے خلجیوں کے اس تحفے کو کسر شان سمجھتے ہوئے انکار کر دیا اور کڑا و مانک پور کی صوبے داری کو ترجیح دی جہاں اس نے فوراً بلبن خاندان کے باقی ماندہ افراد سے تعلقات استوار کر لیے۔ اسی طرح کی ایک پیش کش جیب کوتوال نے بھی رد کر دی[33] تو اس نے مجبوراً بادشاہ کے قائم مقام کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس اثنا میں کیقباد کو بڑے شرمناک انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بے حس و حرکت، بستر پر بھوکا پیاسا پڑا ہوا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اتنے میں فیروز کا بھیجا ہوا ایک خلجی سپاہی اس کے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے کیقباد کو بستر میں لپیٹا اور ایک لات مار کر جمنا میں پھینک دیا۔[34] قائم مقامی تو محض ایک عارضی انتظام تھا۔ عملی طور پر تیرھویں صدی کی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ برنی نے کیومرس کی ناگزیر برطرفی کی تفصیلات نہیں لکھی ہیں۔[35] لیکن اس کارروائی کے بارے میں قیاس آرائی کرنا مشکل نہیں ہے۔ نہ اس واقعہ کے سلسلے میں جذباتی ہونے کی ضرورت ہے۔ نوجوان شہزادہ اپنی فرمارروائی کا صحیح نمائندہ نہیں تھا۔ ایسی فرمارروائی جس کی سیاسی روایات کو نہ تو زندہ کیا جا سکتا تھا اور نہ وہ وقت کا ساتھ دینے کے قابل تھیں۔ فیروز جب مارچ 1290ء میں جلال الدین کا لقب اختیار کر کے کلوکھڑی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے دراصل ایک نئے دور کا باقاعدہ طور پر آغاز کیا۔[36]

انقلاب مکمل تھا لیکن عوام کی زندگی کو معمول پر آنے میں دیر لگی۔ دہلی ترکوں کا ایک مضبوط گڑھ تھا اس لیے فیروز نے بہت دن اس کے دور کلوکھڑی میں رہنا مناسب سمجھا۔ اس کے دشمنوں کو بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ ماضی سے چپٹے رہنا کتنا بے سود اور بیکار ہے اس لیے انھوں نے بھی آہستہ آہستہ حقائق کو قبول کر لیا۔ فیروز کی سادہ مزاجی اور امن پسند طبیعت نے جلد ہی اس کی حکومت سے عام نفرت کو دور کر دیا۔ دہلی کے شہریوں نے اپنی حمایت اور اشتراک پیش کر کے نئی فرمارِوائی کو تسلیم کر لیا۔ مغلوب پارٹی کے بچے کچھے لوگوں کی سب سے زیادہ معزز شخصیت فخرالدین کی تھی اس کے دعوت نامے پر بالآخر فیروز دہلی آیا اور انتہائی ممتاز اور نامور آقا کے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔[37]

برنی نے اس بات پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس دن حکومت ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ یہ بات جزوی طور پر صحیح ہے کیوں کہ تاج شاہی آج بھی اسی نسل کے ایک شخص کے سر پر تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ترکی غلبہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں حاجی دبیر کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جب وہ کہتا ہے کہ "معزالدین محمد بن سام نے شہنشاہوں کے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا، اس کو کیومرس نے اختتام تک پہنچا دیا۔"[38]

حوالاجات

1- برنی، ص۔ 110۔
2 برنی، ص۔ 122، وہ لکھتا ہے "جھگڑے کو تفصیل سے بیان کرنے میں گھریلو راز افشاں ہوں گے۔
3- تاریخ مبارک شاہی، ص۔
4- برنی۔ص۔ 127 اور حاجی دبیر، ii، ص 738 نے اس واقعہ کی تاریخ 1286ء/ 685ھ بتانے میں غلطی کی ہے۔ لیکن امیر خسرو: قران السعدین، ص۔ 27 نے کیقباد کی تاریخ جلوس 686 بتائی ہے تاریخ مبارک شاہی، ص 52 پر نقل کیا گیا ہے، دیکھئے ایلیٹ، iii، ص۔ 525، کیقباد کے اولین سکے مورخہ 686ھ کے لیے دیکھئے رائٹ (WRIGHT)، ص۔ 63 تاہم بلبن کے سکے 685ھ/ 1286ء میں ختم ہوجاتے ہیں۔
5- برنی، ص۔ 128۔
6- ایضاً، ص۔ 130۔ یہ بستی پہلے سے ہی شہری نواح کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی اور ناصرالدین محمود کے دور حکومت میں ہی اسے شہر نو کہا جاتا تھا، ریورٹی، ترجمہ طبقات ناصری، ص۔ 634 کیقباد کے محل کے بیان کے لیے دیکھئے امیر خسرو: ح۔س، ص۔ 44۔ 24۔
7- تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 53 برنی، ص۔ 131۔
8- برنی، ص۔ 168۔
9 برنی، ص ص۔ 135۔ 138۔
10- ایضاً، ص۔ 133۔

11- ایضاً، ص۔ 132۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 53 کا بیان ہے کہ اپنی تخت نشینی کے چھ ماہ بعد سلطان نے اپنے کچھ مسلمان امراء کو گرفتار کرنا چاہا۔ چنانچہ ملتان میں منگولوں پر حاصل کی گئی فتح کا اعلان کرنے کی غرض سے ایک دربار منعقد کیا گیا۔ نظام الدین اپنے خدام کے ساتھ تیار تھا۔ جیسے ہی امیر حاجب، وکیل دار، نائب باربک و سر جاندار اور آخر بک مبارک بادپیش کرنے آئے ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے دو کے علاوہ جنھیں جلاوطن کیا گیا باقی کو سزائے موت دیدی گئی۔

12- برنی، ص 139؛ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 54۔ ابھی تک بغرا کا کوئی سکہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔

13- برنی، ص۔ 140۔

14- قران السعدین، ص 34۔ 35؛ ابن بطوطہ: رحلہ، ii، ص۔ 29؛ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 54۔ طبقات اکبری، i، ص۔ 107 بھی دیکھیے۔

15- قران السعدین کے تلخیص شدہ اڈیشن کے لیے دیکھیے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1860، ص ص۔ 225۔ 238 جہاں پیغامات کے تبادلے کا پورا بیان ہے۔ بغرا نے چھوٹے بیٹے کیکاؤس کو کیقباد کے پاس بطور ضمانت روانہ کیا اور آخرالذکر نے اپنے ننھے بچے کیمرس کو۔ تفصیلی بیان کے لیے دیکھیے، تاریخ مبارک شاہی، ص ص۔ 54۔ 55؛ برنی، ص ص۔ 142۔ 156۔

16- برنی، ص۔ 156؛ قران السعدین، ص ص۔ 154 اور 160۔

17- برنی، ص۔ 164م۔ بہ۔ ابن بطوطہ: رحلہ، ii، ص 29 جو سہواً بیان کرتا ہے کہ اس موقع پر بغرا۔ کیقباد کے ہمراہ دہلی آیا۔

18- تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 55۔

19- برنی، ص۔ 134، ص ص۔ 138۔ 139۔

20- برنی، ص۔ 170؛ اسامی، ص 192۔ 194 پر لکھتا ہے کہ نظام الدین نے ایک بار سلطان کی شراب میں زہر ملا دیا لیکن سلطان کو اس کا پتہ چل گیا اور ملزم کو یہی زہر آلود شراب پی کر مرنا پڑا۔

21- برنی، ص۔ 171؛ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 56 کا بیان ہے کہ وہ فالج اور لقوے

کی مصیبت میں گرفتار تھا: اسامی کی تائید کرتا ہے. ص۔ 194 شعر نمبر 3805۔

22۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 56 اس کا ذکر اس کے ترکی نام فیروز یا غرش خلجی سے کرتا ہے۔ اس غیر مصدقہ روایت کے لیے کہ کس طرح وہ اپنے بھائی فیروز (اسامی اسے شہاب الدین کہتا) کے ساتھ دہلی آیا اور ببیل (BABEL) (؟) کا گورنر مقرر ہوا۔ جہاں سے اس کے دشمنوں کے بھڑکانے پر کیقباد نے حکم دیا کہ اسے زنجیروں میں باندھ کر دہلی لایا جائے۔ راستے میں ایک صوفی نے اسے پر عظمت مستقبل کے لیے مبارک باد دی۔ دہلی آنے پر بادشاہ نے اُسے فوراً ہی نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اسے عریض (ARIZ) کا عہدہ اور عمادالملک کا خطاب بھی دیا۔ دیکھیے اسامی ص۔195۔ 196۔

23۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 56 ؛ برنی، ص۔ 170 اس خطاب کو سیاست خاں بتایا گیا ہے۔

24۔ خلجیوں کی ابتدا کے متعلق جن کے ترکی النسل ہونے پر زمانہ حالی کے تمام مورخ عام طور پر متفق ہیں، دیکھیے ؛ ریورٹی : ترجمہ طبقات ناصری ص۔548 ؛ جرنل دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال 1875 ؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں خلجی پر مقالہ، بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، 1940 ص ص۔ 417۔ 437۔

25۔ حاجی دبیر، ii، ص۔ 750 ؛ برنی، ص۔ 181۔

26۔ فرشتہ، i، ص 88 ؛ برنی، ص۔ 171 نے بہت سی تفصیلات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 59 نے اس واقع کی تاریخ 18 محرم 689ھ/31 جنوری 1250ء دی ہے۔

27۔ تفصیلات کے لیے تاریخ مبارک شاہی، ص۔56، برنی، ص۔ 171۔ 172۔

28۔ تاریخ مبارک شاہی (IDEM) نے اس مقام کا نام جہاں فیروز فوجی معائنہ کر رہا تھا۔ بھکل پہاڑی (BHIKAL PAHARI) بتاتا ہے۔ جب کہ برنی اسے بہارپور کہتا ہے۔ حاجی دبیر، ii، ص۔ 751 اور اسامی، ص۔ 197۔ تاریخ مبارک شاہی کی تائید کرتے ہیں۔

29۔ تاریخ مبارک شاہی، ص۔57۔ 58 کا بیان قدرے مختلف ہے۔ کچھن کو قتل کرنے کے بعد اس نے اپنا گھوڑا کلوکھڑی کی طرف ڈال دیا اور اس پر قبضہ کرنے کے لیے

اپنی فوجیں اکٹھا کرلیں۔ ملک چھجو اور دیگر امراء نے قریب المرگ کیقباد کو محل سے باہر ایک شامیانے میں بٹھا دیا اور کچھ وفادار ہیلیوں کو جمع کر کے فیروز کے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگے۔ چنانچہ اس نے ہمت ہار دی اور کہا کہ وہ صرف کیقباد کو اس کے والد کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ وفادار فوجیوں کے کسی نامعلوم وجہ سے واپس چلے جانے کی وجہ سے فیروز نے اس مقام پر قبضہ کر لیا اور کیقباد کے معصوم بچے کو حرم سے لاکر تخت پر بٹھا دیا۔ روایت ہے کہ کیقباد کی موت کے بعد نہتے حکمراں کا قائم مقام بننے کے لیے ملک چھجو کو پیش کش کی گئی لیکن آخرکار اس نے خود ہی عہدے کو منظور کر لیا۔ کیقباد کو اسی شامیانے میں چھوڑ دیا گیا تھا جہاں دوسرے دن وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے مرگیا۔ اسامی کا بیان ہے کہ کیقبر کی تخت نشینی اس کے والد کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی۔ لیکن روایت ہے کہ خود فیروز نے ہی اسے تخت پر بٹھایا تھا ص ص، 190، 200۔

30- برنی، ص 182 ؛ قدرے مختلف بیان کے لیے دیکھیے تاریخ مبارک شاہی۔ ص ص۔ 199-200۔

31- رائٹ (WRIGHT) ص 66 نمبر 279 راجرس: لاہور میوزیم کٹیلاگ، ص 84 نمبر۔ 4 براؤن؛ کوائنس آف انڈیا، ص۔ 71۔ ان سب پر 689ھ/1290ء کی تاریخ ہے۔

32- تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 61۔

33- برنی، ص۔ 173 ؛ تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 59 حاجی دبیر، ii، ص۔ 752۔

34- برنی، ص۔ 173- اس واقعے سے متعلق تاریخ مبارک شاہی کے بیان کے لیے مذکورہ بالا نوٹ دیکھیے۔ اس بیان کو اسامی، ص۔ 200 کی تائید حاصل ہے۔

35 تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 60۔ 61 کا بیان ہے کہ تین ماہ بعد سرخا کی سرکردگی میں ترکی امراء نے ایک بار پھر خلجی قائم مقام سے چھٹکارا پانے اور سلطنت کو اس کے چنگل سے آزاد کرنے کے لیے سازش کی۔ فیروز کو اس کا اندازہ ہو گیا ایک فوج بادشاہ کو گرفتار کرنے کے لیے کلوکھڑی روانہ کی۔ سرخا کی پارٹی نے مدافعت کی لیکن انھیں شکست ہوئی اور خود سرخا بھی مارا گیا۔ اس کے بعد فیروز محل میں آیا بادشاہ کو

قید میں ڈال دیا اور خود ربیع الثانی 689ھ کو تخت پر بیٹھ گیا۔ نوعمر بادشاہ قید میں ہی وفات پا گیا۔ اس بیان کو کسی حد تک اسامی کی تائید حاصل ہے۔ ص ص ۔ 201۔ 203 کیمرس کی وفات کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی حکومت تاریخ مبارک شاہی کے مطابق 18 محرم 689ھ/ 31 جنوری 1290 سے ربیع الثانی 689/ مئی 1290ء تک رہی۔

36- برنی نے 688ھ/ 1289ء کی تاریخ دی ہے، ص۔ 175 حاجی دبیر، iii، ص۔ 753 نے اس واقعہ کی صحیح تاریخ بتائی ہے جو 689ھ/ 1290ء ہے۔ جسے علم مسکوکات کی تائید حاصل ہے۔ فیروز کا اولین سکہ پر جو سونے کا ہے اور جسے غالباً اس موقع پر جاری کیا گیا ہوگا 689ھ کی تاریخ ہے۔ رائٹ (WRIGHT)، ص۔ 83 نمبر 280۔

37- برنی، ص۔ 173 اور 176- 177-

38- ح۔ س، ii، ص۔ 752-

نواں باب

مغربی سرحد اور بیرونی حملے

شمالی ہند کے دفاع کے مسئلے کو قدرتی سرحدوں نے بڑی حد تک کم کر دیا ہے اگر ہم بحر عرب کے ساحلی علاقے اور خلیج بنگال کو الگ کر دیں تو پھر صرف شمال مغربی حصہ غیر محفوظ رہ جاتا ہے [1] قدیم زمانے سے بیرونی طاقتیں اسی شمال مغربی راستے سے داخل ہوتی رہی ہیں۔ کیوں کہ یہ راستے موزوں مقامات تک پہنچاتے تھے جہاں سے زرخیز میدانی علاقوں کو فتح کیا جا سکتا تھا۔ پہاڑی سلسلوں کی مخصوص ہیئت کی وجہ سے اس درّے کے موثر دفاع کے لیے اس علاقے کو مکمّل طور پر فوجی کنٹرول میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے یہ علاقہ کابل سے غزنی ہوتا ہوا قندھار تک پھیلا ہوا ہے۔ [2] باقاعدہ بنی ہوئی ہندوستان کی یہ قدرتی سرحد، پنجاب کے دریاؤں کی زرخیز وادی کی طرف آنے والے راستوں کی نگہبانی کرتی ہے۔ جنوبی دروازوں سے داخل ہونے والے راستے بولان اور لاس بیلا کے علاقوں سے ہوتے ہوئے ہندوستانی صحرا کی طرف آتے ہیں اور یہ ہماری ”دوسری دفاعی لائین“ ہے [3] کابل، غزنی، قندھار کا سلسلہ ہندوکش سے گھرا ہوا ہے اور اس پر صرف فوجی نہیں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی کنٹرول ضروری ہے کیوں کہ اس زمانے میں ہندوستان کے بیرونی فاتحین مرکزی ایشیا سے کمک حاصل کرنے پر مجبور تھے۔ سرحدی مسئلہ کا ایک پہلو ان سرکش پہاڑی قبائل کو کنٹرول کرنا تھا جو کشمیر سے لے کر سمندری ساحل تک پھیلے ہوئے وسیع پہاڑی سلسلے میں آباد تھے اور تمام خاص راستے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ سندھ ساگر دوآب کے شمالی

نصف میں، سالٹ رینج (کوہ جود) کے گرد، ابتدائی قرون وسطہ میں متعدد جنگجو اور غیر قانونی قبائل آباد تھے۔ مثلاً کھوکھر، ادان اور جنجوہا 3 الف۔ جہلم اور چناب کی وادیوں میں ان قبائل کی غیر یقینی سیاست اور وقتاً فوقتاً کی جانے والی لوٹ مار نے اس مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دیا تھا۔

ہندوستان کے مغل سلاطین کی اہم توسیعی پالیسی کابل، غزنی اور قندھار تک پیش قدمی کرنا تھی۔ اسی طرح تیرھویں صدی میں نئے آنے والے ترکوں کے لیے اپنے ملک سے خبر رسانی کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے اس لائن پر قبضہ رکھنا اشد ضروری تھا۔ غور سلطنت جب تک افغانستان میں قدم جمانے کے لائق رہی، دہلی محفوظ رہا اور خبر رسانی کے ذرائع میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوئی۔ لیکن غور مملکت میں شامل ہونے میں اس پر وسطی ایشیا کی مسلسل بدلتی ہوئی سیاسی طاقتوں کا اثر پڑنے لگا۔ اس سے پہلے ایک باب میں ہم ایبک کی اس شدید تشویش کا ذکر کر چکے ہیں جس سے اُسے معزالدین کی موت کے بعد دوچار ہونا پڑا تھا۔ اسی باب میں ہم ایبک کی ان کوششوں کا ذکر بھی کر چکے ہیں جو اس نے دہلی کو وسطی ایشیا کی کشمکش سے الگ کرنے کے سلسلے میں کیں تھیں۔ خوارزم شاہ کی مملکت میں غزنی کی شمولیت سے جس کی مشرقی سرحد سندھ سے ملتی تھی، دہلی کے تحفظ کو براہ راست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد منگولوں نے ایشیا کے سارے نقشے کو بدل دیا۔ منگولوں نے غزنی پشاور اور افغانستان کے کئی دوسرے مقامات پر اپنی چوکیاں بنا کر سندھ کی سیاسی سرحد کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اس لیے دہلی کے نظم ونسق کی سرحد پیچھے ہٹ کر اس جگہ آ گئی تھی جسے آج ہم پنجاب کہتے ہیں۔ اسی صدی کے باقی ماندہ حصے میں مملوک محض مدافعتی رویہ رکھنے پر مجبور رہے اور اس سمت میں ان کی آئندہ پالیسی کا واحد مقصد وادی چناب پر کنٹرول حاصل کرنا تھا نہ کہ ہندوستان کی مذکورہ "باقاعدہ" سرحد تک پہنچنا۔ وادی سندھ "ہند اور سندھ" کی محض تہذیبی سرحد کے طور پر قائم رہی۔ اور دریا کا مشرقی راستہ ایک ایسا علاقہ ہو کر رہ گیا تھا جو کسی کا نہ ہو۔

اس کتاب میں ہم کسی اور جگہ لکھ چکے ہیں کہ ابتدائی فتوحات کے زمانے میں دہلی

کے انتہائی مغربی صوبے لاہور اور ملتان تھے۔ دریائے چناب کسی حد تک سرحدی لکیر کا کام دیتا تھا اور اس کے اندر سیالکوٹ کا محافظ قلعہ تھا جسے معزالدین نے مرمت کرکے فوجی حفاظتی اڈے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سالٹ رینج میں بسنے والے کھوکروں اور دوسرے قبائلی لوگوں کے خلاف کیے جانے والا اس کا معرکہ دراصل جہلم کے پار کی بے ضابطہ زمین کو کم کرنے کی پہلی کوشش تھی جس کے بعد میں یلدز نے دو دفعہ 6 ھ/ 612ء اور اس کے بعد 612 ھ میں حملہ کرکے حاصل کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں جو مواد ہمیں مل سکا ہے بدقسمتی سے، اس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ان حملوں کا انتظامی سرحد پر کیا اثر پڑا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ یلدز نے پنجاب کو اپنے مال غنیمت کا ایک حصّہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ غزنی کے دور حکومت میں اس نے لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے کئی موقعوں پر فوجیں بھیجی تھیں۔[۵] شہر پر قبضہ کرنے کے لیے نہ صرف یلدز اور قباچہ نے جنگ کی تھی بلکہ التتمش نے بھی اس کا مقابلہ کیا تھا۔ آخرالذکر کے مقابلے میں یلدز کو شکست ہوئی تھی اور وہ مارا گیا تھا۔[۶] دریائے راوی کی جائے وقوع ایسی ہے کہ جنوب کی طرف سے ملتان کی طرف بڑھنے والی حملہ آور فوج کے ایک حصّے کو لاہور سے کاٹا جا سکتا ہے۔ سندھ ساگر دوآب کی طرف بڑھنے کے لیے بھی اس جگہ پر قبضہ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بات ٹھیک ٹھیک بتانا مشکل ہے کہ 1217ء میں لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد التتمش نے اس سلسلے میں کیا کیا قدم اُٹھائے ہوں گے۔ اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اس نے وادی سندھ تک پیش قدمی کرنے کی نیت ضرور تھی۔ غالباً لاہور پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد سالٹ رینج میں کوجاں (KUJAH) اور نندانا (NANDANAH) کو جسے منہاج نے سرحد بتایا ہے مُلک ایتگن کے سپرد کر دیا گیا تھا۔[۷] التتمش کی فتوحات میں ان جگہوں اور سیالکوٹ کی شمولیت سے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ ان جگہوں کو حاصل کرنے کے لیے مجتمع کاروائی کی گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان محافظ فوجی قلعوں سے پہاڑی قبائل کے خلاف کی جانے والی کاروائیوں کے لیے اڈوں کا کام لیا جاتا تھا۔

سندھ کی طرف بتدریج پیش قدمی یہ کاروائی منگول حملوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے سیاسی تغیر نے منقطع کر دی تھی۔ 1220ء/ 617ھ میں خوارزمی مملکت نیست و

نابود ہو چکی تھی۔ جیکسارٹس (JAXARTES) سے لے کر کیسپین سی (CASPAIN SEA) تک اور غزنی سے لے کر عراق تک، چنگیز نے تمام خوشحال شہروں اور علم و ادب کے مراکز کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کو پناہ کی تلاش میں شمالی صوبوں کے پار بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور بالآخر کیسپین کے ایک جزیرے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔[۸] اس کا ولی عہد شہزادہ منگ برنی جب خراسان سے نکالا گیا تو وہ جنوب کی طرف بھاگ کر غزنی پہنچ گیا تھا۔ راستے میں اُس نے برون کے مقام پر پیچھا کرتے ہوئے منگولوں پر بڑی شاندار فتح حاصل کی تھی۔ لیکن جب تلکان (TALKAN) سے چنگیز خود اس کے مقابلے کے لیے نکلا تو وہ غزنی سے بھاگ کر ہندوستانی سرحد کے راستے پر ہو لیا۔ مگر اس کو سندھ پر گھیر لیا گیا جہاں اُسے جان پر کھیل کر لڑنے پر مجبور ہونا پڑا حالانکہ اس عظیم منگول نے جنگ میں اس کی ہمت اور جانبازی کی داد دی لیکن اس کی مختصر فوج پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ منگولوں نے جب فرار کے سارے راستے بند کر دیئے تو منگ برنی نے اپنے خاندان کو جلدی سے ایک کشتی میں بٹھا کر دریائے سندھ میں روانہ کر دیا جہاں وہ بالآخر ڈوب گئے اور وہ خود گھوڑے کے ساتھ دریا میں کود کر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

اس بات پر ابھی تک قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ 1216ء میں منگولوں نے اپنی یلغار ہندوستان کے کس حصے سے شروع کی تھی۔[۹] تاہم یہ بات یقینی ہے کہ یہ علاقہ سالٹ رینج سے زیادہ دور نہیں ہو گا۔ جہاں سے بیشتر ابتدائی مورخین کے مطابق منگ برنی سندھ ساگر دوآب میں داخل ہوا تھا۔ یہ دہلی کی خوش قسمتی تھی کہ چنگیز نے دریا کے پار اس کا پیچھا کرنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ اِغرکی (IGHRAKI) قبائل کو ختم کرنے میں لگ گیا جو دریائے کابل کے شمالی حصے میں آباد تھے اور جنھوں نے خوارزمی فوجی طاقت کے لیے فوجی امداد فراہم کی تھی۔[۱۰] اُس کے بیٹے تُلی اور چغتائی کو خراسان، کرمان اور غزنی کو مطیع کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔[۱۱] چنگیز تقریباً تین مہینے تک سندھ کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ہندوستان کے راستے لکھنوتی اور کامروذ ہوتے ہوئے قراچل (DARACHAL) کے پہاڑوں کی طرف سے قراقرم جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔[۱۲] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس نے التتمش سے

ضروری اجازت حاصل کرنے کے لیے اپنے سفیروں کو دہلی بھیجا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا دہلی کا سلطان منگولوں کو موثر طور پر آگے بڑھنے سے روک سکتا تھا۔ باوجود یکہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ بات بہت حد تک مشکوک بھی ہے۔ چنگیز کا دہلی کی خود مختاری کو تسلیم کرنا اور 1222ء کے سرما میں ہندوکش کی طرف سے واپس جانا اس کے اعتدال اور بین الاقوامی اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی اچھی مثال ہے۔[14]

چنگیز نے اس موقع پر ہندوستان کو چھوڑ دیا لیکن منگ برنی نے سندھ پار کر کے علاقے پر متواتر حملے کیے۔ اس نے دریا پار کرنے والے اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ڈاکوؤں کی ایک جماعت پر رات کو حملہ کر کے ان کے ہتھیار چھین لیے۔ اس کے بعد سالٹ رینج کے سردار کی بھیجی ہوئی پانچ ہزار ہندوؤں پر مشتمل فوج کو شکست دی۔[15] اس فتح کی خبر جب چنگیز کو ملی تو اس نے جیسے ہی دریائے سندھ پار کیا منگ برنی نے اس سے بچنے کے لیے جنوب کی طرف لاہور بھاگا۔ منگول غالباً دہلی سے دشمنی مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے انھوں نے پنجاب میں اس کا پیچھا کیا۔ اس کی جگہ انھوں نے سالٹ رینج کے علاقے میں ملک پور کے فوجی قلعہ کو تاخت و تاراج کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔[16] منگ برنی دہلی کی طرف تین منزل آگے بڑھ گیا اور پھر وہاں سے اس نے عین الملک کو پناہ کی درخواست لے کر دہلی روانہ کیا۔ درخواست کو ملک کی ناموافق آب و ہوا کی بنیاد پر کھلم کھلا طور پر مسترد کر دیا۔[17] بلکہ دہلی اس کا طاقتور دشمن بن گیا۔ چنانچہ منگ برنی اپنی پناہ گاہ کی طرف مڑ گیا۔ اس عرصے میں منگول واپس جا چکے تھے۔ چنانچہ اس نے کھوکر کے علاقے کو تباہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کر دی۔ اس مہم میں اُسے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں نہ صرف کھوکر سردار کو شکست ہوئی بلکہ اُسے اپنی لڑکی سے اُس کی شادی بھی کرنا پڑی یہاں تک کہ اس نے فوجی امداد بھی فراہم کی۔[18]

اس رشتے نے مفرور کو بہت زیادہ طاقت ور بنا دیا۔ اب اس نے قباچہ کی قیمت پر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مستحکم کرنا چاہا۔ قباچہ سلطنت، شمال میں ضلع میانوالی اور نندانہ تک پہنچتی تھی۔[19] اُس کے اور کھوکر کے درمیان پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی اس سے فائدہ اُٹھا کر منگ برنی نے اُس کے شمالی اضلاع پر حملہ کر دیا۔ اُس نے

کلر کوٹ پر قبضہ کرکے اور اُس کے قریبی قلعہ کو تباہ کرکے اپنی جارحانہ کاروائی کی ابتدا کی۔ قباچہ جنگ کی تیاری کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی کاروائی شروع کرتا۔ خوارزمی جنرل ازبک پائی نے اُوچھ کے مقام پر شب خون مار کر اس کے پیر اکھاڑ دیئے۔[20] قباچہ ملتان کی طرف بھاگ گیا لیکن جب منگ برنی نے تاوان مانگا اور اپنی بیوی کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا جس نے اس کے دربار میں پناہ لی تھی تو اُسے فوراً تکمیل کرنا پڑی۔[21] تاہم مفرور کا ہندوستان میں قیام اختتام پر آ گیا تھا۔ جب وہ سالٹ رینج میں موسم گرما گزارنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اُسے اپنے تعاقب میں ایک اور منگول فوج کی خبر ملی۔ یہ خبر سنتے ہی وہ جنوب کی طرف مڑنے پر مجبور ہو گیا۔[22] ملتان سے گزرتے ہوئے اس نے روپیوں کا مطالعہ کیا لیکن اب قباچہ کو مفرور کی مشکلات کا علم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے امداد دینے سے انکار کر دیا اور جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا۔ چوں کہ منگول اس کا تعاقب کر رہے تھے اس لیے جنگ لڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی وہ اُچھ کی طرف چل پڑا لیکن وہاں بھی اس کو اسی قسم کا جارحانہ استقبال ملا۔ چنانچہ شہر کو آگ لگا کر وہ سہوان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں اس نے قباچہ کے گورنر فخر الدین سلاری کو شہر حوالے کرنے پر مجبور کر دیا۔ سہوان میں ایک مہینے قیام کے بعد اس نے دیبل پر حملہ کرکے وہاں کے فرماں روا کو بھگا دیا۔[23] اس کے بعد اس نے ایک مہم گجرات (انھل واڑہ) روانہ کی جہاں اُسے کچھ مال غنیمت ہاتھ لگا۔[24] لیکن اس دوران خبر ملی کہ منگول ملتان کے قریب پہنچنے والے ہیں دوسری طرف قباچہ کی جارحانہ کاروائی نے کھوکر ساتھیوں سے اس کے تعلق کو منقطع کر دیا۔ اس موقعہ پر یہ خبر آئی کہ اس کا بھائی غیاث الدین عراق میں بہت غیر مقبول ہو گیا ہے عوام اور فوج خود اس کی فرماں روائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ منگ برنی نے آئندہ اقدامات کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے حمایتیوں کی کاونسل طلب کی۔ حسن قرلغ۔ ازبیک پائی کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے دہلی کے شہنشاہ سے مل کر منگولوں کے خلاف محاذ کھولنے کا مشورہ دیا۔ لیکن عراق پر حکومت کرنے کا خیال اس کے ذہن پر حاوی ہو چکا تھا۔[25] حسن قرلغ کو افغانستان میں اور ازبیک پائی کو سندھ میں اپنا نمائندہ بنا کر منگ برنی بالآخر 1224ء/ 621ھ میں مکران کے راستے ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا۔[26]

مغربی پنجاب اور سندھ میں اس کے تین سالہ عارضی قیام کا اثر دہلی کی سرحدی تنظیم کے کاموں پر غیر معمولی دباؤ کی صورت میں پڑا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ سندھ تو اب جغرافیائی سرحد بھی نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ سندھ کے پار کے علاقے اب غزنی کا ایک حصہ بن چکے تھے جہاں خوارزمی افسروں کے تعاقب کے سلسلہ میں منگولوں نے اپنی کارروائی پھیلادی تھیں۔ سندھ کے نچلے علاقے سے منگ برنی کی روانگی میں پہلے ہی ترتائی (TARTAI) کی قیادت میں منگول فوج وہاں پہنچ چکی تھی۔ غالباً حسن قرلغ کے افسروں سے نندانا چھین کر ترتائی ملتان کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ابھی حال ہی میں قباچہ نے پناہ لی تھی۔ شہر کا پوری طرح محاصرہ ہوچکا تھا اور شہر پر قبضہ ہونے ہی والا تھا کہ گرمی کی شدّت نے عین موقع پر اُسے محاصرہ اُٹھالینے پر مجبور کر دیا۔[27] واپس لوٹتے ہوئے اس نے لاہور اور ملتان کے علاقوں کو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیا۔ اس بات کا کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے نندانہ کے قلعہ پر اپنی حفاظتی فوج مستقل طور پر رکھ دی تھی یا اس علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1226ء/ 623ء میں خلجی قبائل کی ایک بہت بڑی فوج نے سیہوان پر حملہ کیا۔ یہ خوارزمی فوج کے باقی ماندہ لوگ تھے جنھیں منگولوں نے ان کے وطن گرم سیر سے بھگا دیا تھا۔ لیکن قباچہ ان کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہوگیا۔[28]

ان متواتر حملوں کی وجہ سے شمالی مغربی سرحد کا علاقہ انتہائی افراتفری میں مبتلا ہوچکا تھا۔ شمال میں سالٹ رینج کے قبائل کے حوصلے اپنے حریفوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بڑھ چکے تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف دوآب کے سارے شمالی حصّے پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ وہ مشرق کی طرف اور آگے بڑھ کر بیاس کے پار تک پہنچ گئے تھے۔[29] جہاں سے وہ لاہور پر دباؤ ڈال رہے تھے اور موقعہ ملتے ہی اُنھوں نے لاہور کو تباہ کر دیا تھا۔ مغربی سندھ کا علاقہ جسے ہم عصر مورّخین بنیان کہتے تھے۔[30] حسن قرلغ کی سلطنت کا ایک حصّہ تھا جو اپنے آقا کے غزنی کے مال غنیمت کے جتنے حصّے کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔ بڑے جوکھم سے اپنے قبضے میں رکھے تھا۔ جنوب میں قباچہ کا علاقہ تھا جس کے سرحدی اضلاع مثلاً سیہوان اور دیبل بہت تیزی سے اس کی گرفت سے نکلتے جارہے تھے۔ اور ان سب کے درمیان ازبیک پائی (UZBEK PAI) تھا

جو 1229ء / 627ھ تک سندھ ساگر دوآب پنجاب اور غالباً ملتان میں بدستور جما ہوا تھا۔[31]

التتمش نے جب 1228ء میں قباچہ کی ریاستوں کو ہڑپ کیا تو دہلی کی حکومت منگول کارروائیوں سے براہ راست سابقہ پڑا۔ منگول اپنی یہ کارروائیاں اس جگہ سے کر رہے تھے جسے اب جدید افغانستان کہا جاتا ہے۔ آخری خوارزمی سردار قطب الدین حسن[32] کے غور سے نکالے جانے کے بعد وادی سندھ پر دباؤ کی شدت ناگزیر ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ حسن قرلغ جیسے شخص کو بھی اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے 1230ء / 628ھ میں دشمن کی بروقت اطاعت تسلیم کرنا پڑی تھی۔[33] سندھ میں ازبیک پائی کا مسلسل سیاسی وجود منگولوں کو اپنی طرف بلانے کے لیے ایک مستقل دعوت نامہ تھا۔ جیسا کہ نسادی نے لکھا ہے۔[34] 1229ء میں التتمش اور اس کے ساتھی حسن قرلغ کی مشترکہ کوششوں سے اس کے اخراج کے بعد بھی صورت حال میں کوئی بہتری نہیں ہوئی تھی کیوں کہ اُچھ اور ملتان پر قبضہ کرنے کے بعد التتمش منگولوں کا پڑوسی بن گیا تھا۔[35]

منگول قرل تائی (QURIL TAI) جو 1229ء میں اکتائی خاں کی تاجپوشی کے لیے طلب کیا گیا تھا، اس نے خراسان اور افغانستان کو دوبارہ فتح کر کے اس کے ایک حصے کے الحاق کا فیصلہ کیا۔[36] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی سے متصل علاقوں پر تازہ حملوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ 1235ء / 633ھ میں مغربی افغانستان میں سستان کی قلمرو کو منگولوں کی فرماں روائی تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔[37] ہلمند کے اس پار بلوچستان کے راستے منگول گھوڑ سواروں کی کارروائیاں بالائی سندھ میں لے جانے والی — ڈیراجات (DERAJAT) وادی میں بہت زیادہ ہوگئیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک منگول فوج نے شمالی افغانستان[38] میں گھس کر بالائی سندھ میں کارروائی شروع کر دی۔ اس علاقہ میں اُن کی کارروائیوں کی تفصیلات کا اندراج کہیں نہیں ملتا لیکن اس سلسلے میں بنیان کی طرف کیے جانے والے التتمش کے آخری معرکہ کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا مقصد قرلغ سردار کی اُس معاہدہ کے تحت مدد کرنا تھا جو ازبیک پائی کے خلاف تعاون کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔

منگولوں کے اس نئے دباؤ کی وجہ سے بنیان میں حسن کی صورت حال بہت غیر مستحکم ہو گئی تھی اس لیے اُس نے سندھ کے مشرقی اضلاع میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ 1236ء/ 634ھ میں جب کہ فیروز کے عہد حکومت میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ اس نے زیرین سندھ سے اپنی پہلی کوشش کا آغاز کیا۔ اس نے اچھ پر حملہ کیا لیکن شدید نقصان اُٹھا کر اُسے پسپا ہونا پڑا۔[39] لیکن بہت جلد اُسے مجبور ہو کر دوبارہ سندھ پار کرنا پڑا کیوں کہ 1238ء/ 636ھ میں منگولوں نے اس کے علاقے کا الحاق کر کے اُسے بھگا کر پنجاب میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اس نے التتمش سے اپنی دوستی کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی اور اس دوستانہ تعلق کو اس نے منگولوں کے خلاف ایک مکمل محاذ کی صورت میں ڈھالنا چاہا۔ اس کے بیٹے نے رضیہ کے دربار میں حاضری دی جس نے حسب مراتب تعظیم و تکریم دینے کے باوجود مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے منگولوں سے دشمنی مول لینے پر رضامندی نہیں ظاہر کی۔ برن سے، جسے رضیہ نے شہزادے کے اخراجات کے سلسلے میں بخش دیا تھا، اور جہاں غالباً رضیہ نے اسے نظر بند کر دیا تھا، مایوس قرلغ شہزادہ چپکے سے بھاگ کر اپنے باپ سے دوبارہ جا ملا جہاں اس نے اپنے مرحوم آقا کے کھوکھر ساتھیوں کے ساتھ عارضی طور پر پناہ لے رکھی تھی[40]۔ ایسا لگتا ہے کہ رضیہ کے اس رویہ سے منگول خوش ہو گئے تھے کیوں کہ غالباً چنگیز خاں کی خوارزم شاہ سے جنگ میں اس کے باپ کی غیر جانبداری کی وجہ سے منگولوں نے رضیہ کی سرحدوں کا احترام کیا اور باغی کبیر خاں کی مدد کرنے سے بھی گریز کیا۔ آخر الذکر کی کارروائیوں کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی جانب اپنے فرار کے دوران اُسے رُکنا پڑا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سرحد سدھارا (چناب) کی تھی جس کے آگے جانے سے منگولوں نے اُسے روک دیا تھا۔

بہرام کے دور حکومت میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا نتیجہ اس لائن کے مزید کھنچاؤ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ رضیہ کی معزولی کے بعد منگولوں نے سمجھا کہ دہلی سے جو حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا تھا وہ منسوخ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے بالآخر ہندوستان کو بھی اپنے فتوحات کے منصوبے میں شامل کر لیا۔ 1241ء/ 639ھ میں ہرات، غور، غزنی اور تخارستان کی منگول فوجوں کا کمانڈر بہادر تائر سندھ پار کر کے پہلی دفعہ

لاہور پہنچا۔ شہر محاصرہ کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اور وہاں کے باشندوں نے اس خطرہ کی طرف سے تباہ کن بے تعلقی برتی۔ دہلی سے فوری امداد کی درخواست کے باوجود وزیر کی سازش نے کمک کو دوسری طرف منتقل کر دیا چنانچہ صوبے دار ملک قراقاش کو شہر چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ دفاعی نظام ٹوٹنے پر بالآخر شہری جاگ اٹھے اور انھوں نے جم کر گلی کوچوں میں مقابلہ کیا لیکن شہر پر قبضے کو بس کچھ دنوں تک روکنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے[41] تاہم حملہ آوروں نے لاہور کو حفاظتی قلعہ نہیں بنایا۔ لیکن دہلی کی طرف پیش قدمی کا راستہ کھولنے کے لیے انھوں نے شہر کی آبادی ختم کر کے دفاعی نظام کو برباد کر دیا۔ ان کی واپسی کے بعد باقی ماندہ شہر پر کھوکھر قبیلوں نے ہلّہ بولا اور تقریباً سارے شہر پر چھا گئے۔ قراقراش ان کو بھگانے میں کامیاب ہوا۔ کہتے ہیں کہ نئے بادشاہ مسعود کے تحت لاہور کا اقطع ازبیک۔ طغرل خاں کے زیر انتظام تھا[42] لیکن سارا شہر غیر آباد رہا اور بلبن کی تخت نشینی کے بعد شہر کو دوبارہ تعمیر کر کے نئے سرے سے بسانا پڑا۔ مسعود کے دور حکومت سے یہ ضلع "سرحد" بن گیا تھا جس کی اندرونی لائن تقریباً راوی کے ساتھ ساتھ تھی۔ قراقاش کی درخواست پر بالآخر جو فوج بھیجی گئی وہ لاہور کی طرف "سرحدوں کی حفاظت" کے لیے روانہ کی گئی تھی[43]

منگولوں کی جارحانہ کاروائیوں سے سندھ پر دہلی کی گرفت بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی۔ حسن قرلغ نے جسے اب ایک محفوظ پناہ گاہ کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی ملتان پر حملوں کا آغاز کر دیا۔ اس شہر پر کبیر خاں کا قبضہ تھا۔ جس نے مسعود کے خلاف اعلان بغاوت کر کے اُچھ پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا[44] کئی برسوں کے بعد حسن کو 1245ء / 643ھ میں ملتان کو چھین لینے میں کامیابی حاصل ہوئی۔[45] اس طرح اُچھ پر کبیر خاں کے قبضہ کرتے سے پورا سندھ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ تاہم اگلے سال منگول حملے کی وجہ سے مسعود کی حکومت کو خلاف توقع صوبے پر دوبارہ قبضہ کرنے میں جزوی کامیابی ہوئی۔ افغانستان میں فوجوں کی سربراہی کرنے کے لیے اب بہادر تائر کی جگہ منگوتہ نے لی۔ حالات کے تسلسل پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حسن قرلغ کو سندھ سے بھگانے کے لیے اس نے سندھ پار کر لیا تھا۔ آخرالذکر فوراً ملتان چھوڑ کر پنج ناد (PANJ NAD) سے سیوان ہوتا ہوا زیریں

سندھ بھاگ گیا[46] اب منگولوں نے جن کی رہبری سالٹ رینج کا سردار جسپال سہرا کر رہا تھا۔ اپنی توجہ اُچھ کی طرف منعطف کر دی جیسے کبیر خاں خالی کر چکا تھا۔ شہریوں نے نہ صرف بڑی بہادری سے مقابلہ کیا بلکہ کئی دفعہ محاصرہ کرنے والوں کو پسپا بھی کیا لیکن بالآخر جب اُن کو احساس ہوا کہ مدافعت کو اکیلے جاری رکھنا مشکل ہے تو اُنھوں نے دہلی سے کمک بھیجنے کی درخواست کی۔ نائب اُلغ خاں (بلبن) اس موقعہ سے فوراً فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک مضبوط اور طاقتور فوج کی رہبری کرتا ہوا مدد کے لیے پہنچ گیا۔ بیاس کے شمالی کنارے کی طرف دشمن کی فوج کے ایک پہلو پر حملے کرنے کا طریقہ اختیار کر کے اس نے منگولوں کے بالائی سندھ ساگر دوآب سے واپس جانے والے راستے کو منقطع کر دینے کی دھمکی دی[47]۔ اس خطرے کا احساس ہوتے ہی اور پھر دہلی سے بھیجی جانے والی فوج کی کثیر تعداد کی خبر سن کر منگولوں نے محاصرہ اُٹھا لیا اور بے شمار قیدیوں کو چھوڑ کر سندھ کے پار چلے گئے۔

الغ خاں کو اُچھ اور ملتان پر قبضہ کرنے کے لیے کسی مقابلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا دونوں شہروں کو کشلو خاں کے سپرد کر کے[48] وہ پہاڑی قبائل کو جنھوں نے لاہور کو لوٹا تھا اور منگولوں کی مدد کی تھی سزا دینے کے خیال سے شمال کی طرف اپنی فوجیں لے کر چل کھڑا ہوا۔ تاہم اس کارروائی کو ملتوی کرنا پڑا کیوں کہ دہلی میں ایک ایسی سیاسی تحریک شروع ہو گئی تھی جس کا مقصد مسعود کو تخت سے اتارنا تھا۔ جس کے لیے اُلغ کی فوری واپسی ضروری ہو گئی تھی۔

اُلغ خاں کی کوششوں کے باوجود مغرب کی صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ اگلے سال پھر ایک منگول حملے کا سامنا کرنا پڑا جس کی قیادت نوئن، سالی بہادر (NUIN, SALI BAHADUR) کر رہا تھا۔ اس طرح ایک دفعہ پھر دہلی کے اقتدار کو سندھ میں شکست کھانا پڑی تھی۔ حملہ آور ملتان کی طرف چل پڑے جہاں ایک نزدیکی محاصرے نے وہاں کے نائب صوبے دار چنگیز خاں کو صلح کے مذاکرات کے لیے مجبور کر دیا۔ ہرات کا غلام فرماں روا شمس الدین کرت اس موقعہ پر منگولوں کے ساتھ تھا۔ اُس سے گفت و شنید کے لیے صوفی بہاء الدین ذکریا کو شمس الدین کے پاس بھیجا گیا تاکہ وہ محاصرہ کیے ہوئے شہر کے لیے سفارش کر کے اور تاوان کے طور پر ایک لاکھ دینار کی

پیش کش کی گئی[49] شرائط کو منظور کر لینے کے بعد سالی محاصرہ اُٹھا کر لاہور کی طرف فوج لے کر روانہ ہو گیا جہاں کے صوبے دار کو اسی طرح خریدنے کے لیے اسی قسم کا تاوان ادا کرنا پڑا۔ بلکہ وہ منگولوں کا باج گذار اطاعت گزار بننے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔[50] محمود کی تخت نشینی کے بعد اُلغ خاں دہلی میں غالباً سیاسی تصفیوں میں اتنا معروف رہا کہ متاثرہ علاقوں میں فوری طور پر کوئی کمک نہ بھیج سکا۔ اسی سال کے آخر میں اس کی مہم کو منگول حملے سے مکمل طور پر غیر متعلق نہیں کہا جا سکتا۔ حالاں کہ بظاہر اس مہم کا مقصد سالٹ رینج کے راناجسپال سہرا کے خلاف کارروائی شروع کرنے کا منصوبہ تھا۔[51] چناب پہنچنے کے بعد اس نے پہاڑوں میں گھس کر قبائلیوں کو بے حد و حساب نقصان پہنچایا اور "نندانا کے قرب و جوار" تک سارے علاقے کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اگر نندانا کے ذکر کا مطلب فوجی قلعہ کو واپس لینے کی کوشش سے ہے تو وہ یقیناً ناکام ثابت ہوئی ہو گی کیوں کہ اس موقعہ پر دہلی کی افواج اگرچہ سندھ تک پہنچ گئی تھی لیکن اُن کی فوجی کارروائیاں جہلم سے متصل مشرقی اضلاع تک محدود رہی تھیں۔ اُس کے آگے منگول تھے جو "جہلم کی کشتیوں سے اُلغ خاں کی مسلمان چوکیوں کا مشاہدہ کر رہے تھے، اُن کے دلوں میں دہشت بیٹھ گئی"۔[52] چناب کے پار اس کامیاب پیش قدمی کے باوجود راوی کے پار کا راستہ تمام عملی مقاصد کے لیے نہ صرف بے کار ہو چکا تھا بلکہ منگولوں کے احاطہ اثر میں آ چکا تھا۔

شمس الدین کا جانشین، ہرات کا رکن الدین کرت دریائے سندھ تک پھیلے ہوئے علاقوں پر فرماں روائی کر رہا تھا۔ بلکہ کہتے ہیں کہ وہ تمام شاہراہیں بھی اس کے قبضہ میں تھیں جو "دہلی کی سرحد تک پہنچتی تھیں۔"[53] اس کے بعد "طبقات ناصری" کے اوراق میں جب 1254ء/ 652ھ کے تحت لاہور کا ذکر آیا ہے تو اُسے منگولوں کے ماتحت لکھا گیا ہے۔

سندھ میں محمود کے اقتدار کو جو دھکا لگا تھا وہ بدستور تھا۔ 1254ء/652ھ کے فوراً بعد حسن قرلغ ایک دفعہ پھر ملتان کی دیواروں کے سامنے نمودار ہوا۔ چنانچہ اچھ کو بچانے کے لیے کشلو خاں کو دوڑ کر تیزی سے وہاں پہنچنا پڑا۔ محاصرہ کی کارروائی میں قرلغ سردار مارا گیا لیکن اس کی فوجوں کو شہر پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔[54] کشلو کی اس علاقہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی بے نتیجہ کوششوں تک ملتان قرلغ کے قبضے میں رہا۔

بالآخر دہلی کی ہدایات کے مطابق اس کو بھٹنڈا کے صوبے دار شیر خاں نے حاصل کر لیا۔[55] بعد میں اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کشلو کی کوششوں کو نہ صرف ناکام کر دیا گیا بلکہ 1250ء/ 648ھ میں شیر خاں نے اسے اُچھ سے بھی نکال دیا۔[56] ان اضلاع کے دہلی سے دوبارہ الحاق کی خوشی میں، ملتان کے نائب صوبے دار کے بھیجے ہوئے منگول قیدیوں کی بڑے پر تکلف انداز میں دار السلطنت میں پریڈ کرائی گئی۔[57] لیکن سندھ بڑی غیر محفوظ ملکیت ثابت ہوئی کیوں کہ دہلی سے طویل فاصلے اور منگولوں کی قربت نے گورنر کی وفاداری کو اکثر و بیشتر متاثر کیا۔ روزنامچے میں شیر خاں اور "دار السلطنت کے مُلکوں" کے درمیان خاصی کشیدگی کا ذکر ملتا ہے۔ دار السلطنت سے اُلغ خاں کی جلا وطنی کے زمانے میں کہتے ہیں کہ فریقین کے درمیان مسلح جنگ تک ہوئی تھی۔[58] روزنامچے سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ شیر خاں کی غداری کا تعلق محمود کی حکومت میں ریحان کی برتری اور غلبے کی عام مخالفت سے تھا۔ روزنامچے میں صرف یہ لکھا ہے کہ دریائے سندھ کے ساحل پر غالباً منگولوں سے شکست کھانے کی وجہ سے وہ ترکستان چلا گیا اور پھر وہاں سے منگول شہنشاہ منگو خاں کے دربار میں حاضر ہو گیا۔

سوائے اس کے کہ منگول اسے بطور قیدی لے گئے ہوں۔ شیر خاں کی اس حرکت کو دہلی کے خلاف کھلم کھلا غداری سمجھنا چاہیے۔ منہاج اس کی اصل منشا کو ایک پہیلی بنا دیتا ہے لیکن تقریباً اسی وقت فرماں روا بادشاہ کے بھائی شہزادہ جلال الدین مسعود کی غداری اور بعد میں ہندوستان میں اس کے طریق عمل سے یہ پہیلی بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔[59] 1248ء/ 646ھ میں مسعود کا تقرر سنبھل اور بدایوں کے صوبوں میں کیا گیا تھا لیکن کسی نامعلوم سبب کی بنا پر وہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سرمور کے پہاڑیوں سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا اور وہاں سے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ منگولوں کے حد اختیار میں داخل ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ مسعود کے فرار کا کچھ نہ کچھ تعلق اُلغ خاں کی اس مہم سے تھا جو اس نے بیاس تک پھیلے ہوئے بالائی صوبوں تک اسی سال کی تھی۔[61] وصاف کے[62] مطابق مسعود بھاگ کر منگو خاں کے دربار میں چلا گیا بناگیتی (BENAGITI) نے بھی قتلغ خاں اور سنقار (SUNQAR) (شیر خاں سنقار) کے ساتھ مسعود کی موجودگی کا ذکر کیا یہ تینوں افراد اُلغ خاں سے خوفزدہ ہو کر بھاگے تھے۔[63] ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے اُلغ خاں

یا بدنام ریحان کے خلاف منگول فرماتروا سے عملی امداد مانگی جو اس وقت اقتدار سنبھالے ہوا تھا۔ مسعود نے بھی غالباً باپ کے تخت کو حاصل کرنے کا اپنا دعویٰ بھی اسی میں شامل کر دیا۔ ان تمام لوگوں کے لیے حسب مراتب تعظیم و تکریم کا انتظام کیا گیا تھا۔ منگولوں کے مقاصد اسی بات سے حل ہو جاتے ہیں کہ مسعود کی ہمت افزائی کی جائے اور اُسے کم از کم ایک باجگزار فرماں روا کے طور پر اپنے سندھ پار کے علاقوں پر متعین کر دیا جائے۔ اس کو ان ہدایات کے ساتھ لاہور بھیج دیا گیا کہ وہ سالی بہادر سے ضروری امداد حاصل کرے چنانچہ آخرالذکر اسے اپنی حفاظت میں پنجاب کے پار لے گیا۔ اسی طرح مسعود نے اُن اضلاع پر قبضہ کر لیا جو سالٹ رینج سے لاہور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ان میں کو جاہ اور سودھارا بھی شامل کر لیے گئے۔[64] ہجنیر (HAJNER) سے آگے جاتے سے محافظ منگولوں نے اپنی مجبوری ظاہر کر دی تھی۔[65] اس لیے اُن دنوں دہلی کی سرحد کا تعین کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ سرحد ستلج کے پرانے راستے پر رہی ہو گی۔ یہ بات قرین از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ منگولوں کے سرحد پار نہ کرنے کا سبب دہلی حکومت سے کسی نہ کسی قسم کے امن کے معاہدے کی موجودگی رہا ہو گا۔

اپنی واپسی کے فوراً بعد جبکہ شیر خاں ابھی تک منگول دربار میں تھا کہتے ہیں کہ مسعود "لاہور کی طرف سے" الغ خاں کی جماعت میں شامل ہو گیا جو بھٹنڈا میں ریحان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے لیے جمع ہوئی تھی۔[66] غالباً مسعود کو یقین دلایا گیا تھا کہ اُسے محمود کے تخت پر بٹھا دیا جائے گا۔ تاہم اُلغ خاں کی پارٹی سے صلح ہونے کے بعد وعدہ پورا نہیں کیا جا سکا اس صورت حال میں مایوس شہزادے نے یقیناً سرگرم مخالفت کی تیاری کی ہو گی۔ منہاج نے جھگڑے کے تصفیہ کو جس طرح قلم بند کیا ہے اُس سے بہرکیف یہی رائے سامنے آتی ہے۔ "دو فریقین (سلطان اور اس کے بھائی) میں صلح کرانے والی امرا کی جماعت کے ماحصل کے طور پر، قسموں، وعدوں اور معاہدے کے بعد بھائی نے اپنے کو حوالے کر دیا اور لاہور اس کا اِقطع ہو گیا۔"[67]

یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مسعود اپنے منگول سردار اعلیٰ سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گیا ہو گا۔ کچھ دنوں بعد جب شیر خاں "قدر و منزلت" کے ساتھ واپس پہنچا

تو کہتے ہیں کہ وہ لاہور میں اس سے جا ملا۔ لیکن اُن کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس سے اُلغ خاں نے اپنے چچازاد بھائی کو اپنی طرف کرنے کے لیے ضرور فائدہ اُٹھایا ہوگا۔ لاہور پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش سے باز رکھنے کے لیے اُس نے اُسے منگولوں کے چیلے کے خلاف کر دیا ہوگا۔ شیر خاں بہرکیف مسعود سے الگ ہوگیا جو بعد میں ناکام ہوکر ریٹائرڈ ہوگیا اس نے اپنے خاندان کو بھی چھوڑ دیا تاکہ اُنھیں شیر خاں گرفتار کرے [64] یہ صورت حال محمود کی حکومت کے منصوبوں سے بڑی مطابقت رکھتی تھی جس سے شیر خاں نے صلح کر لی تھی۔ چنانچہ اسے فتح کرنے کے لیے غیر قانونی حملہ کیا تھا اور جسے ارسلان خاں نے پسپا کر دیا تھا۔ اب ارسلان خاں کو اودھ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

تاہم مسعود کے منظر سے ہٹ جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب دہلی کی سرحد فوری طور پر مغرب کی طرف پھیل جائے گی۔ کیونکہ اب بیاس مشرق میں ستلج سے ہم کنار ہونے سے پہلے خود اپنے راستے پر بہہ رہا تھا۔[79] اور اسی راستے کو "سرحد" کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ 1257ء/ 655ھ میں میواتی باغیوں سے اچھی طرح مقابلہ نہیں کیا جاسکا تھا کیونکہ اس وقت منگول دہلی کی سرحدوں سے یعنی سندھ لاہور اور دریائے بیاہ کے کنارے پریشان کرنے کے لیے نمودار ہو چکے تھے۔[80]

اسی طرح سندھ پر قبضہ رکھنا غیر یقینی رہا۔ شیر خاں سندھ چھوڑنے کے فوراً بعد اور 1253ء میں منگول دربار میں دوبارہ شریک ہونے کے لیے روانہ ہوتے ہی اچھ اور ملتان کو دوبارہ کشلو خاں کو دے دیا گیا تھا لیکن تقرر کے ایک سال بعد اندر اندر اُس نے بغاوت کر کے نہ صرف ہلاکو سے اپنی وفاداری منسلک کر دی۔ بلکہ ہرات کے رکن الدین کرت کے ذریعہ ایک منگول ریذیڈنٹ کا استقبال کیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ 1257ء میں قتلغ خاں سے مل کر اس نے دہلی پر حملہ کیا اور ناکام ہونے کے بعد غالباً فوجی امداد طلب کرنے کے لیے وہ خراسان میں ہلاکو سے ملنے پہنچ گیا۔ ہلاکو نے بڑی اچھی طرح اس کا خیر مقدم کیا لیکن امداد کے سلسلے میں اس نے وہی پالیسی اختیار کی جو پنجاب میں جلال الدین مسعود کو برقرار کرنے کے سلسلے میں استعمال کی گئی تھی۔ ہلاکو نے دہلی خاص پر بڑے پیمانے پر حملہ کی اجازت نہیں دی بلکہ سالی بہادر کو سختی سے حکم دیا کہ "کوئی بھی منگول گھوڑ سوار

دہلی کی سرحد کو پار نہ کر پائے۔[72] کشلو خاں اپنے بیٹے کو یرغمال کے طور پر چھوڑ کر خود سالی بہادر کی فوجوں سے جا ملا تاکہ اگر محمود کی فوجیں حملہ کریں تو وہ اس کی حفاظت کر سکے۔[73] الغ خاں نے ان فوجوں کے سندھ پار کرنے کی خبر سن کر ایک بڑی زبردست فوجی تیاری شروع کر دی لیکن جب اُس نے سنا کہ منگولوں نے صرف ملتان کے دفاعی انتظامات کو تباہ کیا ہے۔ اور ان کا سرحد پار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تو اس نے کوئی مزید اقدام نہیں کیا بلکہ اس مقصد کے لیے بھرتی کی ہوئی فوج کو ختم بھی کر دیا۔[74]

دہلی اور منگولوں کا یہ تحمل اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دونوں کے درمیان نہ صرف مفاہمت ہو چکی تھی بلکہ ایک دوسرے کی علاقائی خود مختاری کو تسلیم کرنے کا معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔ دہلی نے تو بہر حال چپ چاپ اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ پورا سندھ اور مغربی پنجاب کا علاقہ منگولوں کو منتقل کر دیا جائے۔ الغ خاں کو ایسے اقدامات کرنے پر مجبور کیا گیا جو جاگزاروں سے لڑائی جھگڑے کے امکانات کو کم کرے۔ جب سے بھٹنڈا میں شیر خاں کو دوبارہ متعین کیا گیا تھا وہ ملتان اور اُچھ کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا بلکہ اُس نے کشلو خاں کے خلاف جارحانہ کاروائیاں بھی شروع کر دیں تھیں چوں کہ ایسی حرکتوں سے دہلی کا منگولوں سے جارحانہ کاروائی میں الجھنے کا خطرہ لاحق تھا اس لیے الغ خاں نے سرحد پر جھگڑوں سے بچنے کے خیال سے 1258ء/ 657ھ میں اُسے کول، گوالیار اور مشرق کے ملحقہ صوبوں میں منتقل کرا دیا۔[75] اور اس کی جگہ لینے کے لیے ملک نصرت خاں کو جس کی دور اندیشی پر دہلی سلطنت بھروسہ کر سکتی تھی، بھٹنڈا، سنام (SONAM) سمانا، بجنیر اور لکھوال کے صوبوں اور دریائے بیاہ (BEAH) کی گھاٹیوں تک کی سرحد کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔[76] اسی سال الغ خاں نے اپنے بیٹے کو حسن قرلغ کے بیٹے نصیر الدین (جو بنیاں میں سکونت پذیر تھا اور منگولوں کا جاگزار تھا) کی لڑکی سے شادی کی اجازت دے دی۔ رضامندی کے اسی پیغام کو لے جانے والا پیغامبر جب کشلو خاں کے علاقے سے گزر رہا تھا تو اُسے منگول افسران نے روک لیا۔ اُس نے مطالبہ کیا کہ اُسے خراسان میں ہلاکو کے پاس بھیجا جائے۔ جہاں اُس نے دہلی سے لایا ہوا ایک دوستانہ خط پیش کیا۔ جس میں غالباً حملہ نہ کرنے کا یقین دلایا گیا تھا۔[77] ہلاکو نے اُس جذبہ کو پسند کیا۔ اگلے سال 1259ء/ 658ھ میں منہاج نے دہلی میں ہلاکو کے وفد کی

آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا بڑا پر جوش اور شاندار استقبال کیا گیا۔[78] تاہم اس موقعہ پر کسی باقاعدہ معاہدے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک ہمیں بتایا گیا ہے، اس موقعہ پر ہلاکو نے اپنے کمانڈنگ افسر کو دہلی کی سرحد کا احترام کرنے کے لیے سختی سے حکم دیا تھا۔

منہاج کے تذکرے کے اختتام پر محمود کی حکومت، سندھ اور بیاس کے پار کے پنجاب کے ایک بڑے حصے کے چلے جانے کی حقیقت کو تقریباً پوری طرح تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے بعد کشلو خاں کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ برنی کہتا ہے کہ بلبن کی سلطنت میں ملتان اور اُچھ کی دوبارہ شمولیت کے سلسلے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بازیابی متعدد معرکوں کے نتیجے کے طور پر ہوئی ہو لیکن اسامی نے اس دلیل کو مبہم طور پر بیان کیا ہے۔ اس جگہ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ہلاکو کی دوستانہ سلسلہ جنبانی کی وجہ سے منگول فوجیں سندھ سے واپس جانے کے لیے تیار ہو گئی ہوں۔[79] بلبن نے اپنی تخت نشینی کے کچھ ہی سال کے بعد صوبہ سندھ کی تنظیم نو کا کام اپنے سب سے بڑے بیٹے کے سپرد کر دیا تھا اور غالباً یہ اس کا سب سے پہلا کارنامہ تھا۔[80] شہزادہ تقریباً ہر سال سرحد پار حملے کر کے تاتاریوں کے گھوڑے چھین لیتا تھا اور ایک طرح سے منگولوں کو دریائے سندھ کے کنارے روکے رکھتا تھا۔

تاہم پنجاب سے منگولوں کو نکالنا مشکل ثابت ہوا۔ 95 سال کے بعد برنی لکھتا ہے کہ بلبن کی تخت نشینی کے وقت بھٹنڈا، دیپال پور اور لاہور کی ذمہ داری شیر خاں کے سپرد تھی۔ اور جب تک اُسے نئے بادشاہ نے زہر نہیں دیا وہ منگولوں کے لیے ایک ایسی دیوار کی مانند تھا جس کی آنکھیں منگولوں کی ہر نقل و حرکت پر جمی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ اُس نے جاٹوں، کھوکروں، منڈھروں، بھٹیوں اور میناؤں کی مطلق العنانی کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ شیر خاں کے کارہائے نمایاں کے پر جوش بیان میں برنی نے غزنی فتح کرنے کا سہرا بھی شیر خاں کے سر باندھ دیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی غلط بیانی ہے جس کی وجہ سے باقی ساری باتیں باطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔[81] حقیقت یہ ہے کہ قبائل کے خلاف کامیابی کو شیر خاں کے اس عہد سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ وہ بھٹنڈا اور سرحدی اضلاع کا صوبے دار تھا جہاں سے اسے ہٹا کر 1258ء میں نصرت خاں کو متعین کر دیا گیا تھا۔ برنی نے منگولوں پر اُس کی فتوحات کا حوالہ یہ قیاس کر کے دیا ہو گا کہ شیر خاں کا اس صوبہ میں تبادلہ 1260ء کے

بعد اور بیاس اور راوی کے درمیان کا سارا علاقہ واپس کیے جانے کے بعد کیا گیا تھا۔ بہر کیف، بلبن کے عہد کی تاریخ اسناد میں دیپال پور کا دوبارہ کہیں ذکر نہیں آتا ہے بجز اس کے کہ وہ ایک سرحدی علاقہ تھا۔ لاہور کا ذکر صرف ایک دفعہ آیا ہے جب سالٹ رینج کی مہم کے دو سال بعد وہ شہر کی از سر تو تعمیر کے لیے واپس لوٹا تھا اور اس نے منتظم افسران کا تقرر کیا تھا۔ سالٹ رینج کا معرکہ اس کا دورِ حکومت کے ابتدائی حصہ میں کیا گیا تھا[93] لاہور نہ تو کبھی سندھ کی وائسرائیلٹی کا حصہ رہا اور نہ کبھی اس کے گورنر کا نام لے کر ذکر کیا گیا ہے بلبن کی تخت نشینی کے چار یا پانچ سال بعد اور التتمش کی موت کے تیس سال بعد جب شیر خاں کا انتقال ہوا[83] تو برنی نے سنام اور سمانا کے سرحدی اقطعوں پر تامور خاں کے تقرر اور شیر خاں کے باقی اور علاقے دوسرے افسروں کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ لیکن وہ آگے چل کر لکھتا ہے ان لوگوں کا منگولوں سے کیا مقابلہ اور انھوں نے وہ کامیابی کبھی حاصل نہیں کی جو شیر خاں کے حصے میں آئی تھی[84]

یہاں تک کہ بلبن کے دورِ حکومت کے اختتام تک اس کی مغربی سرحد بیاس سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ جس سال شہزادہ محمدؒ کا سندھ میں تقرر کیا گیا، اسی سال بغرا خاں نے سمانا اور سنام کے صوبے کو بظاہر تامور خاں کے جانشین کے طور پر لے لیا۔ اس کو اپنی افواج کی تعداد اور کارکردگی کو بڑھانے کی ہدایت دی گئی تاکہ وہ منگولوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر دم تیار رہیں۔ یہ صوبہ اس سارے عہد کے بقیہ حصے میں سرحد سمجھا جاتا رہا۔ برنی کی تاریخ کا مندرجہ ذیل حصہ اس بات کو مکمل طور پر واضح کر دیتا ہے "ان دنوں میں منگول گھوڑسوار اکثر بیاس پار کر کے علاقے (دہلی) میں داخل ہو جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر بلبن، سمانا سے بغرا خاں کو ملتان سے خان شاہد (شہزادہ محمدؒ) کو اور دہلی سے ملک بیکنار کو، منگولوں سے لڑنے کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ یہ لوگ دریائے بیاس تک پہنچ کر منگولوں کو نکالتے تھے۔ اس طریقہ کار سے انھیں اکثر کامیابی حاصل ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منگول پھر کبھی دریا کی طرف آنے کی ہمت نہ کر سکے۔"[85] اس علاقہ کا دفاعی نظام اس وقت اور بھی مضبوط ہو گیا جب بلبن نے بغرا خاں کو لکھنوتی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ دفاعی نظام کی مزید تقویت کے لیے صوبے کو ملک سنج کی فوجی قیادت میں دیدیا گیا اور چھوٹے چھوٹے فوجی اضلاع کو ایسے افسران کے سپرد کر دیا گیا جن کی صلاحیتیں مانی جاتی تھیں۔ سنام، سمانا کمانڈ

کے سپرد بیاس کی دیکھ بھال تھی جسے سندھ کے وائسرائے کے تحت کام کرنا تھا۔ سندھ کا وائسرائے سرحدی فوجوں کا سپہ سالار تھا اور شمالی مغربی سرحد کے دفاع کی تمام تر ذمہ داری اُسی کے سر تھی۔[86]

یہ حکمت عملی بہت موثر ثابت ہوئی جس کی وجہ سے منگول آگے نہ بڑھ سکے۔ بلبن کے دور حکومت کے آخری سال میں اُنھوں نے افغان افواج کے نئے سپہ سالار سے تامور خاں کی قیادت میں بہت بڑے پیمانے پر حملہ کیا۔ وہ شمال کی طرف سے سندھ ساگر دوآب میں گھس آئے اور لاہور دیپال پور کے علاقے کو تاخت و تاراج کرکے وہ پیش قدمی کرتے ہوئے وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ ملتان کا فاصلہ محض تین فرسنگ رہ گیا تھا۔[87] بعدازاں جو جنگ ہوئی اس میں شہزادہ محمدؒ کی فوجوں کو ابتدائی کامیابی ہوئی لیکن پھر اُن کے پیر اکھڑ گئے اور شہزادہ محمدؒ جنگ میں شہید ہوا۔ یہی وہ واقعہ تھا جو امیر خسرو کے ایک مشہور مرثیے کا موضوع بنا۔[88] کثیر تعداد میں مسلمان مارے گئے اور بقول امیر خسرو ملتان کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں کوئی لاش نوحہ کرنے کے لیے نہ پڑی ہو۔[89] ”یہ شکست مجروحین اور مقتولین کی تعداد کے اعتبار سے تباہ کن ضرور تھی لیکن درحقیقت یہ ایک مقامی پسپائی تھی کیوں کہ منگولوں نے مفتوحہ علاقے پر قبضہ کرکے اپنی کامیابی کو مستحکم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ملتان پر قبضہ قائم رکھنے پر کوئی اثر نہیں پڑا اور کیخسرو کو اپنے باپ کی وائسرائیلٹی سنبھالنے میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

بلبن کے عہد حکومت کے اختتام پر دہلی کی سرحد پنجاب میں تقریباً دریائے راوی اور بیاس کو جدا کرنے والے دریا تک رہی۔ کیوں کہ اس کی تخت نشینی کے وقت صوبے کا زیادہ تر حصہ منگول اثر میں جا چکا تھا۔ کیقباد کی نااہلی اور اس کے نتیجے کے طور پر احتیاطی اقدامات میں غفلت کے باوجود دفاعی نظام سالم رہا جس کی وجہ سے حملہ آوروں کو مزید فائدہ اُٹھانے کا موقعہ نہ حاصل ہو سکا۔ ”فرشتہ“[90] دو ایسے ابتدائی حوالوں کا ذکر کرتا ہے جن کا اب کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تخت سے زبردستی معزول کیے جانے کے بعد کیخسرو نے منگول سپہ سالار تامور خاں سے خط و کتابت شروع کی اور فوجی امداد حاصل کرنے کی امید میں وہ غزنی بھی گیا۔ لیکن تامور خاں کو بلبن کی سرحدی فوج کی طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے اس تجویز پر گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا اس لیے یہ

کہا جاتا ہے کہ شہزادہ مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ امیر خسرو کے مطابق ملتان میں کیخسرو کے جانشینوں نے کیقباد کی تخت نشینی کے چھ مہینے کے اندر اندر منگولوں پر فتح حاصل کرلی تھی[91] بادشاہ کے اودھ میں اپنے باپ سے ملاقات کے لیے روانگی سے ایک دن پہلے ایک اور منگول حملے کی خبر آئی۔ تامور خاں نے ایک دفعہ پھر ملتان سے لے کر لاہور تک کی سرزمین کو روند ڈالا۔ اُس نے "سماناتک سارے ملک کو اجاڑ دیا[92] تیس ہزار فوجیوں کی قیادت دے کر ملک بیکتارس کو فوراً روانہ کیا گیا جس نے راوی کے کنارے منگولوں کے چھکے چھڑا دینے کے بعد بے شمار سپاہیوں کو حراست میں لے لیا[93] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس نے سالٹ رینج تک منگولوں کا تعاقب کیا[94]

تاہم یہ کامیابیاں صرف بلبن کے سرحدی دفاع کی مضبوطی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان کا مقصد راوی کے پار نمایاں پیش قدمی نہیں تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مملوک سلاطین کے آخری زمانے میں منگول نہ صرف پنجاب کے بیشتر حصے پر بلکہ زیریں سندھ کے مغربی کنارے پر مضبوطی سے اپنے قدم جما چکے تھے۔ لیکن اب بھی وہ یا تو فوجی اسباب کی بنا پر اور یا سیاسی مفاہمت کے خیال سے، دہلی پر حملے کرنے میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں دکھا رہے تھے۔ جب خلجی سلاطین کا زمانہ آیا تو ان کا یہ محتاط رویہ ختم ہو گیا اور انھوں نے دارالسلطنت پر پنجاب سے فیصلہ کن حملے شروع کر دیئے اور اپنی پیہم کوششوں سے اس جوش و جنوں میں اضافہ کیا۔

حوالاجات

1- مشرقی ہمالیہ اور آسام کی پہاڑیاں کسی بھی حملہ آور فوج کے لیے آسان نہیں ہیں اور تبت سے آنے والے تجارتی راستے کسی ایسے اہم مقام تک نہیں پہنچتے جو شمالی ہندوستان کی فتح کے لیے ضروری ہوں۔ تبتی نسلوں کی ایک خاص وقت میں وادی برہمپتر میں آمد کے حملے کی صورت سے زیادہ قبیلوں کی ہجرت تھی۔ فرشتہ، ا، ص۔ 70 کے بیان کردہ چنگیز خاں کے مشرقی راستے سے حملے کی کہانی (جیسے اسٹیورٹ: ہسٹری آف بنگال، ص۔ 62 اور مقامس: کرانکلر، ص۔ 121، نوٹ نے نقل کیا ہے۔ جیسا کہ ریورٹی نے بہت پہلے ہی خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کہانی کی شروعات فرشتہ کے حاج نگر کو چنگیز پڑھ لینے سے ہوئی جو کوئی بھی لاپرواہ محرر بہ آسانی کر سکتا ہے۔ دیکھیے ریورٹی: ح۔س، ص۔ 665، نوٹ۔ 8۔ ہندوستان میں داخل ہونے کے مشرقی راستوں کے متعلق امپیریل گزیٹر آف انڈیا، ا، ص۔ 18 اور ہولڈچ: گیٹس آف انڈیا، ص۔ 517 بھی دیکھیے۔

2- کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، VI، ص۔ 457۔

3- ہولڈچ: ح۔س، ص۔ 143۔

4- شاہپور سلمنٹ رپورٹ، 1886، ص ص۔ 27۔ 28۔ جہلم ڈسٹرکٹ سلمنٹ رپورٹ، 1874، ص۔ 29۔ 36۔

4- منہاج، ریورٹی کا ترجمہ ص۔ 267۔ جس وقت سندھ کے کنارے چنگیز نے منگبرنی کو شکست دی اس وقت پشاور خوارزم کی مشرقی سرحد پر باہری چوکی تھی۔ 618/ 1221؛ نساوی، ص۔ 79۔

5- منہاج، ص- 143 -

6- منہاج، ص- 171 -

7- دیکھیے نوٹ - 4 پر-

8- خوارزم شاہ کی چنگیز سے جنگ اور بعد کو مشرق کی طرف اس کی واپسی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے بارٹولڈ: ترکستان، ص ص- 403 - 426 - علاؤالدین محمود کی وفات 417ھ/ 1220ء میں ہوئی-

9- اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، جوینی، ii، ص- 43 - ہورتھ بھی دیکھیے: منگولس i- ص- 90؛ نساوی، ص- 83 - 84 - یہ لڑائی 8 شوال 618 کو ہوئی-

10- دیکھیے ریورٹی، نوٹس آف افغانستان؛ ص ص 338 اور 448 ترجمہ، طبقات ناصری، ص- 292 - 293؛ بارٹولڈ ترکستان، ص- 445 - 446 -

11- منہاج، ص- 355 - اغراقیوں کے متعلق جو خلجیوں کا ہی ایک فرقہ بتائے جاتے ہیں ریورٹی کے نوٹس دیکھیے، ترجمہ طبقات ناصری، ص- 1043 -

12- جوینی، i، ص- 108؛ ہورتھ: منگولس، i، ص- 90 -

13- منہاج، ص- 355 اور 375، جوینی، i، ص- 109-

14- جب منگ برنی دہلی میں پناہ لینے کی غرض سے پنجاب کی طرف چلا تو اس کے فوراً بعد ہی منگولوں نے اس کا پیچھا کرنے سے گریز کیا۔ اس کے پیشِ نظر یہ بات ناممکن نظر نہیں آتی کہ دہلی نے چنگیز سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ التتمش کا تارک الوطن کو پناہ نہ دینا غالباً اسی معاہدے کے مطابق تھا۔

15- روایت ہے کہ ہندو فوج "بلالا اور مکالا" کی پہاڑیوں سے آئی تھی۔ موخرالذکر ریورٹی کے مطابق مکھیالا سے مطابقت رکھتا ہے جو سالٹ رینج کا مقامی نام تھا، ریورٹی، ترجمہ طبقات ناصری، ص- 537؛ جوینی، ii، ص 143 - 144 بھی دیکھیے۔ نساوی جو ہندو سردار کا نام چھترسال بتاتا ہے لکھتا ہے کہ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور جب منگ برنی "اور زیادہ ظالم ہندوؤں" سے بچنے کی غرض سے سندھ کو دوبارہ پار کر رہا تھا اس پر حملہ آور ہوا۔ لیکن روایت ہے کہ اس جنگ میں چھترسال مارا گیا اور ہندو تتربتر ہو گئے۔ قدرے مختلف بیان کے لیے دیکھیے شیفر (SCHEFFER) کا

فرانسیسی ترجمہ، ص۔ 142 م۔ بہ۔ الفی، صفحہ ذیل۔ 559 اور فرشتہ، ii، ص۔ 315۔

16۔ ریورٹی کے مطابق ملک پور نام کا ایک شہر راولپنڈی ضلع میں تھا، ترجمہ طبقات ناصری، ص 537، نوٹ۔ وہ اس موقعے پر ملتان کے محاصرہ کا بیان قلم بند کرتا ہے لیکن ص۔ 293، نوٹ میں خود اپنے ہی بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ منگول سپہ سالار ترتئ "ملک پور کے نواح کو تاراج کر کے لوٹ گیا" ہورتھ اور بارٹولڈ دونوں ہی نے اس موقع پر ملتان کے محاصرہ کو سچ سمجھ کر غلطی کی ہے۔ اگر 618ھ میں منگول ملتان تک پہنچ گئے تھے تو پناہ گزیں کو نہ پا سکنا تعجب خیز ہے۔ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اس نے اپنی تلاش میں بھیجی گئی دوسری منگول مہم سے بچنے کی خاطر ہندوستان کو خیرباد کہا، اگر اس نظریے کو تسلیم کر لیا جائے کہ منگول نے 618 میں ملتان پر قبضہ کر لیا تھا تو 621ھ میں ترتئ کی سرکردگی میں روانہ کی گئی دوسری منگول مہم کا ہمیں علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ منگ برنی کی روانگی کی تاریخ کو اور 621ھ میں ملتان پر منگولوں کے قبضے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 618ھ میں منگول پنجاب میں اندر تک داخل نہیں ہوئے۔ دیکھیے ہورتھ: منگولس، ا، ص۔ 90، بارٹولڈ: ترکستان ص 446، منہاج، ص 143؛ انساوی، ص؛ تاریخ محمدی؛ اورینٹل مینسکرپٹس ان برٹش میوزیم 137، صفحہ ذیل 334 اے۔ جوینی ہندوستان میں چنگیز کی بھیجی ہوئی فوجوں کے بیان میں مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے، ص ص۔ 108، 110، 112 اور ii، ص۔ 144 اور 147۔

17۔ جوینی، ii، 145 کا بیان ہے کہ التتمش نے سنیر کو قتل کر دیا۔

18۔ کھوکھروں میں رائج اس شادی کے روائتی بیان کے لیے دیکھیے انڈین اینٹی کویری 1907 ص۔ 3۔

19۔ قمرالدین کرمانی اس مقام پر اس (قباچہ) کی وساطت سے فائیف تھا۔ جس نے کھوکھر سردار کی منگ برنی کے ہاتھوں شکست کے بعد فوراً اطاعت قبول کر لی، نساوی ص۔ 86 ۔ قباچہ پر ایک خوارزمی مہاجر کے قتل کا الزام لگایا گیا، منگ برنی کا ایک نوعمر رشتہ دار بھی کالرکوٹ میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ کالرکوٹ قباچہ کے ماتحت مقاموں میں سے ایک تھا۔ مانساوی، ص۔ 88۔

20- جوینی، ii، ص 146 م. بہ. نساوی، ص۔ 88 ۔

21- جوینی، ii، ص؛ نساوی، ص۔ 90۔ 91 کا بیان ہے کہ منگ برنی قباچہ کو شکست دے کر سنہا اور نہور (NUHOOR) (جس کا مطلب غالباً لاہور ہے؟) گیا جس پر قباچہ کا ایک باغی بیٹا قابض تھا۔ اس نے فوراً ہی اطاعت قبول کر لی۔

22- سالٹ رینج سے واپس ہوتے وقت اس نے بسرور (BUSROOR) کے قلعہ پر قبضہ کر لیا جسے کننگھم نے موجودہ پسرور (PASRAUR) سے شناخت کیا ہے جو سیالکوٹ سے 20 میل جنوب مشرق میں واقع ہے یہ سالٹ رینج سے واپسی کے راستے پر واقع نہیں ہے۔ دیکھئے کننگھم: رپورٹس: XIX، ص۔ 46۔ 47۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ منگ برنی نے اپنی مخالفت میں دہلی سے آنے والی فوج کے بارے میں بھی سنا، ii، ص۔ 315 ۔

23- جوینی، ii، ص۔ 147 م۔ بہ نساوی، ص ص۔ 90۔ 91 ۔

24- نساوی، ii، ص۔ 148 ۔

25- نساوی، ، ص۔ 92 ۔

26- جوئنی، ii ص۔ 149 ۔

27- منہاج، ص۔ 143؛ جوینی، i، ص۔ 112 ۔ اسے بیاہ (BIAH) لکھتا ہے جسے الیٹ نے بھیرا سے شناخت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو جہلم کے مغربی کنارے پر واقع ہے، ii، ص 392، نوٹ i، کننگھم بھی دیکھئے۔ رپورٹس، xiv، ص۔ 37-38۔ منہاج، ص۔ 143 اس کی تاریخ 621 ھ/ 1224ء بتاتا ہے۔ اس روائیت کے لیے کہ اس غیر متوقع چھٹکارے کو کس طرح صوفی قطب الدین بختیار کاکی کی معجز نما قوت سے منسوب کیا جاتا ہے دیکھئے فوائد الفواد، صفحہ ذیل 59 اے۔

28- منہاج، ص۔ 143 ۔

29- بھٹنڈا سے رضیہ پیشہ ور سپاہیوں کی فوج تیار کرنے میں کامیاب ہوئی جس میں زیادہ تر کھوکھر شامل تھے۔

30- منہاج، ص۔ 388، بنیان اور سندھ ساگر دوآب پائے گئے ہیں۔ حسن قارلوغ کے سکوں کے لیے دیکھئے۔ تھامس: کرانکل ونمبر۔ 99

31- اس نے اپنے نام کے سکے جاری کیے اور ان میں سے ایک جس کے سیدھے رخ پر
32- ناگری ہے۔ تھامس نے ٹکسال کا نام ملتان پڑھا کرانکل، نمبر۔ 85 -
اس واقعے کی تاریخ 620ھ/1230ء بتائی گئی ہے؛ منہاج، ص۔ 37 -
33- ایضاً، ص۔ 377 -
34- ص ص۔ 90 اور 217 -
35- اس نے 625ھ/1127ء میں اُچھ اور ملتان کے گورنروں کا تقرر کیا۔ منہاج، ص
232 اور 234 -
36- ہوورتھ: منگولس، i، ص۔ 126 - 127 -
37- تاریخ سیستان، ص۔ 397 -
38- الفی، صفحہ ذیل 617 اے
39- منہاج، ص۔ 237 -
40- ایضاً 392 -
41- منہاج، 392 -
42- ایضاً، ص۔ 195 -
43- ایضاً، ص۔ 262 -
44- ایضاً، ص۔ 399 -
45- ایضاً، ص۔ 235 اور 287 -
46- اس وقت پنج ناد ملتان کے مشرق میں بہتی تھی؛ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، xviii،
i- ص 35؛ جرنل آف د ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1892ص 157؛
ریورٹی: ترجمہ طبقات ناصری، ص 1155 نوٹ - 6 -
47- اس دفاعی نظام کے لیے دیکھیے منہاج، ص۔ 288۔ 289 اور ص 400- اس
راستے کے متعلق تفصیلی بیان کے لیے اور ضمنا پنجاب کے دریاؤں کے پرانی بہاؤں
کے لیے دیکھیے ریورٹی: دَ مہران آف سندھ، جرنل آف دَ ایشیاٹک سوسائٹی
آف بنگال، 1892، ص ص 162- 166-
48- منہاج، ص 269 -

49- روضۃ الجنات: صفحہ ذیل 192 بی۔ یہ سیف ہراوی کی تصنیف تاریخ نامہ ہرات پر مبنی ہے۔ (میر، ایم۔ زیڈ۔ صدیقی کلکتہ 1944) ص 156، 157۔ منہاج نے اس واقع کا ذکر نہیں کیا ہے، م۔ بہ۔ ریورٹی: ترجمہ طبقات ناصری۔ 677 نوٹ اور ص۔ 1201 نوٹ۔

50- روضۃ الجنات IDEM لاہور کے گورنر کا نام کریت خاں بتایا گیا ہے جو غالباً گُریز (KUREZ) خان ہوگا۔ جو کچھ برس بعد شیر خان کی ماتحتی میں ملتان کا نائب گورنر تھا۔ دیکھئے منہاج، ص۔ 277۔

51- منہاج، ص۔ 209 کا بیان ہے کہ اس کا مقصد ملتان کو نجات دلانا اور چین کے کافروں، کو برباد کرنا تھا۔

52- ایضاً، 290۔

53- روضۃ الجنات، صفحہ ذیل۔ 100 بی۔

54- منہاج، ص۔ 270۔

55- دیکھئے فرشتہ، i، ص۔ 125، منہاج، ص۔ 277۔

56- منہاج۔ ص ص۔ 214، 271۔

57- ایضاً۔ 215 حاجی دبیر بھی دیکھئے، ii ص 15)

58- اُچھ، ملتان اور بھٹنڈا میں جو اس کے زیر انتظام تھے اس کی جگہ ارسلان خان کو مقرر کیا گیا؛ صاف ظاہر ہے کہ ایسا الغ خاں کی پارٹی کے ترکی سرداروں کو علیحدہ کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں کو زبردستی ہٹایا گیا، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دشمنی کی طرف منہاج نے اشارہ کیا ہے، ص۔ 271 ص۔ 277 پر بھی غالباً اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس موقعہ پر استعمال گئی زبان جس کے متعلق گمان غالب ہے کہ اس میں تحریف کی گئی ہے سے اندازہ ہوتا ہے کہ الغ خاں سے کش مکش ہوئی۔

59- منہاج، ص۔ 217، 227 اس کے اپنے بیانات میں تضاد ہے۔ دیکھئے ریورٹی کے نوٹس رح، س۔ ص۔ 792، طبقات اکبری، i، ص۔ 75 بدایونی، i، ص۔ 91۔

60- منہاج، ص۔ 212 ریورٹی کا ترجمہ، ص۔ 684۔

61- ایضاً، ص۔ 292۔

62- ایڈیشنل مینسکرپٹس برٹش میوزیم لندن۔ 23517 وصفحہ ذیل، 254 بی۔

63- تاریخ بناگیتی بحوالہ ریورٹی، ص 1225 نوٹ۔ ریورٹی کے مطابق ایک ایسا مبلغ رُبرکیوئین (RUBRE QUIONS) نے جوان دنوں منگو کے ساتھ تھا مشاہدہ کیا اور کچھ ہفتوں تک "ایک ہندوستانی سفیر" کا ہم سفر بھی رہا۔

64- وصاف: ح۔س۔ IDEM ؛ بناگیتی، صفحہ ذیل۔ 116 بی۔ سدھارہ یا سودھرا غالباً اس شہر کا نام تھا جو دریائے چناب پر وزیر آباد سے پانچ میل پہلے (اوپر) چناب کے ایک گھاٹ پر واقع تھا، کننگھم: رپورٹس، XIV، ص۔ 43۔

65- ایلیٹ، iii، ص۔ 37 نے خیال ظاہر کیا ہے کہ کہیں ہنجیر اجمیر کی بگڑی ہوئی شکل تو نہیں ہے، لیکن اس کو جانیر سے شناخت کرنے میں شبہہ کی گنجائش بہت کم ہے جو لدھیانا اور فیروزپور کے بیچ میں دریائے ستلج کے کنارے (ستلج کے پہلے راستے) لاہور سے کیتھال جانے والے راستے پر واقع ہے؛ کننگھم: رپورٹس، xiv، ص۔ 67 رشیدالدین نے اپنی تصنیف جمیعۃ التواریخ میں البیرونی کا حوالہ دیتے ہوئے اُسے ہنجیر لکھا ہے جبکہ البیرونی i، ص 206 پر جاجنیر ہے اور کننگھم نے کسی مخطوطے میں اسے جبیر لکھا ہوا پایا۔ منہاج نے اس مقام کو التمش کی فتوحات کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ چھپے ہوئے متن میں تنجیر ہے جو یقیناً ہنجیر کو غلط پڑھ لینے کا نتیجہ ہے۔

66- منہاج، ص۔ 300۔

67- ایضاً، ص۔ 219؛ ریورٹی کا ترجمہ، ص۔ 700۔

68- منہاج، ص ص۔ 277۔ 278۔

69- ایضاً، ص ص۔ 266، 278۔

70- دیکھئے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1866، ص 332؛ انڈین اینٹی کویری، 1932، ص ص 166۔ 169۔

71- منہاج، 314، ریورٹی کا ترجمہ، ص۔ 851۔

72- ایضاً، ص۔ 322۔

73 منہاج، ص۔ 273۔

74- ایضاً، ص ص، 225-310-311-

75- ایضاً، ص- 278-

76- ایضاً، ص- 274-

77- منہاج، ص ص- 320-323-

78- ایضاً، ص ص- 317- 319-

79- دیکھئے- ص- 220، SUPRA

80- 1265 میں ہلاکو کی وفات کے بعد ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ختم ہوگیا چنانچہ ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔

81- برنی، ص، 65- مذکورہ قبیلوں کے بارے میں علم ہے کہ وہ شمالی راجپوتانہ میں بیکانیر سے بھٹنڈا تک بسے ہوئے تھے؛ دیکھئے کننگھم: رپورٹس، vi، ص، 8 اور xxiii، ص- 223. روایت ہے کہ شیر خاں نے بھٹیز کا قلعہ تعمیر کرایا۔

82- برنی، ص- 60 اور 80 -

83- دیکھئے، ص- 176 SUPRA

84- برنی، ص ص- 65 - 66 .

85- برنی، ص- 81 - اس عبادت کا ایلیٹ نے جو ناقص ترجمہ کیا ہے، iii، ص-112 اس کے بعد ملک بیکتار اور بغرا خاں کو بلبن کے ہمراہ بنگال مہم میں لے جایا گیا۔

86- ایضاً، ص- 75 -

87- برنی، ص- 109 اور فرشتہ i، ص- 82 کا بیان ہے کہ جنگ لاہور اور دیپال پور کے درمیان لڑی گئی لیکن تاج المعاصر، ص- 45 نے اس واقعے سے متعلق امیر حسن کے بیان کو تفصیل سے نقل کیا ہے اور بتایا ہے ------ کہ جنگ ملتان سے تین فرسنگ کے فاصلے پر ایک باغ کے قریب ہوئی جو لاہور میں راوی کے کنارے دنیدا کے پھیلے ہوئے پانی سے ملا ہوا (جزوی طور پر گھرا ہوا) تھا- طبقات اکبری کے مترجم نے نوٹ میں اس بات کا اور اضافہ کیا ہے کہ دنیدا ایک دریا کا نام ہے جو دیپال پور کے جنوب مغرب میں واقع اجودھن کے قریب تھا، ترجمہ طبقات اکبری، ص-114

88- دیکھئے مرزا: لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو، ص ص- 56 - 59 اس نظم کے ترجمہ

کے لیے جو بدایونی نے پوری نقل کیا ہے، منتخب التواریخ، i، ص-138 -

89- مرزا، ح، س۔ ص۔ 63 -خود اس شاعر کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

90- تاریخ، i، ص- 84 -

91- امیر خسرو: قرآن السعدین، ص۔ 48 -

92- ایضاً، ص۔ 49 تاریخ مبارک شاہی، ص۔ 54 -

93- امیر خسرو: ح۔ س، ص۔ 50 -

94- تاریخ مبارک شاہی، ص-54- یحییٰ کا بیان ہے کہ لاہور کی سرحدوں پر دہلی کی فوج پہنچنے پر منگول بغیر جنگ کیے بھاگ کھڑے ہوئے اور انھیں جموں کی پہاڑیوں کے دامن (کوہ پایا) تک پیچھے دھکیل دیا گیا۔ یہاں جموں کا مطلب یقیناً جود ہو گا۔

دسواں باب

مرکزی حکومت

گذشتہ صفحات میں اس بات کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ دہلی سلطنت کے اکابرین دفاع اور توسیعی مسائل میں کس قدر مصروف تھے۔ یہ فوجی مسائل دراصل پوری صدی تک بدستور قائم رہے ایسے حالات میں ریاست کا ایک قابض فوج کی تنظیم سے مماثل ہونا ناگزیر تھا اور اسی لیے اسے حقیقتاً ایک ہی ہونا پڑا۔ جوں جوں اس کے حفاظتی مسائل کم ہوتے گئے غیر فوجی امور سامنے آتے گئے۔ سلطنت کے اصلی ڈھانچے میں منصوبہ بندی کا عنصر زیادہ نظر نہیں آتا۔ مفتوحین نے اپنے آبائی وطن اور ایران کے کچھ مخصوص دستور اور آئین ضرور رائج کیے لیکن ان میں اکثر دستور پہلے ہی سے غزنوی پنجاب میں منتقل تھے اور جن سے ہندوستانی رسم و رواج نامانوس نہیں تھا۔ سرکاری نظریات اور عادتوں میں کم سے کم دخل دے کر مملوکوں نے کام کا آغاز کیا۔ فتح حاصل کرنے کی بنا پر جو تبدیلی ضروری تھی وہ تنظیمی میدان سے زیادہ سیاسی نوعیت کی تھی۔ یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نئی حکومت نے مقامی حکومت کی جزئیات اور محصول کی وصولی کے کاموں میں ابتدا ہی سے مفتوحین سے کام لینا مناسب سمجھا۔ مملوکوں نے اس میں کسی نمایاں تبدیلی کی کوشش نہیں کی۔ ایسے مسائل جو فاتحین کے لیے کم و بیش مخصوص تھے مثلاً مرکزی انتظام فوج اور عدلیہ کے محکمے میں انھوں نے اپنے طرزِ عمل کو رائج کیا، جو ایک قدرتی بات تھی۔ اس قسم کے ہنگامی اور وقتی انتظامیہ کی کمزوریوں کا احساس کافی وقت گزرنے کے بعد محسوس کیا گیا۔ خود اپنے وطن سے رابطہ منقطع اور اُن کا مکمل

طور پر ہندوستانی طرزِ زندگی پر انحصار ہوگیا اور جوں جوں قبضہ دیہی علاقوں کی طرف بڑھنے لگا ہندوستان کی چھاپ مستقل ہوتی گئی۔ خود ان کے اپنے حلقوں میں نئے مسائل سر اٹھانے لگے اور بدلتی ہوئی فوجی صورت حال نے نئی تبدیلیوں کا مطالبہ شروع کردیا لیکن نہ تو کسی نئے بندوبست کا منصوبہ بنایا جاسکا اور نہ اس پر عمل ہوسکا۔ صورت حال اب ایسی ہوچکی تھی کہ صرف وقتی حل تلاش کرنے کی گنجائش باقی رہ گئی تھی۔ مملوک بندوبست اسی لیے محض ایک تجرباتی سلسلہ یا رجحان تھا جو اُس وقت تک ایک جامع نظام کی شکل نہ اختیار کرسکا جب تک کہ ایک نئی حکومت نے اقتدار نہیں سنبھال لیا۔

تیرھویں صدی کے مسلم انتظامیہ کے تحریری ملحقات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بندوبست کا مقصد مصالحت اور عارضی صورت حال کا قیام تھا۔ اس زمانے کے مورّخ فوجی واقعات کو ضبط تحریر میں لانے میں اس قدر مصروف تھے کہ اس زمانے کے دستوروں اور اُن پر عمل درآمد کے سلسلے میں ہماری معلومات میں ایک خلاء رہ جاتا ہے اس خلاء کے بیشتر حصے کو پُر کرنے کے لیے ہمیں ایسے اداروں کے غیر ہندوستانی پس منظر کا سہارا لینا ہوگا۔ جن کے بارے میں پہلے بتایا جاچکا ہے۔ دراصل ان ہی اداروں نے ایک مشترکہ مسلم بندوبست کی بنیاد رکھی ہوگی۔

اسلام کے مقتدر ترین حاکم کی حیثیت سے خلیفہ بہت پہلے ہی اپنی اہمیت کو کھو چکا تھا۔ ترکوں کے غلبہ کے بعد، نویں صدی کے ابتدائی حصے میں اس کے تنزل کا عمل اور تیزی سے شروع ہوگیا۔ ہمدان کے بواہدا (BUWAI HID) حکمراں اُس سلسلۂ سلاطین کے پہلے حکمراں تھے جنھوں نے بغداد پر قبضہ کرکے وہاں کے خلیفہ کو کٹھ پتلی کی حیثیت دے کر اسلام کی آغوش میں ایک نئی حقیقت کو جنم دیا تھا جسے قومی یا ملکی سلطنتوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ عراق کے ایک حصے پر عباسیہ خاندان کو اخلاقی قیادت بلکہ اقتدار حاصل تھا لیکن یہ اقتدار دراصل غزنوی سلجوق اور خوارزمی سلاطین کی عنایت کا مرہون منت تھا۔ مصر میں فاطمیوں کی مدمقابل خلافت کے علاوہ کچھ نئی حکومتیں ابھر آئی تھیں جن کے حکمرانوں کو مکمل اقتدار حاصل تھا۔ اور اس طرح انھوں نے دارالاسلام کو مختلف قسم کی حکمرانیوں کا ایک مرکب بنادیا تاہم آئینی احکام خلافت کے خاتمہ کو تسلیم کرنے میں بہت محتاط تھے۔ کیوں کہ وہ ناقابلِ تقسیم عالم اسلام کے

صرف ایک دینوی حکمراں سے واقف تھے تاہم ان کی قانونی اختراع پسندی نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا اور وہ یہ تھا کہ اُنھوں نے حکمرانوں کو وائسرائے کا عہدہ دے دیا۔ جن کو یا تو باقاعدہ طور پر اور یا مبہم منظوری کی صورت میں اختیار سونپ دیا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ اختیار خلیفہ نے عنایت کیا ہے۔ مذہبی عقائد اس طریقہ کار سے اچھی طرح ہم آہنگ رہے اور اس طرح محض ایک من گھڑت قانون کی وجہ سے عالم اسلام پر خلیفہ کا بلا شرکت غیرے اقتدار جاری رہا۔ بہر حال اب تک جو کام ابتدا میں اخلاق و عنایت کا نتیجہ تھا وہ کچھ عرصے قانونی پابندی بن گیا اور خلیفہ کی جانب سے کیے جانے والے باقاعدہ تقرر کو مزید اعزاز سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ جن جگہوں پر براہ راست اختیار نہیں سونپا گیا وہاں بھی قانونی عذر پیش کرنے والوں نے خطبے اور سکے میں خلیفہ کا نام شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ دسویں صدی سے عباسی خلیفہ اسلام کی بنیادی یک جہتی کی ایک ایسی علامت بن گیا۔ جس سے تمام مسلم حکمراں کسی نہ کسی قسم کی چاہے وہ علامتی ہو وفاداری برتتے تھے۔

معزالدین کی حکومت برائے نام محض کاغذ پر تھی اور خلیفہ کی مملکت کا ایک صوبہ تھی اسی لیے دہلی سے جاری ہونے والے اس کے ابتدائی سکوں پر خلیفہ وقت کا نام ایک فطری بات تھی المنتصر باللہ سے باضابطہ اجازت کے بعد التتمش نے دہلی سلطنت کو براہ راست تابعدار بنا لیا تھا۔ اُس کے کسی جانشین نے اس کاروائی کو دہرایا تو نہیں لیکن اُن میں سے کسی نے اس قانونی تابعداری کو ختم بھی نہیں کیا۔ سکوں پر اور خطبے میں خلیفہ کا نام قانونی حکمراں کے طور پر آخری عباسی کے اپنی جان منگول مظالم کی نذر کر دینے کے بہت بعد تک قائم رہا۔ اس اثنا میں سلطان کے نام کے ساتھ ایسے مناسب فقرے منسلک کر دیئے جاتے تھے جن سے اس کی نیابت کا پتہ چلتا تھا۔ خلیفہ کا نام ناگری رسم الخط میں سکوں پر بھی کندہ کیا جاتا تھا اور کبھی کبھی غیر مسلموں کی توثیق بھی کی جاتی تھی جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ دہلی کی حکومت عالمی سلطنت کا ایک حصہ ہے۔[۲۵]

اس طرح نظریاتی طور پر مملوک بادشاہ کی حیثیت وائسرائے سے زیادہ نہیں تھی لیکن عملی طور پر اس کی فرماں روائی مطلق العنان تھی۔ بجز اس کے کہ شریعت کی طرف سے اس پر ذاتی اور مذہبی پابندی لگائی جاتی تھی، اس کے اختیار لامحدود تھے۔ وہ حاکم اعلیٰ

تھا اور عدالتی اختیار اور طاقت یہاں تک کہ اعزاز عطا کرنا بھی صرف اس کے ہاتھ میں تھا۔ خلیفہ کی طرح وہ بھی شریعت کا اعلیٰ مفسر اور اس پر عمل درآمد کی پابندی عائد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ تاہم مصلحت اندیشی اور قوانین یہ ضرور رائے دیتے تھے کہ ان معاملات میں علماء اور مولویوں سے مشورہ کر لیا جائے۔ لیکن اس طبقہ کی اکثریت تحریص پسندی سے بری نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے غیر متبرک اشتراک کی وجہ سے بادشاہ کے مطلق العنان بننے کا راستہ ہموار ہو جاتا تھا۔ لیکن دوسری طرف اس کی طاقت کو روکنے کے لیے کچھ عملی اور حقیقی رکاوٹیں بھی تھیں۔ مذہبی قوانین کی کھلم کھلا مخالفت کے نتائج کے علاوہ وہ بھی ایسے دور میں جب کہ مذہب اتنی طاقت ور چیز تھی جس کا اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بغاوت کا ڈر بادشاہ کو عام روش پر چلنے کے تسلیم شدہ قوانین کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے آئینی اختیارات، خلیفہ کی طرح کافی حد تک محدود تھے۔ یہاں تک کہ انتظامیہ جیسے غیر مذہبی معاملات میں بھی وہ رسمی طور پر شریعت کے اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ اُن کے ذہن میں یہ ایرانی تصور رچا بسا تھا کہ بادشاہت قادر مطلق کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اور وہ مقدس ہوتی ہے لیکن پھر بھی ترکی ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی وہ نسلی حکومت کا تصور چھپا ہوا تھا شاید اسی لیے ہر قبیلے کے سردار میں ایک بادشاہ چھپا بیٹھا تھا۔ وراثتی حق مسلسل فرماں روائی کی ضمانت نہیں تھا۔ یہاں تک کہ قابل اور طاقت ور حکمرانوں نے بھی اپنی استبدادی حکومت پر پردہ ڈال کر قانونی آرا کی تشفی حاصل کی اور اسلام کے ذاتی اصولوں کی انتہائی تعظیم و تکریم کی۔ سلطان کے ان اختیارات کے لیے ہندوستانیوں کی طرف سے مخالفت کا کوئی خدشہ نہیں تھا کیوں کہ ہندو بادشاہ بھی قادر مطلق کی طرف سے مقرر کیا ہوا افراد تھا اور اس کی شخصی حکومت بھی دھرم کی پابندی کرنے اور بغاوتوں کی روک تھام کرنے کے لیے عملی ضرورتوں تک محدود تھی۔

سلطان دراصل مملکت کی ہر چیز کے لیے ایک محرک طاقت تھا۔ اپنے غیر مذہبی یا دنیوی فرائض وہ خود انجام دیتا تھا۔ لیکن وہ مسائل جن کا تعلق مسلمانوں کے ذاتی یا مذہبی قانون سے ہوتا تھا وہ مقدس ہستی، شیخ الاسلامؒ کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔

سلطان کے بعد اعلیٰ تنظیمی عہدہ وزیر کے سپرد تھا۔ حکومت کے چار ستون تھے

اور وزیر بنیادی طور پر ان میں سے ایک ہوتا تھا۔ لیکن وزیر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے اس کا عہدہ دوسروں سے کسی قدر افضل تھا۔ اس کو عام طور سے نظام الملک، معید الملک، صدر الملک یا عین الملک کہا جاتا تھا اور اس کا تقرر "اہلِ قلم" میں سے ہوتا تھا جو اہل سیف سے الگ ہوتے تھے۔[3] اور اسے دوسرے تمام وزرا کی نگرانی کا اقتدار حاصل تھا۔ یعنی وہ اگر چاہے تو دوسرے تمام شعبوں کے اعلیٰ افسران کو ٹھکرا سکتا تھا یا انھیں رد کر سکتا تھا جس کی مثال وزیر مہذب الدین نے ترکوں کے سارے اختیارات ضبط کر کے پیش کی تھی۔ عام طور پر وزیر کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے اپنی کارروائی کی سلطان سے اجازت حاصل کرے۔ بظاہر عدلیہ کی کارروائیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وزیر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اس کی نگرانی کی ذمہ داریوں میں تنظیم قائم کرنا اور فوج کی سپہ سالاری ضرور شامل تھی۔[4] وزیر مالیات ہونے کی حیثیت سے فوج کی تنخواہ دینے والا عملہ بھی اسی کے ماتحت تھا۔ کبھی کبھی تو وہ میدانِ جنگ میں فوجوں کی قیادت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔[5] سلطان کا مشیر خاص ہونے کی وجہ سے وہ کسی وقت بھی بادشاہ تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ اُسے غالباً مقررہ تنخواہ ملتی کیوں کہ اس کے معاملے میں کسی قسم کے محاصل کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ کہا جاتا ہے کہ مہذب الدین نے کول کے اقطع کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا اس حرکت کو ناجائز قرار دیا گیا تھا بلکہ بادشاہ کے امتیازات، "فیل اور نوبت"، کے اپنانے کو بھی قبیح بے جا سمجھا گیا تھا۔[6] تاہم محمد بن تغلق کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے قلق آشندی اور شہاب الدین عباس ایک ایسے باج گذار علاقے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جو شہزادوں کی گذر بسر کے لیے عطا کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صوبہ عراق کے برابر تھا جس سے وزیر مستفید ہو رہا تھا۔ وزیر کے مددگاروں اور کلرکوں کے پاس بھی شہر اور دیہات تھے جو ان کی تنخواہ کے علاوہ تھے۔ ان میں سے کم سے کم تنخواہ پانے والے کو بھی دس ہزار ٹنکے ہر سال ملتے تھے۔[7] یہ باتیں بعید از قیاس ہونے کے علاوہ، چوں کہ تیرھویں صدی کی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہو۔ وزیر کی مدد کرنے کے لیے نائب ہوتا تھا جسے عام طور سے اعلیٰ جگہوں پر ترقی دیدی جاتی تھی۔[8] الماوردی بیان کرتا ہے کہ بنیادی طور پر وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود وزیر التفویض

کے اختیارات وزیرِ اعلیٰ سے کہیں زیادہ ہوتے تھے۔[9] مملوک عام طور پر ایک وقت میں صرف ایک وزیر رکھا کرتے تھے۔ لیکن منہاج کہتا ہے کہ معز الدین کے تین وزیر تھے۔[10] ایک ضابطہ پرست منتظم ہونے کے باوجود، التمتش کی موت کے بعد اس کی اہمیت بہت کم ہوگئی تھی جبکہ امیر حاجب، وکیل دار یہاں تک کہ نائب مملکت کو اس پر غلبہ حاصل ہوگیا تھا۔ کم از کم عملی طور پر وہ محض مالیات اور محاصل کے محکمہ کا افسرِ اعلیٰ ہو کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ سند وزارت (وزیر اعظم کا محکمہ) اب بھی اس کے پاس تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اختیارات میں صرف دیوان وزارت تھا جو ہمیشہ اس کے ہی پاس رہا۔ اپنے صیغۂ حال کے کارندوں کے ذریعہ وہ غیر درج شدہ زمینوں کا لگان (خالصہ) اور آسامیوں سے خراج وصول کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کا سب سے بڑا کام صوبائی گورنروں کے حساب کتاب کو جانچنا اور فاضل محصول وصول کرنا تھا چاہے اس کے لیے تشدد کا استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس کے تحت کلرکوں کی ایک پوری فوج کام کرتی تھی۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال کا محکمہ دو افسران کے تحت تھا مشرفِ ممالک اور مستوفی ممالک جن کے کام سلطنت کے چیف اکاؤنٹنٹ اور آڈیٹر جنرل کے مماثل تھے۔[12] اس کے صیغۂ مال کا عملہ، عامل، کارکن اور متصرف پر مشتمل تھا۔[13] سرکاری انتظامیہ کی ابتدائی ایام ہی پر دیوان وزارت کے کام بڑے مکمل رہے ہوں گے۔ فخر مدبر نے وزیر کی تعریف کرتے ہوئے ٹھیک ہی کہا تھا "کہ وہ ایک انتہائی پیچیدہ محکمے پر حکومت کرتا ہے"[14] ہم نے سنا ہے کہ محمد تغلق کے وزیر اپنے ماتحت چار دبیر (سیکریٹری) رکھتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ماتحت تین سو کلرکوں پر مشتمل عملہ ہوتا تھا۔[15] فیروز تغلق کے دور کے بارے میں عفیف نے لکھا ہے کہ "اگر کوئی دیوان وزارت کے کاموں کو بیان کرنا چاہے تو اُسے پوری کتاب لکھنا پڑے گی۔"[16]

وزیر کے بعد جس شخص کی سب سے زیادہ اہمیت تھی وہ تھا عارض الممالک جو محکمہ فوج (دیوان عرض) کا سربراہ تھا۔ وہ فوجی متولی ہونے کے علاوہ اقطاع دار کا حاضری کا رجسٹر اپنے پاس رکھتا تھا، زنگہ وٹوں کی بھرتی کرنا اور لڑنے والی فوجوں کی کارکردگی اور اسلحہ کی دیکھ بھال بھی اس کے ذمے تھی۔[17] فوج کو تنخواہ دینے کا کام بھی اُسی کے ذمہ تھا۔ اس کا نائب جو ایک وقت میں ایک سے زیادہ بھی ہو سکتا تھا۔ معرکوں میں فوج

کے ہمراہ جاتا تھا۔ اس کا کام فوجوں کے لیے سامان فراہم کرنا اور ٹرانسپورٹ کا انتظام کرنے کے علاوہ مال غنیمت کی ذمہ داری سنبھالنا بھی ہوتا تھا۔[18] عریض وقتاً فوقتاً لڑنے والی فوجوں کا معائنہ کرتا تھا۔ اس کا مقصد سامان جنگ کی دیکھ بھال اور فوجوں کے عام مستعدی معائینہ کے علاوہ تنخواہوں کی تقسیم میں مدد کرنا اور گورنروں کے بھیجے ہوئے دستوں کو قبول کرنا بھی تھا۔ بلبن کا عریض عماد الملک، خود اپنی آمدنی میں سے فوجوں کو انعام بخشتا تھا۔ اس کی خاص طور پر اس لیے تعریف کی جاتی تھی کہ وہ اپنے کاموں کو انتہائی ایمانداری سے انجام دیتا تھا۔[19] سپاہیوں کی تنخواہ بڑھانے کے سلسلے میں اسے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اسے وزیر کے مالیاتی کنٹرول سے بھی آزاد کر دیا گیا تھا۔ برنی ایک جگہ لکھتا ہے کہ وہ اکثر اپنے اسٹاف کے لوگوں کی تواضع کیا کرتا تھا اور ان سے درخواست کرتا تھا کہ مقطی کے نمائندوں سے رشوت نہ لیں اور سپاہیوں کی تنخواہ میں خرد برد نہ کریں۔ یہ ایک ایسی برائی تھی جو اس کے زمانے میں غالباً عام تھی اور جیساکہ بعد میں پتہ چلا کہ یہ بیماری جڑ سے ختم بھی نہیں ہو سکی تھی۔ عریض کو غالباً تفویض کی صورت میں تنخواہ ملتی تھی کہا جاتا ہے کہ امداد الملک نے اپنے ذاتی اقطع میں سے بہت سے گاؤں عوامی فلاح کے کاموں میں دے دیئے تھے۔[20]

تیسری وزارت شاہی عملہ کا دفتر تھا جسے منہاج نے "دیوان اشرف" لکھا ہے لیکن جسے بعد میں اور عملی طور پر "دیوان انشاء" کے نام سے جانا جاتا تھا۔[21] اس عملہ کا کام دراصل شاہی اعلانات کے مسودے تیار کرنا، ان کو بھیجنا اور مقامی کارگزار افسران تک پہنچانا تھا۔ اس کے تحت دبیروں (سیکریٹریوں) کا ایک بڑا عملہ ہوتا تھا۔ ان کا قائد یا صاحب، صدر الملک کہلاتا تھا۔ بادشاہ کا ذاتی سکریٹری دبیر خاص کہلاتا تھا۔ اس کا کام بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا اس کے علاوہ وہ بادشاہ کی خط و کتابت کا انچارج ہوتا تھا اور فتح نامہ تیار کرتا تھا۔[22] صاحب دیوان انشا، بادشاہ کے بہت قریب ہوتا تھا اور سرکاری ریکارڈ اس کی تحویل میں رہتے تھے۔

کیقباد کو نصیحت کرتے ہوئے بغرا خاں نے ریاست کی چوتھی وزارت کو "دیوان رسالت" کا نام دیا تھا۔[23] اس کے کاموں کی نشان دہی نہیں کی گئی تھی لیکن 'رسالت' کا لفظ بیرونی اور سفارتی خط و کتابت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ

یہ وزارت ایک قسم کا امور خارجہ کا دفتر تھا جو ملک سے باہر متعین کیے جانے والے اور دوسرے ممالک سے آنے والے سفیروں اور ایلچیوں سے قریبی رابطہ قائم رکھتا تھا۔[24]

اِن مخصوص شعبوں کے علاوہ ایک بادید ممالک یعنی سلطنت کا چیف اخبار نویس تھا جس کے تحت متعدد برید کام کرتے تھے شہروں بازاروں اور تقریباً ہر آباد علاقے میں متعین تھے۔[25] یہ ہر اہم واقعہ کی خبر اپنے چیف کو دیتے تھے اور وہ انھیں سلطان تک پہنچاتا تھا۔ عوامی معاملات کی خبر دینے کے علاوہ وہ مقامی سرکاری لوگوں پر جاسوسی بھی کرتے تھے۔ درحقیقت باریدِ الممالک کا شعبہ خبر رسائی کے مخصوص سرکاری محکمے اور خفیہ معلومات حاصل کرنے والے محکمے کا مشترکہ شعبہ تھا۔[26]

ایک اور اہم شعبہ دیوان قضا (عدلیہ) کا تھا۔ جو قاضیٔ ممالک یعنی سلطنت کے چیف جسٹس کے تحت کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی شیخ الاسلام کا عہدہ بھی جو مذہبی امور کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ چیف جسٹس کے پاس ہی رہتا تھا۔ آخرالذکر حیثیت میں اُسے صدر جہاں یا صدرالصدور کیا جاتا تھا۔ یہ وہ عہدہ تھا جو اکثر وقائع نگار منہاج کے پاس رہ چکا تھا۔ مذہبی امور میں بادشاہ کا صلاح کار ہونے کے ناتے وہ تعلیمی اداروں کا ذمہ دار تھا جمعہ کی نماز پڑھاتا تھا اور مقامی مسجدوں کے لیے خطیب اور امام مقرر کرنے کا کام بھی اسی کے ذمے تھا۔

وہی احتساب کی تنظیم کا فائدہ بھی تھا جس میں محسبوں (سرکاری افسر اخلاقی پابندی لگانے والے) کا ایک بڑا عملہ کام کرتا تھا۔ یہ محتسب تمام مسلم علاقوں میں تعینات کیے جاتے تھے۔ عدلیہ کا صدر ہونے کی وجہ سے عدلیہ کے ارکان کی بھرتی اور تقرر کے علاوہ علاقی اداروں کے کام کی دیکھ بھال بھی صدر ہی کو کرنا پڑتی تھی۔

نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے شعبوں میں امیر بحر کا محکمہ تھا[27] جس کے تحت اندرونی جہاز رانی اور دریائی راستوں کا انتظام تھا۔ اسلح خانہ (زراد خانہ (ZARRAD KHANA) شہنا یعنی سپرنٹنڈنٹ کے ماتحت تھا جو واضح طور پر وزارت لشکر سے منسلک تھا۔[28] ایک خازن بھی ہوتا تھا جو وزیر کے احکام کے مطابق کام کرتا تھا۔[29]

یہ تمام ادارے مرکزی حکومت کے تھے اور سیاسی تبدیلیوں کا ان پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ حکومت کی پالیسی پر اگر کوئی اثر پڑتا تھا تو وہ تخت شاہی کی جانشینی سے زیادہ دربار کے مخصوص عہدوں پر کسی کے فائز ہونے سے ہوتا تھا۔ تمام استبدادی حکومتوں کی طرح

بادشاہ کا محل ایک ایسا محور ہوتا تھا جس کی طرف انتظامیہ کا ہر فرد رجوع کرتا تھا اسی لیے قدرتی طور پر محل میں کام کرنے والے زیادہ حیثیت اور طاقت کے مالک ہوتے تھے۔

مملوکوں کا ایک ایسا ہی افسر امیر حاجب تھا۔ جسے ملک الحجاب اور شریف الحجاب[30] بھی کہتے تھے۔ وہ تمام رسومات کا سربراہ تھا۔ اس کے ذمے دربار کے آداب بھی نافذ کرنا تھا۔ وہ ایک درمیانی آدمی تھا جس کے توسط سے بادشاہ سرکاری لوگوں اور عوام سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بادشاہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے متعدد حاجب اور نقیب ہوتے تھے جو بادشاہ کے ساتھ چلتے تھے۔ اس کے ذاتی اتاشی کو خاص حاجب کہا جاتا تھا۔ چیف کی مدد کے لیے ایک نائب ہوتا تھا جو خود ایک معزز امیر ہوتا تھا۔ برنی کے عہد میں امیر حاجب، باربک کے نام سے مشہور تھا۔[31]

امیر حاجب کو بادشاہ کی ذات سے بہت قربت تھی اور اگر بادشاہ کمزور یا کم سن ہو تو وہ ڈکٹیٹر بھی بن سکتا تھا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ایبک، التتمش اور بلبن کے دور میں حاجب یا اس کی سرگرمیوں کا ذکر زیادہ نہیں سنتے۔ یہ عہدہ دراصل دربار کے مخالفت فرقوں کے درمیان تنازعہ کی ہڈی کی مانند تھا۔ کسی نئے گروہ کے غالب ہونے سے جب حکومت بدلتی تھی تو امیر حاجب جیسے عہدوں پر تبدیلی ناگزیر ہو جاتی تھی۔ 1253ء میں بلبن کی معزولی پر بھی اس کے بھائی کاشلی خاں کو امیر حاجب کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ رضیہ کے حاجب ایتگن نے بھی اپنے عہدہ کا فائدہ اٹھا کر اس سازش میں اہم کردار ادا کیا تھا جس کی وجہ سے رضیہ کا زوال ہوا تھا۔ بہرام کے حاجب بدرالدین سنقار نے نہ صرف وزیر پر فوقیت حاصل کر لی تھی بلکہ بادشاہ کی منظوری کے بغیر احکامات جاری کرنے کا حق بھی لے لیا تھا۔

انتظامیہ کے نقطۂ نظر سے وکیل دار کی اہمیت بھی بہت تھی۔ وہ بھی محل کا افسر ہوتا تھا۔ اس عہدے کا ذکر، سب سے پہلے محمود کے عہد میں ملتا ہے۔ جب نوٗ دولتے ریحان نے اس عہدے پر خود اپنا تقرر کر لیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس عہدے کا وجود پہلے ہی سے ہوگا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کا ذکر کرتے ہوئے منہاج کہتا ہے "محل کے معاملات کا رخ مقرر کرنے کا کام ریحان نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔[33]" اور ایسا

لگتا تھا جیسے کہ وہ بادشاہ کے شاہی عملے کا منتظم اعلیٰ یا پھر غزنوی صاحب دیوان وکالت کا جانشین ہو۔[34] اس کے فرائض اور اس کے اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے فخر مدبر لکھتا ہے کہ وہ ایک ایسا عہدہ دار تھا جس کی تعظیم و تکریم کرنا خاندان کے ہر فرد کے لیے ضروری تھا۔[35] سیاست نامہ میں تو یہاں تک لکھا ہوا ہے کہ شاہی خاندان کے بچوں کی تعلیم کی دیکھ بھال بھی اُس کے ذمے تھی۔[36] اس طرح وکیل دار دراصل بادشاہ کا داروغہ یا شاہی خاندان کا محاسب ہونے کی وجہ سے مغل میر سامان پر سبقت رکھتا تھا۔ امیر حاجب کی طرح وکیل بھی بہت زیادہ طاقتور تھا اور اگر محمود اور کیقباد جیسے کمزور بادشاہ ہوں تو وہ خود ڈکٹیٹر بن سکتا تھا۔ اس کا ایک نائب بھی تھا لیکن اس سے اور چھوٹے وکیل نہیں تھے۔[37]

دربار سے متعلق ایک اور افسر ہوا کرتا تھا جسے سر جاندار کہتے تھے۔ بادشاہ کے محافظین جاندار کہلاتے تھے جو سر جاندار کے تحت کام کرتے تھے۔ جانداروں کی اکثریت بادشاہ کے نوجوان غلاموں پر مشتمل ہوتی تھی۔ سر جاندار اعلیٰ خاندان کا تنخواہ پانے والا افسر ہوا کرتا تھا۔[38] ایسا لگتا ہے کہ ایک وقت میں کئی کئی سر جاندار ہوا کرتے تھے جو غالباً مختلف جماعتوں کی سربراہی کرتے تھے۔[39] ان کا خاص کام بادشاہ کی جان کی حفاظت کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح جاندار بادشاہ کے ملازمین کا ایک لازمی حصہ ہوتے تھے۔ طبقات ناصری کی ایک عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ سزا یافتہ مجرمین علاوہ جنگی قیدیوں کی نگرانی، سزا اور سرزنش کا کام بھی سر جاندار کے ذمہ ہوا کرتا تھا التمش نے ملک ایبک کو اس عہدے پر معمور کرنے کی پیش کش کی تھی لیکن اُس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ " بادشاہ سلامت۔ اپنے غلام کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ ایذا رسانی والے محکمے کی ذمہ داری سنبھالے۔ جب کہ اس کا مخلص اور خاکسار غلام نہ تو خون خرابہ کر سکتا ہے نہ کسی کو ایذا پہنچا سکتا ہے مسلمان اور دوسری رعیت کو تو قتل ہی کر سکتا اور ان سے زبردستی روپیہ وصول کر سکتا ہے۔[40]

خاندانی عملہ کے اعلیٰ افسران میں امیر آخور اور اس کے نائب[41] اور شہنائے پیلان[42] بھی ہوتے تھے۔ ایک امیر شکار ہوتا تھا جو بادشاہ کے شکار کے محکمے کا سربراہ تھا جس کے تحت متعدد لوگ کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کا کام شکار کرنے والے مختلف

جانوروں اور پرندوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔[43] روزناموں میں دوسرے اور متعدد عہدے داروں کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن اُن کے کام اتنے چھوٹے تھے کہ جن کی اہمیت انتظامی امور سے زیادہ دکھاوے اور شان و شوکت کے لیے تھی یہ عہدے عام طور پر نئے خریدے ہوئے غلاموں کو دیئے جاتے تھے جہاں وہ اہم ذمہ داری سنبھالنے والے عہدوں کے لیے تربیت پاتے تھے[44]

بادشاہ کے لیے ایک قسم کی مشاورتی مجلس تشکیل کی گئی تھی جو امیر حاجب اُس کے نائب، وزیر، عریض (ARIZ)، وکیل دار اور دہلی کے کوتوال پر مشتمل تھی[45] تاہم اس کے کاموں کا تعین سلطان کی مرضی پر منحصر تھا کسی قسم کا باضابطہ کام اُس کے سپرد نہیں ہوتا تھا عام طور پر غیر سرکاری لوگوں سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا۔ مشورہ دینے والے افسر اور غیر سرکاری لوگوں کی اس جماعت کو ارکانِ دولت کہا جاتا تھا۔ لغرا خاں کو ان مشیروں کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے خاص طور پر ہدایت دی گئی تھی[46] کیقباد سے بھی کہا گیا تھا کہ وہ تمام سرکاری مسائل پر اپنے چار وزراء کی کابینہ سے مشورہ کر لیا کرے۔ یہ کابینہ وزیر، عریض اور دیوان انشاء اور رسالت کے قائدین پر مشتمل تھی[47]

یہ عملے حسب قاعدہ کام کرتے تھے اور سلطنت کی مالیت پر ان کا بالواسطہ یا ذاتی رسوخ کی بنا پر اثر پڑتا تھا۔ خاندانی عملوں میں تقرر کے لیے اعلیٰ حکام سے مشورہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ تاہم یہ اختیار نائب ممالکت کے عملے کے لیے وقف تھا۔ اس عہدے کو ترکی ذہن کی اپج نے خاص طور پر اختراع کیا تھا۔ نائب فرماں روا کی حیثیت سے اس کے اختیارات الموردی کے وزیر التفویض سے بھی زیادہ بڑھ گئے تھے[48] نائب جب اپنے مکمل اختیارات کا استعمال کرتا تھا تو وہ فرماں روا سے بھی زیادہ بڑا ہو جاتا تھا۔ بلکہ عملی طور پر بادشاہ کی جگہ لے لیتا تھا۔ وزیر در اصل ضابطہ پرست حاکم ہوتا تھا۔ اور مخصوص اختیارات کی عدم موجودگی میں اُسے پالیسی کے معاملات میں دخل دینے کی آزادی نہیں تھی۔ لیکن نائب حکومت کے تمام معاملات کو کنٹرول کرتا تھا اور تمام ہدایات جاری کرتا تھا۔ آئینی طور پر اسے کلّی اختیارات کے علاوہ شاہی حقوق بھی حاصل تھے۔ جن حالات میں اس عہدہ کو قائم کیا گیا تھا اس سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی

ہے کہ یہ دراصل اعلیٰ ترین قانونی اختیارات دینے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ یہ عہدہ درحقیقت ترکی فوجی افسروں کی تخلیق تھا جنھوں نے رضیہ کو ہٹانے کے بعد اپنے اقتدار اور غلبہ کو محفوظ رکھنے کے لیے بادشاہ کو ان اختیارات سے دست بردار ہوتے پر مجبور کیا تھا۔ بہرام سے جبراً یہ بات تسلیم کرائی گئی تھی کہ وہ ایتگن کو کم از کم ایک سال کے لیے اپنا نائب مقرر کرے گا اور ایک حکم نامہ جاری کر کے ساری سلطنت کا کنٹرول اُس کے ہاتھ میں سونپ دے گا۔[49] ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں، ایتگن کا ''نوبت اور ہاتھیوں'' جیسے شاہی نشان امتیاز کو استعمال کرنا کوئی غیر متوقع عمل نہیں تھا بہرام کے زوال کے بعد یہ عمل ایک دفعہ پھر دہرایا گیا۔ اس دفعہ مسعود کے نائب نے ان ہی تمام اختیارات کو استعمال کیا۔ تاہم اس موقعہ پر شخصی عنصر غالب رہا۔ عملی طور پر جو اختیارات نائب کو حاصل تھے اُن کو نئے امیر حاجب بلبن کی اعلیٰ ترین قابلیت اور ہوشیاری نے پس پشت ڈال دیا۔ لیکن بعد ازاں جب خود بلبن نے اس عہدے کو سنبھالا تو نائب کے مکمل اختیارات پر عمل درآمد ہونے لگا اور محمود آخر وقت تک آئینی طور پر ایک ایسے بادشاہ کا رول ادا کرتا رہا جس کے پاس کوئی اختیار نہ ہو۔ یہاں پر قیاس آرائی کرنے کو جی چاہتا ہے اگر ضروری سلسلہ سلاطین کا وجود ہوتا اور سیاسی تسلسل بھی نہ ٹوٹتا تو کچھ مدت گزرنے کے بعد نائب کی موجودگی کا نتیجہ شاید آئینی بادشاہ اور ایک نمائندہ وزیر اعظم کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ غزنی کے محمود اور مسعود[50] نے امراء کے نامزد کیے ہوئے لوگوں کے تقرر کی ایک روایت بنا دی تھی اور اس طرح بالواسطہ طور پر انھیں حکومت کو چلانے میں حصہ دار بنا دیا تھا۔ سلسلۂ سلاطین کا تسلسل ہندوستان میں اتنی مدت تک کبھی قائم نہیں رہا کہ وہ ایک سیاسی روایت کا روپ دھار لیتا۔ اس کے علاوہ نیا نائب خود بلبن بنیادی طور پر شہنشاہیت پسند تھا اس لیے اس کے تخت نشین ہونے کا مطلب اس نئے تجربہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ تھا۔

نائب کے عہدے کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ اس سے کچھ دنوں تک کام تو ضرور نکالا گیا لیکن اُسے اپنے مسلمہ اختیارات کو مکمل طور پر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ بلبن چوں کہ تمام محکموں کے قائدین سے براہ راست تعلق رکھتا تھا اس لیے وزیر

ایک غیر اہم کارکن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے نائب کوتوال فخر الدین کی حیثیت محض ایک ایسے نمائندے کی تھی جو بادشاہ کے حکم پر عمل کرتا تھا اور جب بادشاہ لکھنوتی کی مہم پر جایا کرتا تھا تو کوتوال روزمرہ کے بندوبست کے کام کرایا کرتا تھا۔[51] ایسے موقعوں پر بھی اسے اہم کاموں کے سلسلے میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ اسے آخری فیصلے کے لیے بادشاہ کے پاس مراسلہ بھیجنا ہوتا تھا۔[52] کیومر کے لیے متعین کیے نائب کی حیثیت اس سے کہیں کم تھی جو آیتگین اور بلبن کو اپنے بادشاہِ وقت کے سامنے حاصل تھی۔ کیوں کہ اُسے صرف بادشاہ کی طرف سے اختیارات ہاتھ میں لینے کی اجازت تھی، اُسے الگ کرنے یا اس کی جگہ لینے کا اختیار اسے نہیں حاصل تھا۔[53] یہ محض قائم مقامی تھی۔ خلجی دورِ حکومت میں بھی نائب کی حیثیت بالکل یہی تھی۔ بلبن کی تخت نشینی کے بعد وہ نائب ختم ہو چکا تھا جو حکمرانی کی طاقت اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتا تھا یا بادشاہ کو پس پشت ڈال دیا کرتا تھا۔ اس عہدے پر آخری فرد بلبن تھا۔

حوالاجات

1۔ اس قسم کے کچھ سکوں کے لیے دیکھئے رائٹ، ص۔ 26 نمبر 48، 49۔
2۔ التتمش نے یہ عہدہ پہلے قطب الدین بختیار کاکی کو پیش کیا اور اُن کے انکار پر اُسے نجم الدین صغرا کو دیدیا۔ سید العارفین، صفحہ ذیل 57 اے۔ 1253 میں محمود نے جمال الدین بستامی کا تقرر کیا ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نے یہ عہدہ سنبھالا، منہاج ص ص۔ 220 اور 226۔
3۔ فخر مدبر۔ آداب الحرب، صفحہ ذیل 56 بی۔
4۔ فخر مدبر: آداب الحرب۔ صفحہ ذیل۔ 36 اور 53 بی۔ تیرھویں صدی میں وزیر کی عزت دوسرے افسروں کے مقابلے میں کم ہوگئی اور عام طور پر وہ محض انتظامیہ کا سربراہ ہوکر رہ گیا۔ بعد کے تعلق حکمرانوں کے زمانے میں اس کی طاقت اور اہمیت بڑھ گئی۔ اور وہ صحیح معنوں میں وزیر اعظم ہوگیا اور بذات خود افواج ساز و سامان کی نگہداشت کے علاوہ ان کا معائنہ بھی کرنے لگا۔ عفیف: تاریخ فیروز شاہی، ص 193، 442۔ دوسرے محکموں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کے اختیارات کا حصول مملوک حکمرانوں کے زمانے میں خارج از امکان کردینا چاہئے، بلبن نے تو فوج کے حسابات سے متعلق اس کے اختیارات بھی ختم کردیئے تھے۔ جیسا کہ اس کے بعد نظر آئے گا۔ م۔ بہ۔ قریشی: ص 78۔ 79۔
5۔ تاج المعاصر، صفحہ ذیل۔ 237 اے؛ منہاج، ص۔ 173۔
6۔ منہاج، ص۔ 198۔
7۔ SUBHUL - ASHA (صبح الاعشٰی) ۷، ص۔ 94۔ مسلم یونیورسٹی جرنل، علی گڑھ

جون 1935، ص 71 - 72 پر اسپائز (SPIES) کا انگریزی ترجمہ الیٹ، iii ص۔ 578 -

8- نائب وزیر کے فرائض کے لیے دیکھیے برنی، ص۔ 454 . ترقی کی مثالیں ہمیں مہذب الدین اور خواجہ خیر کے حالات زندگی سے ملتی ہیں۔ منہاج، ص۔ 187 . اور برنی ص۔ 24 -

9- الماوردی : ح۔ س، ص ص 21 - 24 - خدا بخش بھی دیکھیے ؛ کانٹری بیوشنس ٹو دُ ہسٹری آف اسلامک سولزیشن، ص ص 146 - 248 .

10- ص۔ 126 -

11- اس قسم کے فرائض کا کوئی صاف حوالہ تیرھویں صدی دستاویزوں میں نہیں ملتا لیکن خلجی اور تغلق تاریخ سے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ زمین کا لگان وصول کرنے کے سلسلے میں غیاث الدین تغلق کی اپنے وزیر کو دی گئی ہدایات کے لیے دیکھیے برنی، ص 424 - فیروز تغلق کے زمانے میں وزارت کے حسابات کی جانچ پڑتال کے کام سے متعلق حوالے کے لیے دیکھیے عفیف، ح۔ س، ص۔ 414 بعض اوقات صوبائی حکومتوں میں حساب کی جانچ کرنے والوں کو بھیجا کرتی تھی، ایسے ایڈیٹر محاسب کہلاتے تھے۔ 909 / 1309 میں مانک پور کے مقطع کے متعلق جس نے حسابات پیش کرنے اور بچے ہوئے مطالبے کو ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، محاسب کی رپورٹ کی نقل کے لیے دیکھیے امیر خسرو : اعجاز خسروی، صفحہ ذیل 106 S9

12- تیرھویں صدی کی تحریروں میں مشرف کا ذکر محاسب کی حیثیت سے نہیں کیا گیا ہے لیکن عفیف نے اس کے کاموں کو عرصہ سے وزارت سے متعلق بتایا ہے۔ ح۔ س، ص۔ 409- 410 - فیروز تغلق نے مستوفی کی اہمیت بڑھادی اور اُسے دیوان وزارت کے تمام محکموں میں مداخلت کرنے کا مجاز بنادیا، عفیف، ح۔ س، ص۔ 376 . مستوفی کی ماتحتی میں ایک اور عہدے دار 'وقوف' اخراجات کی مدوں کی جانچ کرتا تھا۔ یہ عہدہ فیروز خلجی نے قائم کیا تھا۔ مشرف کے یہاں عاملوں کے پیش کیے گئے حسابات کی جانچ کرنے کے لیے اس نے ناظر کا عہدہ

بھی قائم کیا تھا، عفیف: ح۔س، ص۔ 420 ۔

13۔ برنی، ص۔ 288۔ 289۔

14۔ آداب الحرب، صفحہ ذیل۔ 136 اے

15۔ عباس: مسالک الایسار، الیٹ، iii ص 578 ۔

16۔ ح۔س، ص۔ 420 ۔

17۔ برنی، ص۔ 61 ۔

18 ایضاً ص۔ 326

19۔ ایضاً ص ص۔ 115۔ 116۔

20۔ ایضاً ص۔ 117 ۔

21۔ منہاج، ص۔ 185 فیروز تغلق کے زمانے میں مشرف محاسب ہوتا تھا کیوں کہ اس زمانے میں چانسلر صاحب دیوانِ انشا کہلاتا تھا اور وزارت کا مرتبہ کھو چکا تھا۔ دیکھیے عفیف: ح۔س، ص ص 279 اور 409 ۔

22 تاج المعاصر و صفحہ ذیل 73 اے، 124 بی، برنی بھی دیکھیے، ص۔ 158 ۔

23۔ برنی، ص۔ 153 م۔ بہ۔ قریشی: ح۔س، ص۔ 84 ۔جس نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ یہ محکمہ مذہبی معاملات سے تعلق رکھتا تھا اور دیوانِ قضا سے متعلق تھا اور دونوں عہدوں کی صدارت (سربراہی) عام طور پر ایک ہی شخص کرتا تھا لیکن اس بیان کی تائید میں کوئی یقینی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے اور پہلے کے کسی تذکرے میں اس کا ثبوت ملتا بھی نہیں۔ ان کا یہ بیان کہ "دیوان رسالت مذہبی معاملات و متبرک ادارے (FOUNDATION) عالموں اور پارسا لوگوں کے وظائف سے متعلق تھا اور اس کا سربراہ 'صدر الصدور' ہوتا تھا۔" محض مفروضوں پر مبنی ہے. کیوں کہ اس سلسلے میں جو حوالے دیئے گئے ہیں۔ ان سے یہ نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ ان کی انوکھی تشریح کہ رسالت کی اصطلاح جو غزنوی محافظ خانے (CHANCELLARY) کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسے مملوکوں نے کیوں مذہبی محکمے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا، بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دراصل مملوکوں نے پنجاب کے غزنوی اداروں (دستور) میں بہت کم تبدیلی کی

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایشیا کی دوسری مسلم حکومتوں میں رائج انتظامی روایات کو ہی اپنایا۔ محمود غزنوی کے زمانے میں اس محکمے کے کاموں کے لیے دیکھیے ناظم: محمود آف غزنہ، ص۔ 142-143-

24- سفیروں کی روانگی سے متعلق قوانین کے لیے دیکھیے۔ فخر مدبّر: آداب الحرب، صفحہ ذیل 147 اسے۔

25- برنی، ص۔ 24 اور 38-

26- دیکھیے سیاست نامہ، ص ص۔ 57، 58 اور 65 زعوفی: جوامع الحکایات صفحہ ذیل 319-

27- منہاج، ص۔ 258-

28- ایضاً، ص 254 برنی کے زمانے میں اسے اصلاح خانہ کہتے تھے اور اس کا افسر و سرِ صلاح دار، فوج کا منصب دار ہوتا تھا، برنی، ص۔ 24-

29- منہاج، ص۔ 249،

30- ایضاً، ص۔ 249؛ برنی، ص، 527-528-

31- برنی، ص ص۔ 34-36- اور 61-

32- منہاج، ص-193

33- ایضاً 298، ریورٹی کا ترجمہ، ص۔ 827-

34- ناظم: ح۔ س، ص۔ 147-

35- آداب الحرب، صفحہ ذیل۔ 42-43-

36- ص۔ 82-

37- برنی، ص۔ 36-

38- منہاج، ص۔ 237 التتمش کے زمانے میں اس کا مشاہدہ تین لاکھ جتیل تھا۔

39- دیکھیے منہاج، ص۔ 236 اور 252-

40- ایضاً۔ ص۔ 237-

41- منہاج، ص۔ 247۔

42 ایضاً، ص۔ 54-

44۔ ایسے عہدے، چشن گیر (کھانا چکھنے والے) ساقیٔ خاص، (مشروب پہنچانے والا) دوات دار، (قلم دان رکھنے والا) بہلہ دار وغیرہ کے تھے۔ التتمش کے عہد میں 'امیر مجلس'، کا ذکر بھی ملتا ہے۔ منہاج، ص۔ 238 ۔

45۔ برنی، ص۔ 36 اس میں کوتوال کی شمولیت اس کی ذاتی خصوصیات اور بلبن کا خاص دوست ہونے کی وجہ سے تھی اس کا عہدہ غالباً اس کی رکنیت کا باعث نہیں ہو سکتا۔

46۔ برنی، ص۔ 81۔

47۔ ایضاً۔ ص۔ 153۔

48۔ دیکھیے مذکورہ بالا نوٹ۔ 9، م۔ بہ۔ قریشی، ص۔ 77۔ 78۔ جس کا خیال ہے کہ نائب وزیر خاص یعنی وزارت تفویض کا دوسرا نام تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نائب وزیر کے ساتھ ساتھ کام کرتا تھا اور اس لیے ایک علیحدہ انتظامی عہدیدار تھا۔

49۔ منہاج، ص۔ 253 ۔

50۔ احمد بن حسن المیمندی کے اخراج کے بعد محمود نے اپنے درباریوں سے نامزدگی کے لیے کہا ان‌ھوں نے چار ناموں کی ایک فہرست پیش کی۔ جن میں سے اس حسنک کا تقرر کر دیا، مسعود نے بھی یہی طریقہ اپنایا، دیکھیے۔ بیہقی تاریخ مسعودی، ص ص۔ 453۔ 454۔

51۔ برنی، ص۔ 86۔

52۔ ایضاً، ص۔ 87۔

53۔ ایضاً، ص۔ 181۔

گیارہواں باب

صوبائی بندوبست

مرکزی حکومت کے بارے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے آپ کو یہ ضرور محسوس ہوا ہو گا کہ مملوک سلطنت کو ایک غیر مرکزی نظام کی ضرورت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فوجی تسلط پر مشتمل ایک غیر مستحکم ڈھیلا ڈھالا ڈھانچہ تھا اور یہ سب علاقے کسی ایک سمت یا ایک متعینہ وقت میں قائم نہیں کیے گئے تھے۔ حالات سے مجبور ہو کر ان علاقوں کو کافی چھوٹ دی گئی تھی۔ اس رعایت کی ایک وجہ یہ تھی کہ بختیار جیسے لوگوں کی انفرادی شخصیت کی وجہ سے ترک سلطنت کو علاقائی وسعت حاصل ہوئی تھی اور مزاحمت کرنے والی ہندو طاقتوں سے تحفظ ملا تھا۔ قبضہ کرنے اور وسعت دینے کی کارروائی چونکہ کئی نسلوں تک جاری رہی تھی اس وجہ سے طرز حکومت کے سلسلے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں ہو سکی تھی۔

ان حالات کا لازمی نتیجہ ویسا ہی صوبائی بندوبست ہوا کرتا ہے جو مملوک عہد میں رائج تھا۔ مناسب آدمیوں کی کمی کی وجہ سے ساری سلطنت میں یکساں شہری بندوبست کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ نووارد ترکوں سے یہ امید رکھنا غلط تھا کہ وہ بندوبست کے روزمرہ کے مسائل اور جزئیات سے واقف ہوں گے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ایسے افسران مل سکتے تھے جن کو فوجی کاموں سے الگ کر کے اس کام پر لگا دیا جاتا تب بھی ان کے لیے تمام جزئیات کا جاننا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ گورنمنٹ کے موجودہ عملے کو باج گذار ریاستوں کے طور پر قائم رکھنے، فوجی مقبوضہ علاقوں کے اندر واقعے

دیہاتوں سے لگان وصول کرنے اس کا حساب کتاب اور دوسرے ضروری شہری کاموں کے لیے غیر مسلموں کو ملازم رکھنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ ایسے علاقوں پر براہ راست قبضہ رکھنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ جن کے بندوبست کے لیے بڑے پیمانے پر شہری اور فوجی عملے کی ضرورت ہو۔ حکمرانی کرنے والا طبقہ عام طور پر فوجی اڈوں اور بڑے شہروں میں جمع ہوجاتا تھا۔ دیہاتوں میں غیر فوجی مسلمانوں کا داخلہ بہت کم تھا یہ کام عام طور پر مبلغوں کے لیے مخصوص تھا۔ بجز فوجی جماعتوں، اور وہ بھی لڑائی کے دوران میں یا پھر کچھ تاجروں کے علاوہ، دیہاتوں کی غیر مسلم آبادی کا سرکاری لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ کم ازکم ابتدائی دور میں سرکاری بندوبست کا واحد مقصد نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ باقاعدہ طور پر لگان وصول کرنا ہوتا تھا۔ تاہم یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جوں جوں سال گزرتے گئے بندوبست کا یہ فلاحی (سرسری) طریقہ ختم ہوتا گیا — حکومت کی اجازت کے بغیر کام کرنا مقامی بندوبست کا اصول بن چکا تھا جسے خلجی حکومت نے ابتدا ہی میں ختم کر دیا۔ اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ سرکاری اجازت کے بغیر کام کرنے کی روش جو پوری صدی پر اثر انداز ہوئی تھی، ختم ہوگئی۔

اس لیے اگر ہمیں سب سے پہلی ہند مسلم حکومت کو دیکھنا ہے تو ہمیں باج گذار فرماں روا کے رتبے اور اختیارات کو دیکھنا ہوگا جس کے سپرد اقتدار اعلیٰ نے سلطنت کے بیشتر حصے کا عام بندوبست کر دیا تھا۔ تاہم روزنامچوں سے اس موضوع پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ روزنامچوں میں صرف اس کے جنگجو رویہ کے توسط سے جاگیردار حاکم کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ باجگذاری کی اوّلین شرط یہ تھی کہ وہ بہت باقاعدگی سے خراج پیش کرے گا۔ یہاں پر یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ لگان اور "جزیہ" دونوں چیزیں "خراج" کے تحت آتی تھیں اور جو وہاں کے باشندوں سے وصول کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اس کی فرماں روائی کو اس حد تک محدود کر دیا گیا تھا کہ اسے اپنے سکوں پر بادشاہ کا نام بھی لکھنا ہوتا تھا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی باج گذاری کے خاتمے کا بیّن جواز مل جاتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ذاتی سکوں کے اجزاء کا اختیار مکمل طور پر واپس لے لیا گیا تھا کیوں کہ اب تک تیرھویں صدی کے جتنے بھی سکے دستیاب ہوئے ہیں ان میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں اس تبدیل شدہ تابعداری

کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔ رنتھمبور کے ایک چوہان راج کمار (جسے تھامس نے چار دیوا بتایا ہے) کے کچھ سکوں پر التتمش (SAMASORALA-DENA یعنی شمس الدین کا نام ملتا ہے 1215 ء کے ایک اور راج کمار جیترا سنگھ کے ایک کتبے میں رنتھمبور کے ولانا دیوا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس میں ''جوگنی پور''[1] کے التتمش کا ذکر بھی ہے ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ کو کتبوں میں بھی تسلیم کرنا ضروری تھا۔ آسام کے راجہ نے 1255 ء[2] میں پیش کش کی تھی کہ اس کے دارالسلطنت میں مسلمان فاتح یُزبک کے نام پر خطبہ پڑھا جائے گا۔ اس مثال سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تابعداری کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ تابعدار یا آسامی کے لیے ضروری تھا کہ اس کی ہندو ریاست میں اگر کوئی مسلم بستی موجود ہے تو پھر وہ مسلم اقتدار اعلیٰ کا کم از کم علامتی طور پر ذکر کرے۔ بندوبست کی تفصیلات پر اگر کوئی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باج گذار حکمراں کو مکمل آزادی حاصل تھی شرط یہ تھی کہ وہ بادشاہ کے فرمانوں کا احترام کرے۔ اس ترمیم کے ساتھ اپنے سکوں کے اجزاء کی رعایت کے ساتھ غالباً اپنی سرحد کے اندر کسٹم ڈیوٹی وصول کرنے کا حق بھی اُسے حاصل تھا۔ عام طور پر تابعدار آسامی کو تخمینہ لگانے، زمین کا لگان وصول کرنے، عدول وانصاف اور مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہوتی تھی۔ تاہم محصول کا تخمینہ لگانے میں وہی اصول سامنے رکھنے ہوتے تھے جو سرکاری بندوبست کے علاقوں میں رائج تھے۔ لیکن یقین ہے کہ آسامی بننے کے لیے یہ شرط نہیں رکھی گئی ہوگی۔ بہرکیف ان سب باتوں کا انحصار خود بادشاہ کے وقار اور رتبے پر ہوگا جس کے رعب اور دبدبہ کو وقتاً فوقتاً بزور شمشیر منوایا جاتا ہوگا۔

سلطنت کی تقسیم کو ظاہر کرنے کے لیے روزناموں میں اقطاع اور ''ولایت'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اول الذکر لفظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے جس کے لغوی معنے ہوتے ہیں ''حصّہ''۔ تکنیکی اعتبار سے یہ لفظ مقامی بندوبست کی حدود کو واضح کر دیتا ہے[3] اقطاع کے معنی ہوتے ہیں ''تنظیمی حصّہ'' یہ لفظ وسط ایشیائی ریاستوں[4] میں مشتمل تھا جہاں سے ترکوں نے اسے اپنا لیا تھا۔ یہاں پر یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ اس لفظ کا جو ترجمہ ''جاگیر'' ریورٹی نے کیا ہے وہ گمراہ کن ہے کیوں کہ ''جاگیر'' کا لفظ جاگیر داری

نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں بادشاہ کا اعلیٰ آسامی اپنے علاقہ کا مکمل فرماں روا ہوا کرتا تھا۔ روزنامچوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نام نہاد مقطیع (MUQTIS) اُس سے کہیں زیادہ کنٹرول میں رکھے جاتے تھے جتنا "جاگیردار" کو ہونا چاہئے۔ اس کے باوجود ان کو فوجی معاملات میں اتنی آزادی دی جاتی تھی کہ آج کا ضابطہ پرست گورنر ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

بارھویں صدی کے اختتام پر نظام الملک طوسی نے مقطیع [۴۵] کی رہنمائی کے لیے مندرجہ ذیل اصول مرتب کیے تھے۔

مقطیع کو معلوم ہونا چاہئے کہ رعایا کے سلسلے میں ان کے اختیارات صرف یہ ہیں کہ وہ ان سے صحیح رقم یا مال حق پر امن طریقے پر وصول کریں۔ رعایا کی زندگی، اُن کی جائیداد اور ان کا خاندان سلطان سے براہ راست اپیل کرنا چاہتا ہو تو مقطیع کو اُسے روکنے کا حق نہیں پہنچتا۔ جو مقطیع ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہوا ملے گا، اُسے برخاست کر دیا جائے گا اور وہ سزا پائے گا۔ مقطیع اور ولی کے اوپر متعدد نگراں ہوتے تھے جیسے کہ بادشاہ مقطیع کا نگراں ہوتا ہے۔ عامل اور مقطیع کا ہر تین یا چار سال بعد تبادلہ کر دینا چاہئے تاکہ وہ بہت زیادہ طاقت ور نہ ہونے پائیں۔"

تاہم اس میں ان اختیارات اور ذمہ داریوں کا کہیں ذکر نہیں ملتا جن کا دوسرے سرکاری معاملات مثلاً فوج، محاصل اور عدلیہ سے تعلق ہو۔ لیکن سلجوق اور خوارزمی تاریخ میں ایسی مثالیں ضرور ملتی ہیں جہاں مقطیع خود اپنے فوجی دستے رکھتے تھے جن کو سامان حرب سے لیس کرنے اور پرورش کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے رقم خود ان کے اپنے صوبے کے محاصل سے لی جاتی تھی۔ ان اخراجات کے بعد جو رقم بچتی تھی وہ مرکزی حکومت کو دے دی جاتی تھی۔[۴۶]

ہندوستان میں بھی اس طریقے کو کافی حد تک استعمال کیا گیا۔ کیوں کہ یہاں بھی فوجی گورنرشپ کا طریقہ کافی عام تھا۔ مقطیع کا تقرر سلطان کرتا تھا اور اسی کی مرضی پر ان کے تبادلے یا برخاستگی کا انحصار ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ اپنے فوجی دستے رکھتا تھا جو پیادہ فوج اور گھوڑسواروں پر مشتمل ہوتے تھے اور ان دستوں کے اخراجات صوبے کے محاصل میں سے لیے جاتے تھے۔ اس پر اپنے صوبے کا نہ صرف دفاع بلکہ وہاں کے

امن وامان کو قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی ہوتی تھی۔ اس کے فوجی دستوں کو مرکزی حکومت کسی وقت بھی طلب کر سکتی تھی۔ حالانکہ مورخین نے یہ بات کہیں نہیں درج کی ہے وہ محاصل میں سے فوج اور انتظامی محکمے کے اخراجات نکالنے کے بعد باقی رقم اصولی طور پر مرکز کے حوالے کر دیتا تھا لیکن اس عمل کی تصدیق کے لیے مثالوں کی کمی نہیں ہے۔

1204ء میں معزالدین نے ماوراالنہر کی مہم کی تیاری کے سلسلے میں لاہور اور ملتان کے مقطیع کو بقایا محاصل روانہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔[7] برنی نے لکھا ہے کہ بلبن کا سب سے بڑا لڑکا شہزادہ محمد[8] جو سندھ کا وائسرائے تھا، اپنے صوبے کے محاصل کو ہر سال خود لا کر اپنے باپ کو دیا کرتا تھا۔[8] اگر ہم خلجی اور تغلق عہد کی مثالوں پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کڑا اور اودھ کے مقطیع، علاالدین نے فواضل یعنی بچے ہوئے محاصل کو "چندیری" پر پیش قدمی کرنے کے لیے گھوڑے خریدنے اور فوجی دستوں کو ملازم رکھنے پر صرف کرنے کی اجازت مانگی تھی۔[9] مقطیع اور والی کا یہ فرض ہوا کرتا تھا کہ وہ صوبے کے محاصل کا حساب کتاب وزارت مالیات (دیوان وزارت) کے سامنے پیش کیا کرے۔ اس کے ثبوت کے لیے غیاث الدین تغلق کا وہ حکم موجود ہے جو اس نے نئے تقرر کیے جانے والے افسروں کو دیا تھا۔ اس نے کہا تھا "اگر تم چاہتے ہو کہ دیوانِ وزارت تم سے بازپرس نہ کرے تو پھر تمھیں لالچ اور طمع سے گریز کرنا چاہیئے۔ اقطاع سے تھوڑا سا لو اور پھر اس رقم سے اپنے اخراجات پورے کرو، اور اپنے فوجی دستوں کا خرچ نکالو۔ اپنے فوجیوں کی تنخواہ سے ایک پیسہ بھی نہ لو۔" مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مقطیع کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کتنی باریک بینی سے کی جاتی تھی۔ "مقطیع روپے پیسوں میں خیانت اور حساب کتاب میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اقطاع میں سے اپنے مقررہ حصے سے زیادہ لے گا اُسے بیڑیاں ڈال کر قید کر دیا جائے گا۔"[10]

اس بات کا اندراج کہیں نہیں ملتا کہ مقطیع کو کتنی تنخواہ (مواجب) ملتی تھی لیکن اسے یقیناً محاصل میں سے حصہ دیا جاتا ہوگا۔ بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں۔[11] جہاں اپنی آمدنی کو بڑھانے کے خیال سے مقطیع نے اپنے صوبے کی علاقائی سرحد کو بڑھانے کے لیے نہ صرف ہندو علاقوں کو فتح کیا بلکہ اپنے پڑوسی اقطاع کے ایک

حصے یا پورے اقطاع کا اپنے علاقے سے الحاق کرلیا۔ اس حقیقت سے اندازہ ہوتا تھا[12] کسی مقطیع کو بڑے اقطاع سے چھوٹے اقطاع پر تبادلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ بجز اس کے کہ کسی کو سزا دینا مقصود ہو جیسا کہ کبیر خاں کو التتمش نے ملتان سے بلا کر ایک چھوٹے سے اقطاع "پلول" بھیج دیا تھا۔[13] یا پھر 1253ء/651ھ میں بلبن کے دربار سے نکالے جانے پر کشلو خاں کو ناگور کے وسیع اقطاع سے نکال کر کڑا[14] جیسی چھوٹی جگہ پر بھیج دیا تھا۔ یہاں پر ایک بات غور طلب ہے یہ ٹھیک ہے کہ مقطیع کو محاصل کا ایک مخصوص حصہ ملتا تھا لیکن اس کی مالی حالت متوتی (اقتدار) سے مختلف تھی جس پر مرکزی خزانے کے لیے کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ یہ حقیقت اُن دو ہزار شمسی متولیوں کی حیثیت سے بالکل واضح ہو جاتی ہے جنھیں فوجی خدمات کے سلسلے میں دیہاتوں کے محاصل بطور تنخواہ دیدیے گئے تھے۔[15] اسی فہرست میں بختیار کے اقطاع کا نام بھی آتا ہے جو اُسے اودھ کے مقطیع نے غلط کیا تھا۔[16] اسی قسم کی غیر فوجی مراعات سلطنت قاضیوں اور شہر کے امیر دار کو بھی دی گئی تھیں۔

صوبے کے شہری اور فوجی انتظامات میں مقطیع کی ذمہ داریوں کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ فتح کا نتیجہ چوں کہ فوجی قبضے کی صورت میں نکلتا تھا اس لیے صوبائی دستوں کی قیادت اور ان کی نگہداشت کا کام مقطیع کے بنیادی فرائض میں داخل ہوتا تھا۔ ہندوؤں اور بیرونی حملہ آوروں سے لڑنے کے سلسلے میں اُسے بہت زیادہ آزادی حاصل تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شاہی فوجیں اُسے جس جگہ طلب کریں وہ فوراً اپنے فوجی دستوں کو لے کر مدد کے لیے پہنچ جائے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُسے بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ یوں تو تمام مقطیع کے لیے فوجی خدمت ضروری تھی لیکن عام طور پر دہلی کے آس پاس کے علاقوں کے مقطیع کو حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا تھا۔

برنی کے ایک اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ تغلق کی مرکزی حکومت نے صوبائی فوج کی تعداد، ہتھیار اور تنخواہ مقرر کر دی تھی اور مقطیع کو اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔[17] لیکن خیال یہ ہے کہ یہ طریقہ گزشتہ روایات کا تسلسل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ تیرھویں صدی کی شخصی آزادی یا خود اختیاری حکومت اس پابندی کا جواز نہیں پیش کرتی۔ علاءالدین کی قائم کردہ مرکزیت سے پہلے ایسی

کوئی مثال نہیں ملتی جہاں فوجی نظام میں اس طرح کی روزمرہ کے احکام کی تقسیم کی گئی ہو۔ بلبن نے سمانا اور سنام کے مقطیع لبغرا خاں کو ہدایت دی تھی کہ وہ نئے رنگروٹ بھرتی کرکے صوبائی فوجوں کی موجودہ تعداد کو دوگنا کردے۔ اور فوجیوں کی تنخواہ میں اضافہ کردے۔[18] اس نے لبغرا خاں پر یہ بھی زور ڈالا تھا کہ وہ اپنے تمام فوجی معاملات کی تفصیلی خبریں دیتا رہے۔ "فوج پر جتنا بھی روپیہ خرچ ہو اُسے زیادہ نہ تصور کیا جائے اور تم اپنے بھرتی کرنے والے افسر عریض کو اس کام میں لگائے رکھو کہ وہ موجودہ فوجیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ نئے فوجیوں کو بھی بھرتی کرتا رہے اور اس محکمے پر خرچ ہونے والے تمام اخراجات سے باخبر رہے"[19] صوبائی فوجوں کی تعداد کا ذکر کسی جگہ نہیں ہے غالباً اس کا انحصار متعلقہ صوبے کے محاصل پر ہوگا۔ مقطیع کا ایک اپنا فوج فراہم کرنے والا افسر ہوتا تھا جسے عریض کہتے تھے۔ مرکزی حکومت میں اُس کا نائب اس کی نمائندگی کرتا تھا۔[20]

اس بات کا اظہار کسی جگہ نہیں ہوتا کہ صوبے کے محکمہ عدلیہ کا انتظام بھی اُسی کے ذمّہ تھا یا خود اسے جج کے فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔ بڑے شہروں اور فوجی اڈوں والے علاقے میں نظم وضبط قائم رکھنے کے عام فرائض کے علاوہ اس کا کام یہ بھی ہوتا تھا کہ کسانوں اور ہندو سرداروں سے لگان وصول کرکے بادشاہ کے حصے میں اضافہ کرے۔ بڑے شہروں اور فوجی اڈوں میں نظم وضبط کا کام اس کا اپنا متعین کیا ہوا کوتوال بھی کرسکتا تھا۔ اس عہد میں مسلمان کسانوں کے وجود کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے شہروں میں ایسے زمیندار ضرور موجود تھے جنھیں خراج ادا کرنا ہوتا تھا۔ کسانوں کی اکثریت ہندوؤں کی تھی اور بیشتر صوبوں میں وہ اپنا لگان گاؤں کے مکھیا کے ذریعہ جسے مقدّم یا چودھری کہا جاتا تھا ادا کرتے تھے۔[21] ہندو سردار مقطیع کے ماتحت ہوتے تھے جبکہ دوسرے اور لوگ براہ راست دیوانِ وزارت میں روپے کی ادائیگی کرتے تھے۔

مقطیع عام طور پر صوبے میں رہا کرتے تھے لیکن بعض جگہوں پر خصوصاً دارالسلطنت کے قریبی صوبوں میں غیر حاضر باش صوبے دار ہوتے تھے اور بندوبست کا کام اُن کے نائب کرتے تھے۔ جنھیں عام طور پر مرکزی حکومت متعین کرتی تھی۔[22] بہرام کے عہد میں جب ہندو خاں دربار میں واپس آگیا تو وہ اُچھ پر اپنے نائب کے ذریعہ حکومت

کرتا تھا۔[23] بلبن جو پہلے امیر حاجب تھا نائب مملکت ہونے کے بعد جب دربار میں اس کی مستقل حاضری ضروری ہوگئی تو وہ ہانسی اور سوالکھ کے اقطاع کا بندوبست یقیناً اپنے نائب کے ذریعہ کرتا ہوگا۔ 1253ء میں اس کی معزولی کے بعد ہانسی کو محمود کے نابالغ لڑکے کے سپرد کر دیا گیا۔[24] ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں نائب کی موجودگی ناگزیر رہی ہوگی۔ بڑے صوبوں کے مشیروں اور بیرونی چوکیوں کے لیے نائب کا تقرر خود مقطیع کیا کرتا تھا۔ غالباً اسی قسم کے نائب صوبے داروں کی فہرست میں علی مردان کے نارنگولی اور بنگال میں حسام الدین عیوض کے گنگوری اقطاع آتے تھے۔[25] مقطیع کو اپنے افسران کو زمین دینے کا اختیار حاصل تھا۔ اودھ کے گورنر نے بختیار کو فوجی اقطاع دیا تھا۔ خود بلبن نے بغرا خاں کو اپنے وفادار افسروں کو اقطاع دینے کا مشورہ دیا تھا۔ مقطیع کو سلطان کی طرح مفت زمین تقسیم کرنے کا اختیار حاصل تھا اس کا ثبوت منہاج سے ملتا ہے جسے بلبن نے اتنے گاؤں عطا کیے تھے جن سے اُسے تیس ہزار جیتل کی آمدنی ہو جاتی تھی۔[26]

مقطیع کے ماتحت عملے کے سلسلے میں کچھ زیادہ اعداد و شمار سامنے نہیں آتے لیکن چونکہ وہ خود ایک چھوٹا موٹا بادشاہ ہوتا تھا اس لیے باور کیا جا سکتا ہے کہ سلطان کے خاص محکموں کی طرح مختلف محکمے ان صوبوں میں بھی ضرور ہوں گے۔ اس کے سرکاری دفتر کا سب سے اعلیٰ افسر "دبیر" ہوتا تھا اس کے اپنے خفیہ مشیر بھی ہوا کرتے تھے۔[27] لیکن اس بات کا کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ وہ وزیر اعظم یا وزیر بھی رکھتا تھا۔ عین الملک اشعری جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شہزادہ فیروز کے بدایوں کی ذمہ داری سنبھالنے پر وزیر مقرر کیا گیا تھا، غالباً اُس کا اتالیق یا نگراں (اتاتک) رہا ہوگا۔[28] چھوٹے افسروں میں متصرف، کارکن اور عامل تھے جو اس کے انتظامیہ اور صیغۂ مال کی تشکیل کرتے تھے۔[29] اس کی نگرانی خود اس کا محکمہ محاصل کرتا تھا۔ مرکزی دیوانِ وزارت کو صرف اس محکمے کا حساب کتاب جانچنے کا اختیار حاصل تھا۔ برنی نے ایک جگہ التتمش کے واقعہ کو درج کیا ہے جہاں اُس نے وزیر کی سفارش پر قنوج کے اقطاع کے

لیے ایک کلرک (خواجہ) کا تقرر کیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ محض ایک رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے نہ کہ عام دستور کی طرف[30] تاہم صوبے کے عدلیہ اور بارد (BARID) محکموں پر مقطیع کا بہت کم اختیار تھا۔

اقطاع کا طریقہ جامع ضرور تھا لیکن خصوصی نہیں تھا۔ ہم بہت سے خالصہ علاقوں کا ذکر سنتے ہیں جو شہروں اور ضلعوں پر مشتمل ہوتے تھے اور جن پر مقطیع کے بجائے امیر اور شہنا کا حکم چلتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ اصطلاح صرف مالیات کے سلسلے میں استعمال ہونے لگی۔ لیکن تیرھویں صدی میں اس کے بندوبست کی تقسیم بھی کافی مختلف تھی۔ ریورٹی نے اس اصطلاح کا ترجمہ "سلطانی زمین" (CROWN LAND) کیا ہے۔ لیکن مورلینڈ نے اسے "مخصوص علاقہ" بتایا ہے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس علاقہ پر کسی کو متعین نہیں کیا جاتا تھا اور خراج کی وصولی کا کام براہ راست مرکزی وزارتِ محاصل کے ذریعہ ہوتا تھا[31] صدی کے نصف اوّل میں شہنا کے تحت بھٹنڈا اسی قسم کا علاقہ تھا[32] چونکہ محاصل کی وصولیابی بادشاہ کے مالیاتی افسروں کے ذریعہ ہوتی تھی اور کل رقم مرکزی خزانے کو دے دی جاتی تھی اس لیے منتظم کی تنخواہ غالباً کوئی متعینہ رقم ہوتی ہوگی۔ دہلی کے قرب وجوار کا علاقہ بھی اسی زمرے میں آتا تھا۔ یہ علاقہ حوالی دہلی یا "ہریانہ" کہلاتا تھا[33] اور اس کا تعلق کسی اقطاع سے نہیں تھا۔ اس علاقے کے منتظم افسر کا نام کہیں نہیں درج ہے۔ غالباً خود دیوان وزارت براہ راست مالیاتی افسران کی نگرانی کرتا ہوگا۔ بعد میں بھٹنڈا کو ایک معمولی اقطاع بنادیا گیا تھا[34]

اقطاعی نظام سے الگ تو مفتوح علاقے اور قلعہ بھی تھے۔ گوالیار ہمیشہ امیر کے تحت رکھا گیا جو ظاہر ہے کہ ایک فوجی افسر تھا[35] الہ آباد کے قریب گنگا پر کڑا فوجی تقسیم کی مثال پیش کرتا ہے۔ جسے آخر کار ایک شہری بندوبست میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ التتمش کے عہد میں یہ ایک فوجی امیر کے تحت تھا لیکن محمود کے زمانے میں یہ علاقہ ایک عام اقطاع بن چکا تھا[36]

روزنامچوں میں دیہاتی علاقوں کے لیے اقطاع سے چھوٹے کسی تنظیمی محکمے

کا ذکر نہیں ملتا۔ برنی نے اکثر پرگنوں اور فوجداروں کا ذکر کیا ہے لیکن ایسی
کوئی شہادت نہیں ملتی جس کی بنا پر ہم ان کو چھوٹے تنظیمی محکمے کے طور پر تسلیم
کر سکیں۔ اگلی صدی کے ابتدائی حصے میں ہم شِق (SHIQQ) اور سادا (SADA)
کا ذکر سنتے ہیں لیکن ہم اس کو مملوک حکومت کی تنظیم کا نتیجہ کہہ سکتے۔ ایسا کہنے کے لیے
موجود ثبوت کافی نہیں ہیں ہمیں مزید ہم عصر شہادتیں درکار ہوں گی۔

حوالاجات

1۔ حوالوں کے لیے دیکھیے (SUPRA) باب چہارم۔

2۔ منہاج، ص۔ 264۔ 265۔

3۔ دونوں ہی الفاظ ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ دیکھیے برنی، ص۔ 96، ص 430 بھی جہاں بلبن نے لکھنوتی کے مقطیع بغرا خاں کو مشورہ دیتے ہوئے اقلیم داری اور ولایت داری میں فرق بتایا ہے، آخری لفظ صاف طور پر مقطیع کے منصب کے لیے استعمال کیا گیا ہے، مورلینڈ بھی دیکھیے۔ ایگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا و اپنڈکس۔ بی۔

4۔ مثال کے طور پر سیاست نامہ دیکھیے، ص۔ 28 ابن الاثیر نے سلجوق سلطنت کے بیان میں اس کا بار بار استعمال کیا ہے، × (تھارن برگ) ص ص۔ 178؛ 274 نساوی بھی دیکھیے، ص۔ 79۔

5۔ سیاست نامہ، ص۔ 37۔

6۔ ابن اثیر (قاہرہ)، ×، 127، 152، 176، 192؛ گب بھی: ڈمسکس کرانکلس آف دی کروسیڈس، ص 34۔

7۔ الفی، صفحہ ذیل۔ 497 بی۔ جامع التواریخ بھی، بحوالہ ریورٹی، ترجمہ طبقات ناصری ص۔ 482۔ نوٹ۔

8۔ برنی، ص۔ 59 ص ص 108۔ 109 بھی دیکھیے۔

9۔ ایضاً، ص۔ 220۔ 221

10۔ ایضاً، ص۔ 431۔

11- E.G. ایضاً ص ص- 269- 177 -

12- یہ طے کرنا کہ یہ تناسب کیا تھا بہت مشکل ہے۔ غیاث الدین تغلق نے چودھویں صدی کے شروع میں اپنے وزیر مالیات کو ان ''ملکوں اور امیروں'' کو سزا دینے سے منع کیا جو اقطاع یا ولایت کی مالگذاری کا دسویں یا گیارہویں حصے کا نصف یا اور 1/10 یا 1/15 اس عہدے کے روایتی حقوق سے زیادہ لے لیتے ہوں'' برنی، ص۔ 431 یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے حقوق ان کی جو قیمت بھی رہی ہو۔ وہی اس کی تنخواہ تھی لیکن تغلق حکمراں مقطیع کو مذکورہ تناسب کے مطابق تنخواہ سے زائد بھی دینے کو تیار تھا۔ غالباً یہ ایک پرانی روایت کی تجدید کی تھی جسے خلجی مرکزیت نے ختم کر دیا تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ محمدؐ بن تغلق کے گورنروں کو لگان کا 1/20 بطور حق الخدمت ملتا تھا۔ راحلہ (DEF-ET-SANG) ڈف ایٹ سنگ iii، ص- 117 -

13- منہاج، ص- 237 -

14- ایضاً، ص 270 -

15- برنی، ص- 61 - 63 - یہ ان کے ''مواجب'' تھے۔ م۔ بہ۔ مور لینڈ: اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا، ص۔ 27 -

16- منہاج، ص- 147 - بدایوں کے مقطیع نے پہلے اسے نقد ادائیگی کی تھی۔

17- برنی، ص- 431 -

18- برنی، ص- 80 -

19- ایضاً، ص- 101- 102-

20- برنی، ص- 116

21- برنی، ص- 106-

22- E.G. قنوج کے نائب کا تقرر التتمش نے کیا تھا۔ برنی، ص- 38-

23- منہاج، ص- 399-

24- ایضاً، ص- 217

25- ایضاً، ص- 157-158-

26۔ منہاج، ص۔ 214 اور 295۔

27۔ ایضاً، ص۔ 243 اِسے اصل میں کتخدائی کہتے تھے۔ اعجاز خسروی بھی دیکھیے صفحہ ذیل 106 ب۔

28۔ منہاج، ص۔ 174۔

29۔ کول کے مقطع کے تحت ایک "مشرف" کے ذکر کے لیے دیکھیے فوائد الفواد، ص۔ 3 و 55۔
56۔ ان ماتحت افسروں کا مشاہرہ نقداً ادا کیا جاتا تھا لیکن جن کا تعلق لگان کی وصولی سے تھا ان کو شاید ½ یا ایک فیصد حق المحنت لینے کی اجازت تھی، برنی ص۔ 430۔

30۔ برنی، ص۔ 36 روایت ہے کہ بلبن نے بھی امروہہ کے 'متصرف'، کا تقرر کیا تھا۔

31۔ ایضاً، ص۔ 38۔

31۔ مورلینڈ۔ ر۔ س۔ ص۔ 29۔

32۔ منہاج، ص ص۔ 188۔ 250۔ 251۔

33۔ اس کی حدود کے اندازہ کے لیے (APPROXIMATE) دیکھیے مورلینڈ ر۔س، ص۔ 23۔ ہریانہ کے متعلق دیکھیے ایپی گرافیا انڈو مسلمکا 1913-1914، ص 38۔

34۔ منہاج، ص۔ 277۔

35۔ التتمش کا پہلا تقرر گوالیار کے 'امیر'، کی حیثیت سے ہوا تھا، منہاج۔ ص۔ 169۔ 1231 میں اس کی دوبارہ فتح کے بعد وہاں جن افسروں کا تقرر ہوا ان میں کسی مقطع کا ذکر نہیں ہے۔ صرف 'امیر دار'، 'کوتوال'، اور 'قاضی'، کا ذکر ملتا ہے۔ ایضاً ص 175 جب ملک تیاسی (MALIK TAYASI) قلعہ کا نگراں تھا تو اسے مقطع نہیں بلکہ 'شحنہ'، کہا جاتا تھا؛ ایضاً، ص۔ 240۔

36۔ منہاج، ص۔ 177 اور 217۔ ریورٹی کا نوٹ بھی دیکھیے۔ ص۔ 626۔

بارہواں باب

افواج

معاصر مصنفین مضبوط اور مستعد فوج کے قیام پر بہت زور دیتے ہیں کیوں کہ کوئی بھی حکومت اس تشدد آمیز ہتھیار کے بغیر کام نہیں کر سکتی ہے۔؎ غالباً ابتدائی دور میں فوج باہر سے آنے والے انتہائی قابل لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی لیکن کچھ ہی دنوں بعد شعبوں کی تقسیم کے تصور نے زور پکڑ لیا۔ مفتوحین نے جیسے جیسے شہری حکومت کی ذمہ داریاں اپنے سر لینا شروع کر دیں، سماج کی کاروباری تقسیم کی بنیاد پڑنے لگی اور پھر جنگ ایک پیشہ بن گئی۔ حالانکہ یوں تو تمام مسلمان سلطنت کی لڑاکا فوجوں کے ممبر ہوتے تھے، لیکن عام طور پر حکومت کے ملازم، پیشہ ور سپاہی فوج میں رکھے جاتے تھے۔ یہ چار طرح کے ہوتے تھے۔ (i) مستقل سپاہی جو براہ راست سلطان کے ماتحت ہوتے تھے اور ان کی ملازمتیں مستقل ہوتی تھیں۔ (ii) مستقل فوجی دستے جو صوبائی گورنر رکھتے تھے اور اُن کی حیثیت بھی وہی ہوتی تھی جو سلطان کے ماتحت کام کرنے والے سپاہیوں کی ہوا کرتی تھی۔ (iii) زمانۂ جنگ اور معرکوں کے زمانے میں خصوصی طور پر بھرتی کیے جانے والے رنگروٹ اور (iv) رضاکار جو عام طور پر مسلمان ہوتے تھے جن سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ خود اپنے ہتھیار فراہم کریں گے اور جہاد کے لیے بغیر کسی تنخواہ کے فوج میں بھرتی ہوں گے لیکن مالِ غنیمت میں اُن کا حصہ رہے گا۔

بادشاہ کے تحت کسی مستقل فوج کے قیام کا براہ راست کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن،

مرکزی حکومت کے باقاعدہ فوجی دستوں کو رکھنے کی تصدیق ضروری ہوتی ہے۔[2] تاہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی ترتیب اور نوعیت کس قسم کی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا محور بادشاہ کے باڈی گارڈ "جاندار" رہے ہوں گے۔ یہ جاندار نہ صرف بادشاہ کے گرد بلکہ دربار اور محل کے اندر نظم و ضبط قائم رکھنے والی پولیس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ جنگوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ لوگ عام طور پر بادشاہ کے ذاتی غلاموں میں سے منتخب کیے جاتے تھے۔ لیکن اُن کا سردار سرجاندار عام طور پر کسی اعلیٰ خاندان کا آزاد فرد ہوتا تھا۔[3] ان کی تعداد کا انحصار بادشاہ کی مرضی پر تھا لیکن اُن کی تعداد یقیناً بہت کافی ہوتی ہوگی۔ دہلی میں تاج پوشی کے وقت مُعزّی اور قطبی جانداروں نے التتمش کو کافی پریشان کیا تھا۔ منہاج نے مستقل فوج کو چشم قلب یا قلب سلطان کا لقب دیا تھا۔[4] جاندار یقینی طور پر فوج کے مرکز میں منظم ہوتے ہوں گے۔[5] جو ہمیشہ دہلی میں تعینات رہتی تھی۔ محمود کے دور حکومت میں اس فوج کو اکثر شہر سے باہر لا کر فوجی ورزش اور پریڈ کرائی جاتی تھی۔[6] یہاں پر یہ بات بحث طلب ہے کہ شہر کے پاس واقع فوجی قلعوں اور بستیوں میں فوجی دستے رکھے جاتے تھے وہ مرکزی فوج سے لیے جاتے تھے یا متعلقہ صوبوں سے[7] یہ فوج اور جاندار دونوں براہ راست عریض ممالک (ARIZ-I- MAMALIK) کے تحت تھے۔ جو ان کی بھرتی، ان کی کارکردگی اور تنخواہ کا ذمّہ دار بھی تھا ان کی تعداد کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ یہ فوج نہ صرف پیادوں اور سواروں کے رسالوں پر مشتمل تھی بلکہ دو ہزار شمسی اقطاع دار بھی اس کی سوار فوج کا ایک اہم حصّہ ہوتے تھے۔[9]

صوبائی دستے جن کی پرورش عوامی محاصل پر ہوتی تھی، بنیادی طور پر مستقل فوج کا ایک حصّہ ہوتے تھے۔ لیکن مملوکوں کی غیر مرکزی حکومت میں، ان فوجوں پر مرکز کے محدود اختیارات ہوتے تھے۔ صوبائی فوج عملی طور پر مقطع کی ہوتی تھی۔ اُن کی نگہداشت اور پرورش کی تفصیلات بھی اُسے خود ہی مقرر کرنا ہوتی تھیں اور عریض ممالک اس میں زیادہ دخل نہیں دے سکتا تھا موخرالذکر کا دخل صرف اُس وقت شروع ہوتا تھا جب صوبوں سے مخصوص تعداد میں فوج طلب کی جاتی تھی۔ ان موقعوں

پر صوبے سے بھیجی جانے والی فوجوں کی گنتی اور ان کے ہتھیاروں کی جانچ پڑتال حاضری کے رجسٹر کے مطابق ہوتی تھی اور اگر رجسٹر میں اندراج کے مطابق کوئی غلطی ہوتی تھی تو مقطیع کے محکمہ فوج کے نمائندوں سے جواب طلب کیا جاتا تھا۔ صوبائی فوجیں غالباً عریض ممالک کی فوجی فہرست میں درج ہوتی تھیں لیکن مملوک عہد حکومت میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جہاں مرکزی حکومت نے ان کی تعداد یا تنخواہ میں باقاعدگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہو یا ان کی بھرتی اور کنٹرول میں دخل دیا ہو۔ اور نہ کوئی ایسی پختہ شہادت ملتی ہے جس سے معلوم ہو کہ وقتاً فوقتاً ان فوجوں کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں منتقل کیا جاتا تھا جیسا کہ شیر شاہ سوری کے عہد میں ہوا کرتا تھا۔

مندرجہ چند مثالوں سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان فوجوں کو بادشاہ کی مستقل فوجوں کے طور پر دوبارہ منظم کیا گیا تھا۔ یہ فوج ایک مستقل مرکزی دستے اور غیر مستقل فوجیوں پر مشتمل تھی۔[9] مقطیع کا عریض ان کی دیکھ بھال کرتا تھا اور تنخواہیں دیتا تھا اور مرکز میں مقیم نمائندے نائب عریض کے ذریعہ یہ امدادی فوج مرکز میں حاضر کی جاتی تھی۔[10] مرکز اور صوبوں میں جو مستقل فوجیں تھیں ان کو غالباً وجہی (مستقل) کہا جاتا تھا۔ کم از کم تغلق کے عہد میں تو یہی اصطلاح ان کے لیے استعمال ہوتی تھی۔[11]

عارضی کاموں کے لیے مخصوص بھرتی کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ لیکن درج شدہ مثالوں سے اس بات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی بھرتی ایک مستند اور رائج طریقہ تھی۔ 1241ء میں جب منگولوں نے لاہور کا محاصرہ کیا تو صدر الصدور منہاج سراج، سے بادشاہ نے کہا تھا کہ وہ کافروں سے لڑنے کے لیے لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی نصیحت کرے۔[12] 1258ء میں اس نے ایک دفعہ پھر اسی قسم کی تقریر کی جس کا مقصد جہاد کا جذبہ پیدا کرنا اور کافروں کے خلاف جنگ کے فوائد کی اہمیت جتانا تھا۔[13] یہاں پر یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ اس قسم کی فوجی بھرتی صرف مسلمانوں کے لیے وقف تھی۔ اس قسم کی فوری بھرتی طاقت اور باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی ہوا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ لکھنوتی کی مہم پر جاتے وقت بلبن نے اودھ میں ایک جم غفیر کو بھرتی کر لیا تھا ان کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی اور ان میں تیر انداز، مال بردار، شہسوار اور پیدل، غرض سب ہی کاموں کے لوگ

تھے۔ یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ دو لاکھ آدمی صرف جنگ کے لیے نہیں تھے اور ان کا ایک حصہ یقیناً غیر مسلموں میں سے لیا گیا ہوگا۔ مخصوص معرکوں یا مہموں کے لیے کرائے کے ہندو سپاہیوں کی بھرتی بھی اس جگہ قابلِ غور ہے۔ رضیہ جب اپنے شوہر التونیہ کے ہمراہ تخت شاہی حاصل کرنے کے لیے نکلی تھی تو کہتے ہیں کہ اس کی فوج زیادہ تر کھوکھر اور پنجاب کے جاٹ قبیلوں کے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

رضا کار شہری فوج کی موجودگی کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں التمش کے ابتدائی دور میں لکھتے ہوئے فخر مدبر نے ایک فوجی معائینے کا ذکر کیا ہے جہاں وہ ایک ایسے پیدل فوجی دستے کے بارے میں بتاتا ہے جس نے رضاکارانہ طور پر فوج میں شرکت کی تھی جو انفرادی طور پر عریض کے پاس آکر اپنا نام درج کراتے تھے۔ یہ ایک الگ فہرست ہوتی تھی جس کا انچارج نائب "ترجی" ہوتا تھا۔[16] برنی نے بھی ایسے سپاہیوں کا ذکر کیا ہے خود اپنے ہتھیار اور گھوڑے مہیا کر کے باقاعدہ فوج میں شریک ہوتے تھے۔[17] 1259ء میں جب ہلاکو کے سفیر دہلی آئے تھے تو صوبائی امدادی دستوں کو ملا کر شاہی فوج میں دو لاکھ پیدل سپاہیوں اور پچاس ہزار گھوڑ سواروں کی موجودگی دراصل فوجی طاقت کی نمائش تھی۔ ان کی پشت پناہی کے لیے شہری رضا کاروں کی ایک بڑی تعداد اپنے ہتھیاروں اور گھوڑوں سے لیس باقاعدہ سپاہیوں کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہوئی تھی۔[18]

امن کے زمانے میں کوئی مستقل سپہ سالار نہیں ہوا کرتا تھا۔ دفاعی فوجوں کا سب سے بڑا سپہ سالار خود سلطان ہوتا تھا۔ مرکز اور صوبوں کے عریض، غالباً ایک جدید محکمہ جنگ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ فوجیوں کی تربیت، ان کی ترقی اور اطاعت کی تعلیم کی ذمہ داری بھی اسی محکمے کے روزمرہ کے کاموں میں شامل تھی۔[17] صوبوں میں مقطع عملے کا قائدہ ہوتا تھا۔ حالانکہ برنی کا خیال ہے کہ معرکوں کے لیے فوجوں کے انتخاب کا کام بھی عریض کے سپرد تھا۔[18] صرف ایک دفعہ وہ بھی رضیہ کے عہد حکومت میں مستقل مرکزی فوج کے لیے لشکر کا تقرر کیا گیا تھا اور ملکہ نے لڑنے والی فوجوں کی کمان کے اپنے اختیارات ان کے سپرد کر دیئے تھے۔[19] یہ عہد ظاہر ہے کہ عارضی تھا اور اس کی (رضیہ) معزولی کے بعد اس کے عہدے کے بارے میں کچھ نہیں سنا

گیا۔ عام طور پر بادشاہ مہموں یا معرکوں کی سربراہی کرتے تھے لیکن فوجی کاروائیاں مخصوص افسروں کے سپرد کر دی جاتی تھیں۔

رضا کار شہری فوجوں کے علاوہ تمام سپاہیوں کو مقررہ معاوضہ مواجب یعنی نقد کی صورت میں یا پھر تفویض یعنی اقطاع کی صورت میں ملتا تھا۔ مرکز کی مستقل فوج کو، یا کم از کم اس کے اہم لوگوں کو، معاوضہ تفویض کی صورت میں دیا جاتا تھا۔ اس کی مثال وہ شمسی اقطاع دار ہیں جن کو دو آب میں گاؤں دیئے گئے تھے۔ کپتان بلکہ چھوٹے افسروں کو بھی محاصل وصول کرنے کے اسی طرح کے موقعہ دیئے جاتے تھے۔[۵۶] اس کی تفویضات میں آمدنی اقطاع میں کاشت کرنے والے کسانوں سے زمین کا لگان وصول کر کے حاصل کی جاتی تھی۔ بلبن نے معاوضہ میں قابل کاشت زمین دینے کی بھی روایت قائم کی تھی۔ اس نے گوپال گیر، کمپل پٹیالی، بھوجپورا اور جلالی میں قابل کاشت زمینوں پر افغان سپاہیوں کو آباد کیا تھا۔[۵۷] وہ اپنی پرورش اُن زمینوں کے سہارے کرتے تھے جو انھیں کاشت کے لیے دی جاتی تھیں۔ معاوضوں کی ادائیگی کے اس طریقے کا فطری تقاضہ تھا کہ اُن لوگوں کو موروثی سپاہیوں کی فوجی فہرست میں رکھا جائے۔ تاہم سپاہیوں کی اکثریت کو دیوان عریض کی طرف سے نقد تنخواہ ملتی تھی۔ غیر مستقل اور کرایہ کے سپاہیوں کے معاوضہ کی ہمیشہ نقد ادائیگی ہوتی تھی اس بات کا طے کرنا مشکل ہے کہ انفرادی ادائیگی کا دستور تھا یا نہیں۔ عمادالملک کی یہ پریشانی کہ سپاہیوں کی تنخواہوں میں محکمے کے کارندوں کی طرف سے کسی قسم کی کٹوتی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انفرادی طور پر نقد ادائیگی کا دستور عام ہو گا۔ یا کم از کم مرکزی فوج کے لیے ضروری ہو گا۔ لیکن چوں کہ بھرتی انفرادی طور پر نہیں بلکہ فوجی دستوں کے لیڈروں کے ذریعہ ہوتی تھی اس لیے یہ بات مشکوک ہے کہ تنخواہوں کی براہ راست ادائیگی ہمیشہ قابل عمل رہی ہو گی یا ہمیشہ اس کی خواہش کی گئی ہو گی۔ علاءالدین خلجی کا داغ لگانے اور حلیئے کے اندراج کے اصول محض اس وجہ سے رائج کیے گئے تھے کہ فوجی دستوں کے لیڈر بلکہ مقطیع غلط نمائندگی کے ذریعہ سپاہیوں کی تنخواہ ہڑپ نہ کر سکیں۔ شہہ سواروں کو اپنے مواجب میں اسے اپنے ہتھیاروں

کا انتظام کرنا اور اپنے گھوڑے کو چاق و چوبند رکھنا ہوتا تھا۔ تنخواہ دینے سے پہلے اس کے ہتھیاروں اور گھوڑے کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ موجب کے علاوہ ہر فوجی کو اُس جنگ کے مالِ غنیمت (غنیمہ) میں سے حصہ ملتا تھا جس میں اُس نے شرکت کی ہوئی تھی۔ اس رعایت کو غالباً جنگ کا بونس سمجھا جاتا تھا۔

مملوک دورِ حکومت کی مثالوں سے فوجوں کے ڈویژن اور اُن کی ترتیب پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ برنی نے ایسے امیروں کا ذکر کیا ہے جن کے تحت پچاس، سو اور ہزار سپاہی رہتے تھے (امیر، پنجاہ۔ صدر، اور ہزارہ)[22] امیر خسرو نے ایک جگہ کیقباد کے اس جلوس کا ذکر کیا ہے جب وہ اپنے باپ سے ملنے گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مَلِک کے ماتحت تقریباً بیس ہزار سپاہی تھے[23] فوجی نظام کے سلسلے میں اگر ہم لغرا خاں کے بیان کیے ہوئے ترکی نظام کو ہندوستان میں رائج فوجی نظام پر منطبق کریں تو ہم دیکھیں گے کہ سرِ خیل کے تحت دس سپاہیوں کا یونٹ ہوتا تھا جو عشری یا دسویں حصے کے حساب سے بڑھتے بڑھتے سپہ سالار، امیر اور مَلِک سے گذر کر سپہ سالار، خان تک پہنچتا تھا[24] فوج کی یہ تقسیم اس تقسیم سے زیادہ مختلف نہیں ہے جو محمدؐ بن تغلق کے زمانے میں رائج تھی[25]

آداب الحرب میں میدان جنگ کی صف آرائی کا بیان ملتا ہے۔ قلب یا مقدمہ (ہراول) کے دونوں طرف میسرہ (بایاں بازو) اور میمنہ (دایاں بازو) ہوتے تھے۔ چنیدہ فوجیوں کا دستہ (خلف) یا پشت پر ہوتا تھا جسے سب سے آخر میں جنگ کے میدان میں بھیجا جاتا تھا۔ یا پھر اُسے جنگ میں اتارنے میں کچھ مصلحت پنہاں ہوتی تھی۔ خلف کا جنگ میں اترنا سب سے آخری تدبیر سمجھی جاتی تھی۔[26] ایک مخصوص فوج سرلیعہ[الف] (منہاج نے اسے طلایہ[ب] لکھا ہے)[27] کا ذکر بھی ملتا ہے جو چار سو شہہ سواروں پر مشتمل ہوتی تھی اور جس کی کمان امیر کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اس فوج سے اس وقت کام لیا جاتا تھا۔ جب تیز نقل و حرکت کی یا جاسوسی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔[28]

[الف] سرلیعہ۔ فوج کا وہ دستہ جو تیزی سے نقل و حرکت کرتا تھا۔ مترجم۔

[ب] فوج کا وہ دستہ جو رات کو شہر اور فوج کی نگرانی کرتا ہے۔ مترجم۔

حوالاجات

1۔ دیکھیے کیقباد کو لغرا خاں کی نصیحت؛ برنی، ص۔ 102۔ فخر مدبر؛ آداب الحرب، صفحہ ذیل۔ 79 اے۔

2۔ دیکھیے منہاج، ص۔ 113؛ فخر مدبر، تاریخ، ص۔ 33۔

3۔ غور کا معز الدین بذات خود اپنے بھائی غیاث الدین کا سر جاندار تھا، منہاج ص۔ 115۔

4۔ م۔ بہ۔ ریورٹی کا ص 634۔ 635 پر نوٹ طبقات ناصری کے اس کے اپنے ترجمے میں جہاں اس نے یہ بحث اٹھائی ہے کہ یہ قلب دہلی میں تعینات باقاعدہ فوجی نظام کا قلب لشکر نہیں تھا بلکہ یہ ان رسالوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو میدان جنگ میں دہلی کے لشکر کے قلب میں ہوتے تھے، یہ رسالے بہت سے جاگیرداروں کے مہیا کیے ہوئے ہوتے تھے۔ جن کی جاگیریں دارالسلطنت کے نواح میں تھیں اور جن کا بہت کم وقت بادشاہ کے پرچم کے نیچے طلب کیا جا سکتا تھا۔" یہ نتیجہ اس حقیقت کے پیش نظر قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتا کہ "قلب" ہمیشہ سلطان اور دہلی سے متعلق پایا گیا ہے اور جب کبھی دور یا نزدیک کے صوبائی رسالوں کی شمولیت کی ضرورت پڑی تو بیان میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ صوبائی رسالوں کو "قلب" سے متعلق نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ 1256ء میں باغی کشلو خاں سے مقابلے کے وقت بلبن نے اپنی فوجوں اور بھٹنڈا کے گورنر شیر خاں کی افواج کو "قلب سلطانی" اور دہلی کی دوسری فوجوں سے الگ رکھا جن کی سربراہی اس کشلو خاں کے سپرد تھی، منہاج۔ ص۔ 308۔ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ عام حالات

میں بادشاہ کے پاس کوئی فوج ہی نہ ہوتی ہو۔ اس سال جب کشلو خاں اور قتلغ خاں نے دہلی کا محاصرہ کیا تو شہریوں نے دفاع کی تیاری کی کیوں کہ "شاہی افواج شہر میں موجود نہیں تھیں" ایضاً ص۔ 224 برنی ص ص۔ 57 - 58 نے بھی "حشم قلب کا ذکر کیا ہے جنھیں بلبن کٹھریوں کے خلاف مہم میں اپنے ساتھ لے گیا تھا حشم حضرت بھی جس کا ذکر ص، 115 پر ہے غالباً اسی فوج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

5۔ روایت ہے کہ رکن الدین فیروز کے ذاتی غلام "بندگان خاص" قلب ہی میں کام کر رہے تھے جب انھوں نے رکن الدین کا ساتھ چھوڑا اور اس کے خدام کو قتل کیا؛ منہاج، ص۔ 183 ۔

6۔ ایضاً۔ ص۔ 225۔

7۔ قریشی، ح۔ س، ص۔ 133 کا خیال ہے کہ صوبوں میں تعینات دفاعی فوجی ٹکڑیاں مرکزی لشکر کا حصہ ہوتی تھیں، وہ ان کو حشم اطراف کا نام دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں انھوں نے کسی سند کا ذکر نہیں کیا ہے۔

8۔ برنی ص۔ 61 ۔

9۔ دیکھیے، منہاج، ص۔ 257 ۔ صوبائی فوجوں کی تعداد کے بارے میں برنی کے اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بدایوں کے مقطع ملک بق بق اپنی جاگیر میں چار ہزار گھوڑ سوار فوجی رکھتا تھا، ص۔ 40 ۔

10۔ برنی، ص۔ 116 ۔

11۔ مثال کے طور پر عفیف دیکھیے، ص ص۔ 296، 369، 370۔

12۔ منہاج، ص۔ 195 ۔

13۔ ایضاً، ص۔ 310

14۔ آداب الحرب، صفحہ ذیل۔ 109 ب۔

15۔ ص۔ 86 ۔

16۔ منہاج، ص۔ 317۔

17۔ دیکھیے آداب الحرب، ص۔ 46-47 سپاہیوں میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے قوانین۔

18- ص۔ 60-61-

19- منہاج، ص۔ 187-

20- برنی، ص۔ 80-

21- ایضاً، ص۔ 57-58-

22- ص ص۔ 35 اور 495-

23- قران السعدین، ص۔ 40-

24- برنی، ص۔ 145-

25- قلقاشندی: صبح العشار (SUBHUL - ASHA)، ص ص۔91-92، الیٹ
iii، ص۔576

26- صفحہ ذیل۔113 . 114 ؛ اس میں ہندو اور مسلم جنگی افواج کا حلیہ دلچسپ انداز سے دیا گیا ہے۔منہاج بھی دیکھئے، ص۔ 120 ۔

27- ص۔ 288-

28- آداب الحرب، صفحہ ذیل۔ 116 بی-

تیرہواں باب

قانون اور عدلیہ

بادشاہ کے بنیادی کاموں میں سے ایک کام عدل و انصاف کا قیام ہے اور روزناموں میں شریعت پر عمل درآمد کرنے کے سلسلے میں بادشاہ کی ذمہ داریوں کا کافی ذکر موجود ہے۔[1] جن ملکوں میں مسلمانوں کی حکومت تھی وہاں شریعت کی حیثیت بنیادی قانون کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ملک میں رہنے والے غیر مسلم کم از کم سماجی تعلقات کے سلسلے میں شریعت کے تحت نہیں لائے جا سکتے تھے۔ حالات کے مدنظر قانون دانوں نے شرعی قانون کے عملی فرق کو تسلیم کر لیا تھا۔[2] اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان اپنے سماجی اور ذاتی معاملات میں مکمل طور پر شریعت کے قانون پر عمل کرتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہوئی کہ غیر مسلم ذمی کے لیے کون سا قانون بروئے کار تھا۔ ورثے، زمین کی خرید اور منتقلی اور شادی بیاہ کے سلسلے میں غالباً رائج الوقت قانون کے مطابق عمل ہوتا تھا۔ جس میں تمام مقامی قبائلی اور ہندو شاستروں کے اصول شامل تھے۔[3] دہلی سلطنت نے جس اصول کو اپنایا تھا اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ ذمیوں کے سماجی معاملات میں کم سے کم دخل دیا جائے۔ مثال کے طور پر شادی بیاہ کے معاملات میں قاضی صرف اسی وقت دخل دیتا تھا جب دونوں فریق اس کے لیے تیار ہوں اور ان موقعوں پر بھی اُسے ان تمام جائز طریقوں کو تسلیم کرنا پڑتا تھا جو متعلقہ جماعت کے مذہب میں رائج تھے۔[4] وہ جرائم جو کسی بھی قانون کے تحت خلافِ قانون

سمجھے جاتے تھے اور جس کے تعین میں محض اخلاقیات کا دخل ہوتا تھا۔ اس معاملے میں غالباً ذمی اور مسلمان دونوں کی ایک ہی حیثیت تھی [۴۶] اس میں ضرور شبہ ہے کہ آیا مسلم تعزیری قانون اتنی سختی سے نافذ کیا جاتا تھا جیسا کہ فقہ کا مطالبہ ہے۔

جہاں تک زیر بحث عہد کا تعلق ہے یہ سوال محض قیاس آرائی ہے کیوں کہ فتح اتنی مکمل نہیں تھی کہ اس سے مقامی باشندوں کا سماجی نظام متاثر ہوتا۔ متعدد ہندو سرداروں کو اپنی حکمرانی جاری رکھنے کی اجازت تھی جہاں اُن کا رائج قانونی نظام بہت کم متاثر ہوا تھا۔ مسلم بندوبست کے تحت براہ راست آنے والے اضلاع میں ہندو دیہاتوں میں آباد تھے اس لیے اُن کو مسلم قانون سے دوچار ہونے کا موقعہ ہی نہ ملا ہوگا۔ اس فتح سے قدیم مقامی طرز حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اور دیہات اور "جاتی" پنچایت کو اپنے روایتی کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ بشرطیکہ اُن کا قاضی کے حلقہ اختیار سے ٹکراؤ نہ ہو۔ [۴۷] دیہاتوں کے اندر ہونے والے جرائم میں گاؤں کا مکھیا (مقدم) خود ہی استصواب کرتا تھا اور خود ہی فیصلہ کرتا تھا۔ تاج المعاصر کے ایک اقتباس میں اس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ مقامی لوگوں میں امن و امان قائم رکھنے اور انصاف کرنے کے لیے ہندو افسروں کا تقرر ہوتا تھا۔ یہ اقتباس دراصل 1193ء میں ایبک کی اسنی (ASNI) پر فتح اور بعدازاں معاہدے سے متعلق ہے۔ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ اس نے مقامی لوگوں اور علاقہ کے بندوبست کے لیے چاروں طرف راناؤں کا تقرر کیا تھا۔ [۴۸] نئے مفتوحہ علاقے میں عارضی طور پر مقامی افسروں کا رکھنا رائج الوقت رسوم کو تسلیم کرنا دراصل حالات کا واحد تقاضہ تھا اور اسی طریقے کو عربوں نے سندھ میں بھی اپنایا تھا۔ [۴۹] برنی بہت سے ایسے روایتی اور رسمی قوانین کا ذکر کرتا ہے جنھیں وہ "ضابطہ" کہتا ہے اور جو ہندو رعایا کے لیے مخصوص تھے۔ [۵۰]

مسلم بادشاہ سے صرف یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ عدل و انصاف رائج کرے گا بلکہ اُس سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ خود بھی مظلوموں کی سنے گا اور انصاف کرے گا۔ [۵۱] اس لیے بادشاہ نہ صرف درخواستوں پر غور کرتا تھا بلکہ براہ راست مقدمات کو سنتا بھی تھا کیوں کہ وہی عدل و انصاف کی سب سے بڑی عدالت تھا۔ [۵۲]

شریعت کی خلاف ورزی کرنے والے لوگوں کے مقدمات میں آپ سے مفتی اور صدر الصدور سے مدد ملتی تھی اور دینوی مقدمات میں وہ قاضی القضات (چیف جسٹس) کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ وہ کبھی کبھی جرائم کرنے والوں کے فوری مقدمات بھی طے کیا کرتا تھا۔[14]
دوسرے سرکاری محکموں کے برخلاف عدلیہ شروع ہی سے مرکزی محکمہ رہا۔ مختلف صوبوں اور علاقوں کے لیے بادشاہ خود ہی قاضیوں کا تقرر کیا کرتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بڑے شہروں کے لیے نہ صرف امیر داد کا تقرر بلکہ اُن کے تبادلے اور معزولی کے احکامات جاری کرنا وہ اپنے اختیار میں رکھتا تھا۔[15] مقطیع سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر قاضی کے فیصلوں کا نفاذ کرے۔

بادشاہ کے بعد قاضی القضات، عدلیہ کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا۔ وہ دارالسلطنت میں رہتا تھا اور امیر داد کی اعانت سے مقدمات فیصل کرتا تھا۔ منہاج سراج، جس نے تین دفعہ اس عہدے کی ذمہ داری سنبھالی تھی، مذہبی امور کے محکمے کا افسر اعلیٰ تھا۔ وہ اپنے آخری عہدے 'صدر جہاں' کے نام سے عام طور پر مشہور تھا۔[16] یہ عہدہ بعد میں ہمیشہ 'قاضی القضات' کے پاس رہا۔[17] تاہم ان دونوں عہدوں کو الگ الگ رکھا گیا اور خود منہاج نے بھی دونوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔[18] قاضی القضات صرف صوبوں کے چھوٹے ججوں کی نگرانی کرتا اور اپیلوں کی سنوائی کرتا تھا۔ اور غالباً التجا کرنے والے کے جج کی حیثیت سے بادشاہ کے ساتھ بیٹھتا بھی تھا۔ تاہم کسی ایسے مقدمے کے فیصلے کی تفصیلات ہمارے سامنے نہیں ہیں جہاں اس نے خود فیصلہ دیا ہو۔ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مفتی (قانونی مفسر) اس کی مدد کرتا ہوگا بعد کے اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ منہاج نے سماع کو قانونی طور پر جائز کر دیا تھا جس پر قدامت پسند علماء نے اعتراض کیا تھا۔[19] غالباً یہ کاروائی اس نے صدر الصدور کی حیثیت سے کی ہوگی۔ اگر ہم خلجی اور تغلق دور کی مثالیں سامنے رکھ کر بحث کریں تو پھر شریعت کے تمام معاملات میں چاہے وہ مذہبی ہوں یا دینوی چیف قاضی کو بھی سلطان کا قانونی مشیر ہونا چاہیئے۔ قاضی القضات اور صدر الصدور کے عہدوں کے علاوہ منہاج کے پاس سب سے بڑے خطیب کا عہدہ بھی تھا اور وہ کچھ

دنوں تک گوالیار کا قاضی بھی رہا تھا۔[۵۲]

دہلی جیسے بڑے شہروں میں عدلیہ کے دوسرے بڑے افسروں میں شریعت سے متعلق مقدموں کے لیے قاضیوں کے علاوہ امیر داد تھا جسے بعد میں داد بک کہا جاتا تھا غالباً وہ شہر کا چیف مجسٹریٹ ہوتا تھا اس کے عہدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق جرائم کی تفتیش اور تدارک سے رہا ہوگا۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑتا اور قاضی کی مدد سے ان پر مقدمہ کرتا تھا۔ اس کی عدالت "مسندِ مظالم و عدل"[۵۳] کہلاتی تھی۔ جو نہ صرف بغداد کی سلطنت عباسیہ کے دیوان مظالم سے مشابہ تھی بلکہ کسی حد تک الموردی کے "ولایت المظالم" سے ملتی جلتی تھی[۵۴] آخرالذکر نے اس کو بالجبر وصول کیے جانے والے بے جا ٹیکس اور امینوں کی نگرانی کے کام سونپ دیے۔ امین اس زمانے میں سروے کرنے اور مسلمانوں کی جائیداد کا رجسٹر رکھنے کا کام کرتے تھے۔ اس کا کام یہ بھی دیکھنا تھا کہ ہر محکمے کا افسر اعلیٰ اپنے ملازمین سے منصفانہ طریقے پر اور بے جا دخل اندازی کے بغیر کام لیتا ہے۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ دہلی کے امیر داد کے پاس بھی یہ اختیارات تھے۔ منہاج نے امیر داد کے ساتھ کئی سال تک کام کیا تھا وہ اُن کے بارے میں کہتا ہے "تقریباً گذشتہ اٹھارہ سال سے "مسندِ مظالم و عدل" اس کی (سیف الدین عجمی) عظمت سے آراستہ ہے اور اس تمام عرصے میں اس نے عدل اور مساوات کا راستہ کبھی نہیں چھوڑا اور ہمیشہ شریعت کا پابند رہا ہے۔ اس کتاب کا مصنف" کم سے کم دو موقعوں پر تقریباً آٹھ سال تک دارالسلطنت میں محض ملک کے ساتھ رہا اور مصنف نے خود دیکھا کہ اس کی ساری کاروائی طریق کار اور تعزیریں ایمان اور سنت کے مطابق تھیں۔ اس کی سزاؤں کی آن بان اور اس کے انصاف کے جاہ و جلال کی وجہ سے دارالسلطنت کے گرد و نواح کے بے شمار نافرمان اور سرکش لوگ اور ڈاکوؤں کے گروہوں نے ظلم و تشدد سے ہاتھ کھینچ لیے تھے اور عدالت کے خوف اور وحشت نے اُن کو خاموش کر دیا تھا[۵۵] اس طرح امیر داد جرائم کے مقدمات کا نہ صرف جج ہوتا تھا بلکہ گنہ گار مجرموں کو سزا بھی دیتا تھا۔ وہ ایسے افسران کے لیے عدالت کی حیثیت بھی رکھتا تھا جن پر ظلم اور بد عنوانیوں کا الزام ہوتا تھا۔ وہ قاضی کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے اور قوانین کو نافذ کرانے میں محتسب کی مدد بھی کرتا

تھا۔[27] "امیر دادِ ممالک" کہا جاتا تھا[28] اس کا ایک مددگار ہوتا تھا جو "نائب داد بک" کہلاتا تھا۔[29]

شہروں میں پولیس کا کام کوتوال کے سپرد ہوتا تھا۔ جس کا کام نظم وضبط قائم رکھنے کے علاوہ فوجی دفاع کی مدد کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک فوجی افسر تھا جس کے سپرد فصیل بند قصبوں کی سپہ سالاری تھی۔ لیکن جیسے جیسے شہری بندوبست بڑھتا گیا وہ آہستہ آہستہ محض ایک پولیس افسر بن کر رہ گیا اس میں شبہ نہیں کہ اس کے ماتحت ایک پولیس جیتھا کام کرتا تھا لیکن عباسیوں کے شرط (SHURTAH) کی طرح کسی چیز کی موجودگی کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا روزناموں سے ہمیں اس بات کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس مغل عہد کی طرح گذربان کہا جاتا تھا یا نہیں ایک اور افسر ہوا کرتا تھا جسے "رئیس بازار" کہتے تھے۔ اس کا کام بازاروں کی نگرانی بے ایمان سوددوں کی روک تھام، قیمتوں میں باقاعدگی پیدا کرنا اور ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کو سزا دینا ہوتا تھا۔ اس عہدے کے لیے ماتحت کا ہونا ضروری تھا جو بازار کے دورے کرتا رہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے۔

ایک اہم افسر "محتسب" بھی ہوا کرتا تھا جس کا نظم وضبط قائم کرنے سے تھوڑا بہت تعلق تھا۔[29] محتسب بنیادی طور پر عدلیہ کے محکمے سے تعلق رکھتا تھا اور ایک طرح وہ مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کاروائی کرتا تھا۔ لیکن اس کا کام بازاروں کی نگرانی کرنا۔ اوزان وپیمائش کی جانچ پڑتال کرنا، کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ کو روکنا اور شراب کی فروخت پر نظر رکھنا بھی تھا۔ قانونی رسالے لکھنے والے کہتے ہیں کہ اس کے کام آج کے محکمہ تعلیم کے انسپکٹر کی طرح تھے وہ میونسپلٹی کے کام مثلاً حفظان صحت کے انتظامات اور سڑکوں کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔[30] اپنے ماتحت عملے کی مدد سے اُسے فوری طور پر سزائیں دینے کا اختیار حاصل تھا[31] تاہم وہ جج نہیں تھا۔ اور جن مقدمات کا تعلق قوانین کی تفسیر یا واقعہ کی جانچ پڑتال سے ہوتا تھا وہ قاضی کے پاس لے جائے جاتے تھے۔ محتسب، دراصل ایک الگ تنظیم تھی حالانکہ اس کا تعلق "قاضی القضات" سے تھا جو خود ہی عام طور پر محتسب اعلیٰ بھی ہوا کرتا تھا۔ فیروز تغلق کے حوالے سے ایک ٹیکس کا ذکر ملتا ہے جسے "احتسابی"

کہتے تھے۔ جس کا غالباً مطلب یہ تھا کہ افسر کو فیس لینے کا حق بھی حاصل تھا جو اسس کو معاوضے کے طور پر ملتی تھی۔

فوج کے لیے ایک الگ محکمہ عدلیہ تھا۔ فوجی ڈیروں کے لیے ایک 'قاضی لشکر' کا تقرر ہوتا تھا جو غالباً مارشل لا کا انتظام کرتا تھا۔ برنی کے عہد میں اس افسر کی بڑی اہمیت ہو گئی تھی۔ اس عہدے پر بہت قابل اور ایسے ایماندار لوگوں کا تقرر کیا جاتا تھا جو شریعت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔[33] خلجی دور حکومت میں امیر داد فوجی عدالت[34] کا ممبر ہوا کرتا تھا۔ اور غالباً ان دنوں یہ عام رواج تھا۔

عدلیہ میں کام کرنے والے لوگوں کو معاوضہ ملا کرتا تھا۔ تاہم افسروں کو کم ازکم بڑے افسروں کو نقد کی جگہ مال گذاری وصول کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔[35] منہاج کے مطابق (سیف الدین عجمی کو اوپر نقل کیا جا چکا ہے) امیر داد کے لیے غالباً کچھ مخصوص اقطاع مستقل طور پر الگ کر دیئے گئے تھے۔ تاہم یہ اقطاع وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے تھے۔ سیف الدین کو یکے بعد دیگرے پلول، کا ماوہ، برن، کسرا اور محمود کے عہد میں دوبارہ، برن سے لگان وصول کرنے کا اختیار حاصل تھا۔[36] شاید اسی لیے قاضی القضات کو بھی ایسی صورت میں معاوضہ دیا جاتا تھا۔

منہاج کے یہاں ایک بہت دلچسپ اقتباس ملتا ہے جس سے اُس زمانے کی عدالتوں کی کاروائی پر روشنی پڑتی ہے۔ سیف الدین کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "اس زمانے میں دہلی سلطنت کا امیر داد ہونے کی وجہ سے وہ رائج فیس جو دس سے لے کر پندرہ فیصدی ہوا کرتی تھی اور اس سے پہلے آنے والے چیف جسٹسوں نے عائد کی تھی۔ سیف الدین نہ لیتا تھا اور نہ اس سے اس کا کوئی تعلق تھا اور نہ وہ اس کو صحیح سمجھتا تھا۔[37] یہ فیس داد بکی سے مشابہہ تھی جسے فیروز تغلق غیر قانونی سمجھتا تھا اور جسے بعد میں اس نے باقاعدہ طور پر ختم کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جو عام طور پر تسلیم شدہ رواج کے طور پر جاری تھی۔[38]

حوالاجات

1۔ برنی، ص۔ 43 و 81 ۔ 83 ، فتوائے جہانداری، صفحہ ذیل 11 اے۔
2۔ پیلی (POLLIE) ، ڈائجسٹ آف محمڈن لا، ص۔ 174 ۔
3۔ م۔ بہ۔ حسین : ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان مسلم انڈیا، ص۔ 15 جنھوں نے کسی خاص سند کے بغیر یہ کہا ہے کہ پنڈت اور برہمن ان مقدمات کا فیصلہ کرنے میں قاضی کی مدد کرتے تھے جن میں ہندو پرسنل لا کی ضرورت پڑتی تھی۔ ا حمد کی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان میڈیول انڈیا بھی دیکھیے، ص۔ 115 ۔
4 پیلی : ح۔س، ص۔ 178 ۔ 179 ۔
4۔ رحیم : محمڈن جیورسپرڈنس، ص، 59 ۔
6 حنفی فقہ ذمیوں کے مابین مقدمات کے تصفیہ کے لیے منصفوں کا تقرر قرار دیتی ہے۔ لیکن حکومت ان فیصلوں کی پابند نہیں ہے۔ دیکھیے " الماوردی، ح۔س، 62۔
7۔ صفحہ ذیل، 125 بی
8۔ دیکھیے چچنامہ (CHACHNAMA) : الیٹ، ص۔ 160۔ 182۔ 185۔
9 فتوائے جہانداری، صفحہ ذیل 126 اے۔
10۔ سیاست نامہ : ص ص، 11 اور 40 ۔
11 برنی، ص۔ 40 نے بلبن کے اس دستور کا ذکر کیا ہے کہ وہ خود ہی مقدمات سنتا تھا اور فیصلہ کرتا تھا۔
12۔ اس قسم کے ایک مقدمے کے بارے میں جس کی سماعت التمش نے علماء کی مدد سے کی دیکھیے سیدالعارفین، صفحہ ذیل۔ 189 ؛ رنی بھی دیکھیے، ص۔ 40 ۔ 41 ۔

13- منہاج، ص- 175-

14- ایضاً، ص ص- 176، 213، 214- اس امر کے لیے کہ سلطان نے ملتان کے ایک غیر معروف شہر کوٹھی والا میں بھی قاضی کا تقرر کیا دیکھیے "ذکر جامی اولیائے دہلی" صفحہ ذیل- 108 بی-

15- مقامی گورنر سے قاضی کے تعلقات کے لیے دیکھیے سیاست نامہ، ص- 38

16- منہاج، ص- 219 -

17- ہر سلطان کے واقعات کے بیان سے پہلے برنی کی دی ہوئی اس عہد کے امراء کی فہرست دیکھیے۔

18- مثلاً ص ص- 195، 215، 220-

19- عبدالحق: اخبار الاخیار، یا، 221، صفحہ ذیل- 37 اے-

20- نظامِ حکومت کے متعلق علاءالدین نے قاضی مغیث الدین سے اس کی رائے معلوم کرنے کے متعلق بیان کے لیے دیکھیے، برنی، ص- 293 اسی طرح ایک سوال کے لیے جو فیروز تغلق نے پانی پر ٹیکس لگانے کے سلسلے میں اپنے اختیارات کے متعلق قاضی سے پوچھا تھا، دیکھیے، ص- 129

21- منہاج، ص- 193 اور 223-

22- ایضاً، ص- 275

23- احکام السلطانیہ ، ص- 76 سیاست نامہ بھی دیکھیے، ص ص- 28-30 جہاں قاضی کے اسی قسم کے فرائض بتائے گئے ہیں۔

24- منہاج، ص- 275 ریورٹی کا ترجمہ، ص- 789 -

25- قریشی: ح- س، ص- 115 پر فخر مدبر: آداب الحرب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "امیر داد، کوتوال اور محتسب دونوں کی نگرانی کرتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں (تذکروں) میں ایسا اشارہ نہیں ملتا۔

26- تاج المعاصر، صفحہ ذیل- 76 بی۔ اور 178؛ منہاج، ص ص- 175، 276-

27- برنی، ص- 24-

28- آداب الحرب، صفحہ ذیل 147 اے؛ برنی، ص- 34 -

29- برنی، ص۔ 73 -

30- محتسب کے مختلف النوع فرائض شہری، مذہبی اور نظم وضبط ابن الاخوۃ IBNUL UKHUNA نے؛ معلم القربا فی احکام الحساب میں صاف صاف بیان کردی ہیں گیارھویں صدی کے اس رسالے کا ترجمہ مع تلخیص وتدوین، لیوی نے کیا ہے۔ ایف جی۔ ڈبلو۔ میموریل والیومس، لندن، 1938 -

31- فتوائے جہانداری، صفحہ ذیل۔ 8 ، سیاست نامہ بھی دیکھئے۔ 41 - 42 -

32- دیکھئے قریشی: ح۔ س، ص

33- برنی، ص۔ 47 ؛ ص 108 بھی۔

34- ایضاً، ص ص، 385، 361 -

35- تغلق عہد میں تمام منصف اور قاضی تنخواہ دار ملازمین ہوتے تھے۔ لیکن ایسا خلجی مرکزیت کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے اور جاگیر کی جگہ نقد تنخواہ رائج کرنے کا اثر بھی جیسا کہ دوسرے محکموں میں کیا گیا تھا۔

36- منہاج، ص۔ 276 -

37- ایضاً، ص۔ 285 ؛ ریورٹی کا ترجمہ، ص۔ 790 ۔ مطبوعہ متن اس مقام پر ناقص ہے۔

38- فتوحات فیروزشاہی تدوین رشید، ص۔ 5 ؛ ایلیٹ، iii ، ص۔ 377 -

چودھواں باب

مالیات اور رائج الوقت سکّے

مالیاتی معاملات کا ذکر ہم عصر تذکروں میں بہت کم ملتا ہے۔ تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ سلطان کی بنیادی آمدنی چار شرعی محاصل پر منحصر تھی۔ (i) یہ تھے زراعتی پیداوار کا ٹیکس جسے خراج اور عشر[1] کہتے تھے (ii) ذمیوں پر لگایا جانے والا عام ٹیکس جسے جزیہ کہتے تھے۔ (iii) کافروں سے لڑی جانے والی لڑائیوں کے مال غنیمت کا پانچواں حصہ جسے خمس کہتے تھے اور (vi) مسلمانوں پر لگایا ہوا انکم ٹیکس جسے زکوٰۃ کہتے تھے۔ ان میں سے آخرالذکر ٹیکس حالانکہ حکومت وصول کرتی تھی لیکن اس کو کچھ مخصوص کاموں ہی پر خرچ کیا جاسکتا تھا[2] جہاں تک زمین کے لگان کا تعلق ہے خراج اور عشر میں نمایاں فرق تھا۔ عشر دراصل زمین کی مجموعی پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا جو صرف مسلمانوں کی زمین سے یا پھر اس زمین سے لیا جاتا تھا جس کی سینچائی قدرتی ذریعوں سے ہوتی تھی۔ لیکن جب غیر مسلموں نے بڑے پیمانے پر مذہب اسلام اختیار کرنا شروع کیا تو پھر اس ٹیکس کو جاری نہ رکھا جاسکا۔ کیوں کہ مذہب اسلام اختیار کرنے کے بعد انھیں زمین اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی جانے لگی اس طرح اسلام کے ابتدائی دور سے خراج کا اصول مسلموں اور غیر مسلموں دونوں ہی منطبق ہونے لگا تھا[3] یہاں پر یہ شبہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں ان ٹیکسوں کی وصولیابی میں کیا اتنی ہی سختی سے قانونی اصول برتے جاتے تھے جتنی کہ توقع کی جاتی تھی۔ مملوک سلطنت میں زمین کے لگان کو ہمیشہ خراج کا نام دیا گیا۔ لیکن کہتے ہیں کہ

ایبک نے تخت نشین ہوتے ہی خراج اور عشر کے درمیان دوبارہ تفریق کر دی۔ اس نے لاہور کے مسلمان شہریوں کی جائیدادیں (ملک) پر مروجہ پانچویں حصے کی بجائے دسواں اور بعض صورتوں میں بیسواں حصہ ٹیکس عائد کر دیا تھا۔ جسے راوی غیر قانونی سمجھتا تھا۔ [36] لیکن بعد کی مثالوں سے اس کے مسلسل اطلاق کا ثبوت نہیں فراہم ہوتا۔ برنی بلبن کے ابتدائی عہد کے ایک ایسے واقعہ کو تحریر کرتا ہے جس میں ایک شخص سراج الدین کی زمین پر خراج نافذ کیا گیا تھا۔ [37] یہاں تک کہ وکیلوں کے عائد کیے ہوئے مقررہ نرخوں پر بھی ہمیشہ پابندی ضروری نہیں تھی۔ اس سلسلے میں وہ بلبن کی اس ہدایت کو نقل کرتا ہے جو بغرا خاں کو دی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ رعایا پر خراج کے تعین کے سلسلے میں بیچ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے نہ بہت زیادہ اور نہ بہت کم۔ [38] ظاہر ہے کہ فوری وصولی سب سے بڑا اصول تھا۔ اس سلسلے میں علاء الدین خلجی کی اصلاحات بہت مشہور ہیں۔ وہ بغاوت کو روکنے یا حریف کی چالوں کو توڑنے کے خیال سے مجموعی پیداوار کا آدھا حصہ زمین کے لگان کے طور پر لے کر سلطنت کا خزانہ بھر دیتا تھا۔ بادشاہ کی دیوان وزارت صرف 'خالصہ' کے علاقے میں براہ راست کسانوں سے خراج وصول کرتی تھی۔ صوبوں میں مقطیع کا محکمۂ محاصل، وصولی کی نگرانی کرتا تھا اور اس کے حساب کتاب بمعہ فاضل وصولی کو مرکزی خزانے میں جمع کرا دیتا تھا۔ اس میں اس رقم کی بھی درجہ بندی کی جاتی تھی جو تابعدار فرماں رواؤں سے بطور نذر یا ہدیہ وصول ہوتی تھی۔ جو درحقیقت اسی خراج کی ایک نئی صورت تھی جو متعلقہ حکومت کے کسانوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ [39]

یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ابتدائی دور کے روزنامچوں نے مفتوحہ ہندوؤں پر نافذ کیے جانے والے جزیئے کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ [40] تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عام ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اس بات کا جواز ضرور ہے کہ اس وقت جزیئے کی اصطلاح کے معنی محض انفرادی طور پر لیے جانے والے امدادی محصول کے نہیں تھے جیسا کہ آج بھی سمجھا جاتا ہے یا بعد کے آنے والے مورخین نے اس کی تشریح کی تھی۔ [41] اس قسم کے ٹیکس کا سب سے پہلا نفاذ فیروز خلجی نے کیا تھا جس نے ہندوؤں پر یہ ٹیکس عائد کرنا تسلیم کیا تھا۔ [42] ایسا لگتا ہے کہ عملی طور پر اس ٹیکس کو ہمیشہ

اس کی تمام باریکیوں اور ضوابط کے ساتھ نہیں نافذ کیا گیا تھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال فیروز تغلق کے عہد میں ملتی ہے جو اسلام اور شریعہ کے سلسلے میں اپنی کارگزاریوں میں دوسری اور کاروائیوں کے ساتھ ساتھ برہمنوں سے جزیہ وصول کرنے کو بھی شامل کرتا ہے۔ اس سے پہلے برہمن اس ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔[11] اس نے مسلمان ہوجانے والوں کے ساتھ مخصوص رعایت کے طور پر جزیہ معاف کرنے کی بات بھی کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے عہد سے پہلے جو ہندو مسلمان ہوجاتے تھے اُن کو بھی یہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔[12]

خمس کی وصولی میں بھی قانون کو نظر انداز کرنے کی اسی قسم کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ اس بات کا ایک دفعہ پھر فیروز تغلق کی باتوں سے ثبوت ملتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے پہلے دہلی کی حکومت کا دستور تھا کہ مال غنیمت کا اسّی فی صدی حصہ حکومت لے لیتی تھی اور صرف بیس فیصدی حصہ جنگ میں شریک ہونے والے سپاہیوں میں یہ تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ جو قانون کے بالکل برعکس تھا۔[13] 1259ء میں اُلغ خاں جب میواتی مہم سے واپس لوٹا تو اس کے پاس باغیوں سے چھینی ہوئی دوسری اور چیزوں کے علاوہ ساٹھ بورے بھی تھے اور ہر بورے میں تیس ہزار تنکہ تھے۔ جو سارے کے سارے سرکاری خزانے میں جمع کر دیئے گئے تھے۔[14] یہاں تک کہ حکومت نے اس مال غنیمت پر بھی قبضہ کر لیا تھا جو مسلم مخالفین سے دستیاب ہوا تھا۔ قباچہ کا سارا خزانہ التتمش کے فاتح وزیر نے مرکزی خزانے کے لیے ضبط کر لیا تھا۔ خود بلبن نے باغی طغرل کے خزانے کو تحویل میں لے لیا تھا۔[15] تیرھویں صدی میں جب کہ معرکوں اور مہموں پر جانا اور حملے کرنا روزمرہ کی بات تھی۔ اس طرح سے حاصل کی ہوئی بے پناہ دولت ہاتھ لگی ہوگی۔ 1233ء میں چندیلا اور جاج پیلا کے علاقوں پر مَلک تیاسائی کے حملے سے، محض بیس فیصدی مقررہ حصے میں تقریباً پچیس لاکھ تنکے ہاتھ لگے تھے۔[16]

زکوٰۃ وصول کرنے کے طریقوں کے سلسلے میں ہمارے پاس کوئی واضح ثبوت موجود نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم عصر تحریروں میں زکوٰۃ کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ یہ ایک انتہائی مذہبی قسم کی چیز ہے اور چوں کہ اس کے تصرف پر بھی بہت سی شرائط عاید ہیں[17] اس لیے شبہ ہوتا کہ کم از کم مملوک سلطنت میں زکوٰۃ کے قوانین کی سختی سے پابندی

نہیں ہوتی تھی۔ تاہم اس کی وصولی کا سب سے پہلے فیروز تغلق کے عہد میں ذکر ملتا ہے[18] اس کو غالباً جب بھی ممکن ہوتا ہوگا، وصول کیا جاتا ہوگا۔ وہ بھی مذہبی اوقات مذہبی اداروں اور علماء کی پنشن وغیرہ ادا کرنے کے خیال سے۔ محمد تغلق کے ابتدائی دور میں ہمیں ایک ایسے محصول کا پتہ چلتا ہے جو سرحد کے پار سے جانے والے تجارتی سامان پر زکوٰۃ کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔[19] یہ بنیادی طور پر کسٹم ڈیوٹی تھی جو غالباً عام محاصل میں ڈال دی جاتی تھی۔ اس ذریعہ سے وصول ہونے والی جس مصرف میں آتی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غیر مسلموں سے بھی وصول کی جاتی تھی اور جن کے لیے اس کی شرح دوگنی ہوگی۔[20]

راستے کے محاصل اور چنگیوں کا ذکر ہمیں بلبن کے اس سفیر سے ملتا ہے جو اپنے بنیان کے سفر پر بہت سے غلاموں کو لے کر نکلا تھا تاکہ ان کو فروخت کر سکے اور اس طرح حاصل ہونے والی آمدنی سے اپنے اخراجات کی ادائیگی کر سکے۔[21] سلطنت کی آمدنی کے لیے مختلف صورتوں میں اور بھی بہت سے ٹیکس ہوں گے جن کو فیروز تغلق نے ختم کر دیا ہوگا۔[22] شریعت نے تمام زمین دوز خزانوں اور کانوں کو ضبط کرنے کا اختیار فرماں رواکو دے رکھا تھا۔ امیر بحر کے فرائض میں غالباً پانی کے راستوں پر کشتیوں کے محاصل اور چنگی وصول کرنا بھی شامل ہوگا۔

دیوان وزارت کے بیان میں اوپر جو کچھ کہا جا چکا ہے اس میں مالیات کے بندوبست کے سلسلے میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ طبقات ناصری میں صرف ایک جگہ ہم کو "بیت المال" کا ذکر ملتا ہے۔ جس کے سیاق و سباق سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ زکوٰۃ کے لیے کوئی الگ خزانہ کھولا گیا تھا یا نہیں[23] عام طور پر ریاست کی آمدنی کے معنی میں محصول کے لیے "خزانہ" کا لفظ استعمال ہوتا تھا چوں کہ حکومت پر سلطان کے اہل خاندان کا قبضہ رہتا تھا اس لیے عوام سے وصول کیے ہوئے محاصل کو اس کے عیش و نشاط پر صائع کیا جا سکتا تھا۔ ہم ابھی تک کسی جگہ شاہی اخراجات کے لیے صرف خاص کی رقم مقرر کرنے کا ذکر نہیں سنتے ہیں۔ رکن الدین فیروز نے وابستگی کا سامان فراہم کرنے والوں پر حکومت کا خزانہ لٹا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اودھ سے واپس آنے کے بعد کیقباد نے نظام الدین کی بڑی محنت سے جمع کی ہوئی فاضل رقم کو رقاصاؤں پر

نچھاور کر دیا تھا۔[24]

مملوک سکوں کے بارے میں ایڈورڈ تھامس اور نیلسن رائیٹ نے جو غیر معمولی تحقیقات کی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ہم یہاں پر زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ان کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کر دیں اور کچھ ضمنی نکات پر بحث کر لیں۔

جیسا کہ تھامس نے لکھا ہے ترک فاتحین نے نئے مالی نظام کو ایک دم جاری نہیں کرایا تھا بلکہ رائج الوقت نظام کو اپنا لیا تھا انھوں نے ملی جلی دھات کے پرانے "دہلی والا" کو تھوڑی بہت بتدریج تبدیلی کے ساتھ جاری رکھا۔ ہندو سکوں کے ڈیزائن اور ساخت کو انھوں نے نئے جاری ہونے والے مسلم سکوں کے لیے قائم رکھا دہلی کی فتح کے تقریباً ساٹھ سال بعد بلبن نے "سانڈ اور گھوڑ سوار" کی تصویر ہٹا کر دیوناگری رسم الخط میں بادشاہ کا نام کندہ کرا دیا تھا۔[25] فوجی قبضہ کے ابتدائی برسوں میں ملی جلی دھات کا سکہ "دہلی والا" عام رائج الوقت سکہ رہا۔ تاہم منہاج نے ہمیشہ جیتل کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ سال گزرنے کے بعد "دہلی والا" کا نام بگڑتے بگڑتے جیتل ہو گیا تھا۔[26] اور پھر آہستہ آہستہ جیتل روزمرہ استعمال ہونے والا ایک عام سکہ بن گیا اور "دہلی والا" ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ اسی قسم کے سکے یلدز اور قرلغ نے بھی اپنے مختصر دور حکومت میں جاری کیے تھے۔[27]

رائج الوقت سونے کے سکوں میں بھی نئی فرماں روائی کی نمایاں تبدیلیاں محمود کے دور حکومت تک باقاعدہ نہیں آئی تھیں۔ معز الدین کے تین جانے پہچانے سکوں میں سے دو سکے قنوج والا سکوں کی نقل ہیں۔ یہاں تک کہ ان پر "لکشمی دیوی" کی تصویر بھی ہو بہو موجود ہے۔ ان کو پہچاننے کی علامت صرف فرماں روا کا نام ہے جو ہندوستانی رسم الخط میں نقش ہے۔ تیسرا سکہ جو اپنی جگہ ایک عجیب و غریب چیز ہے اسلامی سکے دینار کی طرح ہے جو ان دنوں اس کی شمالی ریاستوں میں مروج تھا۔[28] اور جو یادگاری سکے کے طور پر جاری کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے سکے پر بھی ایک دیوناگری روایت (LEGEND) کے علاوہ ایک گھوڑ سوار کی تصویر ہے جو چوہان سکوں پر ہوا کرتی تھی۔[29] آخر الذکر قسم کے سونے کے سکے التمش نے 608ھ 614ھ اور 616ھ میں ڈھلوائے تھے لیکن سوائے عربی روایت کے مطابق کلمہ اور خلیفہ کے نام کے

اُن میں غزنی دینار کی کوئی مشابہت نہیں تھی۔[31] غالباً اس کی وجہ کسی معیاری وزن کی غیر موجودگی تھی جس کے لیے مقامی چاندی کے سکوں نے کوئی تسلیم شدہ نمونہ فراہم نہیں کیا تھا اس کے بعد سونے کا سکہ پچاس سال تک باقاعدہ سکہ نہیں بن سکا۔[32] لیکن اس کے بعد جب چاندی کا سکہ عام استعمال میں آگیا تو سونے کے سکے کو رائج الوقت سکوں کے زمرے میں شامل کرنا ممکن ہو سکا۔

اسی زمانے کے تانبے کے سکے وزن کے معیار کے اعتبار سے تقریباً پرانے "دہلی والا" کے برابر تھے۔[33] ان سکوں کو 'عدل' کہا جاتا تھا۔[34]

چاندی کے سکے رائج کرنے کی وجہ سے التمش کے دور حکومت کو ہند و مسلم نظام کی ابتدا سمجھا جاتا ہے۔ یہ سکہ، جو آج کے روپے کا باوا آدم ہے، تنکہ کہلاتا تھا۔ تنکہ دراصل چاندی کے وزن کو ظاہر کرنے کی ایک ہندوستانی اصطلاح ہے۔ جس کے رائج الوقت سکے کے طور پر استعمال ہونے کی سب سے پہلی مثال محمود غزنی کے دو زبان والے سکے "درہم" میں پائی جاتی ہے 1027ء میں محمود پور (لاہور) میں ڈھالا گیا تھا۔[35] لیکن دہلی کے تنکہ اور 'درہم' میں کوئی بنیادی تعلق نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ شکل وصورت اور اس پر لکھی ہوئی روایت مشترک ہے۔ تنکہ کو خالص ہندوستانی اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس کے نام اور اس کے وزن کی یکسانیت میں، جیسا کہ تھامس نے کہا ہے 'دیسی روایت کی پیروی کی گئی تھی۔ مملوک تنکہ میں یہ خیال رکھا گیا تھا کہ وہ 32 رتی پراتا سے تقسیم کے قابل ہو کیوں کہ "دہلی والا" کا تقریباً یہی وزن تھا۔ منصوبہ بنایا گیا تھا کہ مملوک تنکہ ایک تولہ یا 96 رتی چاندی کے برابر ہوگا۔ جو رائٹ اور نیول کے حساب سے 172،0 رتی کے برابر ہوتا تھا نہ کہ تھامس کے خیال کے مطابق 175 رتی کا۔ بعد میں جاری ہونے والا سونے کا تنکہ بھی اسی وزن کے اعتبار سے بنایا گیا تھا اور غالباً معزالدین کے جاری کیے ہوئے ہندوستانی دینار (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) نے اسی کی پیش قدمی کی تھی۔

عربی روایت کو اختیار کرکے، جو بلاشبہ دینار سے مستعار لی گئی تھی اور پھر اس میں کلمہ اور فرماں روا کے لقب کو کندہ کرنے کے بعد تنکہ سلطنت دہلی کا معیاری سکہ بن گیا تھا۔ شائع شدہ نمونوں کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سکے کے پیچھے خلیفہ وقت کا نام

شامل کرنے کے بعد وہ تجربہ مکمل ہو گیا تھا جو 1217ء / 614ھ کے ابتدائی حصّے میں شروع ہوا تھا۔[35] ابھی تک سکّے پر صرف کلمہ ہوتا تھا لیکن پچھلے حصّے پر خلیفہ کے نام کا پہلا سکّہ جس پر بہت صاف تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ 1225ء / 622ھ میں جاری ہوا تھا اس پر بادشاہ کا لقب بھی کافی تفصیل سے لکھا ہوا تھا جو "امیر المومنین" سے اس کے قریبی تعلق کو ظاہر کرتا تھا۔[37] 1230-1ء / 628ھ سے خلیفہ المستنصر کا نام لکھا جانے لگا کیوں کہ اس سال التمش کو وہ مذہبی خطابات عطا کیا گیا تھا جس کا مدتوں سے انتظار تھا۔ اس موقع پر ایک بغیر تاریخ کا سکّہ جاری کیا گیا تھا جس پر صرف خلیفہ کا نام اور کلمہ تحریر تھا۔[38] اس طرح سے جو روایت وجود میں آئی وہ تھامس کے نمبر 33 میں دکھائی گئی ہے اور یہی روایت تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ مستقبل میں آنے والے تنکہ کے لیے مثال بنی رہی۔

تنکہ کی تاریخ کی چھان بین کرنے میں تھامس اور رائٹ، دونوں نے اپنے آپ کو دہلی سے جاری ہونے والے سکّوں تک محدود رکھا تھا۔ اسی لیے انھوں نے بنگال میں ڈھالے جانے والے سکّوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ لکھنوتی کے بادشاہ غیاث الدین عوض نے 1219ء / 616ھ میں چاندی کے سکّے جاری کیے تھے وہ شکل و صورت اور روایت کے حساب سے 1234ء / 632ھ میں التمش کے جاری کیے ہوئے آخری سکّے سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔[39] اس کے جاری کردہ دوسرے اور سکّے کا خاص طور پر 1221ء / 619ھ اور 1222ء / 620ھ کے سکّوں پر نہ صرف خلیفہ الناصر کا نام درج ہے بلکہ ان کا وزن بھی 172 گرین کے تسلیم شدہ رائج وزن کے تقریباً برابر ہے۔[40] ان سکّوں پر عوض کے بڑھے چڑھے شاہی القاب کے ساتھ مہینہ اور سال بھی درج ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے تھامس، خلیفہ سے اعزاز عطا ہونے سے تعبیر کرتا ہے۔[41]

تاہم رائج الوقت سکّوں کو نئے نام جیتل کے تحت اپنانے کا سہرا التمش کے سر جاتا ہے۔ جس نے اُسے کم قیمت کا سکّہ تسلیم کیا اور اس کے مقررہ وزن کے مطابق تنکہ میں تبدیلی کر دی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیتل میں عمداً پہلے نمونے کے مقابلے میں کسی قدر کم چاندی رکھی گئی تھی کچھ نمونوں کی جانچ پڑتال سے ظاہر ہوا ہے کہ اس میں 3.6 گرین یا دو رتی چاندی تھی جبکہ "دہلی والا" میں 7.0 گرین چاندی ہوا کرتی تھی۔[42] اس طرح ہم اُس

کی اصلی قیمت مقرر کر سکتے ہیں دراصل اسی فرق نے اس کے اور تنکہ کے معیار کا درجہ مقرر کیا ہوگا۔ تھامس کی جانچ پڑتال کی بنیاد پر رائٹ اور نیول نے فیصلہ کیا کہ جیتل کی قیمت تنکہ کا بارہواں حصہ رہی ہوگی[42] بعد میں انھوں نے اپنے اسی تخمینے کو بدل کر 1/48 حصہ کر دیا جو شمالی ہند میں تیرھویں صدی کے آخری حصے میں جیتل کے تبادلے کی قیمت تھی[44] اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمود[45] بلبن[46] اور کیقباد[47] کے جاری کیے ہوئے چاندی کے چھوٹے سکے "جن کا اوسطاً وزن 14.4 گرین تھا اور جسے رائٹ نے 'ماشہ' کہا ہے، چار جیتل کے برابر رہے ہوں گے۔ غالباً ان کا مقصد ہی جیتل کا چوتھا حصہ بنانا رہا ہوگا۔ بلبن کے دور حکومت میں ملی جلی دھات کے متعدد دو لسانی سکوں کو ڈھالا گیا جن میں جیتل سے زیادہ اور "دہلی والا" کے مقابلے میں نسبتاً کم چاندی ہوتی تھی ان سکوں کا غالباً مقصد ہی کسی درمیانی سکے کو پیش کرتا رہا ہوگا۔ رائٹ کا خیال تھا کہ اس کی اصلی قیمت دو جیتل یا 1/24 تنکہ کے برابر تھی۔[48] اس طرح یہ نہ صرف 48 تنکہ جیتل کے منصوبے پر پوری طور پر منطبق ہوتا ہے بلکہ منصوبے کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ التتمش کا رائج کیا ہوا سکہ رائٹ کے خیال میں 3 جیتل کی مثال پیش کرتا ہے یعنی وہ تنکہ کا 1/16 حصہ تھا جیسے ہم "آنے" کی قدیم ترین صورت کہہ سکتے ہیں[49] کیقباد کا بھی ایک سکہ اسی قیمت کو ظاہر کرتا ہے جس میں اوسطاً آٹھ گرین چاندی ہوتی تھی اور غالباً اس کا مقصد تنکہ کی علامتی قیمت 1/16 رہی ہوگی[50]

جیتل اور تنکہ کے مقابلے میں تانبے کے سکے کی صحیح قیمت نکالنے کے صرف یہ صورت ہے کہ ہم پچھلی معلومات کی بنا پر نتائج نکالیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہم اس کی اصلیت کو نہیں جانتے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ان میں سے کچھ ابتدائی سکوں پر 'عدل' لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح بعد میں جاری ہونے والے چاندی کے سکوں پر بھی لکھی ہوئی پائی گئی ہے[51] چودھویں صدی میں شہاب الدین عباس نے محمد بن تغلق کے سکوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے تانبے کے سکوں کو فلس کا نام دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چار فلس کا تبادلہ ایک جیتل سے ہو سکتا ہے[52] دوسری بات یہ ہے کہ تانبے کے سکوں کا وزن 71 سے 12 گرین کے درمیان ہوا کرتا تھا[53] جس کی وجہ سے ان کی اصلی متناسب قیمت کا کوئی راز نہیں کھلتا۔ لیکن اگر رائیٹ اور نیول کا

یہ کہنا ٹھیک تھا کہ چاندی اور تانبے کے سکوں کا تناسب اسی اور ایک کا تھا۔ (یعنی تانبے کے 288 گرین کو 3.6 گرین یا دو رتی چاندی والے جیتل سے تبدیل کیا جاسکتا ہے) تو پھر اگر تانبے کے سکے کی اصلی قیمت کو چاندی کی بنیاد پر تولا جائے تو پھر دہلی میں رائج قیمتی سکوں کے مقابلے میں اس کی قیمت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک سکے میں 14.4 گرین چاندی ہے تو پھر اس کا 72 گرین فی سکہ وزن والے تانبے کے 16 سکوں سے تبادلہ کیا جاسکتا ہے اور اگر 12 گرین والے چھوٹے سکے ہوں تو پھر ان کے تبادلے کے لیے 96 تانبے کے سکے درکار ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ 72 گرین والے تانبے کے سکے ایک جیتل کے برابر ہوں گے۔ یہ حقیقت دراصل شہاب الدین کے اس بیان کی صداقت کرتی ہے جو اس نے فلس کی قیمت مبادلہ کے سلسلے میں دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ تیرھویں صدی میں سکوں کی اصلی قیمت میں بہت کم اتار چڑھاؤ ہوا کرتا تھا۔

تاہم التتمش کے کچھ ایسے عدل ملے ہیں جن کا وزن صرف آٹھ گرین تھا۔ لیکن رائیٹ کے کہنے کے مطابق ان سکوں کا اونچی قیمت کے سکوں سے کوئی علامتی رشتہ نہ ہوگا۔ ان کی قیمت دراصل اپنی دھات کی اصل قیمت کے برابر ہوگی۔ تانبے کے مختلف سکوں کے اجزاء کی جو درجہ بندی رائیٹ نے کی ہے اس سے ضمنی درجہ بندی کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ چاندی کے تنکہ میں ہوا کرتی تھی۔ کچھ دستیاب شدہ مندرجہ سکے 49، 36، 18 اور 12 گرین[54] کے ہیں جو یقیناً 72 گرین (40 رتی) والے تانبے کے فلس کے زمرے میں آتے ہیں جن کی ضمنی درجہ بندی $\frac{2}{3}$، $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{3}$، $\frac{1}{4}$ اور $\frac{1}{6}$ ہوا کرتی تھی۔ جہاں تک چاندی کا معاملہ ہے التتمش، محمود، بلبن اور کیقباد کے جاری کیے ہوئے چھوٹے سکے بھی اسی قسم کی تقسیم کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔[55] ان کے اوزان کی تبدیلی کو ہم آسانی سے 172 گرین والے ترمیم شدہ تنکہ کی درجہ بندی کے تحت لا سکتے ہیں۔ مثلاً 86.4، 5.66، 28.8 اور 14.4 گرین۔ یہ تقسیم ان کو بالترتیب تنکہ کے مقابلے میں $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{3}$، $\frac{1}{6}$ اور $\frac{1}{12}$ کا درجہ دے دیتی ہے۔ اسی قسم کی تقسیم ہم کو سونے کے اس سکے میں بھی ملی ہے جو مبارک خلجی نے 55.7 گرین کے وزن میں جاری کیا تھا۔[56] نیول اور رائیٹ کے نکالے ہوئے نتیجے کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سونے اور چاندی کا تناسب $\frac{1}{10}$ کا ہوا

کرتا تھا یعنی سونے کے ایک تنکہ (تنکہ طلائی) کا تبادلہ چاندی کے دس ہم وزن سکوں سے کیا جا سکتا تھا۔

ابتدائی سکوں پر ٹکسال کا نام نہیں ہوتا تھا۔ تاہم معزالدین کے تانبے کے دو سکوں پر ایسا لگتا ہے کہ ان کے اجرا کے مقام کا نام درج ہے لیکن اس کو پڑھنا مشکل ہونے سبب سے شک پیدا ہوتا ہے۔[57] التتمش نے ایسا لگتا ہے کہ اپنے سکوں پر ٹکسال کا نام کندہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے چاندی کے نایاب سکوں میں سے ایک پر غیر واضح نام "بلاد الہند" لکھا ہوا ہے۔[58] ایک اور سکے پر جس پر 1219ء / 616ھ کی تاریخ "گور" لکھا ہوا ہے جو غالباً "ناگور" رہا ہوگا۔[59] دہلی بحیثیت ٹکسال سب سے پہلی دفعہ 1230ء / 628ھ میں جاری ہونے والے تنکہ پر سامنے آیا۔[60] اس کے ایک چاندی کے سکے پر "لکھنوتی" کے پڑھے جانے میں مضائقہ ہے۔ اس سکے پر 1235ء/633ھ کی تاریخ درج ہے۔[61] اسی بادشاہ کے ایک اور مفروضہ سکے پر ملتان کا نام لکھا ہوا ہے۔[62] سب سے پہلا لکھنوتی کا صاف صاف نام لکھا ہوا تنکہ رضیہ نے 1236ء / 634ھ میں جاری کیا تھا۔[63] ایسا لگتا ہے کہ بلبن نے متعدد نئے ٹکسال کھولے تھے۔ اس کا ایک تانبے کا سکہ "خطہ" سلطان پور میں ڈھالا گیا تھا۔[64] بلبن کے ایک چاندی کے تنکہ پر عارضی طور پر خطہ الور پڑھا گیا ہے۔ مملوک سکوں میں ماہرانہ منصوبہ بندی اور ترتیب نمایاں نظر آتی ہے اس کو بڑے سلیقے سے ہندوستانی اوزان کے معیار پر ڈھالا گیا تھا اور عوام کے نظریات اور حالات کے مطابق تمام رعایتیں ملحوظ رکھی گئی تھیں۔ دہلی کے ماہر مالیات کی صلاحیتوں کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ سکے کی متناسب قیمت پوری صدی تک یکساں طور پر قائم رہی ہم نے اب تک جن باتوں پر روشنی ڈالی ہے اس کا اختصار درج ذیل ہے۔ جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ چاندی کا تنکہ ایک مرکزی سکہ تھا جس کی بنیاد پر باقی تمام دھاتوں کے سکوں کی درجہ بندی کا تعین ہوتا تھا۔ حالانکہ جیسا کہ نیول اور رائٹ نے اشارہ کیا ہے کہ مالیاتی معیار دراصل تین دھاتوں پر منحصر تھا۔ سکے میں استعمال ہونے والی دھات کی اپنی اصلی قیمت دوسرے اور سکوں کے مقابلے میں اس کی قیمت کی درجہ بندی کرتی تھی۔

2۔ 36 گرین تانبے کے سکے = ایک فلس یا عدل

4 فلس	=	ایک بلن جیتل
48 جیتل	=	ایک چاندی کا تنکہ جس کا وزن 172.8 گرین تھا۔
10 چاندی کے تنکہ	=	ایک طلائی تنکہ
1 چاندی کا تنکہ	=	دو 86.4 گرین اور آدھا تنکہ
	=	تین 57.6 گرین ، چار ماشہ سکے
	=	چھے۔ ڈبل ماشے
	=	12 ماشے (1404 گرین چاندی)
	=	16۔ تین جیتل کے سکے
	=	24۔ ڈبل جیتل
	=	192۔ فلس
	=	288۔ 48 گرین تانبے کے سکے
	=	384۔ آدھے فلس

حوالاجات

1- خراج، اور عشر عاید کرنے کے قوانین کے لیے دیکھیے، ابو یوسف، کتاب الخراج ص ص 35- 39 ؛ افنائیڈس، مسلم تھیوریز آف فنانس، ص ص 362، 425-

2- دیکھیے، رحم، محمد جیورسپروڈنس، ص-

3- انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، خراج، پر مقالہ ؛ الماوری بھی: احکام السلطانیہ ص-130-

4- فخر مدبر: تاریخ، ص ص- 33 - 34 -

5- برنی، ص- 194

6- برنی، ص- 100

7- فارسی لفظ پیش کش، جس کا استعمال مغل دور کے مورخین نے برائے نام خراج کے معنی میں استعمال کیا ہے ابتدائی (شروع کے) تذکروں میں نہیں ملتا- ان میں ہندو حکمرانوں کے اطاعت قبول کرنے کے سلسلے میں 'خراج' اور 'مالگذاری' الفاظ استعمال کیے گئے ہیں- مثال کے طور پر تاج المعاصر: ص- ذ 469 اور 425 اے ؛ المجاز خسروی بھی دیکھیے: ص، 416 اے-

8- ہندوستان میں لکھے گئے تذکروں میں اس کا استعمال پہلی بار آداب الحرب میں ہوا ہے- صفحہ ذیل 157 بی 158 اے- لیکن اس اصطلاح کا استعمال صاف طور پر ہندو اور مسلمان دونوں ہی لوگوں پر عائد کیے گئے ٹیکسوں کے معنیٰ میں کیا گیا ہے-

9- تیرہویں صدی کے آخیر میں لکھے گئے جوینی کے تذکرے میں جزیہ اور خراج دونوں ہی خراج کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں، ii، 89 - برنی نے بھی دو موقعوں پر لگان کو جزیہ لکھا ہے- ص- 574 -

10- برنی، ص-

11- عفیف: ح۔س، ص- 38 فیروز نے بھی آداب الحرب صفحہ ذیل۔ 338 اے میں دیئے گئے ٹیکس کی چار دستوری شرحوں کو لاگو نہیں کیا۔م۔بہ۔ فیروز کے ٹیکسوں سے متعلق عفیف کی دی ہوئی تفصیلات، ص۔383 -

12- فتوحات فیروز شاہی؛ مدیر رشید، ص- 16-

13- ایضاً، صفحہ ذیل- 300 بی، رشید، ص - 6 -

14- منہاج، ص- 315 -

15- الیٹ، ii، ص- 242؛ برنی، ص- 92 -

16- منہاج، ص- 240 -

17- قوانین کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، اغنا ئڈس: ح۔س۔ص ص- 298، 338-

18- تغلق کے عہد میں قانونی دستوں سے متعلق ایک نامعلوم مصنّف کی ترتیب دی ہوئی ایک کتاب فقہ فیروز شاہی، میں زکوٰۃ کے لیے علیحدہ بیت المال کا ذکر ہے؛ جس کا حوالہ قریشی نے دیا ہے، ص۔93 لیکن اس کا ذکر، فتوحات میں ہے۔

19- ابن بطوطہ: کتاب الراحلہ؛ ڈیف سانگ، iii، ص 112- 113 -

20- دیکھیے اغنا ئڈس: ح، س، ص- 318 -

21- منہاج، ص- 321 -

22- ان ٹیکسوں کے لیے دیکھیے قریشی: ص ص- 228- 229؛ اسی قسم کے دوسرے ٹیکسوں کا ذکر عفیف کے یہاں ملتا ہے۔ص ص- 374- 377 -

23- منہاج، ص- 182 -

24- IDAM برنی، ص- 164 -

25- بلبن کے عہد کا صرف ایک بلّن جو جاری ہوا تھا، ملا ہے جس پر پرانا کتبہ ہے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔1892ء صفحہ 64 نمبر 1 -

26- تھامس کے اس خیال میں کہ 'جیتل'، 'دہلی والا' کا ہی تسلسل تھا، تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کیوں کہ اس میں چاندی کی تعداد کم ہوتی تھی اور غالباً اس کے کم شرح مبادلہ اس کے اجراء کا مقصد تھا، دیکھیے رائٹ: ص- 72- 73- وسط ایشیا

میں جیتل کے لیے دیکھیے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1924، ص این-33

27- رائٹ، ص- 90 ؛ راجرس- ص- 42-

28- تھامس کرانکل، ص- 19- 20 رائٹ، ص- 6 نمبر 4 اور 5-

29- دیکھیے لین پول ؛ برٹش میوزیم کیٹلاگ آف کوائنس نمبر 6 شمالی دنیا کے لیے-

30- رائٹ، ص- 6 نمبر 3 اے-

31- ایضاً ص- 15 نمبر 49 - ایف اور 49 جی، ان دیچوہان، خصوصیات کے علاوہ سونے کے ان سکوں کا وزن صرف 70.6 گرین ہے جبکہ غزنی دینار کا وزن 118 سے 134 گرین ہے-

32- م- بہ- نیومسمٹک کرانکل- 1885، ص- 216 ایک طلائی سکے کے لیے جسے ابتداء میں رضیہ سے منسوب کیا گیا تھا- لیکن بعد کو پتہ چلا کہ وہ جعلی ہے، نیومسمٹک کرانکل 1921، ص- 342-

33- 32 رتی یا 16 گرین کا مروجہ وزن تانبے اور بلبن کے سکوں کے لیے مثالی تھا خواہ وہ مسلمانوں کے جاری کردہ ہوں یا ہندوؤں کے، دیکھیے تھامس، ص- 4- مسلمانوں اور ہندوؤں کے جاری کردہ سکوں کے وزن میں کمی بیشی کے سلسلے میں جو مماثلت پائی جاتی ہے- اس کے لیے دیکھیے سپلیمنٹری کیٹلاگ آف دی کوائنس ان دی انڈین میوزیم، ii، ص- 61- 62، ii ص ص- 80- 89، 1000- 106-

34- ایسے سکوں کے لیے جن کی پشت پر لفظ، عدل، لکھا ہوا ہے دیکھیے رائٹ-

35- تھامس: کرانکلس، ص ص- 47- 48-

36- رائٹ، ص- 16 نمبر 49 ایچ-

37- ایضاً ص- 17 نمبر 49 ایل-

38- تھامس: کرانکل نمبر 28 ؛ رائٹ، ص- 18 نمبر 50 سی-

39- جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین (این- ایس) 71، ص- 352 ؛ نمبر 4 رائٹ بھی دیکھیے، ص- 20 نمبر 51-

40- کیٹلاگ آف کوائنس ان انڈین میوزیم، 25 ص- 51 نمبر-

41- جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین، 71، ص- 357- 617، 6

619 اور 620 کے جاری کردہ سکوں میں ایک مخصوص مہینہ کا نام بار بار آنے سے سالانہ یادگار کے خیال کو تقریباً یقینی بنا دیتا ہے۔ یہ مہینہ ربیع الثانی کا ہے، ایک سکے پر 20 ربیع الثانی کی تاریخ ہے۔ 616 ھ کے جاری کردہ سکے پر 19 صفر کی تاریخ ہے۔ جب 621 ھ کے سکے پر جمادی الثانی ہے، م۔ بہ۔ جے۔ این۔ ایس۔ آئی xvi، 1954 پلیٹ، ii، ص 243-252 جس میں تھامس کے خیال سے اختلاف کیا گیا ہے۔ لیکن ان تاریخوں کی کوئی اطمینان بخش وضاحت بھی نہیں کی گئی ہے۔

42- رائٹ، ص 71- 73۔

43- جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال xx، 1924- نیومسمیٹک سپلیمنٹ xxxviii، اور 248-

44- رائٹ، ص- 79۔

45- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1894، ص- 68 نمبر- 21 راجرس ۱۷ سپلیمنٹ نمبر- 15۔

46- راجرس ۱۷، سپلیمنٹ- نمبر- 20۔

47- رائٹ، نمبر، 262 اے۔

48- ص- 80- 81۔

49- ایضاً، ص- 28 نمبر- 91۔

50- ایضاً، ص- 81 نمبر 263۔

51- تھامس: کرانکل، نمبر 124- 180۔

52- رائٹ میں دیا گیا حوالہ، ص- 161۔

53- کٹیلاگ آف کوائنس ان دی انڈین میوزیم، ii ص ص 33- 35 نمبر 145- 146 اور 158- 159-

54- رائٹ نمبر 261 (کیقباد، 49 گرین) 249 (بلبن 55 گرین)، 131 (التتمش، 178 گرین)، 239 (محمود، 4.12 گرین) 256 (بلبن 5.12 اور 3.10 گرین) اوزان اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم محض اندازہ سے ہوتی تھی، استعمال کی وجہ سے وزن میں کمی کا خیال بھی رکھنا چاہیئے۔

55- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1916 ص- 129 نمبر- 1: 1890، ص- نمبر 2، 1883، راجرس سپلیمنٹ، iii - نمبر 20، 1916، 13 نمبر- 3-

56- نیومسمیٹک کرانکل، 1924 ص 346-

57- رائٹ، ص، iii ، نمبر 35 اے اور 36 خیال ہے کہ ان پر الوالہ (آؤلنا) اوراجین لکھا ہوا ہے-

58- نیومسمیٹک کرانکل ر ح- س، ص- 340-

59- رائٹ نمبر 49 ایف، جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین (این- ایس) VI، ص- 348 اس نکتہ کے لیے دیکھئے نوٹ، 57 ص- 108 سپرا-

60- رائٹ- نمبر ایف-

61- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1881 ص- 67 کیٹلاگ آف کوائنس ان دی انڈین میوزیم، ii، ص- 21 نمبر- 38، پیش لفظ بھی، ص- 6 رائٹ، ص- 20 نمبر 52 اے-

62- کیٹلاگ آف کوائنس ان دی انڈین میوزیم، ii، ص- 25 نمبر 82 -

63- تھامس، کرانکلس، ص- 107 نمبر 40 رائٹ، ص- 41 نمبر 161 بی-

64- جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1904 ص- 66، 1910 بھی، ص 566 نمبر 1 -

65- نیومسمیٹک کرانکل، 1924 (v، سیریز، i)، ص- 343 -

پندرھواں باب

معاشرہ اور تہذیب

یہ سمجھنا غالباً ٹھیک ہوگا کہ شمالی ہند میں مسلم فرماں روائی کی پہلی صدی میں مسلم سماج کا اعلیٰ طبقہ ایرانیوں، افغانوں، ترکوں اور تھوڑے بہت عربوں پر مشتمل تھا۔ بعد ازاں ہندوستانی قبائل نے بڑی تعداد میں مذہب تبدیل کر کے اس معاشرہ کے عوام کو جنم دیا۔ سوائے سندھ کے جہاں ابتدائی عرب حوالوں کے مطابق کچھ ایسے نومسلم بھی ہوئے جو اعلیٰ عہدوں تک پہنچے اور جنھوں نے عربی ادب اور معاشرہ میں نمایاں جگہ حاصل کی ہے لیکن موجودہ شہادتوں کی بنا پر ایسا لگتا ہے کہ ان کو برابر کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ اگر ابتدائی مسلم تبلیغی کارکنوں کی روایات کو مدِ نظر رکھا جائے تو مذہب تبدیل کرنے والے بیشتر لوگ نچلے درجے کے ہندوستانی عوام تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ امید بھی نہیں کر سکتے تھے کہ انھیں فاتحین کے اعلیٰ طبقوں میں شامل کیا جائے گا یا ان کو استحقاق اور لطف و کرم سے نوازا جائے گا۔

اعلیٰ طبقے کے سخت ترین محافظ ترک تھے جن کی فوجی طاقت نے انھیں قیادت کا کام اپنی نسل کے لیے محفوظ رکھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ جب انھوں نے شمالی ہند کے دریاؤں کی وادیوں کو فتح کیا تو ان کی شہریت اور بڑھتے ہوئے وسائل کی وجہ سے ان کا احساس برتری اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس احساس برتری کو اس وقت اور بھی شہہ ملی جب دوسرے اور لوگوں کے بھاگ کھڑے ہونے پر انھوں نے منگول طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بلبن کے اس دعویٰ میں بڑی حقیقت نظر آتی ہے کہ مسلم ایشیا کے

کم از کم پندرہ خود مختار شہزادوں نے اس کی سلطنت میں آکر پناہ لی تھی۔ اس میں کوئی اپنی قیادت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔

اسلامی عوام کے مختلف طبقوں کے میل جول پر منگول حملوں کا بہت کم اثر پڑا تھا۔ ہندوستان میں اس کے نتیجے کے طور پر سب سے بڑا یہ اثر ہوا تھا کہ ایک ملا جلا مسلم معاشرہ وجود میں آگیا تھا۔ فخر الدین کے بعد دوسری پشت سے ترکوں کا تعلق اپنے وطن سے منقطع ہو گیا تھا اور ان کو مجبوراً تنگ آمد بہ جنگ آمد کا رویہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ ایک طاقت ور کافر ملحد کا مقابلہ کرنے کے لیے لڑنے والی مسلمان طاقتوں کے استحکام کا جذبہ بڑی شدت سے طاری ہونا ضروری تھا چنانچہ خراسان یہاں تک کہ ہندوکش کے پار عراق سے بے شمار مہاجر آکر فوجی صفوں میں شامل ہو گئے۔ جنگ کے اس طویل ہنگامی حالات میں نو مسلموں یہاں تک کہ غیر مسلموں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ نو مسلموں کو فاتحین کے طور طریقوں کو نہ صرف سیکھنے کا بلکہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کی کوشش کا بھی موقع مل گیا۔ معتیجی ذات کے غیر ترکوں" کے خلاف بلبن کی نفرت کے باوجود، ہندوستانی نژاد، عماد الملک راوت کا اپنے عریض کے عہدے پر تقرر کرنے سے وہ بھی گریز نہ کر سکا۔ برنی کے حوالے کے مطابق سب سے نمایاں وہ منگول تھے جنھوں نے اپنا مذہب بدل لیا تھا اور جو دہلی میں سکونت پذیر تھے ان کی نہ صرف اعلیٰ ترکی خاندانوں سے قریبی رشتہ داری قائم ہو چکی تھی بلکہ وہ کیقباد کے دربار میں بڑی بڑی جگہوں پر فائز بھی تھے۔ مقامی لوگوں اور مہاجرین سے شادیوں کی وجہ سے ترک خون میں غیر محسوس لیکن یقینی طور پر ملاوٹ آگئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے تہذیبی خیالات اور تصورات میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ خلجی حکومت جو مملوک کے مقابلے میں زیادہ وسیع بنیادوں پر قائم تھی دراصل ان ہی تبدیل شدہ سماجی طاقتوں کا سیاسی اظہار تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ ابتدا ہی سے مسلم معاشرے کی داخلی تقسیم واضح رہی تھی ان میں سے ایک اہل سیف تھے اور دوسرے اہل قلم یعنی ایک تلوار کے دھنی تھے اور دوسرے صاحب لوح و قلم۔ فراہم شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی ایک یا دو پشتوں میں اہل قلم صرف غیر ترکی پردیسی ہوا کرتے تھے۔ اور ان ہی لوگوں میں سے دفتری کاموں کے لیے

مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے پڑھے لکھے لوگوں کو بھرتی کیا جاتا تھا۔
اہلِ قلم کا سب سے زیادہ با اثر حصّہ مذہبی علماء، عالم دین اور تصنیف و تالیف کا کام کرنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ لوگ اور امراء مل کر مسلم معاشرے کے پہلے دو حکمراں طبقے بناتے تھے۔ حالانکہ یہ لوگ عیسائیوں کی مذہبی جماعت کی طرح منظم نہیں تھے لیکن پھر بھی ان کی جماعت میں کافی یک جہتی تھی۔ ان کو اپنی اہمیت کا نہ صرف شدید احساس تھا بلکہ اپنے اعلیٰ حقوق کی حفاظت بھی حاسدانہ طور پر کرتے تھے۔ عدالتی اور مذہبی کاموں کی نگرانی اور قیادت اُن کے ہاتھوں میں تھی اور جہاں کہیں مسجد ہوتی تھی اور ہر مسلمان علاقے میں مسجد کا ہونا ضروری تھا۔ امام، خطیب محتسب اور مفتی اپنا حق جتاتے تھے جس کو حکومت تسلیم کرتی تھی۔ یہی لوگ تمام تعلیمی اداروں کو چلاتے تھے اور اس طرح وہ ان غیر قدامت پسند خیالات اور اس تعلیم کو قابو میں رکھتے تھے جو ان کی حیثیت کو کم کرنے کا سبب بنے۔ اس طبقے کی سربراہی کرتا تھا۔ جس کے اقتدار کے تحت مشائخ کے سوا تمام پڑھے لکھے مسلمان آجاتے تھے۔ مشائخ صوفی اور ولی ہوتے تھے جن کی آزادی اور عقبا پرستی، خشک دماغ رکھنے والے عالم دین کو کبھی راس نہیں آتی تھی۔ یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ عالم دین کھلم کھلا طور پر صاحب اقتدار کو خوش کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ جس کی عام طور پر صوفی ولی لعنت و ملامت کرتے تھے۔ تاہم صوفیوں اور ولیوں کی عام مقبولیت کی وجہ سے اُن پر توجہ دینا ضروری تھا۔ اسی لیے نہ صرف سرکاری لوگ بلکہ خود بادشاہ ان لوگوں کے ساتھ مودبانہ برتاؤ کرنے پر مجبور تھا۔ فیروز خلجی کے دور حکومت میں صوفی سدی مولا کا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس حد تک سیاسی خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔ کیوں کہ ان کی آواز تمام نسلی اور مذہبی بندشوں سے ماورا ہوتی تھی۔

لڑنے والے یعنی اہل سیف عام طور پر انتظامی اور فوجی افسر ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ فوجی عہدہ ان کی سماجی حیثیت کا تعین کرتا تھا۔ اس طبقے کی درجہ بندی خان ملک، امیر، سپہ سالار اور سرخیل کے عہدوں میں کی گئی تھی۔ ان القاب کا جس طرح روزنامچے میں ذکر کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترکی قبائلی نظام کا چربہ تھا جس میں خاندان معاشرے کی اکائی ہوتا تھا نہ کہ فرد۔ صدی کی پہلی چوتھائی میں جب کہ قبائلی وفاداری کا احساس تازہ تھا اس خاندانی نظام کی ہندوستان تک قرین از قیاس

سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن جب غیر ترکوں اور خاص طور پر ایرانیوں نے اپنے فوجی گروہ کی تعداد بڑھائی تب معاشرے کا نظام بدلنا شروع ہوگیا۔ ترکوں کے پاس عربوں کے موالی نظام کا کوئی بدل نہیں تھا۔ جس میں ہر قبیلے کی انفرادیت قائم رہتی تھی۔ جب عجمی بڑی تعداد میں مذہب اسلام میں داخل ہونے لگے تو انھوں نے سماج کی قبائلی بنیاد کو درہم برہم کرنے کا خدشہ لاحق کر دیا۔ ہندوستان میں مختلف غیر ترکی غلام خاندانوں سے منسلک تھے۔ انھوں نے ان خاندانوں کی روایات کو اپنا لیا تھا لیکن آزاد پیدا ہونے والے نومسلم اور مہاجر مسلمانوں کو سماج میں سب سے نیچی جگہ بھی نہ دی جاسکی۔

اس وقت یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان حالات کے نتیجے کے طور پر یہ جدید تصوّر سامنے آجائے گا کہ فردِ سماج کی اکائی ہے۔ مجرم کے خاندان کو سزا دینے کا اصول جس کی مثال تیرھویں صدی کے کچھ حکمرانوں کے یہاں ملتی ہیں۔ ایسے جدید ترین خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ خاندان اب بھی سماج کا حصہ رہے لیکن سرِخیل کے سائے میں ان کا اکٹھا ہونا ختم ہوگیا۔ یہ کارروائی بہت آہستہ آہستہ وجود میں آئی یہ کب مکمّل ہوئی اس کے بارے میں کسی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ برنی نے اپنی چودھویں صدی کی تحریروں میں بھی عام اصطلاح خیل خانہ استعمال کی ہے بہرصورت رتبے کو ظاہر کرنے کے سلسلے میں سرخیل کا ذکر روزناموں میں کسی اور جگہ نہیں ملتا۔"طبقاتِ ناصری" میں عہدوں کی ترقی کا کئی جگہ ذکر ہے لیکن ان میں سپہ سالار کا نام کہیں نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اہلِ سیف کے سارے عہدے امیر، ملک اور خان تک محدود تھے صرف ایبک کے عہدے کا ذکر کرتے ہوئے سپہ سالار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔[۲۵] اس کے علاوہ اس کے عہد کے ایک کتبے میں بھی ایبک کے القاب میں سپہ سالار کا لفظ شامل کیا گیا ہے۔ بعد میں ایسا لگتا ہے کہ اس مرتبے کی اہمیت ختم ہوکر سب سے نچلے درجے پر آگئی تھی۔ شہاب الدین عباس نے چودھویں صدی کے ابتدائی دور میں فوج کے افسروں کے رتبے کا ذکر کرتے ہوئے تغلق کی فوجی تنظیم میں سپہ سالار کو سب سے کم حیثیت اور کم تنخواہ کا بتایا ہے۔[۲۶]

فوج کے اعلیٰ عہدوں کی تمنا کرنے والوں کی فہرست میں سب سے پہلا مرتبہ امیر کا ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ طریقہ تیرھویں صدی کے آخری حصّے میں عام تھا لیکن اس کی ابتدا

بہت پہلے ہوئی تھی۔ بارہویں صدی میں نظام الملک نے غلاموں کی تربیت کے نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے امیر کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ تربیت یافتہ غلام کے لیے سب سے پہلا ذمہ داری کا عہدہ 'امیر' تھا۔[۱] آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں یہ عہدہ فرسودہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن مملوک سلطنت کے دور میں ایسا نہیں تھا فوج کے اعلیٰ طبقے میں غازی ملک کا داخلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب وہ ترقی کر کے 'امیر' کے مرتبے پر پہنچا تھا۔[۲] التمش کا بھی یہی پہلا عہدہ تھا حقیقت یہ ہے کہ کسی انتظامی جگہ تک پہنچنے سے پہلے ہر غلام کو یہ مرتبہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔[۳] یہ ٹھیک ہے کہ سبکتگین اور محمود غزنی نے اسی لقب سے اپنی فرماں روائی کا اعلان کیا تھا لیکن اس کے بعد سپہ سالاری کی طرح امیر نے بھی اپنا مرتبہ کھو دیا تھا۔ یہاں تک کہ تغلق کے عہد میں تو یہ صرف ایک کپتان ہو کر رہ گیا تھا جس کے تحت سو سپاہی ہوتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ تیرھویں صدی میں غیر ترکوں کو براہ راست ملک کے عہدے پر ترقی دینے کی وجہ سے 'امیر' کے مرتبے کا زوال ہوا تھا لیکن مملوک روزناچوں میں سب سے پہلے نمبر پر اس اعزاز کا ضرورت سے زیادہ ذکر ملتا ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان کو بھی ملک کہا گیا ہے یعنی 'خان' کا اعلیٰ مرتبہ اصولاً شاہی خاندان کے بالغ شہزادے استعمال کرتے تھے اور ایسے ہی ترک ملکوں کو بادشاہ خاص طور پر یہ اعزاز دیا کرتا تھا۔ اگر منہاج اور برنی کی فہرست کچھ نشان دہی کر سکتی ہیں تو کوئی غیر ترک یہاں تک کہ کوئی خلجی کبھی اس احساس سے مستفیض نہیں ہوا۔ یہ غالباً وہ امتیاز تھا جو اہم صوبوں کے گورنروں کے لیے وقف تھا۔ ایبک اور التمش کے القابات میں اس کے نہ شامل ہونے کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ وہ ٹھیک وقت پر تخت شاہی تک پہنچ گئے رہوں گے۔ بلبن کے اس اعزاز کی مختلف منزلوں سے گزرنے کی غالباً یہ وجہ تھی کہ اس نے تربیت کا ایک لمبا عرصہ گذارا تھا بادشاہ کے بعد دوسرا سب سے بڑا مرتبہ الغ خاں (سب سے بڑا خاں) تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ ایک وقت میں صرف ایک شخص کو حاصل ہوتا ہوگا۔ غالباً منگولوں کی نقل میں بلبن اس کو "قاآن" کہتا تھا۔ یہ اعزاز اس نے اپنے وارث حقیقی کو عطا کیا تھا جو دراصل خود اپنی غاصبانہ کارروائی کو دوبارہ دہرائے جانے کے امکان سے بچنے کی ایک چال تھی۔

تیسرا عنصر 'عوام و خلق' کا تھا جس میں تمیز بہت مشکل تھی۔ چوں کہ اس وقت تک مسلم

معاشرہ شہری تھا اس لیے وہ غیر محدود شہری لوگوں کا مجموعہ رہا ہوگا جس میں دستکار دکاندار، کلرک اور چھوٹے موٹے بیوپاری سب ہی آجاتے ہوں گے۔ بڑے تجارت پیشہ لوگوں کا چوں کہ کہیں الگ ذکر نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کو بھی اسی گروپ کے تحت رکھا جاتا ہوگا۔ لیکن دولت مند، جہاندیدہ، بڑے بیوپاری یعنی تاجر اور ملک التجار کے لیے اشراف میں داخل ہونا آسان تھا ایک اور اہم حصہ بادشاہ اور معززین کے غلاموں پر مشتمل تھا جو امراء کے عہدے تک پہنچنے سے پہلے مختلف گھریلو اور تکنیکی خدمات پر رہتے تھے۔ کارخانوں میں کام کرنے والوں کی اکثریت بھی ان ہی لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر دستکار بھی تھے۔ شہروں کی آبادی میں غیر مسلم بھی تھے۔ براہ راست ثبوت موجود نہ ہونے کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شہر کے کاروباری فرقے میں اکثریت ان ہی غیر مسلموں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ روپے پیسے کا کاروبار کرنے والے اور تاجر ہندوؤں کو اپنی دولت کی وجہ سے جو مراعات حاصل ہوتی تھیں وہ انھیں شرفاء اور اعلیٰ طبقے کا مرتبہ دے دیتی تھی۔ بلکہ برنی تو شکایت کرتا ہے کہ ان لوگوں کو شان و شوکت اور مادّی تشفی مسلمانوں سے زیادہ حاصل تھی۔[۴۳]

منہاج نے معزی اور شمسی ملکوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے بہت ہی کم ترک مہاجر ایسے تھے جو مسلمان پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر غلام کی حیثیت سے یہاں آئے تھے اور اپنے بچپن ہی میں ایرانی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے گئے تھے۔ مسلمان ممالک میں سکونت پذیر وہ لوگ جن کو منگولوں نے ہندوستان بھگا دیا تھا، یہاں آکر سنّی اسلام کے پیرو بن گئے جو کہ غزنوی، سلجوقی، خوارزمی اور شمسیہ بانی سلسلہ سلاطین کا مذہب تھا۔ شیعہ جماعت کی حمایت کرنا سیاسی طور پر خطرناک بات سمجھی جاتی تھی۔ کیوں کہ ان کے عقیدے میں عبّاسیوں کے دشمنوں سے وفاداری شامل تھی۔ اور عباسیوں کی زبانی اور اخلاقی منظوری نے دہلی کے سلطان کو سب سے مضبوط اور طاقت ور سہارا دیا تھا۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند شیعوں پر ملحد ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ان کو بڑی نفرت سے "ملاحدہ" یا "روافض" کہا گیا۔ قرامتیہ کو جنھیں "باطنی" بھی کہتے تھے خصوصی طور پر اذیت دی جاتی تھی۔ فاطمی فرمانروائی کی تباہی کے بعد مشرقی حکومت کے عہد میں یہ عقوبت اور زیادہ بڑھ گئی۔ شمالی ایران

میں ان کے الموت کے فوجی اڈے خوارزمی اور شنسبانی کے حملوں کا مرکز بن گئے جہاں ان کو نمایاں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ چاروں طرف دشمنی اور عقوبت کا ماحول دیکھ کر یہ سنیوں کو خوفزدہ رکھنے والی ایک خفیہ جماعت بن گئی اور پھر اپنے کٹر اراکین کی وجہ سے جنہیں فدائی کہا جاتا تھا۔ چھرے بازی کے ماہر بن بیٹھے۔

نویں صدی میں وادی سندھ کے عرب حکمرانی والے صوبے میں جہاں ترک تقلید پسندی کافی دیر میں وجود میں آئی تھی اسماعیلیوں کے فرقے کی ایک انتہاپسند شیعہ جماعت قرامتیہ کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ یہ جماعت مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ لوگوں کو ہم مذہب بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ اور اسی طرح اس نے بالائی سندھ میں سیاسی طاقت بھی حاصل کرلی۔ گزشتہ دو صوبوں سے ملتان اور منصورہ میں سیاسی اور مذہبی وفاداری مصر کے فاطمی خلیفہ کے ساتھ تھی ۹ ملتان میں سنی حکمراں کو تعینات کرکے محمود غزنوی کی تقلید پسندی کو صرف عارضی کامیابی حاصل ہوئی تھی کیونکہ معزالدین کو قرامینہ حکمراں ہٹانے کے لیے شدید جنگ کرنا پڑی تھی۔ تاہم دہلی کی حکمرانی کی توسیع نے وادی سندھ سے ان کی سیاسی طاقت کو ضرور ختم کردیا تھا لیکن اس فرقے کا وجود ختم نہیں ہوا تھا۔ منہاج کی تحریروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فرقہ جنوب اور مشرق کی سمت پھیل گیا تھا اور اسے گجرات اور دوآب میں اپنے پیرو بھی مل گئے تھے۔ اس فرقے کے ہاتھوں معزالدین کی موت نے مملوک کو ان کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ منگول حملے بھی اس تلخی کو دور نہیں کرسکے تھے۔ بالآخر التتمش نے جب عباسی فرمانروائی کو تسلیم کیا تو ترک فرماں رواؤں سے شیعوں کی دشمنی پختہ ہوگئی تھی۔ ایک طرف علماء اُن کے ناپاک بدعتی ہونے کا اعلان کررہے تھے۔ دوسری طرف وہ علماء پر دنیاوی لالچ اور مذہبی مفاہمت کا الزام لگارہے تھے۔ رضیہ کے دور حکومت کے آخری حصے میں انھوں نے ایک شخص نور ترک ۱۰ کی قیادت میں حکومت پر قبضہ کرنے کی سازش کی۔ اس نے سارے ہندوستان سے اپنے فرقے کے لوگ جمع کرکے اُن کو مسلح کیا اور جامع مسجد میں ایک زبردست بغاوت شروع کرکے عبادت گزاروں کا قتل عام شروع کردیا۔ یہ ایک بڑی بغاوت تھی جس کو کچلنے کے لیے فوج کی امداد لینا پڑی۔ حالانکہ اس موقع پر ان کو دبایا گیا تھا لیکن یہ سوچنا کہ فرقہ ختم ہوگیا ہوگا بالکل غلط ہوگا۔ برنی نے

اکثر جگہ رافضی ملحدوں کی برائی کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ ایک نمایاں مذہبی جماعت کے طور پر باقی رہے ہوں گے۔[11] تاہم مملوک عہد میں شیعت ہندوستان میں پھل پھول نہ سکی۔ لیکن جب ایران کے ال خان نے مذہب تبدیل کیا تو اس فرقے کو ایک دفعہ پھر سیاسی منظوری حاصل ہو گئی۔

تیرھویں صدی کے مسلم معاشرے پر غالب طور پر سنّی مذہب حاوی تھا۔ سنّی اسلام اپنی کٹر سادگی کی وجہ سے ترکی ذہن کے لیے بھی مناسب تھا لیکن شیعوں جیسے مخفی اصول رکھنے والے مذہب کے لیے وہ بالکل غیر موزوں تھے۔ باہر سے لائے ہوئے اور خود ہندوستان میں تربیت حاصل کیے ہوئے فضلاء اور علماء دین کی موجودگی میں مملوک نے خود اپنے اور اپنے رفیقوں کے مذہبی عقائد کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا منگولوں نے ایرانی مسلمانوں کے ایک بڑے حصّے کو مار بھگایا تھا ان کے اصلی رجحانات جو بھی رہے ہوں مہاجرین نے ہندوستان میں حیرت انگیز مطابقت اور مشابہت کا مظاہرہ کیا شنسبانی کا تعلق سنّی مسلمانوں کے کرامیہ فرقے سے تھا۔[12] لیکن مملوک حضرت ابو حنیفہ کے پیرو تھے۔

سنّیوں سے بہت زیادہ الگ نہ ہونے کے باوجود صوفیوں کی عارفانہ جماعت ایک بہت نمایاں اور اہم جماعت تھی تیرھویں صدی بہت سے مسلمان صوفیوں کی موجودگی کی وجہ سے غیر معمولی صدی تھی۔ یہ صوفی علم کی دولت سے مالامال ہونے کے باوجود شہری سماج سے بہت دور رہتے تھے۔ ان لوگوں کو صحیح معنوں میں تارک الدنیا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیوں کہ یہ گھر بار والے بھی ہوتے تھے لیکن پھر بھی ان کو مادّی فوائد اور آسائشوں سے حقیقی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ لوگ تقلید پسندی سے باقاعدہ انکار نہیں کرتے تھے لیکن اس کی تعمیل کے سلسلے میں محتاط ضرور تھے۔ ان کا اعتقاد ایک اخلاقی مذہب تھا اور یہ خدا سے ایک عارفانہ تعلق پیدا کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے تھے۔ عام زندگی میں ان لوگوں کی تقلید پسندوں کے مقابلے میں پہچاننا مشکل تھا ان میں سے اکثر عام پیشوں میں لگے ہوئے تھے۔ سوائے اس کے کہ یہ لوگ کچھ ایسی مخصوص مذہبی ریاضتیں کرتے تھے جن کا مقصد کسی خاص عارفانہ اور پُراسرار تجربے کو حاصل کرنا ہوتا تھا۔ مثلاً سماع میں شرکت جو ایک ایسی موسیقی تھی جہاں دماغ وجد کی حدود تک پہنچ جاتا تھا۔ ساری برادری مرشد (رہبر) کے گرد جمع ہوتی تھی جس کے دروازے تقلید پسند مسلمانوں کے لیے بھی کھلے رہتے

تھے۔ باضابطہ شرکت کے لیے اس سے زیادہ کسی چیز کا مطالبہ نہیں تھا کہ آدمی خود اپنے گھر کی تنہائی میں کچھ مخصوص ریاضتیں کرے۔ عام طور پر ان لوگوں سے کرامات کی توقع کی جاتی تھی اور معصوم عوام ان کی سادگی سے متاثر ہو کر ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ یہاں تک کہ اصولوں کی پابندی کرنے والے علماء بھی بڑے تپاک سے ان کی خانقاہ میں حاضر ہوتے تھے اور مخصوص شاگردوں میں شامل ہونا اپنے لیے باعث عزت تصور کرتے تھے۔ سرکاری حلقوں کی عنایتوں اور نوازشوں سے انھیں نفرت تھی یہ لوگ اپنی عزیت پر فخر کرتے تھے۔

ہندوستان میں اُبھرنے والی بلکہ آج بھی موجود صوفی جماعتوں میں سے زیر بحث دور نے دو مخصوص اور اہم جماعتیں، دو الگ الگ علاقوں میں ابھرتے دیکھیں۔ ان میں سے ایک چشتیہ اور دوسری سہروردیہ کہلاتی تھی۔ پہلی جماعت اجمیر میں معین الدین کی تھی اور دوسری ملتان میں بہاء الدین ذکریا کی۔ بہاء الدین ذکریا کے پیرو تو وادی سندھ تک محدود رہے لیکن چشتی جماعت سارے ہندوستان اور پنجاب میں پھیل گئی ان کے پیرووں اور خیر خواہوں میں اس عہد کا تقریباً ہر اہم مسلمان شامل تھا۔ 1235ء میں اجمیر میں معین الدین کا انتقال ہوا۔ اور اسی وقت سے ان کا مزار نہ صرف ان کے پیروں کے لیے بلکہ دنیاداروں کے لیے بھی زیارت کا ایک بہت مشہور مرکز بن چکا ہے یہی شہرت ان کے مخصوص مریدوں کے مزاروں کو بھی حاصل ہے۔ مثلاً قطب الدین بختیار کاکی جن کا 1255ء میں دہلی میں انتقال ہوا تھا۔ فریدالدین شکر گنج جن کا 1256ء میں پاک پٹن میں انتقال ہوا تھا اور نظام الدین بدایونی جن کا دہلی میں 1325ء میں انتقال ہوا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے پیچھے بلند پایہ مرید چھوڑے تھے۔ سندھ میں بہاء الدین کے جانشین صدرالدین، جلال الدین اور رکن الدین بھی اسی پائے کے بزرگ تھے۔ ان میں سے آخرالذکر کا مقبرہ ملتان میں مسلم فن تعمیر کی ایک بہترین مثال سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مملوکوں کے عہد حکومت میں صوفیا اور ان کی عارفانہ مسلک سے عقیدت مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا ایک اہم حصہ تھی۔ برنی نے ایسے بہت سے صوفیوں اور ولیوں کی فہرست درج کی ہے جن کی اہمیت کی وجہ سے فرشتہ اور مغل عہد کے دوسرے مورخین نے ان پر الگ الگ باب لکھے ہیں۔

اس خیال سے چاہے کوئی متفق ہو یا نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ نشو و نما اور ترقی کی سب

سے بڑی ذمہ داری ہندوستانی ویدانیت پر آتی ہے۔ لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ صوفیوں کی عارفانہ حیثیت نے اسلام کا وہ فلسفیانہ نکتہ پیش کیا تھا جو اسلام کا ہندو مذہب سے ربط قایم کرتا تھا۔ تصوّف کے اسی ربط اور اس کی سادگی اور وسیع انسانیت کے جذبے کی وجہ سے اسلام میں بے شمار ایسے لوگ داخل ہوئے جنھوں نے اپنی مرضی سے تبدیل مذہب کیا۔ اور یہی سبب ہے جس کی وجہ سے صوفی کو مبلغ سمجھا جاتا تھا۔ مرشد کے حکم پر وہ دور دراز کے ملکوں کے سفر کرتا تھا اور اپنی تبلیغی لگن کی وجہ سے غیر مانوس یہاں تک کہ دشمنوں کے درمیان سکونت اختیار کرلیتا تھا۔ اس کی ایک مثال جلال الدین تبریزی کی ہے جو معین الدین کے ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ جلال الدین نے بنگال کے سینا بادشاہ کے یہاں رہائش اختیار کی تھی۔ گجرات میں بھی ہندو حکمرانی کے زمانے میں ایک صوفی نے اپنا مرکز قائم کیا تھا۔[13] کہتے ہیں کہ خود معین الدین، معزالدین کے حملے سے بہت پہلے اجمیر آگئے تھے۔[14] صوفیوں کی وحدتِ وجود کا نظریہ اور روح کی تلاش میں سرگردانی دراصل مذہبی روایات اور عقیدوں سے آگے نکل گئی تھی اور یہی وہ حقیقت تھی جس میں روحانیت کے قائل ہندوؤں کو اپنائیت نظر آتی تھی۔ صوفی کی انکساری رواداری اور انسانیت بہت ہی زبردست کشش کا باعث تھی۔ اسلام کی سماجی اہمیت اور مادّی فوائد کے امکانات کی وجہ سے اس کشش نے ایسی صورت اختیار کرلی تھی جس سے بچنا مشکل تھا۔ خاص طور پر اُن لوگوں کے لیے جو برہمنوں کے ذات پات کے نظام کے مظالم کا شکار تھے۔

اس عہد میں ہمارے سامنے کوئی ایسی مثال نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم واضح طور پر کہہ سکیں کہ ہندو مذہبیت اور اسلام نے ایک دوسرے کی اچھی باتوں کا تبادلہ کیا ہو۔ تغلق عہد کے روزناموں میں جو مثالیں ملتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے فرقے تھے جو ہندو رسم و رواج پر عمل کرتے تھے۔ ان کی ابتدا یقیناً پہلے ہوئی ہوگی۔ اس لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان میں تبدیل مذہب کرکے مسلمان ہونے والوں نے کچھ ہندو نظریات اور رسومات کو باقی رکھا ہوگا۔ ولیوں اور ان کے مزاروں کی پوجا بدستور بڑھ رہی تھی بلکہ بعد میں اس نے ایک بہت بڑی سماجی برائی کا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ اس عجیب و غریب رویّہ کی جڑیں بلاشبہ تیرھویں صدی میں صوفیوں

کی تعظیم وتکریم تک پہنچتی ہیں۔ لیکن اس کے وسیع حلقۂ اثر پر اُس ہندو رجحان کا بھی کم اثر نہیں تھا جو مقامی اور قبائلی دیوتاؤں کو پوجنے سے ظاہر تھا۔ ایک دوسرے کے خیالات پر دونوں فریقوں کے روشن خیال اور سمجھدار لوگوں کا کیا ردِ عمل ہوا ہوگا یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب کی امید تیرھویں صدی سے کرنا غلط ہوگا۔

اپنے انتہائی تغیر پذیر حالات کی وجہ سے مملوک سلطنت کسی بڑی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر فخر نہیں کر سکتی۔ ان نئے حالات میں مسلم علم وادب کو وجود میں آنے کے لیے ایک صدی کا عرصہ لگا۔ دراصل تغلق کے عہد میں جاندار قسم کی تخلیقی قوتیں سامنے آئی تھیں۔ تیرھویں صدی میں جو کچھ لکھا گیا اس کے پیچھے ہندوستان کے باہر کی روایات لازمی طور پر کارفرما رہی ہوں گی مسلم روشن خیال اور ذی فہم لوگوں میں ہندوستانی تصورات اور ہندوستانی زندگی بہت کم مداخلت کر سکی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک ایسے ادبی کام کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جسے ایک مسلمان نے تخلیق کیا تھا۔ اس ادبی کارنامے کو اس کے موضوع، اس کے ڈھانچے اس کے طرز تحریر اور زبان کے اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ یہ یقیناً ہندوستان کی سنسکرت ادبی روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ رَس کی نوعیت کا ایک شاعرانہ رومان ہے جس کا نام سندیسہ رسکا ہے اور اسے اپبھرنش بھاشا میں لکھا گیا ہے۔ مصنف کا نام عبدالرحمٰن ہے جو میر حسن کا لڑکا تھا۔ عبدالرحمٰن بارھویں صدی میں سنسکرت اور پراکرت ادب میں مہارت رکھتا تھا۔[15] یہ دراصل مسلم علم وادب پر اُس ہندوستانی اثر کی تمہید تھی جس میں امیر خسرو جیسا غیر ملکی شخص نہایت غیر معمولی اضافے کرنے والا تھا۔ ہندی شاعرانہ تصورات اور ہندی موضوعات اس کا ہندوستانی موسیقی سے لگاؤ اور اس میں اضافے اور ہندوستانی تہذیب کی خدمات کی چند خصوصیات تھیں۔ مسلم ہندوستان کا وہ پہلا عظیم تخلیقی ادیب تھا۔[16] قرون وسطیٰ کے عظیم ترین مسلمان عالم، البیرونی کی روح اس کی تحریروں کی وجہ سے زندہ ہے۔ لیکن اس کی ہندوستانی فلسفہ اور سائنس کو پڑھنے اور سمجھنے کی درخواستوں پر، اس کے ہم عصروں نے کوئی توجہ نہ دی۔ دوسری طرف امیر خسرو کی غیر معمولی ذہانت نے خالص ادبی تصانیف کے ذریعہ ایسی زندہ جاوید مثالیں پیش کیں جو نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ انھوں نے ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے تہذیبی سرمایہ میں اضافہ بھی کیا۔

فوجی مصروفیتوں کے ماسوا مملوک فرماں رواؤں نے ادب کی دائمی اقدار سے بہت زیادہ دل چسپی لی۔ اس کی ذہنی ساخت میں قلم اور تلوار دونوں کا ایک ہی مقام تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے کچھ عملی ضرورتوں کا نتیجہ تھا۔ ایک طرف مذہبی بندوبست کے لیے مذہب اور قانون پر کام کرنا ضروری تھا دوسری طرف سیاست کا تقاضہ تھا کہ روزنامچے لکھے جائیں اور آئین جہاں بانی پر مخصوص رسالے تیار کیے جائیں۔ لیکن شاعری، ادبی تاریخ اور مضامین سے اس کی غیر معمولی عقیدت، افادیت پسندی کے رجحان سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مملوکوں کو یہ ہدایت صرف ورثے میں ملی تھی اور منگول ظلم و ستم نے بے شمار غیر ملکی ادیبوں کو دہلی پہنچا دیا تھا۔ لیکن ایک مہذب ریاست کی تشکیل میں اُن کا بہت بڑا حصہ تھا۔ برنی نے ہر فرماں روا کے زمانے میں شاعروں، عالموں، قانون دانوں مورخین اور انشائی فن کے ماہرین کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ نثر نگاروں میں دہلی سلطنت نورالدین محمدؒ عوفی جیسے مورخ، فخرالدین مبارک شاہ جیسے تاریخ داں اور سیاسی نظریوں کے ماہر اور حسن نظامی اور منہاج جبزجانی جیسے روزنامچہ نویسوں پر فخر کرسکتی ہے خود ضیاءالدین برنی میں مورخ ہونے سے زیادہ ایک ہمہ گیریت تھی۔ تاریخ قلمبند کرنے کے علاوہ وہ ملکداری پر رسالے، قانون، حدیثوں کی تفسیریں اور مذہبی مناجات پر کتابیں لکھتا تھا۔[17] شاعری کا رواج ہمہ گیر تھا اور شعر کہہ لینے کی صلاحیت ادبی تعلیم کا ایک ضروری حصہ تھا۔ شاعروں کے الگ الگ نام گنانا ضروری نہیں ہے کیوں کہ سرکاری وظیفہ پانے والوں کی فہرست بہت لمبی تھی اس کے علاوہ ہر شہزادے اور امیر کے اپنے درباری شاعر ہوتے تھے۔ شاعروں اور مضمون نگاروں کے درمیان اسی طرح مورخ اور عالم دین کے درمیان تفریق کرنا ممکن نہیں ہے کیوں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ لوگوں کی صلاحیتیں قاموسی ہوا کرتی تھی۔ بلبن کا دربار نہ صرف قابل علما اور شاعروں سے بھرا ہوا تھا بلکہ اس میں ایسے ماہرین طب اور ماہرین علم نجوم بھی تھے جن کا اپنے پیشے میں ثانی نہیں تھا۔ علم طب کی تاریخ میں بدرالدین دمشقی اور حسام الدین مارک لا کا نام بڑی قدر و منزلت سے لیا جاتا ہے۔ حمیدالدین مطرز علم ریاضی اور نجوم میں اتنے ہی قابل تھے جتنے شفا بخشنے کے فن میں۔[18] تیرھویں صدی کے سب سے مایا ناز شاعر خسرو تھے۔ اسی پایہ کے شاعر امیر حسن سنجری بھی تھے ان دونوں نے مل کر ہندوستانی فارسی شاعری کو

اس ادبی معیار تک پہنچا دیا تھا کہ خود ایرانیوں کو حسد ہونے لگا تھا۔ امیر خسرو خود ایک ہم عصر شاعر رکن مہیرا کی بہت تعریف کرتے تھے جو بدایوں کے رہنے والے تھے۔[19]

ہندی تصنیفات کے ترجموں کو فی الحال ادبی میدان میں جگہ نہیں ملی تھی۔ لیکن فیروز تغلق کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی دفعہ بہت سی سنسکرت تصنیفات کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ سنسکرت تصنیف کے عربی ترجمے کی ایک واحد مثال بھی سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب یوگ سے متعلق تھی جس کا نام امرتا کنڈا تھا۔ اس کتاب کا ترجمہ لکھنوتی کے چیف قاضی اور امام رکن الدین سمرقندی نے ایک تبدیل مذہب کرنے والے جوگی، کامروپ کے بھوجبر برہمن کی مدد سے بنگال کے علی مردان خلجی کے دور میں کیا تھا۔[20]

یہاں پر اس اہمیت کو جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ادب کا اسقدر پھیلاؤ اور علم لگاؤ نہ صرف ایک اعلیٰ عام تعلیمی معیار کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس زمانے میں تعلیمی اداروں کو کتنی زیادہ سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ نئے مقبوضہ علاقے میں سب سے پہلے جو ادارہ قائم ہوا تھا وہ مدرسہ تھا۔ جبکہ ہر مسجد میں ایک پرائمری اسکول ہوتا تھا۔ جہاں ایک طرف نجی اسکول چلتے تھے وہیں دوسری طرف حکومت کی مالی امداد پانے والے دارالعلوم بھی قائم تھے۔ التمش نے دہلی میں ایک بہت مخصوص کالج بھی کھولا تھا جس کا نام اس نے اپنے بڑے بیٹے نصیرالدین شاہ کے نام پر رکھا تھا ایک اور کالج ملتان میں کھولا گیا تھا جس کو "فیروزی مدرسہ" کہا جاتا تھا۔[21] خلجی فاتحین نے بنگال میں اسی طرح کے ادارے کھولے تھے۔ برنی نے بے شمار ممتاز پرد تیروں کے نام لکھے ہیں۔ جو ساری سلطنت میں تعلیمی کام میں مصروف تھے۔[22] تغلقوں کے زمانے میں صرف دارالسلطنت میں ایک ہزار مدرسے اور دو ہزار مکتب (مسجدوں سے ملحق) تھے[23] یہ ایک ایسا بیان ہے جو مملوک پیش روؤں کے زمانے میں ملک کی حالت کی طرف تقابلی اشارہ کرتا ہے۔

فنون لطیفہ کی آبیاری کے سلسلے میں ہم عصر تحریروں سے بہت کم معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ان کی ساری توجہ فن تعمیر پر مرکوز تھی۔ تاریخی عمارتوں کے بچے کھچے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ دیواروں کی آرائش میں تھوڑی بہت نقش نگاری شروع ہو چکی تھی۔ کچھ ایسے حوالے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جان دار اور بے جان آرائشی شکلیں بھی ملی ہیں جو

دیواروں پر فرنیچر اور جھنڈوں پر، زین اور ہتھیاروں پر یا تو منقش کی گئی ہیں یا کندہ کی ہوئی یا کشیدہ کاری میں بنائی گئی ہیں[24]۔ ان چیزوں سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مملوکوں کے دور میں نظری فنون بھی اعلیٰ معیار تک پہنچ چکے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ مغلوں کے چھوٹی تصاویر کے البموں میں پائی جانے والی بادشاہوں کی تصویریں، پہلے بنائی جانے والی اصل تصویروں کی نقل تھیں، اس پر صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ بہرکیف فیروز تغلق نے دیواروں کی آرائش کے لیے زندہ چیزوں کی تصویریں بنانے کی ممانعت کر دی تھی۔ رنگ کے احساس کی بھرپور نمائش ہمیں ان مسودوں کے "عنوان" میں ملتی ہے جو امراء اور شاہی خاندان کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ خوشنویسی انتہائی مقبول فن تھا۔ اور جب اس کو پتھر یا کاغذ پر اتارا جاتا تھا تو اس میں وہ ساری حسی دلکشی سما جاتی جو کسی پلاسٹک آرٹ میں ہو سکتی تھی۔ موسیقی میں ایک ناقابلِ مزاحمت دلکشی ہے اسی لیے پابندیوں کے باوجود موسیقی تقریبوں اور جشنوں کا ایک لازمی جز تھی۔ موسیقی اور رقص کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن اس عہد میں یہ امید کرنا زیادتی ہوگی کہ یہ دونوں فن ذہنی اطمینان کی منزل پر پہنچانے کے لیے ہوں گے۔ ہندوستانی فنکاروں پر بڑھتے ہوئے انحصار کی وجہ سے یہ سوچنا غلط نہ ہوگا کہ ان فنون کے ہندوستانی مزاج کے لیے مسلمانوں نے بہت جلد ذوق پیدا کرلیا ہوگا۔ اور دو چیزوں کے امتزاج نے، خاص طور پر موسیقی پر بڑا اچھا اور اضافہ کرنے والا اثر ڈالا تھا امیر خسرو خود بھی ایک بہت باکمال موسیقار تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی نظموں کی ہندوستانی دھنیں تیار کی تھیں بلکہ وہ بہت سے نئے ہندوستانی راگوں کے موجد بھی تھے[25]۔

آداب اور رسوم میں ترکی اثر نمایاں طور پر گھٹتا جارہا تھا۔ طغرلوں، اُغل بکوں اور ایتگینوں وغیرہ کو اپنے ترکی آداب کو خیرباد کہتے اور ایرانی بلکہ ہندوستانی نام کو اپنانے میں دیر نہیں لگی۔ ایبک اور التتمش کے ہم وطنوں کو ہم آپس میں ترکی، بولتے ہوئے تصور کر سکتے ہیں لیکن تیزی سے بڑھتے ہوئے ایرانی اثر کی وجہ سے یہ طریقہ بہت تھوڑے وقفے تک رائج رہا ہوگا۔ تاہم ہم کسی ایسی ترکی تصنیف کے بارے میں نہیں جانتے ہیں جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ بلبن کے ترکی نسلیت پر زور دینے کا مقصد ترکی تہذیب کی تجدید رہا ہوگا۔ سکوں پر ترکی گھوڑ سواروں کی تصویریں لمبے عرصے تک قائم رکھنا بھی

اسی سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سب سے پہلی دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ برنی نے سرکاری کام کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ترکی انقلاب کا استعمال کیا[25] لیکن ترکی رسم و رواج کو صحیح طور پر واپس لانا بلبن کے لیے ممکن نہیں تھا کیوں کہ وہ اپنے کو ایرانیت سے بہت زیادہ ملوث کر چکا تھا۔ اس کے شاہانہ نظریات ان ایرانی بادشاہوں والے تھے جن کے ادراک اور مثالوں نے خود اس کی اپنی مطلق العنانی کے لیے ہیئت اور مواد فراہم کیا تھا۔ وہ اپنے پوتوں کے لیے کوئی مشہور نام نہ سوچ سکا سوائے کیخسرو، کیکاؤس، کیقباد اور کیومرس کے۔ ظاہر ہے کہ ترکستان اس کے دربار کی کلچرل شان و شوکت کو دوبالا کر سکا فارسی ہی صرف ایک ایسا راستہ رہ گئی تھی جس کے ذریعے وہ اسلام کے ذی فہم لوگوں تک پہنچ سکتا تھا اور تہذیب و تمدن کا رسیا بن کر منگول جہالت اور وحشی پن کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مشرقی مسلمانوں کے لیے ایرانی اثرات سے الگ ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہندوستان میں اُسے ایک دوامی استبدادی حکومت کو چلانا تھا۔

ماحول کے اثرات سے بچنا بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ اس سے بچنے کی کوشش کے لیے ہندوستانی ترک جزوی طور پر بھی تیار نہیں تھے۔ اس نئی لہر کی اہمیت اس سے اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ گھرانوں میں پیدا ہونے والے بلکہ خالص ترکی نسل کے مسلمانوں نے بھی "چھجو"، "کچھن" اور حامد راجہ جیسے ہندوستانی نام رکھ لیے تھے۔[27] پان کھانے کی خالص ہندوستانی عادت بھی امیر زادوں اور عالی خاندانوں تک پہنچ گئی تھی اور برنی لکھتا ہے کہ بلبن کے عریض کو پان کھانے کی بہت عادت تھی۔[28] ابن بطوطہ نے تغلق عہد میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر دلہن کو بیڑہ پیش کرنے کی رسم[29] روزمرہ کی بات چیت میں بھی ہندوستانی محاورے جگہ پا گئے تھے۔ برنی برسات کے موسم کے لیے ہندی لفظ "برشکال" مسلسل استعمال کرتا ہے[30] فیروز تغلق نے مسلم یتیم لڑکیوں کے جہیز کے لیے ایک الگ فنڈ بنایا تھا جس کی وجہ سے اس کی پارسائی اور احسان مندی کی مہر لگ گئی تھی۔[31] جہیز کی یہ رسم محض ہندو رسم و رواج کا اثر تھی کیوں کہ مسلم قانون میں دلہن سے روپے لینے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ہندو مذہب سے مسلمان ہونے والوں میں ذات پات کی تفریق نے تعصب کا ایک نیا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ دہلی میں مختلف پیشوں کے مسلمانوں کے لیے مختلف قبرستانوں کی موجودگی پر مشہور

صوفی نصیر الدین چراغ دہلی نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔[32]

جہاں تک تفریح اور دل چسپیوں کا سوال ہے شطرنج اور جوئے بازی (قمار بازی) نے غالباً بہت پہلے اپنا رنگ جما لیا تھا۔ گھر سے باہر کھیلے جانے والے کھیلوں میں چوگان، جو ایک طرح کا "پولو" ہوتا تھا، شروع ہو چکا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد نے دل چسپی اور فوجی ورزش کو یک جا کرنے کے خیال سے شکار پر جانا شروع کر دیا تھا۔ رنگ رلیاں منانے کے لیے شراب ناگزیر تھی۔ دوستوں (ندیم) کی رنگین محفلیں منعقد کرنا تقریباً شاہی دستور بن گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بلبن نے تاجپوشی کے بعد شراب سے توبہ کر لی تھی لیکن اس توبہ کے پیچھے علاء الدین کی سیاسی مصلحت کارفرما تھی نہ کہ قانون پر عمل کرنے کی پریشانی۔ خود قانون دانوں کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں شہنشاہ کو تھوڑی بہت آزاد خیالی سے کام لینا چاہیے۔[33] موسیقی اور رقاصائیں ایک دوسری تفریح تھی جو وقت گزارنے کے ساتھ شراب کی طرح زندگی کا ایک ضروری جز بن گئی تھی یہ جو چیز پہلے تھی تفریح کے لیے تھی وہ کھلے دربار میں رائج ہو گئی۔ پیشہ ور گویوں نقالوں اور بیسواؤں کو ملازم رکھنا ایک ایسی کارروائی تھی جو ہندوستانی روایت سے متاثر ہو کر اختیار کی گئی تھی کیونکہ وسط ایشیا بلکہ عرب ممالک میں بھی صنف نازک کی پیشہ ور گانے والیاں ایک انوکھی بات تھیں۔ ہندوستانی بیسوائیں اور رقاصائیں دراصل تربیت یافتہ "جریہ" سے بہت مختلف تھیں۔

مملوک عہد میں دولت پیدا کرنے والی سرگرمیوں کی تحقیقات سے اطمینان بخش نتائج سامنے نہیں آتے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم عصر مورخین کو اس موضوع سے کوئی دل چسپی ہی نہیں تھی۔ تجارت اور صنعت کی کس طرح اور کتنی نشو و نما ہوئی تھی یا اس عہد نے ملک کی اقتصادیات پر کیا اثر ڈالا تھا۔ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب تلاش کرنے کے لیے بڑی حد تک قیاس آرائی کرنے کی ضرورت ہو گی۔ ہم ایسے تاجروں کا ذکر سنتے ہیں جو گھوڑوں کا، غلاموں اور کپڑوں کا بیوپار کرتے تھے۔ درآمد اور برآمد کرنے والوں کے بڑے بڑے نام سنتے ہیں لیکن یہ لوگ ہمیشہ ایران یا عرب کے مسلمان ہوتے تھے۔[34] کچھ ترک تاجروں کا بھی ذکر ملتا ہے جو جنوبی ترکستان (ختلہ) سے گھوڑے منگوا کر ان کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ لوگ ہندوؤں کی تجارتی دنیا کے جانے پہچانے چہرے تھے۔ مملوک

سلطنت کے پاس کوئی بندرگاہ نہ تھی اور سمندری راستوں سے ہونے والا کاروبار ادھر ادھر گھوم کر دہلی کے بازاروں تک پہنچتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تجارت، چاروں طرف زمین سے گھری ہوئی سلطنت کی اقتصادی زندگی پر بلا واسطہ اثر ڈالتی ہوگی۔ "طبقات اکبری" میں علاء الدین خلجی کے تحت ایک افسر "تاجر بیگی" کا ذکر ہے لیکن فوجی مملوکوں سے یہ امید کرنا قبل از وقت ہوگا کہ وہ خارجی تجارت کو بڑھانے یا اسے باقاعدہ کرنے کی سوچی سمجھی کوشش کریں گے۔[35]

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اقتصادی زندگی میں تجارت کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کے برعکس حکومت کی تاجروں اور دکانداروں پر ٹیکس لگا کر اور کاروباری سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر محصول عائد کر کے بہت آمدنی ہوتی تھی۔ شرفاء اور عالی خاندانوں کی آسائش سے بھری ہوئی زندگی نے بلاشبہ روزمرہ استعمال ہونے والی چیزوں کی مانگ بہت بڑھا دی تھی۔ اسی لیے بیچ کے آدمی اور صناعوں اور دستکاروں کا کاروبار چمک گیا تھا۔ علاء الدین کے عہد میں ہم ایسے بہت سے تاجروں کا ذکر سنتے ہیں جن پر اقتصادی ضوابط عائد کر دیئے تھے۔ بلبن کے دور میں "امیر بازار" کے عہدے کا ذکر ملتا ہے۔[36] فیروز تغلق کے عائد کیے ہوئے ان محاصل کی فہرست جو اس نے ختم کر دیئے تھے۔ ہمارے سامنے اُن مختلف تاجروں کو لا کھڑے کرتے ہیں۔ جو شہری آبادی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لیے سامان فراہم کیا کرتے تھے۔[37] محکمہ فوج کے پاس کوئی محکمہ رسد نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لیے غلّہ کے تاجروں پر بھروسہ کرتے تھے۔ یہ لوگ مہم پر جانے والی فوجوں کے ساتھ چلا کرتے تھے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح یہاں علاقوں کے باقاعدہ بازار نہیں تھے لیکن انسانوں کو فروخت کر کے پیسہ بنانے کا طریقہ تسلیم شدہ تھا۔ یہاں تک کہ علماء بھی اس کو اپنا صنعتی کاروبار بنا لیتے تھے۔[38] ساہوکاری کا دھندا سب سے زیادہ منافع بخش تھا جو مکمل طور پر ہندوؤں تک محدود تھا۔ اور یہ لوگ حکومت کے نافذ کیے ہوئے بے تحاشہ سود کو وصول کر کے عیاش امراء کو کنگال بنا دیتے تھے۔[39] امیر حسن نے بہرام کے زمانے میں لاہور کے ایسے مسلمان سوداگروں کا ذکر کیا ہے جو کاروبار کے لیے گجرات کے ہندوؤں کے پاس جایا کرتے تھے اور ان سے انتہائی منافع کماتے تھے۔[40]

صنعتوں کے سلسلے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مسلم بندوبست کے علاقوں میں ہندو دستکاروں کی برادری اور پیشہ ور طبقے بھی کام کرتے تھے۔ جہاں تک صنعت کا تعلق ہے ہندوستان کی خودکفالتی صورت اور برآمد پر غیر ملکیوں کی فتح کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ امراء کے لیے قیمتی سازوسامان فراہم کرنے کی وجہ سے صناع اور دستکار کام سے لگے تھے۔ بادشاہ کی مختلف ضرورتوں کی وجہ سے نہ صرف صنعتوں کے پہیئے حرکت میں رہتے تھے بلکہ سرکاری کارخانے بھی کھل گئے تھے۔ حالانکہ ہم ان کا ذکر پہلی دفعہ چودھویں صدی کے ابتدائی حصے میں سنتے ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ ان کی ابتدا اور پہلے ہوئی ہو[41]۔ اس دور میں راج پتھر کے کام کرنے والوں، خیمے زین اور فرنیچر اور گھروں کے پردے وغیرہ تیار کرنے والوں کپڑا اور زرہ بکتر وغیرہ بنانے والوں کی ہمیشہ مانگ رہتی تھی۔ ہندوستان میں بنائی جانے والی چیزوں کی برتری اور بہتری کی امیر خسرو نے بڑی تعریف کی تھی[42]۔ ایسی چیزوں کے لیے گاہک ہمیشہ موجود رہتے تھے شاید اس لیے شہروں کے بازاروں میں ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی۔ اگر تیار شدہ چیزوں کی بڑھتی ہوئی قیمت کا مطلب صنعتوں سے زیادہ سے زیادہ مطالبہ کرنے کا ہے تب تو خلجی ضابطے تیرھویں صدی کے صناعوں کی آسودہ حالی کو ثابت کر دیں گے۔ ان کی اکثریت ہندوؤں کی تھی لیکن تھوڑا حصہ نچلے درجے کے مسلمانوں کا بھی ہوتا تھا جن میں زیادہ تر ہندوستانی نومسلم تھے۔

حکومت کی اقتصادیات کا سب سے بڑا سہارا زراعت تھی۔ مملوکوں نے بہت جلد اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ انھیں یہاں کے کاشتکاروں پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنا پڑے گا۔ غیاث الدین تغلق کی سب سے بڑی پریشانی کسانوں کی بہبودی تھی یہ حقیقت صرف اس رویہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جس کے حصے دار اس کے پیش رو بھی تھے۔ بلبن کہا کرتا تھا کہ "کسان حکومت کی ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتا ہے۔ اس کو اتنا مالدار نہیں بننے دینا چاہیئے کہ وہ ایک رئیس اور طاقت ور باغی بن بیٹھے اور اگر اس سے بہت زیادہ لے لیا گیا تو پیداوار کی کمی کا ڈر لاحق ہو جائے گا اور یہ کمی بالآخر سلطنت کو کمزور کر دے گی۔" بلبن نے بغرا خاں کو نصیحت کی تھی "خراج وصول کرنے کے سلسلے میں بیچ کا راستہ اختیار کرو"[43]۔ زمین کے لگان کے تخمینے اور وصولی کی تفصیلات ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن ہم کم از کم کسی قسم کی زراعتی بے اطمینانی یا زمینداری جھگڑوں

کے بارے میں بھی کچھ نہیں سنتے ہیں۔ یہاں پر ہم اس بات کو غالباً تسلیم کر سکتے ہیں کہ بڑی بڑی زراعتی زمینیں اور مویشی رکھنے کی اجازت ہوگی۔ سیاسی پریشانیوں کی وجہ سے ہونے والی فوجی کارروائیوں کے علاوہ دیہاتوں کے کسان اپنے خود کفیل دیہاتوں میں بڑی مطمئن پنچایتی زندگی گذار رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے فاضل غلّہ کو قصبوں کے دیہاتوں میں فروخت کرتے تھے اور مکھیا کے ذریعہ اپنے محاصل ادا کرتے تھے۔ مملوک سلطنت عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ اس نے زندگی کے پرانے رائج طریقوں کو قائم رکھا تھا۔ اسی وجہ سے یہ سوچنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ دیہاتی معیشت کو ویسی زیادہ فوری تبدیلی نہیں برداشت کرنا پڑی ہوگی جیسی مسلسل برسرپیکار راجپوتوں کے زمانے میں سامنے آئی تھی۔[44]

یہاں پر اس نتیجے سے انکار کرنا مشکل ہے کہ متذکرہ دور میں ابھی تک مسلمان ٹیکس وصول کرنے والا ہوا کرتا تھا اور اس نے ملک کی پیداوار اور زراعتی دولت کو بڑھانے میں بہت کم براہ راست حصّہ لیا تھا۔ مسلمانوں کے کاشت کار ہونے کی بہت کم مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس قسم کی ایک مثال ہمیں شیخ جمالی کی اس کہانی سے ملتی ہے جو انھوں نے بہاؤالدین زکریا کے مفلس شاگرد پر لکھی تھی۔ اس غریب شاگرد نے لاہور میں ایک چھوٹی سی زمین پر کھیتی باڑی کی تھی۔ اور لگان نہ ادا کرنے کی صورت میں اسے ایک معجزہ دکھانا پڑا تھا۔[45] دوسری مثال جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ بلبن کے دور کی ہے جب اُس نے حفاظتی قلعوں کی مزید تقویت کے لیے افغان سپاہیوں کو ہندوستان کی نئی شاہراہوں کے پاس زمین دے کر بسا دیا تھا۔ ان مثالوں میں اُن نو مسلموں کو بھی شامل کر دینا چاہیے جو دیہاتی ہندو آبادی سے آئے تھے۔ ان لوگوں نے غالباً اپنی زمینوں کو قائم رکھا ہوگا سوائے اس کے کہ ذات پات کے تعصب کی وجہ سے ان کو زمینیں چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ کسان دراصل ایک بڑی قیمتی سرمایہ تھا اگر اس نے کسی شہری پیشے کو اختیار نہیں کر لیا ہے تو پھر نہ صرف جاگیردار شہزادے کی بلکہ اقتدار اعلیٰ کی بھی یہی کوشش ہوتی ہوگی۔ کہ کسان اپنے پیشے میں لگا رہے۔ لیکن مسلم حکمراں طبقے کی زمین سے دلچسپی کا واحد مقصد لگان کی وصولی تھی۔ مقطیع ہو یا، اقطاع دار، دونوں کو اپنی آمدنی کے لیے کاشت کار سے لگان وصول کرنا ہوتا تھا۔ یہاں تک "اہل قلم" کو

بھی اسی قسم کا اختیار حاصل تھا۔[46]

زمین کا قانونی مالک کون ہوتا تھا۔ یہ سوال پریشان کن ہے۔ اس لیے اس کو چھیڑنا غیر ضروری ہے۔ عملی طور پر، کسان کی پیداوار میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کا مطالبہ ہوتا تھا کہ کسان اپنی کھیتی باڑی سے غیر معمولی محبت بھی کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں بادشاہ اس کو بے دخل کرنے کا مجاز ہوتا تھا۔[47] اس پوری صدی میں ہمارے سامنے کوئی ایسی ٹھوس مثال نہیں آتی جہاں ہم دیکھیں کہ ٹیکس وصول کرنے والے نے کسان کے لیے آب پاشی یا کسی دوسری طرح کی سہولت کا بھی انتظام کیا ہو۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ حکام کی ساری توجہ فوجی اور سیاسی مسائل پر مرکوز رہی ہوگی۔ لیکن مملوکوں کے زمانے میں تالاب اور حوض بھی کھودے گئے تھے کاروانوں کے لیے سرائیں بنائی گئی تھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کریم النفسی اور فیض رسانی صرف شہری آبادی تک محدود نہیں تھی۔ دیہی خوشحالی کو بڑھانے کے کاموں میں غیاث الدین تغلق کی عملی دلچسپی مشہور ہے[48] لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سمت میں اس کی سرگرمیاں ایک ایسے خیال کا عملی اطلاق تھا جو اس کے عہد سے پہلے سوچا جا چکا تھا۔

حوالاجات

1۔ اسلامک کلچر، 1937، ص ص۔ 177۔ 178۔

2۔ فخرِ مدبر: تاریخ، ص۔ 22۔

3۔ الیٹ، iii، ص۔ 578۔

4۔ سیاست نامہ مدیر خلخالی، ص ص۔ 74۔ 75۔

5۔ راحلہ، ڈیف۔ ایٹ سنگھ، iii، ص 201۔ 202۔

6۔ دوسروں کے علاوہ تاج الدین سنجر گزلک خان و طغرل تغان خان، قراقش خان، التتمش اور بدرالدین سنقر کے حالات زندگی کے لیے منہاج، ترکوں میں اس نظام کے عام رواج کے لیے یہاں تک کہ مصر میں بھی دیکھیے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مملوکوں پر مقالہ۔

7۔ کمال ماہیار: برنی، ص۔ 126 معزالدین کا فرمان بھی دیکھیے (اپنڈکس اے) جس میں اجے پال کو ملک محمد قدرراز کہا گیا ہے۔

8۔ فتویٰ جہانداری، صفحہ ذیل۔ 120 اے۔

9۔ زیریں نشیب سندھ کے سمرا حکمرانوں کے فاطمیوں سے سیاسی اور مذہبی تعلقات کے تائیدی ثبوت کے لیے دیکھیے، الیٹ، i، ص۔ 491۔ سندھ اور گجرات میں اسمٰعیلی کامیابی کے لیے دیکھیے۔ آرنلڈ: پریچنگ آف اسلام، ص ص۔ 274۔ 277۔

10 منہاج، ص۔ 189۔ 190۔

11۔ مثال کے طور پر دیکھیے، 15، 43، 98 اور 437 اس الزام تراشی میں مسلمانوں کے تمام حلقوں نے حصہ نہیں لیا، اس کے برعکس ان کے اہم کارکن عزت کی نگاہ سے

دیکھے جاتے تھے۔ جیسا کہ نور ترک کے متعلق نظام الدین اولیا کے ایک قول سے ثابت ہو جاتا ہے، فوائد الفوائد، صفحہ ذیل۔ ۱۰۲ بی

12- منہاج، ص۔ 77 - 78 کہا جاتا ہے کہ غزنی کے شہریوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے معیزالدین بعد کو حنفی ہو گیا۔ اس کا بھائی آخری دنوں میں شافعی ہو گیا۔ کرامیہ فرقے کے لیے دیکھیے، شہرستانی: کتاب الملل والنحال، طبع کیورٹن، لنڈن، 1846، ص ص 79 - 85 انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، کرامیہ پر مقالہ۔

13- ٹائٹس: انڈین اسلام، ص۔ 122- 123-

14- دیکھیے نوٹ، 28، باب XVI النعرا۔

15- مرتب، مُنی، جینا وجیہ اور ایچ، سی۔ بھیانی، سنگھی جین سیریز۔ بامبے ہسٹری آف کلچر آف دا انڈین پیوپل، بھی دیکھیے۔ v، ص۔ 350-

16- دیکھیے مرزا: لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو، تفصیلات کے لیے حبیب: حضرت امیر خسرو، ص۔ 5-

17- مطلوب الطالبین، ایتھ میں حوالہ: ح۔ س۔ اندراج نمبر 655-

18- برنی، ص۔ 112-

19- قریشی میں حوالہ و ص۔ 169 نوٹ۔ 9، اس کی تصنیفات کے حوالوں کے لیے بدایونی بھی دیکھیے، i، ص۔ 70 -

20- حوض الحیات، لا اور ٹن عرب ڈل امرت کنڈ، از یوسف حسین، جرنل ایشیاٹک میں، ccxiii، 1928، ص ص 300 - 344- لیڈن میں ایک مخطوطہ اور رینٹل مینسکرپٹس اِن دَ برٹش میوزیم۔ 723 (3) ہیں۔ "المرأت المعانی فی ادراک العلم الانسانی" بطور عنوان استعمال ہوا ہے، دیکھیے اسلامک کلچر، اپریل، 1947، ص ص۔ 190- 191۔ یہ دراصل دوسرے عربی ترجمہ کا عنوان ہے جسے اسپین کے مشہور صوفی ابن العربی (وفات 1240) نے تیار کیا تھا۔ رکن الدین سمرقندی کے متعلق بروکلمن (BROCKELMANN): گال (GAL) i، ص۔ 446 دیکھیے، جو ابن عمیلہ کے نام سے مشہور تھے۔ جنھوں نے 1218 میں وفات پائی، حاجی خلیفہ، ii، ص 414۔ اس کا فارسی ترجمہ ابن العربی کے عربی ترجمہ سے سولھویں صدی

میں 'بحرالحیات' کے نام سے ہوا۔ جیسے گوالیار کے شطاری بزرگ محمد غوث کی ایما پر اُن کے مرید محمد بن خطیر الدین نے تیار کیا، 1310ھ میں مدراس سے شائع ہو چکا ہے۔ دبستان المذاہب کے مصنّف مرزا محسن فانی نے ہندوستانی جوگیوں کے بیان میں اس فارسی ترجمہ سے بہت کچھ لیا ہے۔ اس فارسی ترجمہ کا منقش اور توضیحی و تشریحی مخطوطہ جو 17 ویں صدی میں تیار گیا گیا تھا۔ چسٹر بیٹی لائبریری ڈبلن میں موجود ہے؛ آرنلڈ؛ کیٹلاگ آف مغل مینی ایچرس ان لائبریری آف چسٹر بیٹی، لندن، i، ص 80 - 82 پلیٹ، 98 اتھ بھی دیکھئے: کیٹلاگ آف پرشین مینسکرپٹس اِن دِ انڈیا آفس لائبریری، نمبر 2002۔

21- منہاج خود برسوں تک نصیری مدرسہ کا نگراں رہا۔ ص۔ 1880۔

22- ص ص - 110-111 -

23- مسالک الابصار، الیٹ؛ iii، ص۔ 578 -

24- فتوحات فیروز شاہی، الیٹ؛ ص ص 381 - 382؛ دیکھئے عفیف ص ص 290-314۔

25- فقیر اللہؒ: راگ درپن'' جس کا حوالہ شبلی نعمانی نے شعر العجم ص۔ 137 پر دیا ہے۔

26- مثال کے طور پر باربک، دادبک، قربیگ، الاغچی وغیرہ؛ برنی ص۔ 126۔

27- برنی، ص ص۔ 170، 173؛ طبقات اکبری، ترجمہ، i، ص۔ 140 ۔

28- ص۔ 116 - 117 -

29- راحلہ: ڈولیف، الیٹ، سنگ، iii، ص۔ 277

30- مثال کے طور پر ص۔ 86 دیکھئے: فتوائے جہانداری، ص۔ذ 116 اے، 117 - ہندوستانی اصطلاح کھاٹ (BED- STEAD) کے استعمال کے لیے۔ دیکھئے برنی، ص۔ 117 -

31- عفیف، ص ص۔ 350- 352 -

32- ایسٹ اینڈ ڈاؤس (علی گڑھ) میں حبیب نے حوالہ دیا ہے۔ ح۔ س۔ ص۔ 154-

33- دیکھئے عفیف، ص ص 145-147 پارسا فیروز سے متعلق ایک واقعے کے لیے جس پر مصنّف نے حاشیہ آرائی کرنے کی کوشش کی ہے۔

34- منہاج، ص ص۔ 138، 159، 167، 168-

35- ترجمہ، i ص- 154-

36- برنی، ص- 34- 35 اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی سرکاری عہدیدار تھا اور علاؤالدین کے نگراں بازار کی طرح رئیس بازار کہلاتا تھا۔

37- فہرست کے لیے دیکھئے قریشی، ح، س- ص- 228- 229؛ اس میں وہ بھی شامل ہیں جن کا ذکر عفیف نے کیا ہے۔

38- اس واقعہ کے متعلق کہ کس طرح ایک افغانی بزرگ نے ایک ایسے امام کے پیچھے نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور بعد کو اسے عبادت کے دوران اس تجارت کے خیال میں الجھے رہنے پر تنبیہہ کی۔ دیکھئے فوائدالفوائد صفحہ ذیل 18- اے۔

39 دیکھئے برنی، ص- 120-

40- فوائدالفوائد، صفحہ ذیل- 63 بی۔

41- عباس: مسالک الابصار، الیسٹ، iii، ص- 578-

42- قریشی میں حوالہ، ص- 211 نوٹ- 4-

43- برنی، ص- 100؛ ص- 574 بھی دیکھئے۔

44- مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں زرعی دستور کے لیے دیکھئے، گھوشال: ایگریرین سسٹم آف اینشینٹ انڈیا، جاگیریں دینے کا طریقہ، مجموعی تعین (ٹیکس کے لیے) اور وصولی جو مسلم مالیاتی نظام کی خاص باتیں ہیں پہلے ہی سے ہندوستانی کسانوں کو معلوم تھیں اور اس طرح پرانا دستور اب بھی جاری تھا۔

45- سیرالعارفین، صفحہ ذیل، 17 اے۔

46- دیکھئے منہاج، ص- 214 اس کے اپنے اقطاع کے لیے ص- 195 بھی دیکھئے۔

47- برنی، ص- 430 اور ص 574 بھی-

48- برنی ص- 442-

سولہواں باب

سایۂ عاطفت میں رہنے والے غیر مسلم (ذمّی)

شنسہ بانی فتح میں مذہب کا بڑا ہاتھ نہیں رہا ہوگا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر بہ مشکل بحث کی جا سکتی ہے۔ ہندوستانی سرزمین پر معزالدین کا پہلا مد مقابل کوئی کافر نہیں تھا بلکہ ایک ایسا شہنشاہ تھا جو خود اس سے زیادہ اسلامی قانون کا معتقد تھا[1] اس نے لاہور کے ایک مسلم فرماں روا کو ختم کر دیا تھا لیکن اجمیر گوالیار اور دہلی میں ہندو راج کو قائم رکھنا اُسے گوارا تھا۔ اُس کا نائب کپتان اس بات پر تیار تھا کہ چندیلا بادشاہ اپنی سلطنت پر قائم رہے۔ بعد میں فراہم ہونے والی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ معزالدین نے خسرو ملک کے خلاف جمّوں کے ہندو فرماں روا سے سمجھوتہ کر لیا تھا[2] اس کے علاوہ متعدد ہندو شہزادوں کو اپنی داخلی خود مختاری اور طاقت برقرار رکھنے دی گئی تھی۔ یہ کہنا کہ مسلمان ترکوں نے اپنی حکومت کی ابتدا جان و مال اور مذہب کی بلا تفریق[3] اور اندھا دھند تباہی سے شروع کی تھی، تاریخ سے انتہائی لاعلمی ظاہر کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہم عصر دستاویزوں میں مندروں کی غارت گری کے جو بیانات ملتے ہیں اُن کو نہ صرف زمانہ جنگ کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے بلکہ روزنامچہ نویسوں کی مبالغہ آرائی کی عادت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ مثلاً حسن نظامی نے اپنی دانست میں بڑی ایمانداری سے کالنجر کے تمام مندروں کی تباہی کا ذکر کیا ہے[4] لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہوبا، کھجوراہو اور کالنجر میں مسلمانوں سے پہلے کے بیشتر مندر آج بھی موجود ہیں[5] اسی قسم کے بیانات بنارس، کالپی، دہلی اور

اجمیر کی فتح کے سلسلے میں بھی درج کیے گئے ہیں۔[8] تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کچھ ملازموں کو نقصان ضرور پہنچا تھا بلکہ کچھ جان بوجھ کر تباہ بھی کیے گئے تھے۔ منہاج نے اجین میں مہاکالی مندر کی التمش کے ہاتھوں تباہی کا اور اجمیر میں وگرہا پالا کالج کو مسجد میں تبدیل کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔[7] دہلی میں قوت الاسلام مسجد کی تعمیر بلاشبہ ہندو مندروں کے سامان سے ہوئی تھی۔ اور اسی طرح بدایوں میں التمش مسجد بھی وجود میں آئی تھی۔[9]

لیکن ہر تباہ شدہ مندر اور خانقاہ کو مسلمانوں سے منسوب کرنا دو حقیقتوں کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہوگا نمبر ایک قدرتی تنزل اور نمبر دو ہندو فرقوں کی آپسی رقابت اور عدم رواداری۔ مثلاً گجرات میں انہل وارا کے قریب دبھوی اور کیمبے کے جین مندروں کو 1193ء اور 1210ء کے درمیان مالوا کے پرامارا راجہ سبھاتا ورمان نے تباہ و برباد کیا تھا۔ راجہ ہرش نے، جس کا تعلق کشمیر کے دوسرے لوہارا سلسلہ سلاطین سے تھا (1089ء۔ 1101ء) اپنے خزانے کو بھرنے کے لیے متعدد ہندو مندروں کو تاخت و تاراج کیا تھا۔[10] تاہم اس قسم کی جتنی بھی تباہی مسلمانوں سے منسوب کی جا سکتی ہے اس کا بیشتر حصہ فوجی کارروائیوں کے نتیجے کے طور پر ہوا تھا اور جہاں ایسا نہیں تھا وہاں تباہی کے اسباب فاتح کی مذہبی جوش و خروش کی جگہ اس کی قیمتی دھاتوں کی حرص میں تلاش کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ ہندو مندر ان دنوں بلکہ آج بھی قیمتی دھاتوں کے سامان سے مالا مال ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان مقدس مندروں میں نہ صرف راج کمار بلکہ عام لوگ بھی اپنے خزانے رکھا کرتے تھے۔ سونے کے سلسلے میں ہندوستان ایک افسانوی ملک تھا اور حقیقت یہ ہے کہ تیار کیے ہوئے سامان کو برآمد کرنے کی وجہ سے ہندوستان میں یہ قیمتی دھات باہر جانے کے مقابلے میں آتی زیادہ تھی۔ کہتے ہیں کہ محمود کے معرکوں کی مالی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ اس نے بڑے منظم طریقے پر مندروں کو لوٹا تھا۔ جواہرات سے جڑی ہوئی سومناتھ کی مورتی کی کہانی جس کے اندر سونا بھرا ہوا تھا عالمی طور پر تسلیم کی ہوئی روایت بن چکی ہے، لق و دق صحرا میں پیدا ہونے والے بدنصیب ترک کے بچّے کے لیے اس مادّی دولت میں ناقابلِ برداشت کشش تھی۔ اس میں مذہبی جوش و خروش زیادہ نہیں تھا کم از کم اس ترک بچّے پر اس

کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ یہ کوئی بے معنی بات نہیں ہے کہ گہاڈوالا راجہ کو راستے سے ہٹانے کے بعد معزالدین کی فوج دارالسلطنت قنوج پر قبضہ کرنے کے لیے نہیں بڑھی تھی۔ اس نے بنارس اسنی کا رُخ کیا تھا جہاں راجہ کا خزانہ تھا۔ روزنامچے میں بھی معزالدین کی کامیابیوں کا تخمینہ زیادہ تر اُس کی دولت کی بنیاد پر لگایا گیا ہے نہ کہ اسلام کی شان کو دوبالا کرنے کی کامیابی پر۔[11]

روزنامچہ نویسوں کے فخریہ بیانات میں مذہبی جوش وخروش کے علاوہ کچھ اور چیزوں کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ مندروں کی تباہی اور خانۂ خدا کی تعمیر کے بارے میں بڑھے چڑھے بیانات میں پروپیگنڈے کا مقصد یقینی طور پر موجود تھا۔ مذہبی کرّوفر اور دنیاوی دولت کی لالچ دے کر وسط ایشیا میں فوجیوں کی بھرتی بہت آسان ہوتی تھی۔ فتح نامہ کی پرتکلف اور شاندار عبارت، مواد کی صحت سے زیادہ اس کے اثر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ چنانچہ جب متوقع رنگروٹوں میں اس کا اعلان کیا گیا تو امید کے مطابق فوج میں شرکت کرنے والوں کا ایک سلسلہ بن گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ مفتوحہ غیر مسلموں کو کبھی غیر مسلح نہیں کیا گیا۔ حملہ آوروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ان کے لیے اپنے مذہبی خیالات کی تبلیغ انتہائی خطرناک تھی۔ بلکہ اندرونی علاقوں میں مسلمانوں کی پُرامن آبادکاری کے لیے فوجی امداد کی ضرورت تھی۔ دیہاتی علاقوں میں مسلمانوں کی رہائش کے سلسلے میں ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ مقامی حالات نے اس کارروائی کی حدبندی ضرور کردی ہوگی۔ قنوج کے قریب نیوال گاؤں میں ایک کہانی مشہور تھی جو غالباً اس مخصوص رویّہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہندو اکثریت نے فتح کے ابتدائی برسوں کے درمیان اختیار کر رکھا تھا "سید علاءالدین قنوج سے نیوال آئے اور انھوں نے بانگرمئو (ایک دیہات کا جدید نام) میں سکونت اختیار کرنا چاہی۔ لیکن وہاں کے راجہ نال نے انھیں نکلنے کا حکم دیا اور انھیں نکالنے کے لیے اپنا نوکر بھیجا۔ صوفی علاءالدین نے یہ سن کر بددعا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری جگہ آن کی آن میں اُلٹی ہوگئی۔" اس کے بعد علاءالدین نے اس جگہ سکونت اختیار کرلی۔ جہاں مقبرے کے کتبے پر لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق 1302ء میں اس کا انتقال ہوا۔[12] غیاث الدین تغلق نے ایک شخص کو زمین[13] بخشی لیکن وہاں کے

ہندوؤں نے اُسے وہاں آباد نہیں ہونے دیا آخر مجبور ہو کر غیاث الدین تغلق کو زمین پر قبضہ کرنے کے لیے کوئی دوسری تدبیر سوچنا پڑی [13] کچھ لوگوں نے انفرادی اور خانگی طور پر بڑا خطرہ مول لے کر دیہاتی علاقوں میں بستیاں بسائیں حالانکہ ان لوگوں کو عام طور حکومت کی مدد نہیں ملتی تھی۔ انھیں خود ہی شدید ترین ہندو مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔[14]

مفتوحین کی اکثریت بدستور حکمرانوں کے تحت رہتی تھی اور پوری طور پر مذہبی آزادی کے ساتھ زندگی گزارتی تھی۔ انھیں صرف اُس وقت مسلم فتح کا احساس ہوتا تھا۔ جب اُن سے خراج وصول کیا جاتا تھا اور یہ کہنا انتہائی مشکوک ہے یہ لوگ زمین کے لگان اور خراج کے علاوہ کوئی ٹیکس آسانی سے دیتے ہوں گے۔ یہاں تک کہ براہ راست بندوبست کے تحت آنے والے علاقوں میں بھی۔ جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ جزیئے میں بھی مخصوص رعایتیں اصولی طور پر دے دی جاتی تھیں۔ باوجودیکہ فرماں روا کا یہ اعلان تھا کہ وہ "شرک" کو روکنا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی مقامی لوگوں کے مذہب اور طرز زندگی پر عام طور پر دخل اندازی نہیں ہوتی تھی نہ یہ عملی طور پر بھی مناسب نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اسلام کے کٹر شیدائیوں نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ بت پرستی اور بدعت کو ہندوستان سے ختم کرنا ممکن نہیں ہے [15] برنی نے تو بلبن کے منہ سے کہلایا ہے کہ بت پرستی کی مکمل بیخ کنی کو صرف ایک ناقابل حصول آدرش ہی رہنا چاہیے [16]

قانون کے اعتبار سے غیر مسلموں کو پوجا پاٹ کی پوری آزادی تھی اور ان کے مندروں کو وہی پہلے والا تقدس حاصل تھا۔ بریلی سے متھرا جانے والی سڑک پر کننگھم نے ۱۰۰۰ء سے پہلے کا بنا ہوا ایک مندر دیکھا تھا جس پر یاتراؤں کی تاریخیں درج تھیں۔ اس نے دیکھا کہ 1241ء سے 1290ء کے درمیان تقریباً پندرہ یاتراؤں کے کتبے اس پر موجود تھے۔ ملتان کے مشہور مندر آدتیہ (ADITYA)، کو جسے قرامطیہ فرماں رواؤں نے منہدم کر دیا تھا دوبارہ تعمیر کر کے سترھویں صدی تک پوری شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا تھا [17] یہاں پر یہ سوچنے کی بات ہے کہ ملتان صرف ایک اہم صوبائی دار السلطنت ہی نہیں تھا مشہور صوفیوں سے اس کا تعلق ہونے کی وجہ سے اور مسلم آبادی کی اکثریت کے سبب قبۃ الاسلام (QUBBATUL ISLAM) (گنبد اسلام) کہلاتا تھا۔ مذہبی

عبادت کی آزادی کا سلسلہ نئے مندروں کی تعمیر تک پہنچا تھا۔ دہلی کے پرانے قلعہ میں فارسی اور سنسکرت میں لکھا ہوا ایک خستہ حال کتبہ ملا تھا جس میں بارہ بیگھہ زمین کو ایک مندر کے لیے وقف کرنے کا ذکر ہے۔ یہ مندر تیار ہونے کے بعد سری کرشنا کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔[19] مندروں کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز شہادت فیروز تغلق نے فراہم کی ہے جو اس کے سابق حکمراں کے دور میں تعمیر ہوئے تھے۔ "ہندوؤں اور بت پرستوں نے شہر اور اس کے گرد و نواح میں مندروں کی تعمیر کی تھی۔" ملیاہ کے دیہات میں ایک حوض تھا جہاں پر انھوں نے مندر بنایا تھا۔ اور خاص خاص دنوں میں ہندو گھوڑوں پر سوار ہتھیاروں سے لیس وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ یہ اس بدعت کو اتنا زیادہ نظر انداز کیا گیا تھا کہ بازار کے لوگوں نے طرح طرح کے سامان نکال کر دکانیں سجالیں تھیں اور اپنا سامان فروخت کرتے تھے۔[20] فیروز کہتا ہے کہ اسی قسم کے بت خانے سلیہ پورہ اور کوہانہ کے دیہاتوں میں بھی بنا لیے گئے جہاں باقاعدہ پوجا ہوا کرتی تھی۔[21] ایٹہ میں جین فرقے کی تین شبیہہ دستیاب ہوئی ہیں۔ جن پر ان کی تعمیر کی تاریخ 1278ء / 1335 وکرمی سمبت لکھی ہوئی ہے۔[22] فیروز خلجی کے مندرجہ ذیل بیان سے یہ بات بالکل ثابت ہو جاتی ہے کہ دارالسلطنت میں ہندوؤں کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ "ہر روز ہندو میرے محل کے نیچے سے مجیرے بجاتے اور سنکھ پھونکتے ہوئے جمنا کے کنارے بتوں کی پوجا کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ خطبے میں میرا نام محافظ اسلام کے طور پر لیا جاتا ہے۔ لیکن خدا اور اس کے رسول کے یہ دشمن۔ میری نظروں کے سامنے بڑے فخر سے اپنی دولت کے مظاہرے کرتے ہیں اور میرے دارالسلطنت میں مسلمانوں کے درمیان بڑے طمطراق اور شان سے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ڈھول پیٹ کر اور مختلف ساز بجا کر غیر اہلِ کتاب لوگوں کے دستوروں اور رواجوں کو زندہ رکھتے ہیں۔[23]

یہ کہنا یقیناً زیادتی ہوگی کہ مملوک بادشاہ نے ہندو مذہب کے لیے بالکل غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اکثریت کے مذہب سے بے تعلقی ایک ایسا اصول ہے جو اس بیسویں صدی میں بھی عالمی طور پر نہیں اپنایا جا سکا ہے۔ لیکن ترک مادہ پرست تھا اُس

نے اپنے مذہب کی صرف اُس حد تک خدمت کی جہاں تک اس کی مادّیت پرستی نے اجازت دی۔ علاء الدین خلجی نے جو جواب قاضی مغیث الدین کو دیا تھا وہ نہ صرف بہت مشہور ہے بلکہ مملوک بادشاہ کے رویّہ کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس نے کہا تھا میں اپنے ہر عمل کو محض مصلحت کے ترازو پر تولتا ہوں۔" حضرت محمد کے دشمنوں کو غارت کرنے کی بات بلبن کے لیے محض پالیسی کی بات تھی کیوں کہ عملی طور پر، جیسا کہ برنی کہتا ہے، وہ صرف حکومت کے فائدہ کو مدنظر رکھتا تھا۔[24]

اسی سیاسی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ترکوں نے کافروں اور اُن کی عادتوں سے ایک مدبرانہ سمجھوتے کے ساتھ اپنی حکومت کی ابتدا کی۔ اس سمجھوتے کا غالباً سب سے بڑا مظہر مملوک سکہ تھا۔ معزالدین کے سونے کے سکے پر ایک "دیوی" کی تصویر کا ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ فاتحین کہاں تک اپنے مذہبی خیالات کو حکومت کے مطالبات پر قربان کر سکتے تھے۔ زراعتی معاملات میں فاتحین نے ماضی کے ڈھانچے میں کوئی واضح شگاف ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی لیے انھوں نے گاؤں کے کارندوں کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ ان سے کام بھی لیے، برہمن کو اب بھی برتری اور تقدس حاصل تھا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ برہمن کی استثنائی حالت قائم رہی اور وہ (۲۲۵۵) محصول ادا کرنے سے مستثنیٰ رہے ہندوؤں کی سماجی رسمیں چاہے وہ انسانی قوانین کے منافی ہی کیوں نہ ہوں جاری رہیں۔ ابن بطوطہ نے ہندوؤں کی سماجی آزادی کا ذکر بیواؤں کی ستی کی رسم کے سلسلے میں کیا ہے۔ اس رسم کو کسی حد تک باقاعدہ کرنے کے خیال سے حکومت نے نہ صرف یہ شرط لگائی تھی کہ متعلقین کو مقامی سرکاری افسر سے تحریری اجازت لینا ہوتی تھی۔ یہ سرکاری افسر اپنے آدمیوں کو صرف یہ دیکھنے کے لیے بھیجتا تھا کہ کہیں عورت کو زبردستی تو نہیں جلایا جا رہا ہے۔[25]

ایسا لگتا ہے کہ تبدیلی مذہب کرنے سے فرماں رواؤں کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی وہ تحفظ کے عظیم مسائل میں الجھے ہوئے تھے اور ایسے میں سرکاری دباؤ سے بڑے پیمانہ پر تبدیل مذہب کرانے کا نتیجہ محاصل کی کمی کی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔ جو اُن کے لیے یقیناً ناخوشگوار تھا۔ یہاں تک کہ ابتدائی مورخین کی پروپیگنڈہ کرنے والی تحریروں میں جن میں کافروں کو جہنم رسید کرنے اور "بت پرستوں کے تزکیہ" کا ذکر بڑے جوش و خروش

سے کیا گیا ہے۔ اُن میں بھی زبردستی تبدیل مذہب کرانے کا ذکر کہیں نہیں ملتا [26] فرشتہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کھوکھر قبیلے نے تبدیل مذہب اس وجہ سے کیا تھا کہ معزالدین نے ان سے رعایتی سلوک کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کیوں کہ ہم عصر مؤرخین نے 1246ء تک کھوکھروں کا ذکر ہمیشہ کافروں کے عنوان سے کیا ہے۔

صرف فیروز تغلق ایک ایسا شخص تھا جس نے اسلام کو پھیلانے میں حکومت کے اقتدار کا استعمال کیا تھا۔ لیکن اس کو چھوڑ کر عقیدے کی تبلیغ ایک الگ کہانی ہے اور اس کو ہمیشہ حکومت کا تعاون حاصل نہیں رہا۔ یہ کہانی صوفیوں اور ولیوں کی کہانی ہے ۔ جنھوں نے ہمیشہ خود اپنی کوششوں پر بھروسہ کیا اور جنھوں نے زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول طریقے پر اسلام کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے پر بادشاہ کی رضامندی کو ہمیشہ تضحیک کی نظر سے دیکھا۔ [28] انھوں نے نچلے طبقوں میں، برہمنوں اور دوسری اونچی ذات والے ہندو سماج کی شدید مخالفت کے باوجود، تن تنہا کام کیا۔ یہاں تک کہ مسلم بندوبست کے علاقوں میں بھی انھیں حکومت کی بہت کم ہی حمایت حاصل ہوتی تھی۔ پٹیالہ صوبے کے ایک مقام نرنول میں، ایک مبلغ محمدؒ کو مقامی ہندوؤں نے قتل کر دیا جو من حیث الجماعت کھڑے ہو گئے تھے اور اس علاقے کے تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ [29] ان مبلغوں کے تبلیغی طریقوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہمیں امیر حسن کے لکھے ہوئے نظام الدین بدایونی کے قصوں سے ہوتا ہے ایک دن ایک مسلمان ایک ہندو کو اپنے پیر کے پاس لایا اور اپنا بھائی کہہ کر اس کا تعارف کرایا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ہندو اسلام کی طرف مائل ہے۔ اس پر اسی شخص نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی جلیل القدر اور بلند پایہ شخصیت کا اس پر اثر ہو سکتا ہے۔ نظام الدین نے کہا "یہ لوگ طاقت یا ترغیب سے نہیں جھکیں گے۔ ان کو صرف ہمدردانہ میل جول کے ذریعہ اسلام کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔" [30]

مسلم قصبوں میں رہنے والے "ذمی" کے اقتصادی اور سماجی رتبے کا صحیح اندازہ فیروز خلجی کی تقریر کے ایک حصّے سے ہو سکتا ہے اس سلسلے میں ایک حالیہ بیان کی تائید میں کوئی شہادت نہیں ملتی ہے کہ ٹیکس لگا کر ہندو یا تراؤں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی [31] یا کھلی جگہوں پر بت پرستی کو قانوناً بند کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک جگہ ایسی ضرور تھی جہاں "ذمی"

کی آزادی پر اثر پڑتا تھا۔ اور یہ تھا کہ "ذمی" مسلمانوں سے تبدیل مذہب نہیں کرا سکتا تھا۔ کیوں کہ اسلام میں مذہب سے انحراف کا قانون انتہائی سخت تھا۔ لیکن یہ صرف ایک نظریاتی پابندی ہو سکتی ہے کیوں کہ نچلے طبقوں کے لوگ۔ تبدیل مذہب کرنے کے بعد عموماً اپنی اصلی مذہبی عادتوں پر لوٹ جاتے ہیں لیکن برہمن ہندو مذہبیت بدلنے والا مذہب نہیں ہے۔ ہندوؤں کی اقتصادی خوشحالی کی تصدیق خود برنی نے اپنی تحریروں میں کی ہے۔ کیقباد کے رنگین دور میں میرٹھ اور کول کے شراب کشید کرنے والے ہندوؤں کا شہر میں بڑا نفع بخش کاروبار تھا۔ تقریباً تمام مسلمان امراء ملتانی ساہوکاروں کے مقروض ہو کر ان کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان ساہوکاروں کو غیر معمولی سماجی عزت حاصل تھی۔[32] برنی نے شکایت کی تھی کہ "شہر دہلی میں ہندو محلوں میں رہتے تھے اور اپنی قیمتی کپڑوں اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی نمائش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی سواریوں کے آگے دوڑنے کے لیے مسلمانوں کو نوکر بھی رکھتے تھے۔ مسلمان ان کے دروازوں پر بھیک تک مانگتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان سلطنت کی راج دھانی کے اندر کافروں کو رائے، رانا، ٹھاکر، شاہ، مہتا اور پنڈت جیسے باعزت القابوں سے مخاطب کیا جاتا تھا۔"[33] غالباً محمد بن تغلق کے دور کا ذکر کرتے ہوئے، جن میں ہندوؤں کو خصوصی سرپرستی حاصل تھی، برنی مزید شکایت کرتا ہے کہ "بت پرستوں اور مشرکوں کو خارجی اور ذمی کہا جاتا تھا۔ ان کو نہ صرف اچھے اور قیمتی کپڑے، گھوڑے اور جھنڈے دیئے جاتے تھے بلکہ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز بھی کیا جاتا تھا۔[34]

تیرھویں صدی میں ہندوؤں کو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز کیے جانے کی بہت زیادہ مثالیں ہم عصر تحریروں میں نہیں ملتی ہیں۔ لیکن جتنی بھی مثالیں مورخین سے بچ گئی ہیں وہ بہت سے راز افشا کرتی ہیں۔ اس بات کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ کرائے کے ہندو سپاہی فوج کا ایک حصہ تھے۔ مدھیہ پردیش کے علاقے بتیاگڑھ میں سنسکرت میں لکھی ہوئی جو دستاویز ملی ہے اس میں کھرپارا فوج کا تذکرہ ہے۔ یہ فوج جوگنی پورہ کے بادشاہ کی جانب سے مقرر کیے ہوئے چیدی علاقے کے مسلمان گورنر جلال خواجہ، کی ملازمت میں تھی۔ کھرپار فوج دراصل اس مقامی ہندو رضاکار فوج سے بہت مشابہ معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر اس علاقے کے قدیم ہندو کتبوں میں ملتا ہے۔[35] اس میں جلال خواجہ

کے تحت ہندو افسروں کے نام درج ہیں۔ اس دستاویز کی تاریخ 1328ء ہے اور اس میں لکھا ہوا ہے کہ ان افسران نے مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک باغ "گوماتھا" اور ایک کنواں تعمیر کیا تھا۔ علاء الدین خلجی کی وزارت محاصل نے مانکپور کے گورنر کے حساب کتاب کی چھان بین کے لیے ایک محاسب بھیجا تھا۔ اس نے مستوفی[35] کو لکھنے والے خط میں ایک اعلیٰ ہندو افسر جس کا نام "بوچند" تھا گورنر سے ساز باز کر کے غیر وفادارانہ رویّہ اختیار کرنے کی شکایت کی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے مقامی حساب کتاب میں کانٹ چھانٹ کر کے فاضل لگان کو خورد برد کیا ہے[36] مخصوص نسلی امتیاز برتنے والے مملوک اس بات پر مجبور رہے تھے کہ سرکاری نوکریاں صرف ترکوں کے لیے وقف رکھیں اس لیے یہ صحیح ہے کہ بندوبست اور نظم ونسق کے کاموں میں ہندوؤں کا تقرر مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی ہم کو رجنی، ہاتھیا، اور بیر ناتھن جیسے نام بعد میں آنے والے مملوکوں کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ لوگ دارالسلطنت میں کچھ غیر اہم عہدوں پر متعین تھے۔ آخری نام کوتوال کا تھا فیروز خلجی کے ابتدائی دور میں غالباً دہلی میں متعین تھا۔[37]

دستیاب شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم دارالسلطنت اور اس کے گرد و نواح کے ہندوؤں پر کچھ زیادہ پابندیاں یا امتناع نہیں عاید تھے۔ ہندوؤں کی دولت بلاشبہ ان کو سماجی عزت اور ناموری دیتی تھی۔ ازدواجی رشتہ داری کو چھوڑ کر[38] مسلمانوں کو بالآخر اپنی خلوت پسندی سے باہر آنا تھا اسی لیے آخری نصف صدی میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے کچھ طریقوں کو اپنا رہا تھا۔ شہری آبادی میں سماجی میل ملاپ کافی قریبی رہا۔ امیر خسرو غالباً مسلمانوں کے نئے رویّہ کی عکاسی کرتا ہے جب وہ "ہندوی" پیدا ہونے پر ناز کرتا ہے اور بڑے کھلے لفظوں میں باقی تمام ممالک پر ہندوستان کی سبقت کا اعلان کرتا ہے[39] ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو جوگی اور مسلمان صوفی آزادی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور مذہبی اور سماجی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس قسم کے ایک مباحثہ کو ہمارے لیے امیر حسن نے قلمبند کیا ہے۔ جس میں فریدالدین شکر گنج نے بھی حصہ لیا تھا[40] فیروز تغلق کے عہد میں لکھے جانے والے ایک واقعہ کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ جب مسلمان مرد اور عورتیں دہلی کے ایک ہندو کے گھر گئی تھیں جس

لہ اعلیٰ محاسب جو دوسرے حساب کرنے والوں سے حساب لے۔ میر منشی۔ مترجم

نے انھیں غیر اہلِ کتاب کے مذہبی طریقوں سے روشناس کرایا تھا۔ اس واقعے سے سماجی میل ملاپ کا ثبوت ملتا ہے جس کی ابتدا تیرھویں صدی کے اختتام پر ہوگئی ہوگی۔ یہی، جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہی میل ملاپ اردو زبان کو وجود میں لانے کا باعث بنا تھا جس کے ابتدائی شاعرانہ نمونے امیر خسرو کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ یہی اسی طرح دو مختلف لوگوں کے میل جول نے ہندو مسلم فن تعمیر کو بھی جنم دیا تھا۔ جس کا پہلا دور ہمیں مملوک بادشاہوں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں نظر آتا ہے۔

ذمّی کی صورت حال کا سب سے اچھا اندازہ خود اس کی اپنی تحریروں سے ہوتا لیکن سوائے جنگجویانہ جھڑپوں کے ریکارڈ کے ان کا کہیں وجود نہیں ہے۔ نئی سلطنت میں خود اس کا اپنی حیثیت کے بارے میں کیا خیال تھا اس سلسلے میں صرف قیاس آرائی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ابتداء میں مفتوحین کے دل میں، جیسا کہ البیرونی نے گیارہویں صدی کے ابتدائی دور میں پایا تھا، ان لوگوں کے لیے جانی دشمنی کا ہونا ضروری تھا کیوں کہ ان فاتحوں کی کاروائیوں کی وجہ سے نہ صرف جان ومال کی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کی سماجی اقدار کی تباہی وبربادی ہوئی جو یقیناً ناگزیر تھی۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو مذہبیت کی فطری خلوت پسندی اور الگ تھلگ رہنے کی خواہش نے اس دشمنی کے احساس کو اور بھی بڑھا دیا ہوگا۔ اور ہندو نے فخریہ علیحدگی اختیار کر کے ذات پات کی پابندیوں میں پناہ ڈھونڈلی ہوگی۔ ہارے ہوئے لوگوں کے لیے بدلہ لینے کا صرف ایک راستہ رہ جاتا تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ فاتحین کو گندہ اور ہیبت ناک ملیچھ سمجھیں لیکن فاتحین کی اصل کامیابی اسی میں مضمر ہوتی ہے کہ وہ اس تلخی کو کم کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے اور بالآخر مقامی لوگوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کر لیتا ہے بدقسمتی سے اس موضوع پر ہمارے پاس کچھ زیادہ قابل بھروسہ دستاویز نہیں ہے۔ ایسے دستاویز بھی نہیں ہیں جن سے اندازہ ہو کہ ایک عام مقامی باشندہ، مسلمان بادشاہ اور اس کے بندوبست کے بارے میں کیا اندازہ لگاتا تھا۔ حالانکہ بعد میں آنے والے ادوار اور صوبائی سلطنتوں کے ایسے دستاویزات موجود ہیں۔ تاہم حکمراں طبقے نے اس سلسلے میں حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اس تلخی کو مزید بڑھنے نہ دیا جائے لیکن فتح کی تکمیل کی طویل مدّت کے سبب وہ مشکل ہی سے کوشش میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ نئے شہری کے لیے جذبہ یقیناً

ایک ناقابل برداشت بے عزتی کے مترادف ہوگا۔ لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ عہد وسطیٰ کے لوگوں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا ہوگا۔ برہمنوں نے فیروز شاہ تغلق کے سامنے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی اس کی بنیاد بے عزتی کے مقابلے میں عالمی نقصان پر زیادہ تھی۔[45] بلبن کے دور کی ایک عجیب و غریب دستاویز فراہم ہوئی ہے جیسے ایک عام ہندو نے سنسکرت میں لکھا تھا۔ اس دستاویز میں مسلمان بادشاہ کا بڑا، خوشگوار ذکر ہے۔ تاہم اس جگہ روایتی اسلوب بیان کی رعایت ضرور دینی چاہئے۔ خاص طور پر اُس وقت جب کہ ایک مسلمان سلطنت میں سنسکرت کا قصیدہ گو انتسابی کتبہ تیار کر رہا ہو۔ اس کے باوجود اس میں جذبات کے اظہار میں واضح خلوص اور صدق دلانہ جذبہ احترام موجود ہے۔ پالم کے کتبے میں جس کی تاریخ 1280ء ہے، جوگنی پورہ کے بادشاہ کا بندوبست کی اچھائی کے سلسلے میں وشنو سے مقابلہ کیا گیا ہے "جو دنیا کی دیکھ بھال سے (بادشاہ کے سپرد کرنے کے بعد) کنارہ کشی اختیار کر کے دودھ کے سمندر میں سونے کے لیے چلا گیا تھا"۔ بادشاہ نے اپنی مطمئن مملکت کے تمام لوگوں کے لیے امن اور تحفظ کی ضمانت لی تھی۔ موسم بہار کا حسن ساری سرزمین پر چھا گیا تھا"[46] علاء الدین خلجی کے دور کے ایک کتبے میں جس میں جودھپور میں ایک ہندو مصنف نے بادشاہ کی مستعد اور منصفانہ سرکار کے لیے تہنیت پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے "خدا کی مانند شجاعت نے زمین کو ظلم و ستم اور نجاست سے پاک کر دیا تھا"[47] تھوڑے عرصے کے بعد مشہور شاعر ودیاپتی نے اپنی ایک ادبی تصنیف میں، ترشکا کے بادشاہ کی فیاضی اور انصاف پسندی کا ذکر بڑی قدردانی کے انداز میں کیا ہے۔[48]

غیر مسلموں کی حالت کے سلسلے میں یہاں پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن تاثرات کو دور کر دیا جائے جو ابتدائی روزنامچوں کو سطحی طور پر پڑھنے کی وجہ سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ کھینچ تان کر نیچے نکالنے کی مصنفوں کی عادت کا ذکر ہو چکا ہے۔ حسن نظامی اور امیر خسرو کے یہاں شاعری ہے لیکن برنی جس دور کا بھی ذکر کرتا ہے اُس پر اپنے تعصب کو طاری کر دیتا ہے۔ یہاں پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا وہ چودھویں صدی کے رجعت پسندانہ نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر لکھا تھا، یہی وہ دور تھا جب فیروز کی قیادت میں جنگجو اور تنگ نظر اسلامیت کو سب سے پہلی دفعہ حکومت کا سہارا ملا تھا۔

اس کی تحریروں میں عام طور پر اس کی انفرادی رائے ہوتی تھی جو مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے لیکن واضح حصے کی نمائندگی کرتی تھی۔ اپنی اسی رائے کو وہ بلبن اور التمش کے مذہبی خیالات بنا کر پیش کرتا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ اپنے قارئین پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بلبن انتہائی تقلید پسند اور زیر دست شریعت پسند تھا وہیں دوسری طرف اسے اس کا احترام بھی کرنا پڑتا ہے کہ حکومت کے معاملات میں سلطان شرعی احکام کی بالکل پرواہ نہیں کرتا تھا اپنی فتاویٰ جہانداری میں برنی حکومت کے سلسلے میں اپنے نظریات بناتا ہے جو حیرت انگیز طور پر بالکل ویسے ہی تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بلبن اور التمش نے اختیار کیے تھے۔ پھر بالکل اسی زبان میں وہ بت پرست ہندوؤں اور مسلمان رافضیوں کو نیست و نابود کرنے کی وکالت کرتا ہے جو اس کی تاریخ کو پڑھ کر پایۂ ثبوت کو پہنچے ہوئے حقائق نظر آتے ہیں۔[49] اس کے نظریات کتنے متعصبانہ تھے اس کا اندازہ اس رویہ سے ہوتا ہے کہ وہ مسلمان فلسفیوں اور آزاد خیالوں کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لیے اسی شدت سے اصرار کرتا تھا جو کافروں اور مشرکوں کے لیے روا تھی۔" تقدس، پارسائی اور راست بازی اس وقت تک کیسے قائم ہو سکتی ہے جب تک کہ فلسفیوں رافضیوں (بد مذہبان) کو جو یونانی مذہبی عقلیت کو سنت اور شریعت پر ترجیح دیتے ہیں اور جو جنت اور دوزخ کے مادی وجود سے انکار کرتے ہیں، کھلے عام اپنے عقائد پھیلانے کی اجازت حاصل رہے گی۔ خدا کا دین کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔ جبکہ یہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، پوری عزت اور شان و شوکت سے دارالسلطنت میں رہیں اور پھر اپنے خیالات کی تبلیغ سے خوفزدہ بھی نہ ہوں۔"[50] یہی ایک بدقسمتی ہے جس کی وجہ سے اسلامی تاریخ نے ہر دور میں نہ صرف یہاں بلکہ بہت سے ممالک میں نقصان اٹھایا ہے۔ اس کے مورخ ہمیشہ ایک چھوٹے سے رجعت پسند گروہ کے ہوتے تھے اور پڑھے لکھوں کی واحد جماعت ہونے کی وجہ سے یہ اس حیثیت میں ہوتے تھے کہ اپنے تعصبات کو آنے والی نسلوں تک پہنچا سکیں۔[51]

حوالاجات

1- وہ اور اس کا بھائی کرامیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ غزنوی ابو حنیفہ کے پیرو تھے۔ منہاج، ص۔ 77۔
2- راج درشنی، صفحہ ذیل 45 بی۔
3- م۔ بہ۔ ٹائیٹس: انڈین اسلام، ص ص۔ 15۔ 35۔
4- تاج المعاصر، صفحہ ذیل 175 بی۔
5- کننگھم: رپورٹس، XXI، ص ص۔ 25، 58، 59 اور 71۔ 79
6- تاج المعاصر، ص۔ ذ، 69 بی، 123 اے، 126 بی، فخر مدبر: تاریخ، ص۔ 24۔
7- ص۔ 176۔
8- کتبہ دیکھیے ایپی گرافیا انڈو مسلمکا، 1911 ۔ 1912، ص۔ 13۔
9- کننگھم: رپورٹس، XI، ص۔ 1۔
10- ہسٹری اینڈ کلچر آف دا انڈین پیوپل، V، ص ص 70 اور 99۔
11- منہاج، ص 124۔ 125۔
12- کننگھم رپورٹس، XXI، ص۔ 94: الیٹ: کرانکل آف اناؤ، ص۔ 88۔
13- بہرائچ گزیٹر، ص۔ 120 ۔ 121 ۔
14- دیکھیے الیٹ: کرانکل آف اناؤ، ص ص۔ 94۔ 95 ۔
15- دیکھیے برنی، ص۔ 41 مبارک التتمش کے دربار میں ایک پائے کے عالم سید مبارک غزنوی کی اس تقریر کے لیے جس میں انھوں نے ایک مسلمان بادشاہ کے فرائض کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

16- ایضاً، ص 72 اور 74 - 75۔

17- رپورٹس: i، ص- 206۔

18- 1666ء میں فرانسیسی سیاح تھیونو وہاں گیا اور اس نے اس کا حال قلم بند کیا ہے
کننگھم: رپورٹس، v، ص ص- 114 - 119۔

19- رپورٹس آف آرکیالوجکل سروے آف انڈیا، 1909- 1910 ص- 131۔

20- فتوحات فیروز شاہی، رشید، ص- 9 - 10۔

21- فتوحات، ح- س، ص- 10۔

22- رپورٹس آف دَ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، 1923- 1924، ص- 92۔

23- برنی، ص- 217۔

24- ایضاً، ص ص- 41 - 42۔

25- راحلہ، ii، ص- 16۔

26- مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تاج المعاصر، ص- ذ، 126، 162، 175 کول کی فتح اور انہلواڑہ پر حملہ جہاں "پچاس ہزار کفار کو تہہ تیغ کر دیا گیا" کالنجر میں "پچاس ہزار غلامی کے بندھن میں پکڑے گئے۔" م- ب- آخری واقعہ کے بارے میں، فرشتہ i، ص- 63- جس کا بیان ہے کہ ان سب کو مسلمان بنایا گیا، لیکن حسن نظامی کا بیان بالکل صاف ہے کہ اُن کو قلعہ خالی کر کے آزادی سے نکل جانے کی اجازت دی گئی، صفحہ ذیل- 174 بی

27- مثال کے طور پر فخر مدبّر: تاریخ، ص 28، منہاج نے 1204 میں اُن کے خلاف کیے گئے فوجی اقدامات کو جہاد بتایا ہے- ص- 124 - 1246ء کے بیان میں بھی ان کا ذکر کافر ہی کے نام سے کیا گیا ہے، ص- 290 آرنلڈ کے اس نکتے پر پریچنگ آف اسلام، ص ص- 280- 282 اور ویدیا (VAIDYA)؛ ڈاؤن فال آف ہندو انڈیا، iii، ص 130 دیکھئے اور اپنڈکس سی، بھی ملاحظہ کیجیے۔

28- بزرگوں کے تبلیغی کاموں کے لیے دیکھیے، آرنلڈ پریچنگ آف اسلام، ص ص- 280- 282- کہا جاتا ہے کہ فروز الدین شکر گنج نے پنجاب کے متعدد قبیلوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ سخی سرور نام کے ایک بزرگ کی جالندھر اور ہوشیار پور ضلعوں میں

سبھی بڑی عزت کرتے ہیں اُن کا مقبرہ ڈیرہ غازی خان میں ہے، دیکھیے جھنگ ڈسٹرکٹ سٹلمنٹ رپورٹ، 1874 ص۔ 33. مانٹگمری ڈسٹرکٹ سٹلمنٹ رپورٹ، 1874 ص ص۔ 44۔ 46۔ ہوشیار پور سٹلمنٹ رپورٹ 1879 ص۔ 31۔ 30 ہوشیار پور سٹلمنٹ رپورٹ، ص۔ 30 اجمیر میں معین الدین چشتی کی سرگرمیوں کے بیان کے لیے دیکھیے اخبار الاخیار، ص ص۔ 22۔ 24، فتح سے پہلے انھوں نے جو کچھ تبدیل مذہب کیے اُن کا بیان اورنٹیل مینسکرپٹس اِن دَ برٹش میوزیم، 1756 ص۔ ذ، 66۔ 67 اور 69 اے میں موجود ہے۔ اُن کے ذریعے دہلی میں ہندوؤں کی پہلی ٹولی کے مسلمان کیے جانے سے متعلق بیان کے لیے دیکھیے اورنٹیل مینسکرپٹس اِن دَ برٹش میوزیم 1746 صفحہ ذیل 29 اے۔ بنگال میں جلال الدین تبریزی کے بیان کے لیے دیکھیے سیر العارفین صفحہ ذیل 193۔ اُن کا انتقال 1245ء میں ہوا اور مالدہ میں اُن کے مقبرہ کو سبھی مقدس مانتے ہیں۔ سنسکرت کی دلچسپ تصنیف شیکا شبھودیا کا انگریزی مقدمہ بھی دیکھیے، جس میں اس بزرگ کے لکشمن سین کے دربار میں جانے کا بیان ہے جس نے اُن کے کردار سے متاثر ہو کر اُن کو کچھ زمینیں دیں، بادشاہ کے ایک درباری نے سلام قبول کیا۔

29۔ اخبار الاخیار، ص۔ 47۔

30۔ فوادالفواد، صفحہ ذیل۔ 94 بی

31۔ شرما: ریلجس پالیسی آف مغل ایمپررس، ص۔ 26۔

32۔ برنی، ص ص۔ 120۔ 157۔

33۔ فتوائے جہانداری، صفحہ ذیل۔ 120 اے۔

34۔ ایضاً، ص۔ 120 بی۔

35۔ ایپی گرافیا انڈیکا، xii ص۔ 44 جرنل آف دَ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین 1897، ص۔ 893۔

36۔ اعجاز خسروی، ص ص۔ 107 بی۔ 110 اے۔

37۔ تاریخ مبارک شاہی ص۔ 57 برنی، ص۔ 210۔

38۔ کھوکھر شہزادی سے منگبرنی کی شادی ایک ابتدائی واقعہ ہے، جوینی، II، ص۔ 145۔

39۔ دیکھیے۔ مرزا: لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو، ص ص۔ 182۔ 185۔

40- فوادالفوائد، صفحہ ذیل۔ 125 اسے

41- عفیف، ص۔ 370 ۔

42- ان کی ہندی تصنیفات سے چند کے لیے دیکھیے، محمد حسین آزاد، آب حیات، ص ص۔ 70- 77 مرزا بھی دیکھیے: ح۔ س، ص۔ 227 ۔ 228 ؛ خسرو کی ہندی گوییتا بھی دیکھیے زبان کے معاملے میں آپسی لین دین کا اندازہ خود منہاج کی تحریر سے ہو جاتا ہے۔ اس نے ص۔ 252 پر ہندوستانی مہینہ اساڑھ (ASAR) کا استعمال کیا ہے۔ پیل (PIL) اور دبیر (DIBIR) کی فارسی اصطلاحات ہندو بھی غالباً استعمال کرتے تھے۔ دیکھیے، جرنل آف دی ڈپارٹمنٹ آف لٹرس کلکتہ، XVI، ص۔ 35-

43- البیرونیز انڈیا، ترجمہ ای۔ سچاؤ، ا، ص۔ 22-

44- اگر ترکسا ڈنڈا کو گڑھوال سلطنت میں بسنے والے ترکوں پر عائد کیا گیا عام محصول مان لیا جائے تو یقیناً ہندوستانی بھی اس سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ بائزنٹائن سامراج میں بھی کسی نہ کسی قسم کا عام محصول وصول کیا جاتا تھا، دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جزیہ پر مقالہ۔

45- عفیف، ص ص۔ 382 ۔ 384 ۔

46 ایپی گرافیا انڈو مسلکا، 1913ء۔ 1914ء ص ص۔ 35 ۔ 45

47- ایپی گرافیا انڈکا، xii ص۔ 23 ۔

48- پروش پر کشا، گریرسن کا تعارف، جس کا حوالہ قریشی میں ہے۔ ح۔ س، ص۔ 213-

49- تاریخ فیروز شاہی، ص ص 42 اور 72 اور اس کی فتوی جہانداری، ص۔ ذ، 118- 120-

50- ایضاً، ص۔ 120 اسے

51- اس مسئلہ پر دیکھیے ری ویلوشن آف دی لٹریری سورسز آف پری مغل ہسٹری : اسلامک کلچر میں، 1941ء، ص۔ 207 ۔ 216

سترھواں باب

ماضی کے واقعات پر ایک نظر

ترکوں نے حیرت انگیز تیزی سے پندرہ سال کے اندر اندر سارے شمالی ہند پر قبضہ کر لیا تھا۔ مشرقی صوبوں پر معزالدین کی فرمانروائی جس آسانی سے قائم ہوئی تھی اس کا واضح سبب موجود ہے تاریخ کے ابتدائی دور سے وسط ایشیا کی طرف سے ہونے والے حملوں نے اس علاقے کے لوگوں کے نسلی اور مذہبی احساسات کو بڑی حد تک ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اس لیے غزنوی اور شنسبانی حملوں کو سیاسی مخالفت کے علاوہ کسی اور چیز کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ہندوستان میں بھی جہاں عام طور پر خارجی حملوں اور موروثی سلاطین سے زیادہ سابقہ نہیں پڑا تھا۔ طاقتور سلطنتوں کو بھی اتنی ہی آسانی سے شکست دے دی گئی تھی۔ اس کے باوجود آنند پال اور ترکلوچنا پال (TRICLOCHANPAL) کے تحت وے ہند (WAI HIND) کی ہندو شاہیوں نے محمود غزنوی کی مخالفت کو بڑی حد تک قائم رکھا تھا۔ پہلی ہی جنگ کی شکست کا فیصلہ کن اور ناقابلِ تلافی ہونا اس وقت اور زیادہ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے جب ہم فاتحین کی قلیل تعداد اور اُن کے وطن کی دوری کو دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم سنجیدگی سے ہندوستان کی صورت حال کا تجزیہ کریں تو بعد میں ہونے والا واقعات ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندو بادشاہتیں آپس میں مسلسل اس طرح لڑ رہی تھیں جیسے یہ ان کا فرصت کا مشغلہ ہو۔ چوہان، چندیلیا، گہاڈوالا اور سین

حکمراں، ایک دوسرے کی قیمت پر اپنے اپنے اقتدار اعلیٰ اور علاقائی توسیع کے لیے جنگ آزما تھے۔ بدیسی دشمن کے ہاتھوں کھائی ہوئی ایک شکست کو دوسرا اپنے لیے کارآمد اور مفید سمجھتا تھا۔ ایسی جنگوں میں فتح سے دراصل لڑنے کی طاقت میں اضافہ نہیں ہوا کرتا تھا کیوں کہ ان موقعوں پر فاتح صرف اپنے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا کرتا تھا اور ہارنے والے کو اگلی جنگ میں کسی بھی لڑنے والے فریق کا ساتھ دینے کی آزادی حاصل ہوتی تھی۔ اس طرح بجائے اس کے کہ کوئی قطعی فائدہ حاصل کیا جائے وہ محض اپنے وسائل کو منتشر کر دیتے تھے جہاں تک آدمیوں کے رائیگاں ہونے کا سوال ہے ہمیں اس کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو سپاہی آبادی کے صرف ایک ہی طبقے سے آتا تھا۔ راجپوت بادشاہوں کی لڑنے والی طاقت ایک دوسرے کے مقابلے میں عام طور پر ہم پلّہ تھی لیکن بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں، جو لڑنے والی پیشہ ور ذات کے پابند نہیں تھے اپنے تمام لڑنے والے عملے پر دباؤ ڈال کر اتنے ہی اور آدمی فراہم کر سکتے تھے۔ تعداد میں برتری حاصل ہونے کے غیر متزلزل یقین کی بنا پر وہ عام طور پر اپنی ساری فوج کو میدان میں اتار کر اپنا سب کچھ محض ایک جنگ کے فیصلے کے لیے داؤں پر لگا دیتے تھے۔ ان کی خودداری انھیں واپس لوٹنے کی اجازت نہیں دیتی تھی ان کے سپاہی یا تو جنگ میں ختم ہو جاتے تھے یا پھر قیدی بنا لیے جاتے تھے۔ اس لیے ایک واحد شکست ان کے لیے دائمی تباہی ہوتی تھی۔

لڑائی کی انفرادی صلاحیت کے اعتبار سے راجپوتوں کو ترکوں پر فوقیت حاصل تھی لیکن وہ اچھے منتظم تھے وہ وسیع تر مسائل کے مقابلے میں زیادہ تر اپنی انفرادی ناموری کے لیے لڑتے تھے۔ اولوالعزم اور حاسد فوجی سرداروں کو صرف بادشاہ متحد کر سکتا تھا۔ جنگ کے طریقوں میں بھی راجپوتوں کی صلاحیتیں خاص طور پر غیر ترقی پذیر تھیں۔ وہ داؤں پیچ اور نقل و حرکت کے مقابلے میں فوج کی تعداد کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ میدان کارزار کی ان کی ترتیب وہی پرانی فرسودہ طرز کی تھی ایک منجمد اور کسی حد تک نہ قابو میں آنے والی صف بندی۔ ہاتھیوں پر سوار اور فوج کے آگے پیدل چلنے والے تیر انداز۔ اُن کے کثیر تعداد والے سامنے کے حملے بڑے شدید ہوتے تھے اور ان کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ لیکن صف بستہ دستوں کے مقابلے میں اُن کے سواروں

کا رسالہ کچھ زیادہ کامیابی نہیں حاصل کر پاتا تھا۔ ہاتھی کو ایک زبردست ہتھیار کی سی حیثیت حاصل تھی لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میدان جنگ کی زمین ہموار ہو کیوں کہ اونچی نیچی زمین ہاتھی کو غیر مفید بنا دیتی تھی۔ تاہم یہی وہ زمین ہوتی تھی جہاں ترک خاص طور پر اپنے سواروں کے رسالے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے کیوں کہ پہاڑوں سے گھرے ہوئے علاقے اس کی نقل و حرکت کی آزادی میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ مثال کے طور پر معزالدین کی شکست اور چالوکیہ فوجوں کے آگے آبو کے نیچے کیادرا میں ایک کی گھبراہٹ کی وجہ، یہی اسباب تھے۔ ترکوں کے پاس شروع میں ہاتھی نہیں تھے وہ اپنے سواروں کے رسالے سے حملے کرتے تھے اور حملے کی شدت ہندو صف جنگ کو توڑ کر ہاتھیوں کو خود اُن کی فوج کی طرف موڑ دیتی تھی۔ راجپوتوں نے میمنہ یا میسرہ یا پشت سے کیے جانے والے حملوں کی روک تھام کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا اور جونہی شہسوار ان کی صفوں کو توڑ کر تیر اندازوں کو بیکار کر دیتے تھے۔ ہلکے پھلکے مسلح شہسوار ایسے نازک وقت میں ان کے دائیں اور بائیں بازو یا میمنہ اور میسرہ میں گھس کر جنگ کا فیصلہ کر دیتے تھے۔

ان حالات میں شکست پر تعجب کرنے کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ مزید مدافعت کی امید فوجی قلعہ بندیوں اور سارے ملک میں عوام کی مخالفت کو منظم کرنے سے ہوتی ہے۔ تاہم اول الذکر طریقے میں ایک خامی ہے۔ چوں کہ یہ بنیادی طور پر ایک مدافعتی طریقہ ہے اس میں فاتح کو دیہی علاقوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی آزادی حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ بار بار حملے کی تیاری کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ صرف وقتی اہمیت رکھتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے جب ہندو راج کماروں نے جارحانہ کارروائی کی ہو وہ صرف اس وقت مستعدی دکھاتے تھے جب دشمن اُن کے مضبوط اڈوں کے سامنے آپہنچتا تھا۔ دور اندیش پالیسی اختیار کرنے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس کی مثال مہاور چالوکیہ فوجوں نے دی تھی جب اُنھوں نے ایبک کو شکست دے کر اُسے پناہ کے لیے اجمیر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی دوسری مثال اڑیسہ کے نرسمہانے لکھنوتی کا محاصرہ کر کے دی تھی۔ حملہ آوروں کو باہر نکالنا صرف اُسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب ایسی جارحانہ کارروائیوں کو مسلسل اور متحد طور پر استعمال کیا جاتا۔ لیکن مقصد کی یک جہتی نے بھی راجپوتوں

پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ صدی کے آخری حصے میں چوہانوں نے مسلسل جارحانہ کارروائیوں سے نمایاں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن انھوں نے صرف فوجی ناموری حاصل کرنے کے لیے جنگ لڑی تھی۔ انھوں نے اسی طرح کی فوجی ناموری گجرات کے بگھیلاؤں اور مالوہ کے پرماروں کو شکست دے کر بھی حاصل کی تھی۔

مسلسل جنگ و جدال والے ملکوں کے عوام کی اکثریت عام طور پر جنگ کے نتائج اور سلطنتوں کی طرف سے بے حس اور سنگ دل ہو جاتی ہے۔ قومی احساس کی موجودگی مسلسل جدوجہد پر مجبور کرتی ہے لیکن اس احساس کی عوام میں اتنی ہی کمی تھی جتنی کہ حکمرانوں میں۔ ان کی بے تکلفی دونوں کے لیے یکساں تھی۔ چاہے ایک بادشاہ نے دوسرے بادشاہ پر اقتدار حاصل کر لیا ہو، یا ایک بادشاہ نے کسی حملہ آور کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہوں فرماں رواؤں اور سلطنت اور عوام کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ بیرونی حملے کا ان کے لیے صرف یہ مطلب تھا کہ سلطنت کی مسلسل تبدیلیوں میں ایک تبدیلی کا اور اضافہ ہو گیا جو عوام کو نہ تو بہتر بنائے گا اور نہ بد سے بدتر کرے گا۔

مسلمان دشمن کی موجودگی میں اس بے تکلفی کے قائم کر لینے کے اور بھی اسباب تھے۔ مسلمان کی حیثیت سے ترک ہندوستان میں اجنبی ضرور تھا لیکن نسلاً وہ نیا نہیں تھا کیوں کہ ہن اور ساکا کے غیر اہلِ کتاب ہونے کے رشتے سے اس کا ہندوستان سے صدیوں پرانا تعلق تھا۔ وہ یہاں تاجر بن کر اور سکونت اختیار کرنے کے لیے آیا تھا۔ اُس نے اپنی زبان، عادات و اطوار اور سماجی امتیاز کا بیشتر حصہ مذہب اسلام قبول کرنے کے بعد بھی قائم رکھا تھا، قرونِ وسطیٰ کے ہندو سماج کے الجھاؤ میں شامل ہونے کے باوجود اس نے فاتح کے لیے راستہ ہموار کیا تھا۔ شمالی ہند کے لوگوں کو ہلکے پھلکے اسلام کی آڑ میں چھپا ہوا ترک کا چہرہ مانوس چہرہ لگا۔ بلکہ کچھ راجپوتوں کو اس میں دور دراز کی رشتہ داری تک نظر آئی۔[4] اسی لیے ہندوستان میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کی حملہ آوروں سے مخالفت کی شدت پر نسلی ہمدردیوں کا پرتو تھا۔

راجپوت ہندوستان کی مذہبی تاریخ کا سب سے اہم عنصر برہمنیت کا احیا تھا۔ جس نے ہندو سماج کو جنگ جوئی کا سبق سکھایا تھا لیکن اسی کے ساتھ اپنی ایذا رسانی کی وجہ سے بدھ مذہب کے ماننے والوں کو الگ بھی کر دیا تھا۔ ان کو فاتت باہر کر کے ہندوستان

کے تمام حصوں سے بھگا کر نیپال میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہمارے پاس اس کی کوئی براہ راست شہادت نہیں موجود ہے جیسی کہ سندھ پر عربوں کے قبضہ کی ملتی ہے لیکن یہ بات بہت زیادہ قرین قیاس ہے کہ ذلیل سمجھے جانے والے بدھ اور ملک کے چھوٹے طبقے کے لوگوں نے برہمن سلطنتوں کے زوال پر زیادہ آنسو نہ بہائے ہوں گے۔ کم از کم مشرقی ہندوستان کے سلسلے میں ہمارے پاس تبت کے لاما ترانا تھ کے حوالے موجود ہیں جن میں ایسے "متعدد بدھ بھکشوؤں کا ذکر ملتا ہے جو لاونگ سینا (LAVANG SENA) کے زمانے میں قاصد بن گئے تھے۔ ترشکاؤں کا نام رُمون، تھا جو گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے 'انتر بیدی' (ANTARBEDI) پر حکمراں تھا۔ ترشکاؤں کی فوجوں نے یہاں آکر ملک کو تاخت و تاراج کیا اُودنتا پوری اور وکر ماسلا کو تباہ کر کے وہاں کے بہت سے راھبوں کو قتل کر دیا تھا۔" یہ ردّ عمل سیناؤں کی پالیسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ "جس کی فرماں روائی کے آغاز ہی سے مگدھ تک میں ترتھیکا (TRITHIKAS) (برہمن) ملیچھوں اور تاجکوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔" اور اس طرح بدھ خانقاہوں کی طاقت کو "سین" تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے[2]

دوسرے تمام بیرونی حملہ آوروں کی طرح ترکوں نے کم سے کم مزاحمت کی پالیسی اختیار کی تاکہ وہ اس سرزمین پر قدم جمائے رکھیں۔ ان کے پہلے ریلے نے انھیں ہمالیہ کے علاقے مدھیہ پردیش جنوبی راجپوتانہ اور آسام تک پہنچا دیا۔ لیکن وہ گنگا اور جمنا کے کنارے کی ایک مختصر پٹی پر دیرپا قبضہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسری طرف شمال مغرب میں سندھ اور اس کی شاخیں اُن کی سلطنت کی سرحدیں بنی رہیں۔ راجپوتانہ پر قبضہ کبھی مستحکم نہیں ہونے پاتا تھا اسی لیے صدی کے آخری حصّے میں ان کو اس خطہ سے تقریباً نکال پھینکا گیا۔ اس طرح شمالی ہندوستان کا ایک بہت ہی مختصر سا حصہ ترکوں کے قبضے میں رہا۔ لیکن یہ علاقے انتہائی زرخیز علاقہ تھا۔ اس لیے ہندو ریاستوں کے مستقل حملوں اور ہر طرف فتح کا جھنڈا گاڑنے والے منگولوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی مسلسل صلاحیت بیرونی حملہ آوروں میں قائم رہی۔

اس محدود علاقے کی فتح کو مستحکم کرنے میں تقریباً ایک صدی لگ گئی۔ چھوٹے ہندو سرداروں نے دہلی کی حکومت کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ مسلم آبادکاری کی سختی سے مزاحمت

کی گئی۔ کوئی بھی اولوالعزم سردار، وہ چاہے ہندو ہو یا مسلمان لڑنے والوں کو جمع کرکے بغاوت پر آمادہ کرلیتا تھا۔ صدی کے آخر تک نظم ونسق کا محکمہ تکمیل کی حدود سے بہت دور تھا۔ قبضہ کی فوجی نوعیت بدل چکی تھی کیوں کہ ابتدائی مہاجرین کی جگہ اُن لوگوں نے سنبھال لی تھی جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے یہاں کی دیسی زبانیں بولتے تھے اور ملک سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ترکوں کو ہندوستانی بنانے میں منگولوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ کیوں کہ انھوں نے ترکوں کے لیے ہندوستان کو آخری پناہ گاہ بنا دیا تھا اور اسی لیے انھوں نے اتنی ہی شدت سے اس کی مدافعت کی تھی جتنی کوئی اپنے وطن کی کرسکتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ سلطنت بنیادی طور پر بیرونی لوگوں کی مسلط کی ہوئی تھی۔ لیکن وہ بہت جلد مقصد اور جدوجہد کے اعتبار سے ہندوستانی ہو چکی تھے۔ ہندوستان کی تاریخ وحشیانہ حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد سے بھری ہوئی ہے۔ منگولوں کا مقابلہ کرکے ترک مسلمان دراصل باب ہند کی حفاظت کر رہے تھے اسی لیے ہندوشاہیوں اور چوہانوں کی مانند وہ بھی ہندوستانی راج کماروں کے احسان مند ہونے کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔

فتح کی وجہ سے جو حکومت وجود میں آئی تھی اس کی تشکیل عجیب وغریب قسم کی تھی رنگ ڈھنگ کے اعتبار سے اس میں قبائلی طرز حکومت اور مقدس طور پر متعین کی ہوئی بادشاہت کا امتزاج تھا۔ طرز حکومت کا یہ انداز ہندوستانیوں کے لیے یہ ایک انوکھی بات تھی کیوں کہ ہندوسیاسی نظریہ کے اعتبار سے بادشاہ یا تو ملکوتی انتخاب کی بنا پر یا پھر اقرار نامے کے تحت حاصل کیے ہوئے اختیارات کی بنا پر حکومت کرتا تھا۔ اور دونوں صورتوں میں اس کی حیثیت سماج کے عام افراد سے بالاتر ہوتی تھی[۸] لیکن ترکوں کے لیے حکومت ایک مشترکہ جائیداد کی مانند تھی جس میں ہر شخص کو مالکانہ ساجھے داری حاصل تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی "خان"[۹] تخت پر بیٹھنے کے لائق ہوتا تھا بشرطیکہ وہ دوسری تمام شرائط پر پورا اترتا ہو۔ مثلاً یہ کہ وہ قابلیت رکھتا ہو اور جواز بھی موجود ہو۔ تاج شاہی کو حاصل کرنے کی کشلو خاں کی کوشش یہ ثابت کرتی ہے کہ اس اصول پر درحقیقت عمل بھی ہوتا تھا۔ ترک چوں کہ اپنی سلطنت کے نظم ونسق میں خود اپنا حصہ کھوتے جارہے تھے اس لیے وزیر مہذب الدین کو قتل کردیا گیا تھا۔

درحقیقت مملوک سلطنت نسلی کردار گہرائیوں میں چھپے ہوئے اسی سیاسی تصور سے ابھرا تھا۔ سلطنت میں حصہ لینے کے خیال نے مادّی طور پر اس نسل کے لوگوں کی کہاں تک انفرادی طور پر مدد کی اس کا اندازہ فخرالدین مبارک شاہ کی ہم عصر تحریروں کی ایک عبارت سے ہوتا ہے ''یہاں تک کہ ایک غریب گھر کا آدمی جس کے پاس ایک بھی غلام نہیں تھا معزالدین کی عظیم فتح کی وجہ سے متعدد غلاموں، گھوڑوں اور اونٹوں کا مالک بن گیا۔ ایک ایسا آدمی جس کے پاس ابتداء میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ سپہ سالار بن گیا اور اب اس کے پاس نقارہ تھا۔ سپہ سالاری کا جھنڈا اور نوبت تھی۔[5]

تاہم اس طرز حکومت کا ایک اور بھی پہلو تھا۔ ترکوں کو ہندوستان آنے اور حکومت کرنے میں جتنا وقت لگا اس میں ان لوگوں پر ایران کے سیاسی اور تہذیبی تصوّرات کا بہت زیادہ اثر پڑ چکا تھا۔ اب وہ سیاسی معاملات میں رہبری کے لیے مسلم شریعت سے زیادہ جمشید، خسرو اور بہرام جیسے قدیم شہنشاہوں کی طرف دیکھتے تھے۔ شخصی یا استبدادی طرز حکومت جو ایران کے سیاسی نظام کی بنیاد تھا کے معتقدین دہلی میں بھی پائے جانے لگے۔ منتخب کیے ہوئے امام کو تقریباً بھلا دیا گیا اور اس کی جگہ حکومت کے اختیارات سلطان نے لے لیے تھے جن پر کبھی اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ خدا کا منتخب کیا ہوا تھا اور بنی نوع انسان پر حکومت کرنے کے لیے اسی نے اس کا تقرر بھی کیا تھا۔ اس سے قطعی وفاداری کا مطلب خدا سے وفاداری کے مترادف تھا۔[6] سلطان کی ذات اگر معصوم نہ بھی ہو اس کا عہدہ یقیناً تمام انسانی کمزوریوں سے مبرا ہوتا تھا۔ تمام لوگ اس کے غلام ہوتے تھے اور وہ ان کی جان مال کا مالک۔ تیرھویں صدی کے ابتدائی حصے میں ایک مصنف نے بادشاہ کے مقابلے میں عوام کی حیثیت کی اس طرح تعریف کی تھی ''مسلمانوں کو امام کے انتخاب میں اپنے اختیارات استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ انھیں صرف اس کا حکم ماننا ہوتا تھا چاہے وہ حبشی ہو یا غلام ہو یا پاجی ہو۔''[7] اس کے احکام کو ماننا ''فرض'' سمجھا جاتا تھا[8] اور سلطان، اگر خدا نہیں تو کم از کم ''زمین پر خدا کا سایہ ضرور ہوتا تھا۔'' اس کی شخصیت اور ذات کو مقدس سمجھا جاتا تھا اور مورخ کو جب بھی اس کا ذکر کرنے کا موقع ملتا تھا وہ اس کی شان میں ''جلیل القدر'' اور ''واجب التعظیم'' کے لفظ استعمال کرتا تھا۔[9] برنی

نے تو فیروز تغلق کو "انسانی پیراہن میں خدا" کہا تھا اور اس کے دربار کا مقابلہ "حضرت جبریل اور دوسرے فرشتوں کی معیت میں اللہ تعالیٰ" سے کیا تھا[۹۵]

تاہم اس تقدس میں بادشاہ کی اولاد شریک نہیں تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ملکوتی بادشاہت کے نظریہ پر ہندوستان میں نامکمل طور پر عمل ہو رہا تھا۔ فرماں روا بادشاہ کا لڑکا چاہے وہ ولی عہد ہی کیوں نہ ہو، صرف ایک درباری ہوا کرتا تھا[۱۱] بادشاہ کا اقتدار مسلّمہ ہوتا تھا لیکن اس کی اولاد کے لیے اس قسم کے اقتدار کا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت کے لیے بادشاہ کے قطعی حق کو اس کی موروثی سلطنت کے لیے جزو لاینفک نہیں بنایا جاسکا تھا۔ اس قطعی حق کو انفرادی طور پر حاصل کرنا پڑتا تھا۔ موروثی ابتدائی بادشاہت کے نشوونما کے لیے خلف اکبر کے قانون کی عدم موجودگی ایک اور موافق وجہ بن گئی تھی کیوں کہ شریعت میں تمام لڑکوں کو یکساں حصہ ملتا تھا۔ عام طور پر مسلمان بادشاہ کے کئی حقدار وارث ہوتے تھے اور ان میں سے اکثر اپنا حق جتانے کے لائق بھی ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ مرحوم بادشاہ کی نامزدگی بھی آخری انتخاب کا فیصلہ نہیں کرسکتی تھی۔ غلاموں کو بھی وراثت کا حق حاصل ہونے کی وجہ سے جانشینی کا مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہوگیا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ براہ راست وارثوں کی فوقیت کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ تاج شاہی کو ملکوتی درجہ حاصل ہونے کے باوجود انتقال ملکیت کے غیر متعین طریقوں نے وراثت کے تسلسل میں روڑے اٹکا دیئے تھے۔

یہ واضح طور پر غیر اسلامی فرماں روائی صرف نظریوں تک ہی نہیں محدود تھی بلکہ اس کا مکمل اظہار دربار کے آداب اور بادشاہ کی قطعیت اور افضلیت میں بھی ملتا تھا۔ بلبن کے دربار کی رسموں کا ہم اس سے پہلے حوالہ دے چکے ہیں۔ زمین بوسی اور پابوسی کی رسوم انتہائی سختی سے عمل کرایا جاتا تھا۔ یہ سب وہ طریقے اور رسمیں ہیں جنھیں پیش روؤں نے بھی جاری رکھا تھا۔ آسمانی یا ملکوتی اعزاز کے یہ مفروضے ایسے نہیں تھے جن پر کبھی اعتراض نہ کیا جاتا ہو۔ التمش کے دربار کے ایک مذہبی رہنما نے کھلے الفاظ میں ان رسوم پر لعنت ملامت بھیجی تھی اس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ یہ رسمیں مشرک (خدا کی وحدت سے انکار) کے مترادف ہیں۔ لیکن ایسے تمام احتجاجوں کی طرف

سے آنکھ بند کی جا سکتی تھی اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ یہی مذہبی رہنما ان رسوم کو جاری رکھنے کی منظوری صرف اس صورت میں دے سکتے تھے کہ بادشاہ "دین پناہی" عقیدے اور ایمان کو قائم رکھنا) کی چار ضروری پابندیوں پر عمل کرے۔ اور ان میں سے ایک تھی بدعت کو دبانا[12]

بظاہر اس قسم کی قطعیت، اوپر ذکر کیے جاتے والے قبائلی نظام حکومت کے سخت منافی معلوم ہوتی ہے۔ التمش جیسے با اختیار آدمی نے بھی جس کی تخت نشینی کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ ایبک کے بعد ترک افسروں میں سب سے زیادہ با اثر آدمی تھا، آخر الذکر طرز حکومت کو رائج ہونے سے روک دیا تھا۔ اس کی جنگی پالیسیوں نے س سلسلے میں اس کی مدد کی تھی کیوں کہ اس نے تمام ساتھیوں کی طاقت کا رخ موڑ دیا تھا اور جب متعدد ممتاز شہزادے منگولوں کے پنجے سے چھوٹ کر اس کی سلطنت میں پناہ لینے کے لیے بھاگ آئے تھے، تو سارے مخالف تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ خلیفہ کے اعزاز نے اس کی مطلق العنانی کو قانونی منظوری کے پردے کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ اور اُسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ بادشاہت کو اپنے خاندان کے لیے محفوظ کر سکے۔ لیکن اس کی موت کے بعد وراثت کو قائم رکھنے کے لیے کسی جماعت کی مسلسل حمایت کی ضرورت تھی۔ یہ جماعت اس نے اپنے غلاموں میں بنانا چاہی اور اس طرح سیاست کے میدان میں ایک تیسرا عنصر نہ صرف داخل ہو گیا بلکہ اُس نے اس پورے عہد کو ایک امتیازی حیثیت بھی دے دی۔ اولادوں کے مقابلے میں ایک غلام اپنے آقا کا زیادہ وفادار ہوتا تھا۔[13] جیسا کہ لین پول (LANE POOLE) نے لکھا ہے کہ غلام پر داؤں لگانا بیٹے کے مقابلے میں زیادہ یقینی ہوتا تھا کیوں کہ وراثت پر بیٹے کے دعوی کی بنیاد قابلیت پر نہیں ہوتی تھی[14] زیادہ اولادیں بادشاہ کے مفاد کے خلاف ہوتی تھیں جبکہ کچھ آزمائے ہوئے اور قابل غلام یقینی اثاثہ کی طرح ہوتے تھے جن کا مفاد صرف آقا کے خاندان کی خدمت سے وابستہ ہوتا تھا۔[15] التمش کو اپنی اولادوں کی صلاحیتوں کے بارے میں کوئی وہم نہیں تھا اس لیے مخالف رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی راستہ کھلا نظر آتا تھا اپنے ذاتی خادموں کی جماعت تیار کرنا جو وقت آنے پر اس کے خاندان کا ساتھ دے اور اس طرح اس کی قطعی استبدادی حکومت

قائم رکھ سکے۔ اسی لیے معزی اور قطبی غلاموں کی طرح شمسی غلاموں کو بھی اپنی سیاسی جماعت بنانے کی اجازت دی گئی جسے اس کی موت کے بعد "چالیس" کا نام دیا گیا[16] سابق بادشاہوں کے حمائتیوں کو اپنا کر یا تباہ کر کے وہ اس کی موت کے بعد اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ برنی کے الفاظ میں "انھوں نے آپس میں سلطنت کو تقسیم کر لیا[17]"

اس طرح ایک عجیب و غریب سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ غلاموں کی ایک ایسی جماعت تھی جس نے آقا اور اس کے خاندان کی طاقت کو برقرار رکھنے کا حلف اٹھا رکھا تھا۔ ایک ایسی جماعت جو سلطنت کو ایک وسیع خاندان سمجھتی تھی جس کے دروازے باہر سے آنے والوں کے لیے بند تھے۔ اس طرح سلطنت کو ایک قسم کی خاندانی طرز حکومت کی شکل دے دی گئی تھی۔ اپنے آقا کے وارث کی جگہ انھوں نے خود ہی ساری حکومت کا انتظام کیا اور اپنے کو التمش کی روایت کا واحد نگہبان سمجھنے لگے۔ اس کے ناخلف جانشینوں کو کسی وقت بھی الگ کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ بلبن نے کیا بھی۔ لیکن جب تک جماعت قائم رہی۔ انھوں نے التمش کے بچوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح تخت پر قائم رکھا۔ اسے محض اس ڈر سے کہ کہیں "چالیس" کی آپس کی رقابت ترکوں میں عام بغاوت کی آگ نہ پھیلا دے۔ ان کے وجود کا واحد مقصد التمش کے خاندان سے وفاداری تھی۔ اس طرح کنبہ کی اس جماعت نے بادشاہت کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے دراصل موروثی سلطنت کو زندہ رکھا۔ دوسری طرف اس کا ایسا ہی اثر حکومت کی قدرتی نشو و نما پر پڑا۔ کیوں کہ اس طرز حکومت کو نہ تو عوام سے طاقت اور سہارا مل سکتا تھا اور نہ ترکوں ہی سے اس کی طاقت اور حمایت کا باعث صرف کچھ با اثر لوگ اور بانی موروثی سلطنت کے رکھیل ہو سکتے تھے۔ اس نے تو تاج شاہی کی حدود تک متعیّن کر دیے تھے۔

تاہم بلبن کے 'نائب' ہوتے ہی سلطنت کی نشو و نما کا یہ دور دھندلانا شروع ہو گیا حالانکہ محمود کی ترقی اسی طرز حکومت کو جاری رکھنے کے خیال سے کی گئی تھی لیکن حقیقت میں یہ آغاز ہی اس کا انجام ثابت ہوا۔ التمش کے سیاسی تصوّرات سے بلبن ضرور متفق تھا لیکن وہ اس بات سے متفق نہیں تھا کہ تاج کی مطلق العنانی کے لیے خاندان کے غلاموں کی پشتہ بندی ضروری ہے اور نہ وہ رضیہ کے اس طریقہ کار کا حمایتی تھا کہ "چالیس" کا مقابلہ

کرنے کے لیے غیر ترکوں کا سہارا لیا جائے۔ اپنی نیابت کے طویل دور میں اس نے اس جماعت کو بالکل ختم کرکے "تاج" کے اختیارات کو بحال کر دیا تھا۔ اور پھر محمود کی جگہ خود تخت شاہی پر بیٹھ کر اس نے شمسی جماعت کو مکمل طور پر ختم کر دیا تھا۔ بلبن نے اس جماعت کو ختم کرنے کے بعد سلطنت کی بنیاد کو وسیع کرنے کے لیے تمام ترک مہاجرین کو ساتھ لینے کی کوشش کی تھی۔ ایسا کرنے کے لیے اس نے بلاشبہ سلطنت کے اقربا پرست کردار کو اہمیت دی لیکن اس نے تاج شاہی کے لیے جو بے نظیر استبدادی اختیارات حاصل کر لیے تھے انھوں نے اس کو مخالف سیاسی جماعت کی شکل نہیں اختیار کرنے دیا۔ نئی جماعت چونکہ مکمل طور پر ترکوں کی تھی اس لیے ظاہر ہے کہ وہ بلبن کے خیالات سے متفق اور نسلی مطلق العنانی کی نمائندگی کرنے والے اس شاہی سلسلے کو قائم رکھنے کی قطعی حامی تھی۔ چنانچہ اس طرح بلبن نے قوم پرست وفاداری کے جذبے کو بڑی ہوشیاری سے اپنی مطلق العنان حکومت کی خدمت پر لگا دیا گیا۔ یہ نسل پرستی کیسے ناقابل عمل ہو گئی اور اس کی وجہ سے کیوں انقلاب آیا۔ اس کا ذکر ہم متعلقہ باب میں کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود بادشاہت پر اس افراتفری سے کوئی آنچ تک نہیں آئی بلکہ اس کو خلجیوں نے سلطنت کی نشوونما کے ایک نئے دور کے آغاز کے لیے استعمال کیا۔

"غلام بادشاہ" غالباً ایک ایسی اصطلاح ہے جو خود اپنی تردید کرتی ہے اس جگہ اس کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اسلام میں "غلام" کے لیے بڑی امکانی طاقت موجود ہے۔ کیوں کہ نام کے علاوہ اسے کسی قسم کی سماجی معذوری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ کسی غلام کا یا کسی آزاد شخص کا تاج شاہی پہنتا کوئی مخصوص مسلم عجوبہ نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کی متعدد مثالیں بیزنطینی تاریخ میں ملتی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ تیرھویں صدی کے ہندوستان میں تاج شاہی پہننے والے ترکوں کو مشکل ہی سے غلام کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ سب ہی آزاد افراد کی طرح مرے تھے۔ صرف ایک ایک ایسا آدمی تھا جو لاہور میں اختیارات سنبھالنے کے وقت نظریاتی طور پر غلام تھا۔ لیکن اس نے بھی فوراً ہی اپنے آقا کے وارث غیاث الدین محمود سے آزادی کا پروانہ حاصل کر لیا تھا۔[18] ایبک کے غلامی سے رہائی پانے سے پہلے ہی التتمش نے بالکل ابتدائی دور میں غلامی سے اپنی آزادی حاصل کر لی تھی۔[19] اس میں شبہ نہیں کہ آزادی ایک بڑی نعمت تھی لیکن

یہ سب سے بڑی سند نہیں تھی۔ بہت سے رواج پسند وکلاء کو مطمئن کرنا مصلحت اندیشی کی بات تھی۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن سے توقع کی جاتی تھی کہ مسند پر بیٹھ کر ایمان کا محافظ اور مسلمانوں کا محافظ فرماں روا" کے نام کا اعلان کریں۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ التتمش کی تاج پوشی پر وفاداری اٹھانے کی تعریف پر، اس سے پہلے کہ جلسہ میں شرکت کرنے والے لوگ وفاداری کا اعلان کرتے، وکلاء بادشاہ کی موجودگی میں اُس کے سامنے آکر بیٹھ گئے تھے۔ بادشاہ جانتا تھا کہ یہ وکلاء کیا بات کرنا چاہتے ہیں اس لیے اس نے قالین کا ایک کونہ اٹھا کر غلامی سے رہائی کی دستاویز ان کے سامنے پیش کر دی تھی۔[20] بلبن کے غلامی سے رہائی حاصل کرنے کا کوئی واضح بیان موجود نہیں ہے لیکن فرماں روا خاندان سے قریبی خاندانی تعلق ہونے کی وجہ سے یہ رہائی یقیناً حاصل کر لی گئی ہوگی۔

روزنامچہ نویس ہمیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ سلطنت صحیح معنوں میں اسلامی حکومت تھی اور مسلسل اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ اس کی پالیسیوں کی بنیاد شریعت کے مطابق ہو۔ پچھلے کچھ ابواب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ بادشاہت کا غیر اسلامی کردار ہمارے سامنے ہے۔ برنی نے تسلیم کیا ہے کہ بادشاہت دراصل دنیاداری کی ایک مکمل تصویر تھی جو دین داری کے بالکل برعکس ہے۔[21] اسلام میں غیر اہلِ کتاب بادشاہت کے بتدریج داخل ہونے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ فرماں روائی اُس وقت تک ممکن ہو نہیں سکتی جب تک کہ غیر اسلامی رواجوں پر عمل نہ کیا جائے۔[22] با اصول مذہبی علماء اپنے کو یہ کہہ کر دھوکہ دے سکتے ہیں کہ بادشاہ کا وجود درحقیقت ایمان کی حفاظت اور شریعت پر عمل درآمد کے لیے تھا۔ لیکن اس جگہ یہ اہمیت جتانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے کہ بادشاہ کی ہر کارروائی کا آخری فیصلہ کرنے میں سب سے بڑا عنصر طاقت اور مصلحت کے اصول کا ہوتا تھا۔ بادشاہت کی اصلیت اور فطرت کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے برنی آخر لکھتا ہے "بادشاہت کا مطلب ہوتا ہے طاقت (استیلا) چاہے وہ قانونی طریقوں سے حاصل کی گئی ہو اور چاہے طاقت کے ذریعے یہاں تک کہ غیر اہلِ کتاب کے قدیم موروثی بادشاہت کے اصولوں کے لیے موجودہ بادشاہت میں کوئی جگہ نہیں تھی۔[23] عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں شریعت کو عام قانون سے زیادہ اہمیت نہیں حاصل تھی۔ برنی یہ تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کو پھانسی دینے کی سزا

شریعت کے مقدس قانون کے خلاف تھی لیکن پھر بھی بہتر حکومت کی ناگہانی ضروریات کے لیے ضروری تھی۔[25] اس طرح وراثت کا قانون، حلال اور حرام کی واضح تفریق اور دوسرے جانے بوجھے امتناعی احکامات کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ علماء ان کے خلاف احتجاج کرتے تھے لیکن بالآخر ان کے جواز کے لیے بہانہ تلاش کرکے خاموش ہوجاتے تھے شریعت میں روپے کے لین دین پر سود لینے کی پابندی کو کھلم کھلا نظرانداز کیا جاتا تھا امیر خسرو نے ایک ٹنکہ کی اصل رقم پر ایک جیتل فی مہینے کے سود کا ذکر کیا ہے۔ جو فریقین کی رضامندی پر تحریری دستاویز کی شکل میں ہوتا تھا۔ اس دستاویز کو قانونی منظوری حاصل تھی اور قاضی عمل درآمد کراتا تھا۔[26] برنی بادشاہ کو چار نصیحتیں کرتا ہے جو اُسے فرمان (ضابطہ) جاری کرتے وقت اپنے دماغ میں رکھنا چاہئیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ اگر مجوزہ احکامات میں سے کوئی ایک بھی شریعت کے خلاف ہو تو اُسے واپس نہ لینا چاہیے بلکہ ایک ضروری برائی کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اتنے ہی عرصہ کے لیے نافذ کرنا چاہیے جب تک کہ اس کی ضرورت ہو۔[27]

علماء یعنی شریعت کے محافظوں کی اکثریت خیالات کے اعتبار سے انتہائی مادیت پرست اور کردار کے حساب سے موقع شناس تھی وہ غیر مذہبی حکام سے ناجائز سمجھوتے کرتے تھے اور شریعت کے اصولوں کو توڑ مروڑ کر بادشاہ کی غیر اہلِ کتاب حرکتوں کا جواز تلاش کرلیتے تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی مطلق العنانیت کو اخلاقی سہارا دینے کے لیے وہ پیغمبر کی حدیثوں کو گھڑ لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان کا عملہ پیغمبر سے بہت تھوڑا سا نیچے اور اس کی پاک دامنی تقریباً خدا کے برابر تھی۔[28] سلطان کی سہولت کے مدنظر اس کے مذہبی کام صرف نماز پڑھانے اور علماء اور مذہبی اداروں کو اوقاف اور اعزاز دینے تک محدود رکھے گئے تھے۔ لیکن شراب نوشی اور روزے نہ رکھنے کے قسم کی شریعت کی صریحی خلاف ورزیوں سے چشم پوشی برتی گئی تھی۔[29] یہاں تک کہ علماء نے اسے اپنی مرضی کے مطابق دوسرے کی دولت پر قبضہ کرنے تک کا اختیار دے دیا تھا۔[30]

اس طرح علماء انتہائی غلام اور بداخلاق ہوچکے تھے۔ قابلِ نفرت خوشامد پسندی کا بیان منہاج اور برنی دونوں نے اپنے سرپرستوں کے سلسلے میں کیا ہے۔ ان کی شان میں کی جانے والی قصیدہ خوانی میں ایک نفرت پیدا کرنے والی چاپلوسی تھی۔ ان میں

تو بنیادی اخلاقی اقدار تک کا فقدان تھا۔ بلبن نے اُن میں سچائی اور ہمت کی کمی کی شکایت کی تھی لیکن امیر خسرو نے انھیں ایک ایسے گروہ سے تعبیر کیا تھا جو جاہل ریاکاروں پر مشتمل ہونے کے علاوہ شیخی باز، خود بیں اور قابل نفرت حد تک خود غرض تھا۔[31] یہ بدکرداری چھوت کی بیماری کی طرح تھی جو ایسا لگتا ہے کہ عام آدمیوں تک پھیل چکی تھی۔ امیر حسن نے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا ہے جس میں لاہور کے کچھ مسلمان تاجر نہایت بے باکی سے گجرات کے ہندوؤں کو دھوکہ دیا کرتے تھے۔[32] یہاں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ صحیح اسلام قدیم بادشاہوں سے وابستہ تھا لیکن مادّی اور دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لیے اسلام کو سوچ سمجھ کر بگاڑنے کو محض جدید دور کا عجوبہ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرکیف سنجیدہ، متین اور دلی صفت لوگ بھی تھے بلکہ ان کی کمی نہیں تھی۔ مسلمان صوفی اس کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی طاقت اتنی نہیں تھی جو سماج اور سیاست کے رنگ اور رجحانات کا فیصلہ کرتی۔

حوالاجات

1- ہندوستان میں ترکی مہاجرین سے متعلق معلومات کے لیے دیکھئے بیگچی، رول آف سنٹرل ایشین نومیڈس ان دی ہسٹری آف انڈیا، جرنل آف دی گریٹر انڈیا سوسائٹی X، ص ص۔ 133-134۔

2- جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1898، i، ص۔ 21۔ 59 اور ایس بی سرکار بھی۔ سم بشٹن رفرنسز۔ نومسلم ایڈوانس انٹو بہار اینڈ بنگال، سپروسیڈنگس آف دی انڈین ہسٹری رکارڈ کمیشن، 1942، میں ترکی فاتحین کے مساواتی سماج کا نیچی ذات کے ہندوؤں میں خیر مقدم کے مسئلہ پر دیکھئے الیٹ (علیگڑھ) میں حبیب کا تعارف 54-59۔

3- دیکھئے بھنڈارکر۔ سم آسپکٹس آف انڈین پولیٹی، ص ص 125- 168، گھوشال بھی دیکھئے۔ ہندو پولٹیکل تھیوریز، ص ص۔ 269- 278۔

4- ابن بطوطہ کے وقت میں بھی 'خان'، بادشاہ کے بعد سب سے زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا، راحلہ، i، ص۔ 170۔

5- فخر مدبر، تاریخ، ص۔ 20۔

6- ایضاً، ص ص۔ 12۔

7- ایضاً، ص۔ 13 آداب الحرب، صفحہ ذیل 3 بی بھی دیکھئے۔

8- فخر مدبر، تاریخ، ص۔ 13 ؛ منہاج بھی، ص۔ 205۔

9- (۴۵۰) جیسے منہاج، ص۔ 167- 176۔

10- برنی، ص۔ 578 ؛ فتویٰ جہانداری، صفحہ ذیل 199 اے۔

11- التتمش کے بیٹوں کا نام اس کے درباریوں کی فہرست میں شامل ہے۔ منہاج، ص۔ 177 اسی طرح بلبن اور فیروز خلجی بھی ہیں، برنی، ص۔ 24 اور 176۔

12- برنی، ص۔ 41؛ فتوئ جہانداری، ص 45۔ اے، امیر خسرو بھی دیکھئے: کلیات۔ صفحہ ذیل 221؛ برنی بھی، ص۔ 142۔

13- معزالدین کا جواب دیکھئے جب بیٹا نہ ہونے پر اس سے ایک درباری نے اظہار افسوس کیا۔ منہاج، ص۔ 132۔

14- میڈیول انڈیا، ص۔ 64

15- دیکھئے، برنی، ص۔ 150 کہ کس طرح بلبن نے ولی عہد کو بڑا خاندان رکھنے کے خطرات کی وضاحت کی۔

16- برنی، ص۔ 26؛ برنی اور منہاج کے بیانات میں التتمش کے چالیس سے زیادہ غلاموں کے نام شامل ہیں۔

17- برنی، ص۔25۔

18- الفی، صفحہ ذیل۔ 529 بی، منہاج کے بیان کے مطابق ایبک اور یالدوز دونوں کو ایک ساتھ 605ھ/ 1208ء کے لگ بھگ آزاد کر دیا گیا تھا، ص 89۔ 90۔

19- خود معزالدین کی سفارش پر ایبک نے اسے 601ھ/ 1205ء میں آزاد کیا منہاج، ص۔ 170۔

20- راحلہ، ii، ص۔ 25۔

21- فتوئ جہانداری، صفحہ ذیل۔ 159 اے۔

22- ایضاً، صفحہ ذیل 100 اے۔

23- ایضاً، ص۔ ذ، 214 اے اور 225۔

24- ایضاً صفحہ ذیل 147 اے؛ برنی بھی، ص۔ 511۔

25- کلیات، ص۔ 312؛ مسلمان سود خوروں کے وجود کے بارے میں دیکھئے — مطلع الانوار، ص۔ 150۔

26- فرشتہ، i، ص۔ 95۔

27- فتوئ جہانداری، صفحہ ذیل 159 اے۔

28۔ ایک مثال اس کہاوت کی ہے کہ "اگر سلطان نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کو ہلاک کر ڈالیں، دیکھیئے فخر مدبر، تاریخ، ص ص۔ 12۔ 13۔

29۔ فتوئ جہانداری، صفحہ ذیل۔ 11 اے۔ محمود غزنوی کی زبردست پاک دامنی کو ثابت کرنے کے لیے برنی لکھتا ہے کہ اس نے کبھی اتنی شراب نہیں پی کہ وہ نماز نہ پڑھ سکتا۔

30۔ فقہ فیروز شاہی (انڈیا آفس لنڈن 2987)، صفحہ ذیل 191۔ 192۔

31۔ برنی، ص۔ 94، مطلع الانوار، ص۔ 69۔

32۔ فوائد الفوائد، صفحہ ذیل۔ 63 بی۔

اٹھارھواں باب

فنِ تعمیر کی یادگاریں

بارھویں صدی تک مسلمانوں نے اپنی مذہبی اور سماجی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نمایاں طور پر فنِ تعمیر کی روایتوں اور ہیئتوں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے میں انھوں نے نہ صرف بزنطی اور ایرانی تکنیکی اور فنی تجربوں کو آزادی سے اپنایا تھا بلکہ مشرق میں بودھ فنِ تعمیر سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ سلجوق ترکوں کے عروج کی وجہ سے اُن کی خانہ بدوش زندگی سے متاثر ہو کر کچھ مخصوص عنصر بھی مسلم فنِ تعمیر کے طرز میں شامل ہو گئے تھے۔ سوائے شام کے جہاں تعمیری روایت کی بنیاد پتھر سے تعمیر پر تھی باقی تمام جگہوں پر اینٹوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ پتھر کے برعکس اینٹوں سے مسطح ساخت یا نقش و نگار کا کام زیادہ آسانی سے ہو سکتا تھا چاہے وہ مخصوص طرز کی اینٹیں لگا کر کیا جائے یا مسالہ کو مخصوص شکل میں ڈھال کر استعمال کیا جائے۔ شبیہہ بنانا چونکہ مذہبی عقائد کے خلاف تھا اس لیے آرائشی نقش و نگار نازک اور رنگا رنگ بن گئے، یہاں تک کہ وہ جب پودوں کی شکل میں آئے تب بھی اُنھوں نے اپنے دو رُخی تاثر کو قائم رکھا۔

مہاجر ترکوں نے ابتدؤں کے فنِ تعمیر کی نشوو نما پائی ہوئی روایت کو ورثہ میں پایا۔ تاہم ہندوستان میں ایک بالکل ہی مختلف روایت ان کے سامنے آئی جس کی بنیاد پتھر کے مجسموں اور مسالوں پر تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندو فنِ تعمیر نے کھلی ہوئی جگہوں کے ڈھانکنے کے تکنیکی مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں زیادہ ترقی نہیں کی تھی بلکہ اُنھوں نے اسے مجسمہ ساز

اور پتھر کاٹنے والے کی فنی اور تکنیکی مہارت کے لیے چیلنج کے طور پر قبول کیا تھا۔ اس کا مقصد ایک ایسے مذہبی نظام کی تشبیہات، استعاروں اور اشاریت کے ذریعہ خدمت کرتا تھا۔ جس کے خلوت پسند ماحول کے لیے چھوٹی عبادت گاہوں کی ضرورت تھی جو بہت دور ہوں اور تکلیف دہ حد تک اندھیری ہوں۔ اور جہاں دیوار گیریوں اور بے شمار کھمبوں کے جھرمٹ میں راستے اور حجرے ہوں۔

ہندو فن تعمیر کے تعمیری اصول لمبے چوڑے ہال بنانے کے لیے موزوں نہیں تھے جو مسلمانوں کی اجتماعی نمازوں کے لیے ضروری تھے۔ کھمبوں اور دروازوں کے آس پاس کے حصّے کی سیدھی سادھی افقی اور عمودی ترتیب بڑی جگہوں پر چھت بنانے کے لیے خاص طور پر ناکافی تھی۔ نچلے حصّے پر زیادہ دباؤ ڈالے بغیر ضروری عظمت اور شان حاصل کرنے کے لیے سب سے آسان اور پائیدار طریقہ گنبد تھا جو اپنی مخروطی اور نصف کری شکل وصورت کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبی عمارتوں اور مقبروں میں بہت کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ اس عظیم الشان معبد گاہ سے ملحق معاذنیہ، یا اذان دینے کی جگہ کا ہونا ضروری تھا۔ یہ ایک اونچی جگہ ہوتی تھی جہاں سے مسلمانوں کو دن میں پانچ دفعہ نماز کے لیے پکارا جاتا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اونچے مینار کی تعمیر کا تصور مسلمان کی بالکل ابتدائی تاریخ میں پیدا ہو چکا تھا۔ عراقی طرز کے چوکور سے شروع ہو کر میسوپوٹامیا کے انداز کی چکردار اور پر اٹھتی ہوئی لاٹ کو ' المنار' (فارسی مینار) کہتے تھے اس مینار نے چار صدیوں کی مسافت طے کر کے اور پھر مشرق میں پہنچ کر کہیں گول کہیں عمودی کٹاؤ کے ساتھ اور کہیں کوکبی شکل کو اپنا لیا۔ اس کی شاندار بلندی کی وجہ سے، موذن کے مینار کو فتح یادگاری لاٹ کے تصور سے ملا دیا گیا۔ حالاں کہ اس قسم کے فتح کے مخصوص مینار تعمیر کرنے کا تصور مسلم سماج میں عالم گیر حیثیت کبھی نہیں حاصل کر سکا۔

یہ دعوی کرنا غلط ہوگا کہ یہ مخصوص طرز تعمیر مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے کیوں کہ یہ طریقہ دونوں کے لیے نیا نہیں تھا۔ اونچی چھت، مدور یا اسطوانہ طرز، اہرام کی شکل یا نصف کری اشکال، ہمیں گجرات اور مغربی ہند کے دسویں اور گیارہویں صدی کے حسین اور ہندو طرز تعمیر کے آثار قدیمہ میں کہیں کہیں نظر آتی ہیں[1] بلکہ شمالی اور جنوبی ہند میں یہ طرز تعمیر اور زیادہ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ جہاں منفرد مینار (استمبھ یا لاٹ) یا

تو روشنی کے کھمبوں دیواپدانا (DVIPADANA) کے طور پر استعمال ہوتے تھے یا مندروں کا حصہ ہوتے تھے۔ کرتی استمبھ یا من استمبھ (KIRISTAMBHA OR MANSTMBA) اور یا پھر فتح کے ستون (جے استمبھ) ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ تجہیز و تکفین کے حجرے اور مقبرے بھی ہندوستانی سرزمین کے لیے بالکل نئے نہیں تھے۔

عمارتوں کی تعمیر کے فن میں ترک مسلمانوں نے جس چیز سے ہندوستان کو متعارف کرایا تھا وہ نئی ہیئت یا شکل وصورت نہیں تھی بلکہ وہ نئے فنی اصول، عمارتی اجزائے ترکیبی اور خیال کی وسعت تھی۔ بناوٹ کا محرابی طریقہ، جس میں کنکر اور چونے کے مسالے کو ملا کر سمنٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جس نے ہندوستانی معماروں کو کڑیوں کے استعمال کی پابندیوں سے آزاد کرا دیا تھا۔ اور اس طرح انھیں عمارت کی ساخت اور اس میں استعمال کیے جانے والے سامان پر زیادہ قابو حاصل ہو گیا تھا۔ ایک پتھر سے بنائے جانے کا تصور اور وہ بھی کم وبیش اس طرح تیار کیا ہوا کہ مجسموں کی آرائش کے پس منظر کے طور پر کام آسکے اب بدل چکا تھا اور اب عمارت خود اپنے مطالبات اور اپنی اقدار کی بنا پر تعمیر ہونے لگی تھی تعمیری عناصر کی طرح عمارت کے نقشے میں خالی جگہ بھی ناگزیر سمجھی جانے لگی۔ پیچ در پیچ۔ خود بیں اور بہم مرکز مندروں کے مقابلے میں نئی حکومت کی مذہبی عمارتیں زیادہ روشن، باہری رخ پر اور کشادہ تھیں۔ اپنی عظیم الشان بلندی، سامنے کے رُخ کے نمایاں دروازے اور آسمان کے پس منظر میں نظر آنے والی سیدھی سادھی لائینوں کی وجہ سے مسجد ایک ایسے پیغام کی منادی کرنے کی علامت بن گئی تھی جسے ہندو فن تعمیر نے ایک ایسے راز کی طرح چھپا رکھا تھا جیسے مندر کے تاریک گوشوں میں تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔

دوسری طرف ہندوستانی دستکاروں کی برتری خاص طور پر پتھروں پر نقش ونگار بنانے میں، بے مثال تھی۔ مجسمہ سازی اور اس میں لکیروں کی موزونیت روانی اور سہہ رُخی تاثر پیدا کرنے میں ان کے پیچھے قدیم اور طویل روایات تھیں۔ مسلمان ہرگز توقع نہیں کر سکتے تھے کہ پتھروں پر نقش نگاری کے فن میں وہ ہندو دستکاروں سے کبھی آگے نکل سکیں گے۔ اسی لیے ان کے تعمیری منصوبوں کو تفصیلی طور پر عملی جامہ پہنانے میں ہندو معمار اور دستکاروں کی موجودگی ضروری تھی۔ اور اس طرح ہند۔ مسلم" فن تعمیر" کے

نشوونما پانے والے دور میں وہ ایک بہت اہم کردار ادا کرتا رہا۔ تفصیلی خاکہ، بناوٹ کی طرز اور نقش و نگار جیسے اہم عناصر کے تعین میں ہندو دستکاروں کو جزئیات کی اپنی تاویل پر بھروسہ کرنا ہوتا تھا۔ اور اس طرح اسے نہ صرف اپنے خزانے سے نکال کر بہت سے نقش و نگار اور امتیازی خصوصیتوں کو پیش کرنے کا موقع ملتا تھا بلکہ وہ اپنے خاص تعمیری نظریوں کو روشناس کرا دیتا تھا۔ ان میں سے کچھ کو بالآخر مسترد کر دیا جاتا تھا یا پھر کچھ میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کر کے اپنا لیا جاتا تھا جو بعد میں اس کا ایک لازمی جز بن جاتے تھے۔ مثلاً نکیلی محراب، جس کا ہر ضلع دہرا، انگریزی حرف ایس (S) کی طرح ہوتا تھا، پرسی براؤن[6] کے کہنے کے مطابق، بہت پہلے سے ہندوستان میں موجود تھی۔ یہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے بدھ چیتیہ (CHAITYA) کی دھوپ کھڑکی سے مشابہت رکھتی ہے اور اسے پہلی دفعہ دہلی میں ایبک کی مسجد میں منقش پردے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ ڈاٹ لگانے کے صحیح طریقے یا نوک دار پتھروں کے استعمال کی وجہ سے پرانی ہیئت غائب نہیں ہوئی بلکہ حالات کے مطابق بدل گئی۔ جس کی مثالیں ہمیں گجرات، منڈو، جونپور اور دوسرے صوبوں میں بعد میں بنائی جانے والی عمارتوں میں ملتی ہیں۔ ایبک کے منقش پردے کے چوطرفہ حاشیوں پر کھودے جانے والے نقش و نگار ہندو "سانپ اور بیل" کی نقل ہیں جو حاشیوں پر بڑی آزادی سے استعمال کی گئی ہے۔ اس طرز کو بعد میں مسترد کر دیا گیا تھا لیکن لچک دار ملائم ہندو منبت کاری کی حساس نزاکت اور روانی کو اپنے اظہار کے نئے طریقے مل گئے تھے۔ اب وہ خوبصورت لکھائی، ہندسی اشکال اور پھولوں کی تجریدی نقوش کی صورت میں سامنے آئے جنھیں مسلمان فرش کی سجاوٹ کے لیے ترجیح دیتے تھے۔ مندر کے گاؤدم چوٹیوں (SHIKHARA) کے املک (AMALAKA) اور کلس جیسے ہندو طرز تعمیری کے عناصر ہمیں بہت واضح طور پر تغلق، سید اور لودی عمارتوں کے گنبدوں کے کلس میں نظر آتے ہیں۔

مملوک عمارتیں اس مخصوص طرز کے بتدریج کام کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ ہندوستانی سرزمین پر ان کی پہلی عمارت، جو بڑی پرمعنی ہے، ایک مسجد تھی۔ جس کی روشن کشادہ جگہیں اندھیرے، تنگ اور پراسرار مندر کے بالکل برعکس تھیں۔ دہلی میں اجتماعی عبادت

کے لیے بنائی جانے والی مسجد، جس کا نام خاص غرض سے "قوت الاسلام" رکھا گیا تھا، کی تعمیر ایبک نے فتح کے دو سال کے اندر 1195ء / 592ھ میں شروع کی تھی۔ یہ مسجد بلاشبہ ہندو سامان سے بنائی گئی تھی۔ اس کے تمام کھمبے، ستون اور کارنس قرب و جوار کے مندروں سے لیے گئے تھے۔[44] مورخ نے لکھا ہے کہ اس کی تعمیر کے لیے 27 مندروں کا سامان استعمال کیا گیا تھا۔ سجے کیے ہوئے پتھروں کو نہایت عجلت سے نماز پڑھنے کے چھتے دار ہال کی ضرورت کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا۔ اس ہال کا رخ مغرب کی طرف تھا اور مرکز میں ایک کشادہ اور وسیع صحن بنایا گیا تھا۔ پتھروں پر کھدی ہوئی شکلوں کو یا تو بگاڑ دیا گیا تھا یا انھیں الٹ کر چھپا دیا گیا تھا۔ یہی وہ تبدیلی تھی جو دراصل ساری مملوک تاریخ کی تصویر پیش کرتی ہے اس مسجد کو ایک مندر کے چبوترے پر بنایا گیا تھا جیسا کہ مارشل کہتا ہے محراب کے علاوہ اس عمارت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے اس کا اسلامی کردار سامنے آئے۔ کیوں کہ اس کی بناوٹ بھی ہندو کڑیوں کے اصول پر ہے یہاں تک کہ چھوٹے مخروطی اور گول گنبد بھی اس طرح مختلف جگہوں پر لٹکا دیئے گئے ہیں۔ اس کے ہندو کردار کو چھپانے کے لیے ایبک نے مسجد کی تکمیل کے دو سال بعد اس کے مغربی حجرے کی طرف ایک منقش جالی دار پردہ بنوایا تھا۔ جو کہ ترکوں سے ورثے میں ملے ہوئے مسجد کے نقشے کا ایک امتیازی عنصر تھا۔ لیکن اس میں بھی تعمیر کی تفصیلات اور نقش و نگار میں مقامی طرز فکر کو اختیار کرنا پڑا تھا۔ اس کے سامنے کے حصے کے کمان دار پردے پر گہری منبت کاری میں قرآن کی آیات کو خوبصورت انداز میں لکھنے سے یہ حقیقت ہرگز نہیں چھپتی کہ اس کی نکیلی محرابیں کڑیوں کے اصول پر بنائی گئی تھیں۔ عربی تحریر کے گرد بنائے جانے والے نقش و نگار میں دستکاری کے ماہر ہاتھ کے بنائے ہوئے روائیتی ڈزائن بالکل صاف نظر آتے ہیں۔ فتح کے فوراً بعد ایبک نے "اڑھائی دن کا جھونپڑا" کے نام سے جو مسجد اجمیر میں بنوائی تھی وہ بھی منہدم کیے ہوئے مندروں کے سامان سے تیار کی گئی تھی۔ اس لیے اس میں بھی ہندو رنگ صاف نظر آتا ہے لیکن دہلی کی مسجد کے مقابلے میں مسجد کی منصوبہ بندی میں زیادہ غور و خوض سے کام لیا گیا تھا۔ ستون دار صحن کے مشرقی حصے کے صدر دروازے کو بلندی پر بنانے اور اس کو ڈھاکنے کا انتظام اور اس کے نیچے کھمبے دونوں حصوں پر ابھرے ہوئے عمودی کٹاؤ

دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسجد کا منصوبہ بنانے والے نے اصل حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔

قصداً بنائی جانے والی مسلم عمارت اور ہند و مسلم فن تعمیر کے ارتقاء کی ایک نئی منزل کا اشارہ ہمیں قطب مینار کی تعمیر میں نظر آتا ہے۔ جس کا ایبک نے 1199ء سے پہلے منصوبہ بنا کر تعمیر کا آغاز کیا تھا اور جسے التمش نے پائے تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اگر مقصد اور تعمیری تفصیلات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ایران میں نشو ونما پانے والے مسلم تصور کا ارادتاً تعارف کرایا گیا ہے۔ حالاں کہ کسی عمارت سے ملحق ہوئے بغیر الگ کھڑا ہوا ستون ہندوستان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا۔ پھر بھی قطب مینار کا سلسلۂ نسب مسجد کے میناروں سے ملانا چاہیئے۔ جو بالآخر عیسائی سیریا (شام) کے کلیسا کے میناروں سے ماخوذ تھا۔[8] الگ اساتدہ مینار کی سب سے پہلی مثال غالباً صحرائے شام میں بنائی جانے والی "قصر الخیر الشرقی" کے چوکور مینار کی ہے جسے امیہ خلیفہ ہاشم نے 743-724ء میں تعمیر کرایا تھا۔[ح] اس مینار کو جب مڑنے کی صلاحیت رکھنے والی اینٹوں سے بنایا گیا تو مسجد سے ملحق اس معاذنیہ نے گول شکل اختیار کرلی تھی گول طرز تعمیر کے ابتدائی نیچے کھچے نمونے، یعنی عباسی خلیفہ "متوکل" (861 - 847) کی سمارا میں بنائی ہوئی عظیم مسجد کے مالویہ مینار، ایران کے راستے مشرق پہنچے اور یہاں پہنچ کر ان میں مقبروں اور یادگاری میناروں کا تصور شامل ہو گیا۔[9] ایسا کرنے میں، اس کی شکل وصورت اور طرز میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس کی انتہائی مشرقی مثالیں محمود اور مسعود سوم کے غزنی میں بنائے جانے والے اینٹوں کے مینار پیش کرتے ہیں جن کا اوپر کا اسطوانی حصہ ستاروں کی طرح مرتب کیے ہوئے پتھروں پر نیچے بنایا گیا تھا۔[9] یہ طرز نہ صرف شیروان[15] کے مینار سے بلکہ جنوبی ہند کے تقریباً ہم عصر جین استمبھوں (STAMBHAS) سے بھی مشابہہ ہے۔[11] یہ بات شاید اس تعلق سے بھی واضح ہوتی ہے جو بدھ اور جین مذہبی عمارتوں کی جگہوں کا غزنوی سلطنت سے تھا۔ تاہم بارھویں صدی میں خراسان میں بنائے جانے والے میناروں میں سلجوقوں نے جو تبدیلیاں کیں اس میں مینار اوپر سے کافی پتلے ہو جاتے تھے اور اس پر غزنوی انداز میں کتبوں کی مزید پٹیاں بھی لگائی جاتی تھیں۔ ان کی ہر منزل پر آمدہ نما چھت، دیوار سے جڑے ہوئے پتھر بے شمار مثلث ٹکڑوں

پر ٹکی ہوتی تھی۔[12] کہتے ہیں کہ یہ مخصوص طرز ترکستان سے درآمد کیا گیا تھا۔ جہاں گیارھویں صدی کے ابتدائی حصے اور بارھویں صدی کے چار کرغان کے مینار میں نہ صرف مخروطی شکل بہت نمایاں ہے بلکہ کوفی خط تحریر کی پٹیاں بھی لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ستون کی منزلوں پر عمودی کٹاؤ اور ہر جگہ ڈاٹ پر بنی ہوئی محرابیں ہیں۔ اور یہ سب وہ خصوصیات ہیں جو اس سلسلے کو قطب مینار سے ملا دیتی ہیں۔[13] افغانستان میں آثار قدیمہ سے متعلق فرانسیسی مشن نے ابھی حال میں "جام" کے علاقے میں جواب فیروزکوہ کہلاتا ہے، ایک غوری مینار ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس دریافت نے قطب مینار کو ایک واضح تاریخی اور طرزی پس منظر دے دیا ہے۔ اس تاریخی عمارت پر غیاث الدین بن سام (1202-1163) کے شاہی القاب لکھے ہوئے ہیں۔ مینار ہشت پہل بنیاد پر اینٹوں سے تیار کیا گیا ہے۔ گول مخروطی ستون کی موجودہ اونچائی تین حصوں میں بٹی ہوئی ساٹھ میٹر ہے ہر منزل پتھروں کے مثلث ٹکڑوں پر ٹکے ہوئے برآمدے سے آکر کھلتی ہے۔ جہاں فانوس یا شہ نشین بنا کر زیبائش کی گئی ہے۔[14] اندرونی حصے میں وسطی ستون کے گرد گھومتے ہوئے زینے اوپر کے برآمدے تک جاتے ہیں۔ لکھی ہوئی پٹیاں ایک دوسرے سے مل کر آرائشی پٹیاں اور شش پہل ڈیزائن بناتی ہیں۔ ان پر کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی ہے جس کو پڑھا جا سکے۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسے معزالدین کے بڑے بھائی نے 1202ء سے پہلے بنوایا ہوگا۔[15] یہ کہنا مشکل ہے کہ مینار معاذنیہ کے طور پر بنوایا گیا ہوگا کیوں کہ دریا کے تنگ کنارے کے پاس کسی مسجد کے باقیات نہیں ملے ہیں۔[16] اس کو دیکھ کر ایک دم قطب مینار یاد آتا ہے جو غیاث الدین کی موت سے صرف تین سال پہلے سامنے آیا تھا۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ غیاث الدین شنسبانی سلطنت کا قانونی فرمانروا تھا۔ "جام" مینار اور قطب میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ صرف ان میں استعمال ہونے والے سامان اور باہری زیبائش میں ہے ان میں سے اول الذکر کی سطح گول ہے اور اس پر خط کوفی اور نستعلیق میں لکھا ہوا ہے اور انگور کے گول پتے مسالے اور چینی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب چیزیں ایرانی طرز کی دلالت کرتی ہیں۔ دوسری طرف دہلی کا مینار ان ہی سب چیزوں کو سنگ سرخ میں پیش کرتا ہے۔ گہری عمودی لکیروں اور گوشہ دار سطح کو محض پتھر کی وجہ سے ترجیح دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ تجربے کے تسلسل کو بھی نمایاں

کرتا ہے۔ مثلاً قطب مینار کے نقشے میں عمودی کٹاؤ، جار کرغان کے مینار سے اور نوک دار گوشہ دار ابھار، رتے (RAYY) (تعمیر 1139ء) کے مقبرے کے مینار سے مشابہت رکھتے ہیں یا غزنی میناروں کی نچلی منزل کے ستارہ نما ڈیزائن سے لیے گئے ہیں۔ برآمدوں کے مثلث نما چونے کے ٹکڑوں سے ہندوستانی صنّاعوں نے اپنے مندروں کی چھتوں میں نوک دار پتھروں کے آرائشی کٹاؤ کا تصور اپنایا ہوگا۔ جو بہر کیف، جام، مینار کے مثلث نما ٹکڑوں پر ٹکے ہوئے برآمدوں کے بچے کھچے آثار سے بہت مشابہہ ہیں۔ یہ برآمدے اینٹوں سے بنے ہونے کی وجہ سے عناصر کی دست و برد سے نہ بچ سکے۔ تاہم، جام، مینار کے برعکس قطب مینار دو چیزوں کی نمائندگی کرتا ہے نمبر ایک معاذ نیہ اور نمبر دو، فتح کا مینار[18] ایک اور اس کے آقا کے مسلم فوجوں کی فتح کی دوامی یادگار بنانے کے تصوّر کو غالباً التمش نے اپنا لیا تھا۔[19]

قطب مینار کی تعمیر نے جس رویّہ کو اختیار کیا تھا اس کی واضح مثالیں 1225ء کے بعد اس کے جانشین التمش کی بنائی ہوئی عمارتوں میں بہت نمایاں ہیں۔ دہلی میں اُس نے قوت الاسلام، مسجد کے گرد ایک وسیع مستطیل بنایا اور اضافہ شدہ عبادت گاہ کے سامنے اس سے مطابقت رکھنے والا ایک منقش جال دار پردہ لگایا۔ توسیع شدہ علاقہ کے باقیات جس میں منقش پردہ سب سے زیادہ نمایاں ہے اس میں اسلامی عناصر بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ محرابیں حالانکہ ہندوستانی اصولوں پر بنائی گئی ہیں پھر بھی اس میں نکیلے خم نہیں دکھائی دیتے، بلکہ پرسی براؤن کے کہنے کے مطابق انھوں نے زیادہ نوک دار شکل اختیار کر لی ہے۔ اور سطح کی زیبائش کے لیے نازک نقش و نگار کی تراش نے اس آزادی، لچک اور ملائمیت کو کھو دیا ہے جو ایبک کے بنائے ہوئے منقش پردے میں ملتی ہے۔ اس میں خط نستعلیق کی لکھائی اور تجریدی اشکال کے مسلم روایتی طرز کو اختیار کیا گیا ہے۔ اڑھائی دن کا جھونپڑا میں بھی التمش نے کچھ اضافہ کیا تھا۔ خاص طور پر مغربی ستون دار صحن کے سامنے جہاں اُس نے اسی قسم کا محراب دار منقش پردہ بنوایا تھا۔ یہاں پر بھی ہم مسلم ساخت اور آرائشی طرز کو بہت واضح طور پر قصداً استعمال ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں سامنے کے حصے میں عمودی کٹاؤ والے مینار مقامی طرز کے نقش و نگار کی بجائے دہلی کے منقش پردے کی طرح بنائے گئے ہیں جن پر مسلم وجدان کے مطابق تجریدی نقش و نگار ہیں۔ اس کی محرابیں بھی دہلی کے اصل

نمونے کے مطابق ہیں اور اس جگہ ہندوستان میں پہلی دفعہ کنیر پر توں والے ڈیزائن کا تعارف کرایا گیا ہے۔

قطب مینار کی طرح ایک اور خالص مسلم تصور کو ہندوستان میں جہاں پہلی دفعہ عمارتی شکل میں ظاہر کیا گیا وہ ایک مقبرہ تھا جو اس نے اپنے بڑے بیٹے اور ولی عہد نصیرالدین محمود (وفات 1229ء) کی قبر پر بنوایا تھا۔ یہ عمارت دہلی سے کچھ میل دور ایک علیحدہ جگہ پر جسے مقامی طور پر سلطان غازی کہتے ہیں واقع ہے۔ عمارت ستون کی مربع کرسی پر بنائی گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف پتھر کی دیواروں پر برج بنے ہوئے ہیں اور اس کا بہت عالی شان دروازہ ہے۔ عمارت محض اپنے تصور کے اعتبار سے اسلامی کہی جا سکتی ہے۔ اس کی ساخت کی تفصیلات خاص طور پر اس کے ستون، کارنس، محراب کے نقش و نگار اور مخروطی تکونوں پر ٹکی ہوئی چھتیں، صریحی طور پر ہندو طرز کا نچوڑ ہیں بجز اس کے کہ پتوں کے ڈیزائن کی بنی ہوئی محراب اور عبادت کی جگہ، جہاں بڑے حروف میں قرآن کی آیتیں کھدی ہوئی ہیں، باقی بناوٹ کی تمام چیزیں اور سامان منسبت کاری کا سارا تصور اس قدر واضح ہندو طرز کا ہے کہ اس کے مسلم ہونے پر شبہ کا اظہار کیا گیا ہے[20]۔ تاہم اس کے دروازے پر لکھا ہوا التتمش کا کتبہ[21] اس شبہ کو دور کر دیتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ مقبرے کی عمارت ہونے کی بنا پر، اس کی منصوبہ بندی بعد کی اس قسم کی تمام عمارتوں سے مختلف ہے۔ یہ بات اس کی قبر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے جو کہ ایک ہشت پہل زمین دوز حجرے میں رکھی گئی ہے[22]۔ اس قسم کا انتظام ہمیں ہندوستان میں سترھویں صدی سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتا ایسا لگتا ہے کہ بارہویں صدی کی سلجوق قبر کے میناروں کے طریقے کی توثیق کی گئی تھی[23]۔ جس کے تہہ خانے میں لاش کو دفن کیا جاتا تھا اور اوپر کے حجرے میں ایک یادگار پتھر، صحیح جگہ کے تعین کے خیال سے لگا دیا جاتا تھا۔

لیکن جب 1235ء میں قوت الاسلام مسجد کے شمال مغربی کنارے پر خود اس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا تو اس میں یہ طریقہ نہیں استعمال کیا گیا۔ اس سے تجرباتی کارروائیوں کے تسلسل کا مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس کے خالص مسلم تاثر میں مزاحمت نہ کرتے ہوئے بھی یہ عمارت، منصوبہ بندی کے تحت بنائے جانے والے چوکور ہال کی پہلی مثال ہے جس

کی گنبد نما چھت اب گر چکی ہے۔ اس عمارت کی ساخت کی تفصیلات بنیادی طور پر ہندو طرز کی ہیں۔ اس کی محرابیں اور ڈیزائن ہندوستان میں پہلی دفعہ پیش کی گئی ہیں جو مثلث نما ٹکڑوں کے سہارے بنائے جانے والے گنبد کے گول قطر کی چوکور بنیاد کے عام طریقے کو بدلنے کے لیے متعارف کرائی گئی تھیں اور پتھروں کے ایک دوسرے سے آگے نکلے ہوئے کے خالص مقامی اصول کی بنیاد پر بنائی گئی تھیں۔[24] دراصل سطح کے نقش و نگار ایک ایسی چیز تھے جہاں نئی طرز کو اپنے اظہار کا پورا موقع ملا تھا۔ اس کے اندر کی دیواروں پر کھدے ہوئے کتبوں اور نقش و نگار میں دیسی خزانوں سے کچھ بھی نہیں اپنایا گیا تھا۔ فرش سے لے کر چھت تک بنائے جانے والے نقوش کا تاثر، ہر چند وہ بہت نزاکت سے بنائے گئے ہیں، ایسا ہے جس میں بے روک شان و شوکت پائی جاتی ہے اور جو ہندو مندروں سے غیر مشابہہ نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ دستکاروں کو صرف نسخ کوفی اور طغرا تحریروں اور ہندسی نمونوں کو استعمال کرنے کی ہدایت دی گئی تھی اسی لیے اُن کے تنوع، اُن کے باہمی ربط اور بار بار آنے والے گھماؤ، حلقے اور زاویوں نے اُنھیں اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔

مسلم عمارتی اور آرائشی طریقوں کے مسلسل استعمال اور مقامی عمارت سازی کی ترکیبوں کے استعمال سے بڑھتی ہوئی آزادی کو کم از کم دہلی میں، منگول فتوحات کی وجہ سے اور زیادہ سہولت مل گئی ہوگی۔ کیوں کہ منگول فتوحات نے مغربی مسلم علاقوں کے پڑھے لکھے لوگوں اور تکنیکی ماہرین کے لیے مملوک دارالسلطنت کو اُن کے لیے ایک پناہ گاہ بنا دیا تھا۔ مسلم عمارتی تصورات کے قدم جمنے میں مزید ترقی کا پتہ اس چھوٹے سے گنبد والے مقبرے سے چلتا ہے جہاں بلبن اور اس کے بڑے لڑکے شہزادہ محمدؒ کی قبریں ہیں۔ یہ مقبرہ 1286ء کے بعد اس وقت کے دارالامان کے علاقے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ گو یہ اب تباہ حال ہے لیکن جب یہ ثابت و سالم تھا۔ اُس وقت بھی سیدھا سادا معمولی تھا۔ لیکن اس کی اہمیت نہ صرف مسلم وجدان و افکار کے متوازن استعمال کی وجہ سے ہے بلکہ اس پہلی اصلی محراب کی تعمیر کی وجہ سے بھی ہے جو پہلے استعمال ہونے والی کڑیوں کی جگہ رکاوٹ کے پتھر کے اصول پر تعمیر ہوئی تھی۔[25]

اسی دور کی دوسری عمارتیں جو صوبائی شہروں میں بنائی گئی تھیں ترقی کے تقریباً ان ہی راستوں پر چل کر تعمیر ہوئی تھیں۔ ان میں سے اکثر عمارتوں کی بعد میں اتنی دفعہ

مرمت کی گئی کہ اُن کی اصلی تفصیلات بالکل غائب ہو چکی ہیں۔ یہی حشر بدایوں میں 1223ء میں بنائی جانے والی التتمش کی مسجد کا ہوا۔ جلالی میں 1266ء میں بنائی جانے والی بلبن کی مسجد کا اور ملتان میں بہاء الدین ذکریا (وفات 1262ء) کے مقبرے کا انجام بھی یہی ہوا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُسے خود بہاء الدین ذکریا نے اپنے لیے بنوایا تھا۔ بیاناکا اوکھا مندر دراصل ہندو مندر تھا جسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب اُسے دوبارہ مندر بنایا جا چکا ہے۔ ملتان میں ایک اور ولی کا مقبرہ جن کا نام شمس الدین تھا لیکن مقامی طور پر وہ "شمس تبریز" کے نام سے مشہور تھے۔ اس مقبرے کو یوں تو ان کے پوتے نے بنوایا تھا لیکن بعد میں اُن کے معتقدین نے اس مقبرے میں بڑی تبدیلیاں کرائی تھیں۔ صرف ایک کسی حد تک غیر معروف مقبرہ ملتان میں ہے جو بڑی خراب حالت میں ہونے کے باوجود ابھی تک اپنے اصلی ڈھانچے کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ یہ مقبرہ ایک ولی صفت بزرگ شادنا شہید کا ہے جو 1288ء میں ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ ناگور کا اونچا دروازہ جو اتارکن کا دروازہ کے نام سے مشہور ہے ابھی تک اپنی اصلی سطحی زیبائش کو قائم رکھے ہے۔ یہ زیبائش اجمیر میں التتمش کے بنائے ہوئے منقش پردے سے مشابہہ ہے اس لیے یہ غالباً اسی دور میں بنایا گیا ہوگا تاہم کہا جاتا ہے کہ محمد بن تغلق نے اس کے اصلی ڈھانچے کی بہت زیادہ مرمت کرائی تھی۔ محمود کے دور میں کول (علیگڑھ) میں بلبن کا مینار تعمیر کیا گیا تھا لیکن اُسے ایک برطانوی افسر نے خواہ مخواہ تباہ کر دیا تھا۔[26] یہ مینار اپنے دور اور اپنی طرز کے اعتبار سے ہندوستان کا دوسرا مینار تھا۔ اور یہ غالباً فتح کے مینار کے طور پر بنوایا گیا تھا۔

حوالاجات

1- E.9.0 ماؤنٹ آبو میں ومالا مندر یا مودھیرا گجرات میں سورج مندر۔ فرگوسن: ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکٹیکچر، II ص ص۔ 37۔ 40، 56 - 57؛ براؤن، انڈین آرکٹیکچر، I ص۔ 120۔ 121۔
2- گجرات اور راجپوتانہ میں دسویں اور گیارھویں صدی کی مثالوں کے لیے دیکھئے براؤن I، ص۔ 123 اور تصویریں، فرگوسن بھی دیکھئے، ح۔ س، I، 347-348، II ص، 81۔ 83۔
3- بدھ استوپ گو کہ بدھ رشیوں کو مدفون کرنے کے لیے نہیں تھے پھر بھی ان کی ذاتی تبرکات اور باقیات کا تحفظ اُن کا اصل مقصد تھا۔ مثلاً بدری، جنوبی کنارہ، میسور میں جین رشیوں کے خاص انداز سے بنے ہوئے یادگاری مقبروں کے لیے دیکھئے فرگوسن، II، ص۔ 79۔ 80؛ براؤن، I۔ 132 یہ امر قابلِ غور ہے کہ راجپوتانہ کے حکمراں خاندان کے افراد کی آخری رسومات سے متعلق یادگاریں اور یادگاری کتبے مسلم دورِ حکومت کے ہیں اور بلاشبہ مسلمانوں کے طریقوں کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ دیکھئے فرگوسن، II ص۔ 164۔ 169۔
4- براؤن، II، ص، 11، پلیٹس، 17، XXX، 17، XLV۔
5- تھامسن، کرانکلس، ص۔22۔ 23 پر اس کتبہ کا متن دیا ہوا ہے۔
6- کیرسول: شارٹ اکاؤنٹ آف مسلم آرکٹیکچر، ص۔ 111
7- کیرسول: ح، س، ص۔ 116۔
8- قصیروں میں مینار تعمیر کرنے کی مثالیں جو گیارھویں اور بارھویں صدی میں گرگن

(GURGON) (گنبد قابوس مورخہ 1006) اور رے (RAYY) (تعمیر 1139) میں ہیں، دونوں ہی ایک منزل گول مینار ہیں جن کے اوپری سرے مخروطی ہیں لیکن آخرالذکر کے چاروں طرف گاؤدم مثلث ابھار ہیں اور گردن کے چاروں طرف اسکوینچ[1] (SQUINCH) محرابوں کا گچھا سا ہے۔ کشمیر کا مینار قطب مینار سے بیرونی سطح پر زاویائی اور بانسری کی شکل کے ابھاروں میں مماثلت کی وجہ سے غیر معمولی حد تک مشابہہ ہے۔ لیکن اس کی تاریخ تعمیر غیر یقینی ہے تاہم پوپ اُسے شمالی رواکان (RADAKAN) تعمیر شدہ مقبرے کے مینار (مورخہ 1283) سے مماثلت کی بنا پر چودھویں صدی تعمیر قرار دیتا ہے۔ پوپ سروے آف پرشین آرٹ، II ص 1023۔ مندرجہ بالا یادگاروں کے لیے دیکھئے، پوپ: ١٧، وبلٹس، 337-346 اور 347 بی۔

9۔ فرگوسن، ح۔س۔ II ص۔ 192 توضیحی نقشے، کتبے کے لیے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، 1843 ص ص۔ 77 - 78 -

10۔ پوپ، ح۔س، II، ص۔ 928-929-

11۔ فرگوسن۔ ح۔س، ص۔ 81 -

12۔ E.g. بستام کا مینار مورخہ 1120ء اور ساد یان اصفہان میں بارھویں صدی کے اواخر میں تعمیر کردہ مینار۔ پوپ، ح۔س۔ ١٧ پلیٹ 360 بی اور 362 بی۔

13۔ کوہن وینر (COHN WEINER)؛ توران، پلیٹ ١٧ - ١X، پوپ میں حوالہ ح۔س، II، ص۔ 1027، نوٹ ١ اور 2 جار کرگان مینار کا خاکہ وکوہن وینر کے بعد پوپ میں ہے، ح۔س۔

14۔ آندرے ماریق (ANDRE MARICQ) اور گیسٹاؤں ویٹ (GASTON WIET) لامینیرٹ دی جام (LA MINARET DE-DJAM) پیرس، 1957، ص۔ 20۔

15۔ ایضاً۔ ص۔ 27۔ 28۔

---

[1] ایک ڈاٹ مربع مینار کے اندرونی زاویے پر جو بالائی ہشت پہلو عمارت کے لیے بنی ہوئی ہے۔ مترجم۔

16- ایضاً۔ ص۔ 18۔ 19 ص 65 بھی دیکھئے۔ ماریق نے یہ بات نوٹ کی کہ اندر چکر دار زینہ فرش کے نیچے سے شروع ہوتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً کسی سرنگ سے شروع ہوتا ہے جو مقامی روایت کے مطابق مینار کو محل سے ملاتی تھی۔ زیر زمین راستہ گندگی کی وجہ سے بند ہو چکا ہے۔

17- پوپ۔ ح۔ س۔ 17 پلیٹ 346۔

18- قطب مینار میں استعمال کیے گئے کچھ پتھروں پر دیوناگری طرز تحریر میں کندہ جیسے استمبھ اور کیرتی استمبھ بھی دیکھئے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کام کرنے والوں نے ہی کندہ کیے تھے۔ جے، اے پیج: این ہسٹاریکل میموائر آن دُ قطب، میموائرس آف آرکیو لوجیکل سروے آف انڈیا نمبر 22۔ (1926) ص۔ 41 نمبر 20، ص۔ 42 نمبر 21۔

19- یہ خیال جسے سب سے پہلے میکس وین برچم (MAX VAN BERCHEM) نے پیش کیا تھا اور جسے اب آندرے ماریق کی تائید بھی حاصل ہو گئی کہ ایبک نے اسے دراصل اپنے مقبرے کے مینار کے بطور بنوایا تھا نہ کہ بطور موذنہ (MAAZINA) لیکن پہلی منزل کی تکمیل پر اس کی وفات کے بعد اسے التتمش نے موجودہ مینار کی شکل دیدی۔ اس خیال کہ بنیاد خراسان میں کشمیر کے مینار سے اس کی حد درجہ مماثلت پر ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ بھی اسی عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ کشمیر کے مینار کی تاریخِ تعمیر غیر یقینی ہے۔ پوپ نے اسے چودھویں صدی کی تعمیر قرار دیا۔ دیکھئے مندرجہ بالا نوٹ 8۔ اس خیال پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ قطب مینار میں چکر دار زینہ اندرونی جگہ کے وسط میں ہے جو بعد کی ترمیم نہیں معلوم ہوتا بلکہ اصلی تعمیری پلان ہی کا جز لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے مزار کے لیے کوئی جگہ نہیں بچتی جبکہ کشمیر اور دوسرے تمام مقبروں کے میناروں میں مزار وسط ہی میں واقع ہے۔ سلجوق عہد کے معاذنہ (MAAZINA) زیادہ تر مسجد کے شمال مشرق کونے میں ہوتے تھے۔ (پوپ۔ ح۔ س، II ص 1029) جبکہ قطب مینار جنوب مشرقی کونے میں ہے۔ یہ بات غیر اہم نہیں ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانا شہر زیادہ تر مسجد قوت الاسلام کے جنوب میں واقع تھا۔

20- کننگھم: رپورٹس، ص- 60 : کار اسٹیفن بھی دیکھئے: آرکیالوجی اینڈ مانیومنٹل ریمینس آف ڈلہی، 1876 ص- 73 -

21- ایپی گرافیا انڈو مسلمکا و 1911 - 1912، ص- 23 اس پر 629 / 1231 کی تاریخ ہے۔

22- اس یادگار کی تفصیلات کے لیے دیکھئے اینشینٹ انڈیا: نمبر 3 (جنوری 1947) ص- 4 - 10 اور پلیٹس- براؤن، ح- س II، ص 14 کا خیال ہے کہ زمین دوز کمرے کی چبوترا نما چھت اس اندازے سے بنائی گئی ہوگی کہ وہ اس شہہ نشین کا بوجھ برداشت کر سکے جس کی اہرام نما چھت سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم تھی- یہ سب کچھ اب غائب ہو چکا ہے-

23- E.g. گنبد سرخ، سی- 1147، گنبد کبود، سی- 1196 - دیکھئے پوپ، ح- س، II، ص- 1026-

24- براؤن، ح- س- II- ص- 15-

25- اسٹیفن، کار: ح- س- ص 79 - 80 ؛ براؤن، ح- س، ص- 12 -

26- مورخہ 625 کے کتبے کے چربے کے لیے جس میں صرف عمارت کا ذکر ہے کسی مسجد کا ذکر نہیں ہے- دیکھئے- تھامس: کرانکلس، ص- 129 -

ضمیمہ الف

معز الدین محمد بن سام کا برن "فرمان"

میری درخواست پر جناب حسن برنی۔ ایڈوکیٹ بلند شہر یو۔ پی نے مندرجہ ذیل نوٹ 1944ء میں مجھے از راہ کرم بھیجا تھا کیوں کہ ان کے پاس جو دستاویز ہے وہ اس وقت شائع نہیں ہوا تھا جس کے بارے میں انھوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ جلد ہی شائع کر دیا جائے گا۔

"اس پر 588ھ کی تاریخ ہے جو ظاہر ہے دہلی کی فتح کے بعد کی ہے۔ اس میں بدایوں جاتے ہوئے محمود غوری کی افواج کے ہاتھوں برن (بلند شہر) کی فتح کا ذکر ہے اور اس پر فاتح کا طغرا بھی ہے۔"

"اس میں برن کے قاضی کا عہدہ نور الدین کو اور زمینیں اجے پال لانبا کو دی گئی ہیں، جو برن کا چودھری تھا اور جس نے اپنے سپاہیوں اور پیروں کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا اور برن کی فتح میں مدد کی تھی۔ قبول اسلام کے بعد اس کا نام ملک محمد قدر دراز رکھا گیا تھا۔"

میرے دوبارہ استفسار پر انھوں نے مندرجہ ذیل تفصیلات بھیجیں:

"اس فرمان کے اوپری سرے پر معز الدین کا طغرا ہے اور اس کے والد کا نام "سام" بھی دیا ہوا ہے۔"

چندر سین کو چودھری اجے پال کا جد بتایا گیا ہے۔

"قاضی منیر الدین کو جو عہدہ دیا گیا ہے وہ حکومت و ریاست منصب صدارت

ہے۔ اور اس کے ماتحتوں کا ذکر ولی مقطیع، کارکن اور گماشتہ کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس فرمان میں صرف اجے پال کے ہتھیار ڈالنے، زمین کا انتظام اس کے حوالے کرنے اور نورالدین کے قاضی مقرر کیے جانے کا ذکر ہے۔ اس میں برن پر قبضہ کا مفصل بیان درج نہیں ہے۔"

جہاں تک مجھے علم ہے یہ دستاویز ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے جب تک اس کو تفصیل سے جانچنے کا موقع نہ ملے اس کی اصلیت کو یکسر تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے۔

ضمیمہ ب

پرتھوی راج اور معزالدین کی جنگ کا مقام

منہاج نے اسے ترائن بتایا ہے (مطبوعہ متن ص۔ 118) فارسی رسم الخط میں حرف اوّل پر نقطوں کی معمولی سی ہیر پھیر اسے "نرائن" بھی بنا سکتی ہے۔ فرشتہ اور نظام الدین بخشی نے موخرالذکر کو ہی اپنایا ہے لیکن انھوں نے اتنا اضافہ بھی کیا ہے کہ "یہ ضلع سرسوتی میں ترائن کے قریب" (خطہ سرسوتی) فرشتہ کا کہنا ہے کہ فرائن وتاراواری کے نام سے بھی موسوم تھا۔ موخرالذکر بیان کی بنیاد پر الفنسٹن (ہسٹری آف انڈیا ص۔ 355) مقام جنگ تھا نیشور اور کرنال کے درمیان متعین کرتا ہے۔ یعنی وہ ترائن کی شناخت تھانیشور سے چودہ میل جنوب میں واقع عظیم آباد تاراواری سے کرتا تھا۔ اس خیال کو پنجاب گزیٹر میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ (ا ص۔ 318) ویدیا (ڈاؤن فال آف ہندو انڈیا' iii' ص 333) اور ریورٹی (ترجمہ طبقات ناصری' ص۔ 459 نوٹ) کے علاوہ گنگولی (ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیوپل' v' ص۔ 110) نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔

لیکن یہ شناخت صحیح نہیں ہے۔ یحیٰی سرہندی' (تاریخ مبارک شاہی' ص۔ 8) نے صاف طور پر بتایا ہے کہ یہ خطۂ سرسوتی میں ہی تھا اور اگر سرسوتی موجودہ سرساہی ہے تو اس کی تلاش مغرب میں کسی جگہ کی جانی چاہیئے۔ اس کا بہت کم امکان ہے کہ معزالدین چوہانوں کے علاقے میں سرہندیا' بھٹنڈا کی سمت سے (تبرہندہ کا مطلب ان دونوں میں سے کوئی ایک ہے۔ اتنی دور تک پرتھوی راج کی تازہ دم فوجوں سے مقابلہ کرنے

کے لیے آگیا ہوگا۔ جن سے وہ اس موقع پر بچنا چاہتا تھا۔ تھانیشور سرہند کے جنوب میں تقریباً 80 میل دوری پر اور بھٹنڈا سے 100 میل دور جنوب مشرق میں ہے۔ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ وہ (معزالدین) بھٹنڈا پر قبضہ کرنے کے بعد غزنی واپس ہونے کے لیے روانہ ہونے والا تھا کہ راجپوت پہنچ گئے اور اسے مجبوراً جنگ کرنا پڑی اس کو شکست دینے کے بعد پرتھوی راج نے فوراً بھٹنڈا کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جنگ قلعہ کے قریب ہی ہوئی تھی اور عین ممکن ہے کہ اس کے جنوب ہوتی اس مقام پر لڑی گئی دوسری جنگ کے بعد کہا جاتا ہے کہ پرتھوی راج کو سرسوتی کی سرحد (حدود) کے قریب بھاگتے ہوئے گرفتار کیا گیا جو تھانیشور بلکہ کرنال سے بھی سو میل دور مغرب میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دارالسلطنت پہنچنے کے لیے وہ (پرتھوی راج) فرار کا قریب ترین راستہ اختیار کرتا۔ بھٹنڈا سے یہ راستہ سرسا ہو کر گزرتا ہے۔ جبکہ میدان جنگ کو تھانیشور کے قریب کوئی مقام مان لینے کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے سرسا سے ہو کر فرار ہونے کے لیے مغرب میں لمبا چکر لگایا۔ جہاں آخرکار اسے گرفتار کیا گیا۔ کننگھم کا یہ خیال (رپورٹس، ۱۷x، ص۔ 68 - 69) کہ ترائن سرسا اور بھٹنڈا کے درمیان واقع تھا۔ زیادہ قریب ترین قیاس ہے۔ وہ اس کی شناخت تراوانا (TORAWANA) نام کے ایک گاؤں سے کرتا ہے۔ بھٹنڈا سے 27 میل اور سرسا سے 20 میل دور تھا۔ جو واقعہ کی تفصیلات سے مطابقت رکھتا ہے۔

ضمیمہ ج

کھوکھروں کی تبدیلیٔ مذہب

1206ء میں مغربی پنجاب کے جن قبیلوں نے معزالدین کی مخالفت کی تھی ان میں کھوکھر بھی تھے۔ جن کو برگس (ترجمہ فرشتہ I ص۔ 183۔ 184) نے گکھر قرار دیا۔ ایسا ہی جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (1871، ص۔ 67) میں بھی کیا گیا۔ لیکن گکھر بابر کے دور حکومت تک امتیازی حیثیت حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اس غلطی کی تصحیح انڈین اینٹی کویری (1907، ص 1۔ 7) اور روز کی : گلاسری آف دی پنجاب ٹرائبس اینڈ کاسٹس (II، ص 54) میں کی گئی۔ ریورٹی نے بھی اس شناخت پر نوٹس آن افغانستان میں اعتراضات کیے، ص ص۔ 367۔ 368۔

فرشتہ نے I، ص 59۔ 60 پر معزالدین کے ذریعہ کھوکھروں کے قبول اسلام کا حال بیان کرتے ہوئے ان کے پرانے چند شوہری اور لڑکیوں کو مار ڈالنے کی رسموں کا ذکر کیا ہے۔ جسے انڈین اینٹی کیوری (1907) میں بے شک شبہہ پنجاب کے اصلی قبیلے۔ کھوکھر کی مصدقہ ابتدائی تاریخ کے بطور تسلیم کر لیا گیا۔ ریورٹی نے اپنے نوٹس میں ان کی تبدیلی مذہب کی روایت پر اعتراضات کیے ہیں۔ پھر بھی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا (iii، ص۔ 47) اب بھی اسی سے متفق ہے۔ دراصل فرشتہ کا بیان قطعی طور پر ابن الاثیر (xii، ص۔ 98) پر بنی ہے اور اس نے غلطی سے کھوکھروں کو سندھ پار کا قبیلہ تصور کر لیا ہے جو "سنکرن اور مکران کے ضلعوں" میں بستا تھا۔ یہ قبیلہ یا لوگ جنھیں ابن الاثیر، تراحیہ (TIRAHIH) کہتا ہے سبکتگین کے زمانے سے ہی پشاور کے مسلمانوں کے لیے مسلسل پریشانی کا باعث تھے۔ انھوں نے 1205۔ 1206ء میں بھی

بغاوت کی تھی لیکن اس علاقے کے گورنر یالدوز نے موثر طور پر اس بغاوت کو کچل دیا تھا۔
یہی دراصل وہ قبیلہ ہے جس کے بارے میں ابن الاثیر کا بیان ہے کہ ان کے یہاں چند شوہری
اور بچیوں کو مار ڈالنے کا رواج تھا اور جن کا مذہب تبدیل کرنے میں معزالدین کو کامیابی
ہوئی تھی۔ فرشتہ نے بھی تراحیہ کا ذکر کیا ہے (ص۔ 60) لیکن اس بات پر غلط اصرار کرتا ہے
کہ تراحیہ اور کھوکھر دونوں ہی کے مذاہب 1205ء۔ 1206ء کی مہم کے دوران تبدیل کیے
گئے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ یہ لوگ 1218ھ/1609ء تک مسلمان رہے۔ ابن الاثیر صرف تراحیہ
کے تبدیلی مذہب کا ذکر کرتا ہے، کھوکھروں کو حسن نظامی اور منہاج دونوں برابر کافر
کہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سیاہ (SIAH) کو غلطی سے تراحیہ پڑھ لیا گیا ہو جس کا ذکر
فخر مدبر نے کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بھی ان قبیلوں میں تھا۔ کھوکھروں کی بغاوت میں
شامل تھا؟ بہرکیف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہاں (SIAHAN) موجودہ سیہی
(SEHI) قبیلہ کا فارسی نام ہے جو، روز، کی فہرست میں دیا ہوا ہے، گلاسری آف
دی پنجاب ٹرائبس اینڈ کاسٹس، iii، ص۔ 394۔

ضمیمہ۔ د

حوالے جات کی فہرست

1۔ مسودات

فخرالدین مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبّر

آداب الحرب والشجاعت

برٹش میوزیم 16853

عبدالحق دہلوی

اخبار الاخیار

اورینٹیل مسودے برٹش میوزیم 1149

ضیاء الدین برنی

فتاویٰ جہانداری

انڈیا آفس لندن 1149

امیر حسن سنجری

فوادالفوائد

اورینٹیل مسودے برٹش میوزیم 1806

شرف محمد

فوائدِ فیروز شاہی

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

نامعلوم

فقہ فیروز شاہی
انڈیا آفس 2989

فیروز شاہ تغلق

فتوحات فیروز شاہی
اورینٹیل مسودات برٹش میوزیم 2039

ہیرامن منشی

گوالیار نامہ
برٹش میوزیم 16709

امیر خسرو

اعجاز خسروی
برٹش میوزیم 16842

نورالدین محمد عوفی

جوامع الحکایات
برٹش میوزیم 16862

امیر خسرو

کلیات خسرو
برٹش میوزیم 21104

محمد معصوم

مراۃ معصومی
برٹش میوزیم 24091

حسام الدین مانک پوری

مراۃ الابرار
اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم۔

نامعلوم

مراۃ جہاں نما

اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم 1998

بیضاوی۔ ابوسعید عبداللہ

نظام التواریخ

برٹش میوزیم 16708

معین الدین زماچی

روضۃ الجنات

انڈیا آفس 195

حامد بن فضل اللہ

سیر العارفین

اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم 215

منہاج بن سراج جُزیانی

طبقات ناصری

(الف) انڈیا آفس 2533

(ب) اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم 26189

حسن نظامی

تاج المعاصر

(الف) انڈیا آفس 1486 (ب) انڈیا آفس 209

(ج) برٹش میوزیم 7623

(د) اڈیشنل مسودات اِن برٹش میوزم 7624

ضیاءالدین برنی

تاریخ فیروز شاہی

(الف) اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم 1039

(ب) انڈیا آفس 360

ملا احمد ٹھٹھاوی اور ساتھی

تاریخ الفی

برٹش میوزیم (الف) اورنٹیل مسودات 142

(ب) اورنٹیل مسودات 162

ابوالفضل بنیاگینی

تاریخ بیناگینی

(الف) برٹش میوزیم 7626 (ب) انڈیا آفس 215

شیام پرشاد منشی

تاریخ گوڑ

انڈیا آفس 2898

حمداللہ مصطوفی

تاریخ گزیدہ

برٹش میوزیم 22692

یحیٰ سرہندی

تاریخ مبارک شاہی

اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم 163

طاہر نسیانی

تاریخ طاہری

برٹش میوزیم 2388

عبداللہ شیرازی

تاریخ وصاف

برٹش میوزیم 23517

نامعلوم

تفصیل سکہ

انڈیا آفس 1939

عبدالحق دہلوی

تاریخ محمدی

اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم 137

میر علی شیر قانی

تحفۃ الکرام

برٹش میوزیم 21589

امیر خسرو

تحفۃ الصغر

انڈیا آفس 1187

نورالحق دہلوی

زبدۃ التواریخ

انڈیا آفس 1805

حبیب اللہ

ذکر جامی اولیائے دہلی

اورنٹیل مسودات برٹش میوزیم 1746

II- مطبوعہ ایڈیشن، مختصرات اور تراجم

البیرونی ابوریحان

کتاب الہند

انگریزی ترجمہ ای سچاؤ۔ لندن 1910

عبدالحق دہلوی

اخبار الاخیار

دہلی 1889

ابویوسف

کتاب الخراج

بلاق 1886

ابوالفضل

آئین اکبری

(الف) مولف بلوشمان دو جلدیں۔ کلکتہ 69-1867

(ب) انگریزی ترجمہ از بلوشمان اور جیرٹ۔ نظر ثانی از

فلٹ اور سرکار۔ تین جلدیں۔ کلکتہ 69-1927

عفیف شمسی سراج

تاریخ فیروز شاہی

کلکتہ 1890

بیحاقی عبدالفضل

تاریخ بیحاقی معروف تاریخ آل سبکتگین

مولف۔ ڈبلیو۔ ایچ مورے۔ کلکتہ 1862

بخشی نظام الدین

طبقات اکبری

(الف) ڈے اور حسین تین جلدیں۔ کلکتہ 41-1927

(ب) ترجمہ بی۔ ڈے تین جلدیں۔ کلکتہ 1940-1913

برنی ضیاء الدین

تاریخ فیروز شاہی

کلکتہ 1862

بدایونی، عبدالملک

منتخبۃ التواریخ

مولفین۔ امیر، احمد اور علی۔ تین جلدیں کلکتہ 69-1864

انگریزی ترجمہ رینکنگ، لو اور ہیگ تین جلدیں کلکتہ 1925-1884

نامعلوم

چاچ نامہ

مولفہ، محمود علی بن حامد، انگریزی ترجمہ کا یچ بیگ، فریدون بیگ

کراچی 1900

نامعلوم

پرتھوی راج۔ وجے کاویہ (حصہ حصہ)
جرنل آف گریٹ انڈیا سوسائٹی میں تذکرہ 1913

چند بردائی

پرتھوی راج راسو
مولفہ: ایم۔ وی۔ پانڈیا اور سام سندر داس، ناگری پرچارنی
سبھا بنارس 1913

فاربس

رس مالا
مولفہ: رولن سن

فخرالدین مبارک شاہ (معروف بہ فخر مدبر)

تاریخ فخرالدین مبارک شاہ
مولف: ای۔ ڈی۔ راسن۔ لندن 1927

فرشتہ قاسم بن ہندو خان

تاریخ فرشتہ
لکھنؤ 1867

حاجی دبیر

ظفرالیوالہی (ZAFARLE-WALIHI)
تالیف زیر عنوان "گجرات کی ایک عربی تاریخ"
مولفہ: ای۔ ڈی۔ راس 1921

ہراوی، سیف بن محمود بن یعقوب

تاریخ نامہ ہرات
مولف: ایم۔ زیڈ۔ صدیقی۔ کلکتہ 1944

نامعلوم

ہمیرا مہا کاویہ (ایک جزو)
انڈین اینٹی کویری میں ایک انگریزی ترجمہ 1879

ابن الاسیر

الکامل فی التواریخ
(الف) قاہرہ (ب) مولفہ: تھورن برگ لنڈن

ابن بطوطہ

کتاب الراحلہ دوسرا نام تحفۃ النظار فی غرائب الامثار
تالیف (الف) قاہرہ 71-1870 (ب) ایک فرانسیسی
ترجمے کے ساتھ DE FREMERY اور SANGUINATTI
پیرس، چار جلدیں 59-1853 (ج) مختصر انگریزی ترجمہ
ایچ-اے-آرگب- لندن 1929 (د) ہندوستان مالدیپ
اور سیلون میں سیاحت کا انگریزی ترجمہ- از مہدی حسین
بڑودہ، 1953

اسامی (قلمی نام)

فتوح السلاطین
مولف: اے- ایم- حسین- آگرہ 1938

جوینی علاؤالدین عطاملک

تاریخ جہاں گوشۂ جوینی
مولفہ: عبدالوہاب قزوینی- دو جلدیں، گب یادگاری
سلسلہ 1916- 1912-
جلد سوم ایک FACSIMILE اڈیشن از-ای-ڈی- راسن
لندن 1931
انگریزی ترجمہ جے-اے، بوائیل- دو جلدیں- مانچسٹر 1958

خسرو امیر

ہشت بہشت
علی گڑھ 1918، اعجاز خسرو لکھنؤ 76-1875،
مطلع الانوار لکھنؤ 1884، قران السعدین (الف) لکھنؤ

1884،(ب) انگریزی اقتباسات ان جنرل آف دی
ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ 1866

کلہانا

راجہ ترنگنی
انگریزی ترجمہ: اے اسٹین۔ لندن 1900۔

ملک الشعرا بہار (مولف)

تاریخ سیستان۔ تہران 1935۔

ماوردی عبدالحسن

احکام السلطانیہ
قاہرہ 1298 اے۔ ایچ

منہاج ابو عمر بن سراج جوزجانی

طبقات ناصری
(الف) مولف: نساؤلی، خادم حسین اور عبدالحئی BILI-IND
کلکتہ 1864 (ب) انگریزی ترجمہ از: ایچ۔ جی۔ ریورٹی۔
دو جلدیں BILI-IND کلکتہ 1897

مستوفی حمداللہ

تاریخ گزیدہ
FAESINILE اڈیشن۔ گب یادگاری سلسلہ۔ لندن 1913۔

نسّاوی نورالدین محمد زیداری

صراۃ جلال الدین منگ برنی
فرانسیسی ترجمے کے ساتھ ایک تالیف از: سی شیفر۔ پیرس 1891۔

نظام الملک طوسی

سیاست نامہ
(الف) مولف: سی شیفر۔ پیرس 1897۔
(ب) خلخالی۔ تہران۔

نظامی عروضی سمرقند

چہار مقالہ

(الف) مولف مرزا محمد لندن 1915 (ب) مختصر انگریزی ترجمہ از: ای۔ جی۔ براؤن۔ لندن 1921۔

ال قلقاشندی

صبح الاعشا (SUBHUL ASHA)

دار الکتب خدیویہ۔ قاہرہ

الروندی ابو بکر محمد بن علی

راحت الصدور

مولف: ایم۔ اقبال۔ کیمبرج 1922

سین سوکمار (ایڈیٹر)

شیکا شبو دھیا

سنسکرت متن، ایک انگریزی تعارف کے ساتھ۔ کلکتہ 1927!

سنہا کے۔ سی (ایڈیٹر)

راج مالا

نثری اقتباسات۔ کومیلا، بی۔ ایس۔ 1903 ۔ انگلش PANAPHDMA از: جے لانگ۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ 1850۔

سرہندی یحیی

تاریخ مبارک شاہی

(الف) مولف: ایم۔ ہدایت حسین BILI-INR کلکتہ 1931۔

(ب) انگریزی ترجمہ۔ از: کے۔ کے۔ باسو۔ بڑودہ 1932۔

سلیم غلام حسین

ریاض السلاطین

(الف) مولف: عبدالحق عابد۔ BILI-IND کلکتہ 1890-98

(ب) انگریزی ترجمہ از: عبدالسلام۔ کلکتہ 1902-1904

عطبی ابولفر

تاریخ یمینی۔ کتاب یمینی بھی نام ہے۔
عربی متن۔ مولف: علی اور اسپرنگر۔ دہلی - 1847

iii۔ ثانوی کتب

احمد شمس الدین

بنگال کے کتبات ١٧ انسکرپشین آف بنگال
راج شاہی ویرندر ریسرچ سوسائٹی 1960

علی عابد

گوڑ اور پانڈو
مولفہ: ایچ اسٹیپل ٹن۔ کلکتہ 1930۔

اگنیدس (اگنی دیس)

محمڈن تھیوریز آف فائنانس
نیویارک۔ 1916۔

احمد۔ بی۔

ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ڈیورنگ مسلم رول ان انڈیا
علی گڑھ۔ 1914۔

آرنلڈ۔ ٹی۔ ڈبلیو۔

پریچنگ آف اسلام
لندن۔ 1916

آزاد۔ محمد حسین

آب حیات ۔لاہور۔ 1917

بنرجی۔ آر۔ ڈی۔

بنگالار اتہاس دو جلدیں ۔کلکتہ۔ 1915
ہسٹری آف اڑیسہ دو جلدیں۔ کلکتہ۔ 1930

بیلی۔ ای۔ بی۔

ڈائجسٹ آف محمڈن لا۔ لندن۔ 1875۔

بارٹولڈ

ترکستان ڈاؤن ٹو منگول ان ویژن۔ انگریزی ترجمہ اے۔ آر۔ گِب۔ لندن 1928۔ دوسرا ایڈیشن 1958۔

بروا۔ کے۔ ایل۔

ارلی ہسٹری آف کام روپ۔ شیلانگ 1933

بھنڈارکر۔ ڈی۔ آر۔

سم آسپکٹس آف اینشنٹ ہندو پالیسی۔ کلکتہ یونی ورسٹی۔

بھٹاچاریہ۔ پدماناتھ

کام روپ ساسنایابی۔ بنگالی زبان میں تعارف کے ساتھ کلکتہ 1932۔

بوس۔ این۔ ایس

ہسٹری آف چنڈیلس۔ کلکتہ 1957

براؤن۔ ای۔ جی۔

لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ چار جلدیں۔ لندن۔1924-1902

براؤن پرسی

انڈین آرکیٹکچر۔ دو جلدیں۔ بمبئی۔ 1943
کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم۔ مولفہ: ٹی۔ ڈبلیو۔ کیمبرج۔1876۔

کار اسٹیفن

آرکیالوجی اینڈ مانو مینٹل ریمنیس آف دہلی۔ 1876۔

کریس ویل کے۔ اے۔ جی

اے شارٹ اکاؤنٹ آف ارلی آرکیٹکچر۔ پینگوین بکس لندن۔ 1958

ایلٹ، سر ایچ ایم

(مولف)
ہسٹری آف انڈیا، ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریَنس، آٹھ جلدیں
جلد دوم سے جلد ہشتم تک۔ مولفہ ڈاؤسن۔لندن۔77-1867۔
جلد دوم کی دوسری طباعت، ایم حبیب کے تعارف اور کے، اے
نظامی کے ایک ضمیمے کے ساتھ ۔ علی گڑھ۔ 1952۔

ایلٹ اے۔ سی

کرانیکلس آف اناؤ۔
لاہور۔ 1902

الفنسٹن اترییل ایم

ہسٹری آف انڈیا
مولفہ ای۔ بی۔ کاؤ ویل۔ لندن۔ 1905۔

فرگوسن

ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن ارکٹیکچر۔ دو جلدیں۔

گِب۔ ایچ۔ اے۔ آر۔

(ترجمہ) ڈیمسکر کرانیکل آف دی کروسیڈس۔لندن 1932۔

گیٹ سر ایڈورڈ

ہسٹری آف آسام۔کلکتہ اور شملہ۔ 1926۔

گنگولی۔ او۔ سی

ہسٹری آف بارامار ڈائی ناسٹی آف مالوہ۔ ڈھاکہ 1933۔

گھوشال۔یو۔این۔

اے ہسٹری آف ہندو پولٹیکل تھیوریز۔ مدراس۔ 1926
ایگریرین سسٹم آف اینشنٹ انڈیا۔ کلکتہ یونی ورسٹی 1910۔

حبیب۔ ایم

حضرت امیر خسرو۔ بمبئی۔ 1930۔

ہارڈی۔ پی۔

ہسٹورینس آف میڈیول انڈیا۔ لندن۔ 1960

ہیول ای۔ بی۔

انڈین آرکٹیکچر۔ لندن۔

ہولڈرچ۔ ڈبلیو ایچ

گیٹس آف انڈیا۔ لندن۔ 1919

ہوڈی والا۔ ایس۔ ایچ۔

اسٹڈیز ان انڈو مسلم ہسٹری۔ بمبئی 1939

ہوورتھ۔ سرہنری

ہسٹری آف دی منگولس۔ لندن۔ تین جلدیں۔ 1927!

ہیرالال

ڈیسکریٹیو لسٹ آف انسکرپشنس ان سی۔ پی اینڈ برار۔ ناگپور۔ 1916۔

حسین واجد

ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان مسلم انڈیا۔ کلکتہ یونی ورسٹی۔

جے، این بنرجی والیوم

المنائی ایسوسی ایشن۔ ڈپارٹمنٹ اف اینشنٹ انڈین ہسٹری اینڈ کلچر۔ کلکتہ یونی ورسٹی 1960

خدابخش۔ ایس۔

کانٹری بیوشنس ٹو دی ہسٹری آف اسلامک سویلزیشن۔ کلکتہ یونی ورسٹی۔1905۔

لین پول۔ ایس

میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول۔ لنڈن 1903

لیوی۔ آر۔

سوسیالوجی آف اسلام۔ دو جلدیں۔ کیمرج۔1933،

نظر ثانی شدہ پہلی جلد۔ سوشل اسٹرکچر آف اسلام کے نام سے تالیف۔ کیمرج۔ 1957

موجمدار۔ این۔ جی۔ (ایڈیٹر)

اِنسکرپشنس آف بنگال۔ جلد سوم۔ راج شاہی 1929

موجمدار۔ آر۔ سی۔ (ایڈیٹر)

ہسٹری آف بنگال۔ جلد اول۔ ڈھاکہ۔ یونی ورسٹی 1943

موجمدار اور پسالکر (اڈیٹر)

ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل۔ چھے جلدیں۔ طبع شدہ بمبئی۔ جلد پنجم دی اسٹرگل خار ایمپائر۔ طبع شدہ 1957

نارک اندرے اینڈ ویٹ۔ جی

لے مینا ریٹ ڈی ڈی باج ۔ پیرس۔ 1059۔

مارٹن

ایسٹرن انڈیا

پورنیا، رنگ پور، شاہ آباد، گیا اور ہزاری باغ وغیرہ سے متعلق بُشن نان اور ہیملٹن کی رپورٹ سے انتخاب

تین جلدیں۔ لندن۔ 12-1910۔

مرزا۔ ایم۔ ڈبلیو

لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو۔ پنجاب یونی ورسٹی 1953

مورلینڈ۔ ڈبلیو ایچ

اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا۔ کیمرج۔ 1929۔

نینار۔ ایم۔ ایچ

عرب جیوگرافرس نالج آف ساؤتھ انڈیا۔ مدراس 1947۔

نعمانی شبلی

شعر العجم

تیسرا اڈیشن۔ اعظم گڑھ۔ پانچ جلدیں 1923-1920۔

ناظم محمد
لائف اینڈ ٹائمز آف سلطان محمود آف غزنا کیمرج۔1931۔

اوجھا گوری شنکر ایچ
راج پوتانے کا اتہاس - اجمیر۔1927۔

پرساد۔ آئی۔
ہسٹری آف میڈیول انڈیا۔ الہ آباد۔ 1925

پوپ۔ اے۔ یو۔
سروے آف پرشین آرٹ۔ چھے جلدیں۔ آکسفورڈ۔

قریشی۔ آئی۔ ایچ
دی ایڈمنسٹریشن آف سلطنت آف دہلی۔ لاہور 1942

رحیم۔ اے
محمڈن جیورس پروڈنیس۔ لندن

اے حل۔ جے
مے موائرآف اے سیپ آف ہندوستان۔ لندن 1794

ریورٹی۔ ایچ۔ جی
نوٹس آف افغانستان۔ لندن۔ 1880۔

اے۔ ایچ۔ سی
ڈائی ناسٹک ہسٹری آف ناردن انڈیا
تین جلدیں۔ کلکتہ یونی ورسٹی 35-1931

روز
گلوسری آف پنجاب ٹرائبس اینڈ کاسٹس تین جلدیں۔

ریو۔ وی۔ این
ہسٹری آف راشٹر کٹاز۔ جودھپور۔ 1933۔

سماداد۔ جے۔ این
گلوریز آف مگدھ۔ پٹنہ۔

شاردا۔ ایچ۔ این

اجمیر۔ ہسٹاریکل اینڈ ڈیسکرپٹیو۔ اجمیر۔ 1911۔

اسمتھ۔ وی۔ اے

ارلی ہسٹری آف انڈیا۔ آکسفورڈ

شرما۔ سری رام

ریلیجس پالیسی آف مغل ایمپررز۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ 1940

اسٹیورٹ چارلس

ہسٹری آف بنگال۔ لندن۔ 1813۔

تھامس ایڈورڈ

کرانکل آف دی پٹھان کنگس آف دہلی۔ لندن۔ 1871

تھامس۔ ایف۔ ڈبلیو

میوچودل اِن فلوائنسز آف محمڈنس اینڈ ہندوز اِن انڈیا کیمرج۔ 1892۔

ٹائی ٹس مرے

انڈین اسلام۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس۔ 1930۔

ٹوڈ کرنل

اینلس آف راجستھان۔ مولفہ کروک۔ آکسفورڈ 1920۔

ترپاٹھی۔ آر۔ پی

سم آسپکٹس آف مسلم ایڈمنسٹریشن۔ الہ آباد۔ 1935

ودیا۔ سی۔ وی

ہسٹری آف میڈیول انڈیا۔ جلد سوم بعنوان ڈاؤن فال آف ہندو انڈیا۔ بمبئی۔

رائٹ نیلسن

کوائنس اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانس آف دہلی۔ دہلی۔ 1936۔

۱۷ رسائل گزٹ فہرستیں اور حوالے کے ذرائع

اینشنٹ انڈیا : ڈیپارٹمنٹ آف آرکیالوجی۔ دہلی۔

بانگیا ساہتیہ پریشت پتریکا : سہ ماہی۔ کلکتہ۔

بلیٹن آف لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز۔ سالانہ۔ لندن۔

کٹیلاگ آف کوائنس ان دی انڈین میوزیم مرتبہ : این۔ رائٹ۔ آکسفورڈ 1907

کٹیلاگ آف کوائنس اِن برٹش میوزیم۔ لندن : دی سلطان آف دہلی۔ مرتبہ : ایس لین پول۔ لندن۔ 1884۔

کٹیلاگ آف کوائنس ان دی گورنمنٹ میوزیم۔ لاہور۔ مرتبہ : سی۔ ایچ۔ جی۔ راجرس۔ کلکتہ۔ 1891۔

کٹیلاگ آف پرشین مینوسکرپٹس ان دی انڈیا آفس لائبریری۔ تیار کردہ۔ ایچ۔ ایتھ۔ لندن

ایپی گرافیا انڈیکا۔ گورنمنٹ پریس۔ دہلی۔

ایپی گرافیا انڈو مسلمکا۔ گورنمنٹ پریس دہلی۔ (1951 سے، ایپی گرافیا انڈیا کے عربی فارسی ضمیمے کے طور پر شائع ہوئی۔)

گیا ڈسٹرکٹ گیزیٹر۔

انڈین اینٹی کیوری۔ بمبئی

انڈین ہسٹاریکل کوارٹرلی۔ کلکتہ۔

اسلامک کلچر۔ حیدرآباد دکن۔

جرنل آف دی امریکن اورنٹیل سوسائٹی۔

جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ کلکتہ۔

سیریز۔ دو حصوں میں، الگ الگ ایک ایٹی کوئیز کے لیے اور دوسرا نیچرل سائنس کے لیے تین سیریز۔ (1905 سے) جرنل اور کارروائی (PROCEEDINGS) ان پروگریس جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ادب سائنس اور ایریک کے لیے الگ الگ شائع شدہ۔

جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ۔ لندن۔

جرنل آف دی ڈیپارٹمنٹ آف لیٹرس۔ کلکتہ۔ یونی ورسٹی۔
جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی۔ پٹنہ
جرنل آف دی گریٹ انڈیا سوسائٹی۔ کلکتہ۔
مے موائرز آف دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ دہلی۔
مے موائرز آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ کلکتہ۔
ناگری پرچارنی پتریکا۔ سہ ماہی۔ بنارس۔
نیو انڈین اینٹی کیوری۔ بمبئی۔
نیومس میٹک کرانکل۔ لندن
راجپوتانہ گزیٹر۔ مرتبہ: ارسکنا۔
رپورٹس آف دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔
(الف) اولڈ سیریز۔ مولفہ: سر اے کننگھم
(ب) نیو امپریل سیریز۔ ہر حلقے کے لیے الگ الگ شائع کی ہوئی۔
رپورٹ آف دی ریوائزڈ سیٹلمنٹ آف جھنگ ڈسٹرکٹ۔ از: ای۔ بی۔ اسٹڈیز۔ لاہور 188[illegible]
رپورٹ آف دی ریوائزڈ سیٹلمنٹ آف شاہ پور ڈسٹرکٹ۔ از: جی۔ او سلے اور ڈبلیو۔ جی۔
ڈیوس۔ لاہور۔ 1886۔
رپورٹ آف دی ریوائزڈ سیٹلمنٹ آف مانٹگمری ڈسٹرکٹ۔ لاہور 1878۔
رپورٹ آف دی ریوائزڈ سیٹلمنٹ آف ہوشیار پور۔ ڈسٹرکٹ۔ لاہور 1879۔